رمضان مبارک
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مئی 2021
بانی
معراج رسول
صفحات 290
قیمت 100 روپے

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

چٹنی نکتہ چینی — 07
مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

سراغ — 16
شبنم شفیق
سلگتے خوابوں اور الگ راستوں کا انتخاب...
ایک پر عزم لڑکی کے دلیرانہ اقدامات

بھٹکے مسافر — 61
مظہر سلیم ہاشمی
غیر سازگار ماحول کا شکار ہو
جانے والے نوجوان کی دلچسپ کتھا

ایک اور ایک گیارہ — 71
سیر ینا راض
ذہین اور بے غرض
سراغرساں کی عملی کاوش

انعام — 81
تنویر ریاض
دولت و شہرت کی چاہ میں اقدام
قتل کے مرتکب کا سنسنی خیز احوال

اناگیر — 92
امجد جاوید
صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ
ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

گردشِ دوراں — 131
طاہر جاوید مغل
عمران جونیئر اور تابش کے لازوال
کرداروں سے سجی تحریر کے سنسنی خیز موڑ

طوفان — 144
محمد سلیم کرد
موج حوادث میں گھرے دو مصیبت
زدہ مسافروں کا دل خراش ماجرا

جلد 51 • شمارہ 05 • مئی 2021 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

4

تنک مزاج — 157 — جمال دستی

تنک مزاج حامل شخص کی کارستانی...... بے سکونی نے اسے گھائل کر رکھا تھا......

الاؤ — 166 — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

معاوضہ — 201 — اعتزاز سلیم وصلی

مختلف معاوضے میں ایک ہی کام کو سرانجام دینے والے فتنہ پرور کا شاخسانہ

دائرہ — 209 — حسام بٹ

عیش...... امید اور رشک کے دائروں میں زادِ سفر ڈھونڈتی کہانی......

آسیب زدہ — 216 — تنویر واسطی

پراسرار انداز میں در آنے والی خوش قسمتی کا احوال......

وحشی — 225 — مرزا عمران بیگ

ایک فتنہ ساماں حسینہ کی چالاکیاں...... ہوس زر نے اسے وحشی بنا دیا......

آشنا نا آشنا — 238 — ماہ رخ ارباب

دوست و دشمن...... نفرت و انتقام کے گرد گھومتی پراسرار کہانی کے پیچ و خم

فریبی چہرے — 263 — نجمہ مودی

سرورق کے صفحات پر بکھرے جفا پیشہ و فریب کاروں کا کھیل

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 5500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

pklibrary.com

مدیر اعلیٰ

نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

مئی 2021ء کا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ اسلامی کیلنڈر کے مطابق رمضان المبارک کی بابرکت ساعتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام امتِ مسلمہ کو ماہِ صیام کی برکات و فیوض سے مستفید فرمائے۔ گزشتہ دو برسوں میں تیزی سے بڑھنے والی مہنگائی نے جہاں ہر شخص کو بے بس و بے حال کر رکھا ہے۔ وہیں ملک بھر میں کورونا وائرس نے ایک بار پھر اپنے پنجے پھیلانے شروع کر دیے ہیں۔ وائرس کی اس نئی قسم نے جنوبی ایشیا میں تباہی مچا دی ہے۔ ویکسی نیشن بھی کوئی مکمل علاج نہیں، مگر موجودہ صورتِ حال میں اس نئی قسم کے وبال سے نمٹنے کے لیے الگ ویکسی نیشن کی تیاری ازحد ضروری ہو گئی ہے۔ مختلف آراء کے مطابق یہ پہلے سے طے شدہ بائیولوجیکل ویپن تھا۔ انسانوں نے خود اپنی زمین کو ایسی مصیبت میں دھکیل دیا ہے جس سے نکلنا دشوار ہے۔ اگر یہ اللہ کی ناراضی ہے تو سامراجی طاقتوں سمیت ہم سب کے لیے ایک نشانی ہے کہ اجتماعی توبہ کریں ورنہ نافرمانی پر ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے پہلے ابابیل اترے تھے...... اس بار اللہ کی نہ نظر آنے والی مخلوق کرۂ ارض پر کسی کو نہیں چھوڑے گی۔ موجودہ دگرگوں صورتِ حال میں سائنس اس مسئلے کا حل دینے سے قاصر ہے۔ جہاں سائنس...... انسانی عقل کی بے بسی کی حد ختم ہوتی ہے وہاں ربِ کائنات کی رحمتوں کا آغاز ہوتا ہے...... سب پاکستانیوں سے التجا ہے کہ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں پوری دنیا بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کریں کہ ربِ کریم پوری دنیا...... ہم سب کو اور ملکِ پاکستان کو اس عذاب سے محفوظ رکھیں...... کیونکہ توبہ اور عاجزی میں ہی نجات ہے۔ ہم معاشی طور پر کسی آزمائش کے قابل نہیں ہیں...... اللہ ہم سب کا نگہبان ہو۔

نگاہِ حبیب کی راولپنڈی سے نظرِ کرم ''اپریل کا شمارہ شدید بارش میں لینے نکلی تو بھرحاصل کر کے ہی دم لیا۔ سرورق پر آدھا چہرہ چھپائے حسینہ نظر آئیں، مادام نے کسی قسم کا کوئی تبصرہ لکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سب سے پہلے تو خالد شیخ طاہری صاحب، جاسوسی میں پہلی آمد اور بالخصوص رنگوں میں آمد کی بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیے۔ بلاشبہ پہلی جست میں یہ کامیابی سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کہانی کا عنوان، انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ جب تحریر پڑھنا شروع کی تو انداز بیاں اور منظر نگاری نے جو سماں باندھا، وہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ایک ایک لفظ، قلمکار کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ تحریر کے تانے بانے، گٹھ جوڑ، اور مختلف سچویشن کو ایک ساتھ جیسے جوڑا گیا، وہ داد دینے کے لائق ہے۔ کچھ شرپسند عناصر، طب ہو یا سیاست، پولیس کا محکمہ ہو یا پھر کسی بھی شعبے میں، ایسا ناسور ثابت ہوتے ہیں کہ انہیں معاشرے سے جدا کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہ تحریر ایسے ہی ظالم افراد کے خلاف ایک جدوجہد ہے۔ محض کچھ جگہوں پر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قاری کے لیے کچھ چیزیں، سمجھنے کے لیے آسان ہونی چاہیے تھیں۔ طبی حوالے سے بہت سی باتیں ابتدا میں مبہم رہیں جس نے روانی میں معمولی سا اثر چھوڑا۔ بہرحال یہ صرف میری ذاتی رائے ہے۔ بہت ہی منفرد اور دل کو چھو جانے والی تحریر۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ آمین !! اسما قادری صاحبہ کا رنگ، زیرِ نقاب بہت ہی اچھوتی اور دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ اوائل میں جو حالات و واقعات پیش آئے ان کے مطابق سارے شکوک و شبہات سمیر پر ہی جاتے تھے مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھی، دلچسپی اور سسپنس کا عنصر بڑھتا گیا۔ جرائم کی مختلف وارداتوں کے تانے بانے کیسے بے قصور سمیر کے ساتھ جوڑے گئے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت ہی اعلیٰ۔ کبیر عباسی کے قلم سے ٹک ٹاک اسٹار پڑھی۔ یہ تحریر زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ ٹیکنالوجی کی دنیا میں یہ ایک ایسا زہر جس نے دیکھتے دیکھتے نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے میں عالیان جیسے نوجوان کا انجام پڑھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ بس دکھ اور تکلیف کی سی کیفیت ہے۔ پسِ سازش از قلم حسام بٹ کی بات کروں تو اغوا برائے تاوان کے موضوع پر ایک دلچسپ تحریر رہی۔ عندلیب کا کردار اگرچہ شروع میں کچھ پیچیدہ دکھایا گیا۔ کامران کی طرف سے اس قدر بے وقوفی اور بے پروائی کی امید نہیں تھی۔ اختتام اچھا رہا۔ محفوظ راستہ از قلم تنویر ریاض اچھی رہی۔ قتل کا ایک اچھوتا اور منفرد منصوبہ جس نے پڑھنے والے کو قاتل کی منصوبہ بندی کی داد دینے پر مجبور کر دیا۔ فرانزک میڈیسن اور باریک بینی سے تفتیش کا احوال پڑھ کر مزہ آیا۔ آتشِ انتقام از قلم اے آر راجپوت پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انتقام کی لپیٹ میں آنے والے تین دوستوں کی کہانی بہت خوب رہی۔ شبینہ نے جس طرح تینوں کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتارا، وہ دلچسپی سے خالی نہ تھا مگر اصل ٹوئسٹ کا علم ہونے

پر تاسف اور تکلیف کی کیفیت رہی۔ بہت خوب لکھا۔ عنائشہ چوہدری کی عفریت نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے مگر جس جرم کے پیچھے عفریت ہو اس قوم کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔ بہت ہی دل گرفتہ موضوع چُنا گیا۔ فتنہ پرواز از غلام قادر، توقع کے عین مطابق بغیر کوئی تاثر چھوڑتی ہوئی تحریر رہی۔ سیدھا سادہ بے وفائی کا قصہ جس میں کوئی پیچ و خم تھے ہی نہیں، ابتدا سے آخر تک بالکل سپاٹ سی تحریر۔ محبت اور مخبری از نجمہ مودی منفرد رہی۔ محبت کی ایسی داستان جس نے پتھر دلوں کو موم کر ڈالا۔ جمال دستی کا دھچکا واقعی دھچکا تھا۔ خالصتاً کاروباری طریقے سے پرانا انتقام لینا اور دوسرے کو نیچا دکھانا آخری وقت میں مہنگا پڑ گیا۔ معاوضہ از عمران قریشی غلط کام کرنے میں کتنی بھی ہوشیاری کیوں نہ دکھائی جائے کوئی نہ کوئی ایسا کلیو ضرور رہ جاتا ہے جو مجرم کو اس کے انجام تک پہنچا تا ہے۔ اچھی تحریر رہی۔ سب لکھنے والوں کے لیے نیک خواہشات۔''

عبدالجبار رومی انصاری کی بورے والا ایکسپریس لاہور سے تیز رفتاری ''ناک پر انگلی رکھے لڑکی حیران تو ہے کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہو رہا ہے مگر اس کی حیرانگی میں آنکھیں بالکل بے تاثر ہیں مگر سرورق کی مین چیز دوشیزہ تو بالکل اچھی نہیں لگی۔ لو جی اس دفعہ در ہم بر ہم صاحب، میرا مطلب ہے محترم پرویز احمد لانگاہ نے چل رہن دے رہن دے نی چل رہن دے کا تکیہ کلام لیا ہے۔ عمدہ تبصرہ تھا۔ انور یوسف زئی کی خوشی تو ہوائی فائرنگ پر ہوا ہونے کو تھی۔ مسز فاروق بلوچ شکایت میں بھی اچھا تبصرہ و تجویز دی۔ عثمان خاں مختصراً تبصرہ؟ ریاست خان واہ جی واچھکا مار لیا آپ نے تو آپ تو مین آف تبصرہ نگار ہو گئے۔ اس دفعہ ظہیر ملک کے عمدہ تبصرے کے ساتھ داد خوب رہی۔ خلیل احمد انجم کی تعریف و تنقید بھی اچھی رہی۔ زندگی میں مصروفیات اپنی جگہ مگر ساتھ نبھانے کی رفاقت کا مزہ ہی اور ہے۔ بے چینی سے انتظار کرتی، بینا راجپوت کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ جمائل حیدر خوش آمدید۔ کنول کی لفاظی بھی اچھی تھی، لگتا ہے جلدی میں ہی تبصرہ کر گئیں کہ کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔ اداس سی مادرا عالمگیر نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ آخر میں کاشف عبید بھی پہلی دفعہ ہنستے مسکراتے محبت نامہ لکھ رہے تھے، بہت خوب بھئی ویلکم کرتے ہیں۔ پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار، عرفانہ کو اغوا کیا اور خورشید کو دے دی مار، پانچ کروڑ تاوان کی خاطر بدنام ہوا نجیب۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھا کر ہونے لگا فرار، ایک شکار عندلیب نے کر لیا دو کو زہر کا جام۔ رضا ہنڈی حوالے سے ہوا تحویلِ سرکار، پس سازش کی حقیقت جو کھل کے سامنے آئی۔ اپنے ہوں یا غیر دیکھ بھال کے کرو اعتبار۔ دو سو فٹ کی بلندی پتلی دیوار پر جھومتے ہوئے مسکراہٹ اچھالی اور گر کر اپنی جان دے دی۔ مطلب خودکشی کر لی ایسی... دھماکا خیز ویڈیو بنا کے مرنے کا فائدہ اس سے تو بہتر تھا زندہ رہ کر اپنا نام روشن کرتا۔ انتقام کے جذبے سے لبریز آتشِ انتقام عمدہ کہانی تھی۔ بھلا عورت بھی کسی کی سمجھ میں آتی ہے؟ تو ننکانا والی پوجا اس کی سمجھ میں کیسے آ جاتی اور پھر پوجا کو ڈن کرنے کے بعد اس کا راکیش ورمانیٹ ورک ختم کرنا اور آسان ہو گیا۔ زہرِ نقاب میں بیگم شہوار اور اس کے بیٹے زبیر نے جو کیا، اس کا خمیازہ بھگت لیا۔ اظفر کمال نے اپنی محبت کو مجبور ہو کر چھوڑا مگر ان کے لیے اپنی وصیت میں بڑی جائداد بھی لکھ دی سو عبیرہ اور سمیر کو اپنی نیک نیتی کا اچھا پھل مل گیا۔ کرپٹ بڑے لوگوں کے کرتوت بھی بڑے ہی ہوتے ہیں۔ نادر فریال، رافع اور انسپکٹر ذیشان کی پلاننگ سے انسانیت کے دشمن رستم شاہ، مسٹر ناظمی ریحانہ اور فقیر داد گسی اپنے انجام کو پہنچے۔ اس سب میں محبوب بھائی کی قربانی بے مثال رہی۔''

انور یوسف زئی کی اسلام آباد سے پرچہ دیر سے ملنے کی شکایت ''شدید بارشوں اور تعطیل کی وجہ سے جاسوسی اس بار 26 تاریخ کو مل سکا۔ سرورق بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ پرویز احمد کو اس ماہ کی صدارت مبارک۔ ریاست خان شاید ان دنوں زیادہ ہی

التماس دعائے صحت

اشفاق نیوز ایجنسی ملتان کے مالک جناب عباس ملک پر عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا ہے اور وہ اس وقت ملتان کارڈیالوجی میں زیرِ علاج ہیں۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ شفائے کاملہ کے لیے دعا کریں۔ اللہ رب العزت انہیں جلد سے جلد صحت کلی عطا فرمائے۔ ادارہ اس مشکل گھڑی میں ان کے ساتھ ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ پاک مکمل صحت دے۔ الٰہی آمین۔

ادارہ

فارغ ہیں جو اتنا طویل ڈیڑھ صفحات کا تبصرہ لکھ مارا۔ (قینچی کا استعمال کرنے پر) سب سے مختصر تبصرہ نووارد جمائل حیدر کا تھا۔ میری ہم شہری ایمانے زارا شاہ اس بار غائب تھیں۔ شمارے کی اولین کہانی حسام بٹ کی پسِ سازش اچھی تحریر تھی اور بلاشبہ اول قرار پائی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں زیرِ نقاب اور نجات نیم شب گزارے لائق تھیں۔ سلسلے وار کہانی الاؤ میں ڈاکٹر سیف اپنے مجرموں تک پہنچ ہی گیا تھا کہ انڈین آرمی کے ہتھے چڑھنے کو ہے۔ دوسری کہانی انا گیر میں علی زین پوجا کے فریب میں آچکا ہے۔ مغربی کہانیوں میں تحویر ریاض کی محفوظ طریقہ ایک اچھوتی تحریر تھی اور مقامی کہانیوں میں نجمہ مودی کی محبت اور مخبری شاندار تھی۔ کارٹون صرف ایک اور کتر نیں گیارہ تھیں۔"

محمد رؤف مغل کی شاہ کوٹ ضلع ننکانہ صاحب سے چینی نکتہ چینی "جے ڈی پی کے ساتھ میرا تعلق تقریباً 25 سال پرانا ہے مگر محفل میں حاضری آج پہلی بار دے رہا ہوں۔ (کیوں بھئی۔ اتنی تاخیر؟) معراج رسول صاحب کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تعزیت قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اس ماہ جاسوسی کا شمارہ 22 مارچ کو ڈیرہ غازی خان میں مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے سلسلے وار کہانیاں انا گیر اور الاؤ پڑھیں۔ چاچا عبدالحمید کے بعد ایک عدد تایا بھی میدان میں آگیا ہے۔ امجد جاوید صاحب بہت خوب، مزہ آگیا۔ علی زین کا یہ سفر کب ختم ہوگا اور کب اسے چین نصیب ہوگا؟ دوسری سلسلے وار کہانی میں ایک جگہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے لکھا ہے کہ جب ڈاکٹر سیف مانڈے کے ریلوے اسٹیشن پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ریڑھے والے نے کالی سلیٹ پر ترکاری پھلکا، دال گھوٹالا لکھ کر لٹکایا ہوا ہے۔ کیا اس نے یہ عبارت اردو یا پنجابی میں لکھ کر لٹکائی تھی؟ کیونکہ ڈاکٹر سیف کو تو ہندی پڑھنی اور بولنی نہیں آتی۔ (ہوسکتا ہے اردو میں لکھا ہو۔ وہاں بھی یہ زبان لکھی اور بولی جاتی ہے یا پھر انگریزی میں.....) ویسے کہانی اچھی جارہی ہے اور مزہ دے رہی ہے۔ عنائشہ چوہدری کی کہانی عفریت پڑھی یہ کہانی Two in one اسٹوری ہے یعنی ایک اسٹوری میں دو کہانیاں۔ اے آر راجپوت کی آتشِ انتقام پڑھی۔ شبینہ نے غلط فہمی کی بنیاد پر تین قتل کردیے اور اصل قاتل سے شادی کر کے خود بھی خودکشی کرلی۔ جمال دستی کی دھچکا پڑھ کر خود کو بھی دھچکا لگا۔ اس لیے کہتے ہیں کہ غصہ حرام ہے۔ کبیر عباسی کی نک ٹاک اسٹار پڑھ کر دل بہت غمگین ہوا اللہ تعالیٰ ہماری نئی نسل کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ حسام بٹ کی پسِ سازش پڑھ کر پتا چلا کہ آستین کے سانپ والا محاورہ سچ ہے اور بٹ صاحب نے سسپنس میں شائع ہونے والی ملک صفدر حیات کی اسٹوری کا مشہور ڈائیلاگ ہماری تفتیش کی گاڑی تو شک کے پیٹرول سے ہی چلتی ہے یہاں بھی استعمال کرلیا۔ ویل ڈن بٹ صاحب۔ تبصرہ اتنا ہی کافی ہے زندگی رہی تو پھر سہی۔ اولین صفحات پر پرویز احمد لانگاہ براجمان نظر آئے۔ مبارک باد جی ریاست خان کا طویل تبصرہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ محمد عثمان، انور یوسف زئی، ظہیر ملک، خلیل انجم، بینا راجپوت، کنول صاحبہ، کاشف عبید، جمائل حیدر اور مسز فاروق بلوچ کے تبصرے بھی اچھے لگے۔"

جمائل حیدر کی باتیں اختصار کے ساتھ "تمام مشاغل میں سے سب سے اولین جاسوسی کو پڑھنا ہے اور اس کے خطوط کی محفل کا حصہ بننے پر دلی مسرت حاصل ہوئی۔ ازحد تشکر مدیران صاحب! کورونا کی تیسری لہر کی آمد آمد ہے، خود کو اس وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں تمام تر احتیاطی تدابیر بروئے کار لانی ہوں گی۔ کورونا کے ساتھ ساتھ غیر معمولی بارش بارانِ رحمت کے بجائے زحمت کی طرح برس رہی ہے۔ فصلوں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا ہے ہمیں ان آفات سے بچائے۔ آمین ثم آمین! حسام بٹ کی پسِ سازش سے آغاز کیا اور اختتام نجات نیم شب پر ہوا۔ نک ٹاک کے فتنہ پرداز آتشِ انتقام نے زیرِ نقاب دھچکا دیا۔ محبت اور مخبری ایک ساتھ عفریت ہی بن جاتی ہیں اور کوئی محفوظ طریقہ کارگر نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا لگا۔ خطوط کی محفل میں پرویز احمد لانگا کا درہم برہم تبصرہ جگمگا رہا ہے۔ ریاست خان، مسز فاروق، بینا راجپوت اور کنول کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ دیگر لوگوں کی نوک جھوک بھی مزہ دوبالا کردیتی ہے۔"

بینا راجپوت کی اسلام آباد سے پسند ناپسند "اس بار جاسوسی نے ہمارے سارے گلے شکوے دور کردیے اور اسلام آباد میں 18 مارچ کو ہی بہ آسانی دستیاب ہوگیا۔ سرورق کی بات کریں تو ٹھیک تھا نہ اچھا نہ برا۔ چینی نکتہ چینی میں ایمانے کے نہ ہونے سے تھوڑی کمی سی محسوس ہوئی۔ امید ہے اس بار وہ اپنی شعلہ بیانیوں کے ساتھ موجود ہوں گی۔ محمد عثمان خان لاہور سے ہمارے ادبی گروپ کے بڑے اچھے ممبر اور جاسوسی سسپنس کے بہت کریزی قاری ہیں۔ مجھے بطور خاص بتایا کہ بینا جی میں نے اپنے تبصرے میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ میں عثمان جی میں نے بھی آپ کا ذکر خیر کردیا۔ سب سے پہلے سرورق کی دوسری کہانی کا ذکر کروں گی۔ خالد شیخ طاہری صاحب کا نام جاسوسی کی سرورق کہانی پر دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ جاسوسی میں اس دھانسو قسم کی شمولیت کے لیے مبارک

باد۔ میں ان کی بہت سی تحریریں پہلے پڑھ چکی ہوں اور ان کو اپنے قلمی استاد کی جگہ مانتی ہوں۔ بے حد نفیس انسان ہیں۔ میرے جیسے ننھے منے نئے قلمکاروں کی بہت شائستگی سے راہنمائی کرتے ہیں۔ اب بات کریں نجاتِ نیم شب کی تو ابتدا بہت زبردست تھی اور کہانی کے تانے بانے بہت عمدگی سے بُنے گئے، منظر نگاری بھی خوب رہی اور مرکزی خیال بھی اعلیٰ تھا، بلاشبہ ہمارے معاشرے کے کرپٹ سسٹم کا احاطہ کرتی یہ ایک خوب صورت تحریر تھی مگر مجھے محسوس ہوا کہ کہانی کا جو بنیادی مدعا تھا اس کی وضاحت میں طاہری صاحب تھوڑا چوک گئے، اس کے علاوہ رافع کا کردار تھوڑا تخیلاتی محسوس ہوا۔ باقی یہ کہ کہانی کا کینوس بہت وسیع اور کردار بہت زیادہ تھے، ایک وقت تو مجھے لگا کہ اتنے زیادہ کرداروں کی موجودگی میں کہیں کہانی کو منہ کے بل نہ گرا دے لیکن یہاں طاہری صاحب سو فیصد داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سب کرداروں کو ایک منطقی انجام دیتے ہوئے کہانی کا اختتام کیا۔ امید ہے طاہری صاحب آئندہ بھی جاسوسی میں اپنے رنگ بکھیرتے نظر آئیں گے۔ (انشاء اللہ) اسما قادری جی بھی اس بار سرورق کہانی کے ساتھ شامل ہوئیں۔ اسما جی میری پسندیدہ قلمکاروں میں سے ہیں اور ان کا قلم کافی کاٹ دار ہے۔ اکثر معاشرے کے تلخ پہلوؤں کو موضوع بناتی ہیں۔ زیرِ نقاب میں بھی ایسے ہی ایک کڑوے پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات نفرت، حسد اور انتقام کے جذبات ہم پر بری طرح حاوی ہوتے ہیں اور ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے کسی غیر ذمے دارانہ اقدام سے ہم سے جڑے بہت پیارے لوگ تکلیف میں آسکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کسی بھی عمل کا دارومدار انسان کی نیت پر ہوتا ہے۔ سوتیلے رشتوں کو کوئی بھی دل سے قبول نہیں کر پاتا لیکن اگر تھوڑا سا ظرف بڑا کر لیا جائے تو زندگی قدرے سہل ہو سکتی ہے۔ زبیر بھی اگر اپنے سوتیلے بھائی سمیر کے لیے اپنی نفرت اور حسد کے جذبات پر قابو پا کر آگے بڑھ جاتا تو اتنے بُرے انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ حسام بٹ اس بار ابتدائی صفحات میں نظر آئے، ان کی تحاریر عموماً ایک چونکا دینے والا اختتام لیے ہوتی ہیں۔ جس کو وہ اکثر قاری کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ پسِ سازش بھی ایسی ہی ایک تحریر تھی۔ اس نے شروع سے اختتام تک دماغ کو کافی پٹخنیاں دیں کہ میں سوچنے لگی شاید پسِ سازش عرفانہ خود ہی ہے۔ لیکن وہ شہلا نکلی۔ دلچسپ کہانی تھی۔ اس کے علاوہ دھچکا، آتشِ انتقام، عفریت اور ٹک ٹاک اسٹار مزے کی تھیں۔ محفوظ طریقہ، محبت اور مخبری، معاوضہ اور فتنہ پرداز نے بور کیا۔ مجموعی طور پر اپریل کے شمارے نے بوریت اور دلچسپی کا توازن قائم رکھا۔"

ابوحسان ابرار احمد کی رائے اسلام آباد سے "جاسوسی اپریل 2021ء مارچ 31 کو بک شاپ سے خریدا اور سرورق پر نظر دوڑائی جہاں پر ایک گورا ہاتھ میں پستول لیے کالی زلفوں والی حسینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا اور پس منظر میں ایک لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ سرورق کے بعد فوراً سے بھی پہلے چینی نکتہ چینی میں چھلانگ لگائی جہاں پر پرویز احمد لانگاہ ایک طویل اور جامع تبصرہ کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئے (مبارک باد)۔ ریاست خان داودخیل، ظہیر ملک اور خلیل انجم بھی کہانیوں کا تیا پانچا کرتے ہوئے چینی نکتہ چینی میں مرکزِ نگاہ رہے۔ محمد عثمان خان اپنا خط شائع ہونے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے نظر آئے جبکہ مینا راجپوت، کنول اور ماورا عالمگیر نے صنفِ نازک کی ترجمانی کرتے ہوئے خوب صورت تبصروں کے ساتھ محفل کو چار چاند لگائے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف جس میں سب سے پہلے بات ہو جائے خالد شیخ طاہری کی نجاتِ نیم شب کی۔ ایک نئے مصنف کے لیے جاسوسی کے رنگوں میں جگہ پانا ہی اس کی کہانی کے لیے سب سے بڑا خراجِ تحسین ہوتا ہے۔ خالد شیخ طاہری نے ایک حساس موضوع کو قرطاس کی زینت بنایا جس میں معاشرے کے چند گھناؤنے کرداروں کو بے نقاب کیا گیا۔ مصنف نے پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری کو اپنے قلم کے سحر میں جکڑے رکھا۔ رافع، محبوب بھائی اور انسپکٹر ذیشان جیسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو حسبِ استطاعت اس ملک کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔ کہانی تھوڑی مختصر رہی کچھ مزید اضافہ کیا جا سکتا تھا لیکن بطور مصنف خالد شیخ نے بھرپور انٹری کی (مبارک باد)۔ سرورق کا پہلا رنگ زیرِ نقاب جس کو اسما قادری جیسی منجھی ہوئی مصنفہ نے تحریر کیا اپنی مثال آپ تھا۔ کہانی نے شروع سے آخر تک قاری کو تجسس میں جکڑے رکھا۔ جاسوسی کے معیار کی ایک بہترین کہانی رہی۔ جس میں سگے سوتیلے رشتوں کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ، اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی۔ سمیر جس کو جائداد کی خاطر اس کے سوتیلے بھائی نے پولیس کے چنگل میں پھنسا دیا۔ اس کے خلاف کیس اتنے مضبوط تھے کہ وکیل بھی کیس ہاتھ میں لے کر پچھتا رہا تھا۔ عبیرہ، سمیر کی ماں جس کو اپنے بیٹے کی بے گناہی کا یقین تھا اور آخر کار ماں کا یقین جیت گیا دوسری طرف بیگم شہوار جس نے اپنے بیٹے کے گناہوں کی سزا بھی اپنے سر لے لی لیکن بیٹا مکافاتِ عمل سے بچ نہیں پایا۔ حسام بٹ کی اولین صفحات کی سوغات پسِ سازش اغوا برائے تاوان سے شروع ہونے والی ایک تجسس تحریر تھی جس میں ملزم آخری لمحے تک پسِ نقاب رہا۔ شہلا جیسی سادہ لوح انسان بطور مجرم کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا لیکن کہانی کا ایک فقرہ بھولا پن اور معصومیت صرف بچوں پر ہی زیب دیتا ہے کہانی کا نچوڑ رہا۔ غلام

قادر کی فتنہ پرداز شوبز اور بازارِ حسن کے پس منظر میں لکھی گئی ایک بولڈ تحریر تھی جس میں مصنف نے اپنی سابقہ تحاریر کی طرح کھلے ڈلے انداز میں منافقت سے لبریز رشتوں کو بے نقاب کیا۔ امجد جاوید صاحب کی انا گیر بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ ہر روز ایک نیا بکھیڑا اعلیٰ کا منتظر ہوتا ہے۔ امجد جاوید صاحب کہانی کو بہترین انداز میں آگے لے کر جا رہے ہیں۔ کبیر عباسی کی ٹک ٹاک اسٹار موجودہ حالات میں ہر روز سنے جانے والے ٹک ٹاک کے شوقین افراد کے حادثات کے پس منظر میں لکھی گئی ایک چونکا دینے والی تحریر تھی جس کے اختتام نے افسردہ کر دیا۔ ٹک ٹاک اور سوشل میڈیا کیسے ہماری زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے اور ہماری نوجوان نسل کیسے اس کی بھینٹ چڑھ رہی ہے، ان معاملات کا پردہ چاک کرتی ہوئی ایک اعلیٰ تحریر۔ عالیان جیسے نوجوان توجہ حاصل کرنے کے لیے زندگی کی بازی لگا دیتے ہیں۔ والدین کی عدم توجہی اولاد کے لیے ایک ناسور بن جاتا ہے جس کا علاج ڈھونڈنے کے لیے اولاد اچھے بُرے کا فرق بھی بھول جاتی ہے۔"

محمد حسنین مہال فرام جتوئی سے لکھتے ہیں "حسینہ کی آنکھیں ہماری فلکا جیسی تھی۔ خوب صورت ماشاء اللہ اور فہرست میں جا کر دم لیا اور فہرست میں کبیر عباسی کی ٹک ٹاک اسٹار پڑھی۔ کیا کمال کی لکھی ہے۔ عالیان بیچارہ توجہ کا بھوکا تھا۔ جو اسے مرنے کے بعد ملی۔ دوسرے نمبر پر حسام بٹ کی پپ سازش پڑھی، اچھی تھی مگر دل کو نہیں لگی۔ پھر ہمیں الاؤ نے متوجہ کیا ہم تو بھاگے چلے گئے۔ شروع کیا تو وقت کا احساس تک نہ ہوا جسونت رائے نے ٹشو کی طرح سیف کو استعمال کر کے پھینک دیا۔ اور مجھے ایک پشتون کہاوت یاد آ گئی کہ اگر امیر آدمی گدھا بھی ہوگا وہ تب بھی چالاک ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ کوئن نے اکو نائٹ خریدنے کے بعد اس کی رسید ضائع کیوں نہ کی۔ پھر ہم چینی نکتہ چینی میں پہنچے جہاں ... پرویز لانگاہ صاحب کرسیِ صدارت پر بیٹھ کر سب کو درہم برہم کرتے نظر آئے۔ لگتا ہے انہوں نے محی الدین نواب کی اسٹوری پڑھی ہے جو ابتدائی صفحات پر شائع ہوئی تھی جس کا نام درہم برہم تھا اس لیے سب کو درہم برہم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ باقی سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ شبینہ نے تین بے گناہوں کا قتل کر دیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے نظر کا فریب ہو۔ پھر خالد شیخ کی اسٹوری پڑھی..... آپ نے بہت محنت کی کبھی کبھی پڑھتے ہوئے لگتا تھا کہ غلام قادر جیسا انداز ہے۔ آپ لکھتے اچھا ہیں۔ مگر آپ اپنے قلم میں تھوڑی سی روانی آنے دیں۔ جمال دستی اچھا لکھتے ہیں۔ اسما قادری نے بہت اچھا لکھا۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

ماورا عالمگیر کی پریشانی، اداسی رحیم یار خان سے "سرورق پر موجود حسینہ مجھے اپنی طرح ہی دل گرفتہ اور اداس محسوس ہو رہی تھی یا پھر خون میں ڈوبا قفس میری ترجمانی کر رہا ہے۔ سین کچھ یوں ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ گزرنے کے باوجود رسالہ نہ مل سکا، کافی شور مچانے پر ہاکر نے کہا کہ وہ تو رسالہ دے گیا ہے۔ جب بھائی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ نہیں ہمیں تو ایک ہی دے کر گیا ہے، اچھا تم میرے والا پڑھ لو جب وہ اپنے پورشن سے رسالہ لے کر آیا تو کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہی ڈائجسٹ ہے۔ ہمارے پاس دو پڑے تھے۔ اور یوں مجھے چار اپریل کی شام کو ڈائجسٹ ملا۔ اسما قادری کی کہانی ان کی طرح ہی لاجواب ہے۔ اسما جی مجھے اے سی شہریار والی کہانی ابھی تک یاد ہے پلیز اس جیسی کوئی اور تحریر لکھیں نا پلیز۔ اس دفعہ طاہر جاوید دی لیجنڈ غیر حاضر ہیں؟ وی مس یو عمران۔ باقی ڈائجسٹ ابھی نہیں پڑھا۔ اور ریاست خان بھلا چائے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے؟ ہر وقت چائے پینے کا ہوتا ہے۔ باقی افراد کا محفل میں خوش آمدید کہنے اور پسندیدگی کا شکریہ۔"

ساجد محمود کی انگلینڈ سے سرشاری "جاسوسی انگلینڈ میں کبھی وقت پر مل جائے، یہ انہونی کبھی نہیں ہوئی لیکن اس بار ہونی کو کون ٹال سکتا تھا جب انہونی ہونے جا رہی تھی۔ جی ہاں اس بار جاسوسی اتنا جلدی صرف اس وجہ سے ملا کہ یہاں کی حکومت نے پاکستان کو نو اپریل سے ریڈ لسٹ میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یوں سارے پردیسی نو اپریل سے پہلے پہلے واپسی کے ٹکٹ کٹوا رہے ہیں۔ کووڈ پاکستان میں پھر سے اپنے مہیب پنجے پھیلا رہا ہے جو ساری قوم کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ جانے کتنے جاننے والے اور دوست احباب اس وبا نے چھین لیے۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اس موذی وبا سے ہماری جان چھڑائے آمین۔ جاسوسی کا اپریل کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی بات کریں تو ٹھیک ہی لگا۔ چینی نکتہ چینی میں کچھ پرانے تبصرہ نگار نا دیکھوں تو پوری چینی پھیکی محسوس ہوتی ہے۔ لانگاہ صاحب کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح ہونٹوں پر مسکان سجا گیا۔ ایمانے شاہ اس بار غائب تھیں تو شہر اقتدار سے بینا راجپوت نے اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کر لی۔ بینا کو محفل میں شمولیت پر بہت بہت مبارک باد، قبول ہو۔ خالد شیخ طاہری صاحب ماشاء اللہ تبصرہ نگاری سے آگے بڑھ کر اب قلمکاروں کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں جس کے لیے وہ بہت داد اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان کا نام جاسوسی کی سرورق کہانی پر دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ نجات تیم شب کی ابتدا بہت زبردست رہی اور کہانی کے

تانے بانے بہت عمدگی سے مُبنے گئے تھے۔ کمال کی منظر نگاری بہت خوب رہی۔ ہمارے معاشرے کی کج روی اور کرپشن کا احاطہ کرتی تحریر بہت بہترین رہی۔ اس کہانی کا کینوس بہت وسیع اور واقعات کی شمولیت کا اسکوپ بھی زیادہ تھا۔ شیخ صاحب کے کردار بہت زیادہ تھے اور جس طرح انہوں نے سب کو ایک منطقی انجام تک پہنچایا، اس کے لیے شیخ صاحب کو ویلڈن اور شاباشی۔ امید ہے شیخ صاحب آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ اسما قادری بھی اس بار سرورق کہانی کے ساتھ شامل تھیں۔ سرورق کے رنگ ہمیشہ میرے پسندیدہ رہے ہیں۔ زیرِ نقاب ایک اچھی کہانی رہی۔ حسام بٹ اس بار ابتدائی صفحات میں نظر آئے۔ شاد صاحب مرحوم کی جگہ بٹ صاحب نے خوب اچھی طرح پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا لکھا عموماً قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ پس سازش بھی ایسی ہی تحریر تھی جس کے آغاز اور اختتام نے چونکا دیا۔ اس کے علاوہ دیکھا، آتشِ انتقام، عفریت اور ٹک ٹاک اسٹار مزے کی تھیں۔ کبیر عباسی نے ٹک ٹاک اسٹار کے ذریعے سوشل میڈیا پر ہونے والے کئی ناخوشگوار واقعات بھی یاد کرا دیے۔ باقی کی کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھیں کیونکہ تبصرہ بھیجنے کی آج آخری تاریخ ہے۔ اپریل کا شمارہ مجموعی طور مجھے تو بہت پسند آیا ہے ہاں اگلے شمارے کا انتظار رہے گا کہ باقی قارئین کی کیا رائے تھی۔ اس وقت تک کے لیے اجازت۔"

ریاست خان داؤد خیل میانوالی۔ مارچ کا اختتام ہو رہا ہے اور ہاتھ میں جاسوسی ہے۔ اب میں تو خوش ہوں لیکن گھر والے خاص طور پر ابو اس بات پر زیادہ حیران ہوتے ہیں کہ ابھی مہینہ شروع ہوتا نہیں تو رسالہ کیسے آجاتا ہے۔ اپریل کا جاسوسی 21 مارچ کو 3، 4 چکر لگانے کے بعد مل گیا۔ سرورق زیادہ اچھا تھا نہ برا۔ چینی نکتہ چینی میں ادارہ کورونا کا حال احوال بتا رہا تھا۔ ہمیں لگا تھا کہ اب کورونا ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی تیسری لہر نے اودھم مچایا ہوا ہے۔ اسکول جو خوش قسمتی سے کھل چکے تھے، اب پھر بند ہو چکے ہیں۔ آگے اللہ بہتر جانے کہ کیا ہوتا ہے۔ پرویز احمد لانگاہ بہت مبارک باد...... پر چل بن رہن دے تبصرہ مختصر لیکن اچھا تھا۔ انور یوسف زئی گولڈن جوبلی کا اشتہار دیکھنے کے بعد حواس کھوتے ہوئے اور ہوائی فائرنگ کا خیال دل میں لاتے ہوئے، ارے بھئی آہستہ ایسا ظلم مت کریں ورنہ پولیس کی تحویل میں اگلا تبصرہ لکھنا پڑے گا۔ مسز فاروق صاحبہ شکوہ کرتے ہوئے حاضر ہوئیں کہ ان کا تبصرہ کاٹ دیا گیا ہے۔ محترمہ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے آپ دل پر مت لیں ادارے کو ویسے بھی ثواب کمانے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔ ظہیر ملک خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ تبصروں میں جگہ بنانے کے لیے مبارک باد۔ خلیل احمد نجم سرورق پر تنقید کرتے ہوئے نظر آئے۔ بھئی سرورق اتنا اچھا تو ہوتا ہے اب اور کیا کیا جائے بھلا کہ رنگ زیادہ نظر آئیں۔ بینا راجپوت صاحبہ اتنے عرصے بعد واپس آنے پر خوش آمدید۔ جاسوسی ڈائجسٹ ہے ہی ایسا کہ ایک ماہ کا پڑھتے ہیں نہیں اور اگلے ماہ کے آنے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ نئی تبصرہ نگار محترمہ حمائل صاحبہ بھی مختصر تبصرہ کے ساتھ محفل میں شریک تھیں۔ خوش آمدید جناب اب سے ہر ماہ جاسوسی کی محفل میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ مس کنول 5 تاریخ کو تبصرہ بھیج رہی ہیں۔ اتنی دیری کیوں ہو جاتی ہے بھلا جاسوسی سب کو پہلی تاریخ سے پہلے مل جاتا ہے۔ مادر اعالمگیر صاحبہ کاشف زبیر صاحب مرحوم کی تحریر سب لگ چکی ہیں۔ گولڈن جوبلی میں شاید کوئی جگہ بن جائے خواہش تو ہماری بھی یہی ہے۔ کاشف عبید پہلی مرتبہ میں ہی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے بہت بہت مبارک باد جناب اور خوش آمدید۔ اس بار تبصروں میں مس ایمانے کی کمی تھی، ان کو ڈانٹا کریں تھوڑا اتنی فارغ ہو کر بھی وہ حاضر نہیں ہوتیں۔ کہانیوں کی بات کریں تو سب سے پہلے ابتدائی صفحات پر حسام بٹ صاحب کی پس سازش تھی، کہانی اچھی تھی لیکن دل کو زیادہ نہیں لگی۔ اس شمارے کی سب سے بیسٹ اسٹوری میرے خیال میں ٹک ٹاک اسٹار تھی۔ موجودہ زمانے کے تلخ پہلوؤں کو اجاگر کرتی پُراثر تحریر جس نے کمال کر دیا۔ فتنہ پرداز غلام قادر کی تحریر... ایسی مثلث تھی جس کے تینوں کونے مختلف سمتوں میں تھے۔ آتشِ انتقام اے آر راجپوت کی خوب صورت تحریر جو نفرت اور انتقام کے گرد گھومتی رہی۔ الاؤ کچھ زیادہ ہی بھڑک اٹھا ہے۔ کہانی بہت زبردست ہوتی جا رہی ہے۔ محبت اور مخبری نجمہ مودی کی پُراثر تحریر۔ ڈرگ ماسٹر کا پوتا جو آگے جا کر بڑا آدمی بننے والا تھا۔ ایک لڑکی جو مخبر ہوتی ہے اس کی وجہ سے اپنے گینگ سے بغاوت کر دیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے لیکن وہ ان دونوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں اور بڑے ملک صاحب جو اس گینگ کے سربراہ ہوتے ہیں ان کے سامنے لے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے پوتے کو بھی معاف نہیں کرتے اور ان دونوں کو وہیں پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی اسما صاحبہ کی زبردست کہانی رہی۔"

کنول کی کول کول باتیں چنیوٹ سے "اس بار جاسوسی بائیس مارچ کو ملا۔ سرورق شاندار تھا۔ اداریے میں اس بار کورونا کی وبا کا ذکر رہا۔ خطوط میں پہلی کرسی پر پرویز احمد لانگاہ صاحب براجمان تھے۔ تبصرہ شاندار تھا۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ انور یوسف زئی، محمد عثمان خان، ریاست خان، خلیل احمد نجم، مبارک دینے کا شکریہ۔ ظہیر ملک صاحب نے بھی تبصرہ پسند کیا، ان کا

بھی بہت شکریہ۔ ریاست خان کا تبصرہ سب سے طویل تھا اور سب سے اچھا مجھے مینا راجپوت کا تبصرہ لگا۔ سب سے پہلے عمران قریشی کی تحریر معاوضہ پڑھی۔ کہانی میں مرکزی کردار مالی بحران کا شکار تھا۔ انگم بڑھانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا۔ سسپنس سے بھرپور شاندار تحریر تھی۔ جمال دستی کی دھچکا ایک دلچسپ تحریر ثابت ہوئی اور کہانی کے اختتام پر پڑھنے والوں کو بھی اچھا خاصا دھچکا لگنا لازمی ہے۔ شاندار تحریر تھی پسند آئی۔ نجمہ مودی کی تحریر محبت اور مخبری ڈرگ مافیا سے متعلق تھی۔ ڈرگ لارڈ کا جانشین اور پوتا محبت کے ہاتھوں ایسا گھائل ہوا کہ خاندان سے غداری کر بیٹھا۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ جس طرح سے امان کی تعریفیں کی گئی تھیں، اسے اور اس کی محبوبہ کو کچھ فائٹ تو دینی چاہیے تھی۔ اتنی آسانی سے ہاتھ لگ گئے جیسے کہ فرار ہی پکڑے جانے کے لیے ہوئے تھے۔ اور پھر مافیا ڈان کا اتنی آسانی سے اتنی سی غلطی پر اپنے اکلوتے پوتے کو مروا دینا یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ عنائشہ چوہدری کی عفریت گزارے لائق تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دو مختلف کہانیوں کو ایک کر دیا گیا ہے۔ البتہ پاکستان میں جنس کے عفریت کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ اے آر راجپوت کی آتشِ انتقام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انتقام کے جذبے پر لکھی گئی تحریر تھی۔ شبینہ نے اپنے شوہر کے قتل کے بدلے میں تین معصوم لوگوں کی جان لے لی اور اصل قاتل ریحان سے ہی شادی کر بیٹھی۔ بہرحال اختتام پر خودکشی کر کے بھی اس نے ریحان سے انتقام لے ہی لیا۔ غلام قادر کی فتنہ پرداز ہمیشہ کی طرح ان کے مخصوص انداز اور موضوع پر ہی تھی۔ ویسے ان کی کہانیوں میں شاداں نام کچھ زیادہ ہی استعمال نہیں ہوتا۔ کہانی ٹھیک ٹھاک تھی کبیر عباسی کی نک ناک اسٹار شاندار تحریر ثابت ہوئی۔ آج کل کی نوجوان نسل جس طرح نک ناک کی لت میں مبتلا ہو چکی ہے اسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کوئی بھی عادت یا شوق جب ایک..... حد سے بڑھ جائے تو پھر آر یا پار والی سچویشن ہو جاتی ہے یا تو انسان اس شوق میں کمال حاصل کر لیتا ہے یا پھر سب کچھ کھو کر خالی ہاتھ اور مایوس رہ جاتا ہے۔ بچوں کی اس قسم کی بے اعتدالیوں میں بچوں سے زیادہ والدین قصوروار ہوتے ہیں۔ اگر ایک زندگی کو دنیا میں لانے کی غلطی کر ہی لی ہے تو اس کی مناسب تربیت کرنا بھی والدین کی ہی ذمے داری ہے۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر سے پہلے کسی بچے کو اسمارٹ فون لے کر دینے کی بیوقوفی سے پرہیز کرنا چاہیے ورنہ پھر نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ عالیان کی نک ناک کے لیے حد سے بڑھی ہوئی دیوانگی اسے لے ڈوبی۔ زرتاج کا کردار بالکل پسند نہیں آیا۔ تنویر ریاض کی تحریر محفوظ طریقہ کافی الجھی ہوئی اور پیچیدہ سی لگی۔ کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ خالد شیخ طاہری کی پہلی تحریر نجاتِ نیم شب جاسوسی میں شامل ہوئی ہے اور پہلی بار میں ہی متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ ایک نئے لکھاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کافی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ میں اتنی بہتر کہانی کی امید نہیں کر رہی تھی۔ کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن وہ تو بہت منجھے ہوئے لکھاریوں کی کہانیوں میں بھی نکل آتی ہیں۔ پولیس یا یوں کہہ لیں انسپکٹر ذیشان نے اتنی آسانی سے رافع، نادر، فریال اور محبوب کو ماورائے عدالت قتل کرنے کی اجازت بھی دی اور خود بھی اس منصوبے میں شامل ہو گیا اور وہ بھی عوامی جگہ پر..... یہ بہت ہی عجیب بات تھی ماورائے عقل قسم کی لگی۔ (حالات و واقعات نے بہت سی چیزوں کو بہت آگے کر دیا ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں) اس طرح کی ایک دو خامیوں کے علاوہ کہانی شاندار تھی۔ امید ہے آئندہ بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھتے رہیں گے۔ اسما قادری کی زیرِ نقاب بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی بوتیلے رشتوں سے جنم لینے والی نفرت جرائم پر مشتمل اچھی کہانی تھی، پسند آئی۔ حسام بٹ کی پسِ سازش بھی اچھی تھی۔ ایک بڑے بزنس مین خلیق کی بیٹی کے اغوا برائے تاوان اور اس کے مجرموں کی تلاش کی کہانی تھی۔ ویسے حسام بٹ کی کہانیوں میں لفاظی بہت زیادہ ہوتی ہے۔" (یہ ان کا اسٹائل ہے)

عامر مشتاق کا قصور سے مطالعہ "جاسوسی اپریل کا شمارہ اردو بازار سے ملا، سرورق کافی پیارا تھا، چینی نکتہ چینی اچھا سلسلہ ہے، شاندار تبصرے پڑھنے کو ملے۔ کہانیوں میں حسام بٹ کی پسِ سازش نمبر ون کہانی رہی، جاسوسی دنیا میں انہوں نے اپنے نام کا لوہا منوایا ہے، فتنہ پرداز بہت اچھی تحریر تھی، آتشِ انتقام بھی پسند آئی، الاؤ اچھی جا رہی ہے، معاوضہ اور زیرِ نقاب بھی اچھی تھیں۔ باقی خوب صورت شمارے کا مطالعہ جاری ہے۔

ثاقب تبسم ثاقب کی علی پور چٹھہ سے عمدہ نگاری "ماہ اپریل کا شمارہ لاہور میں موصول ہوا، کورونا کے باعث خوف کے ماحول میں جاسوسی ڈائجسٹ کا یہ تازہ شمارہ تازگی کا احساس لیے ہوئے تھا۔ لیکن سرورق کی حسینہ نے ماتھے پر شکنیں لیے، توپیں میں ملبوس اینگری ینگ مین کو ریوالور تانے دیکھا تو سینے کی گہرائی میں اترتی اک ٹیس محسوس ہوئی کہ اس ماحول میں بھی لوگوں کو دشمنی اور عداوت پالنے کا وقت میسر ہے۔ ان حالات میں بھی لوگ سراپا نفرت بنے ہوئے ہیں۔ سرخ ٹائی والے اس جوان کے بازو کے نیچے حسینہ بلکہ فتنہ دلربا کے نیم براؤن بال دکھائی دیے۔ نفاست سے سجے یہ بال اچھے لگے۔ گوری اور کشادہ جبین کے نیچے ابرو بھی

مہارت سے تیار کیے گئے تھے اور آنکھیں۔ ان آنکھوں کی تو بات ہی نرالی تھی، مدھ بھری، مسحور کن۔ شاعرانہ آنکھیں۔ جن میں مستی کے کٹورے بھرے پڑے تھے اور اُمڈنے کو تیار تھے۔ ہلکے نیلے رنگ کی آنکھوں کو باریک، خوب صورت پلکوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس چہرے کا حسن اس وقت تو اور نکھر گیا جب اس حسینہ کی خوب صورت مخروطی انگلیوں کو ماسک بنا کر ناک اور منہ پر سجا ہوا دیکھا۔ ناک پر انگلی جس انداز سے ٹھہری تھی، صاف لگتا تھا کہ ستواں ناک ہے۔ سرورق کے دائیں نچلے کونے پر ایک شخص کی خون آلود لاش تھی اور لاش ہی کی طرح بے ڈھنگی زمین پر پڑی تھی۔ سرورق حسبِ معمول شاندار تھا۔ اس کا لطف لیتے ہی ہم محفل غوں غاں میں پہنچے تو پرویز احمد کا اندازِ تخاطب بے ثمرا، بے ڈھنگا اور بے ہنگم ہونے کے باوجود محبت بھرا لگا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ انور یوسف زئی، مسز فاروق بلوچ اور عثمان خان کے خیالات جاننے کے بعد ریاست خان کا تفصیلی جائزہ عمدہ لگا۔ بینا راجپوت اور کنول۔ کی باتیں بھی اچھی تھیں۔ اس کے بعد کہانیوں کی جانب بڑھے تو حسام بٹ استقبالیہ پر نظر آئے۔ پسِ سازش میں ان کی مہارت عروج پر نظر آئی۔ ہمارے معاشرے کے کئی نقاب بے نقاب ہوئے۔ اس سازش کی تکنیک نے ہمیں تنویر ریاض کا محفوظ طریقہ دکھایا۔ کتابوں کی خرید و فروخت کے پس منظر میں ایک قتل کو پیش کیا گیا۔ اس کہانی کا پلاٹ قدرے کمزور یا بور سا لگا یا شاید اس میں روانی محسوس نہ ہوئی۔ اسی طرح غلام قادر کی فتنہ پرداز بھی ابتدا میں بچکانا سی لگی لیکن غلام قادر نے بعد میں اس پر گرفت مضبوط کر لی۔ دولت اور شہرت کی ہوس نے حقیقت نگاری کا حق ادا کیا۔ امجد جاوید کی اناگیر کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہے اور اس وقت اپنی پیک پر ہے۔ ہم اس کے جملوں اور مناظر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ لاہور کے مناظر اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ اے آر راجپوت نے بھی آتشِ انتقام خوب بھڑکائی۔ اس کا کلائمکس عمدہ تھا۔ عائشہ چودھری کے مغربی عفریت میں نجانے کیوں مشرقی عکس نظر آیا۔ عمدہ کہانی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا الاؤ تو ہندو وجنتا کے زخم جھلسا رہا ہے۔ تیز رفتاری کے باوجود کہانی کی اٹھان متاثر نہیں ہوئی۔ نجمہ مودی کی محبت اور مخبری خاصے کی شے تھی۔ تجسس اور دلچسپی کے باعث یہ کہانی پسند آئی۔ اس کے اختتام پر اچانک دھچکا لگا جو جمال دستی کی جانب سے تھا۔ کہانی بھی دھچکا ہی تھی جس میں منفرد انداز میں اپنے موضوع سے انصاف کیا گیا تھا۔ عمران قریشی کا معاوضہ۔ کام کے مطابق مناسب تھا۔ اختصار اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ زیرِ نقاب میں اسما قادری نے سرورق کا قرض نبھایا۔ دل پذیر کہانی تھی۔ ریوالورتا نے صاحب بھی آشکار ہوئے۔ نجاتِ نیم شب خالد شیخ طاہری کی تخلیق تھی۔ نام بہت عمدہ تھا۔ کردار نگاری اور واقعات میں تسلسل بھی عمدہ تھا۔“

کاشف عبید کاوش کی بنگرام سے تجاویز ”اپریل کا شمارہ ملا تو دگنی خوشی ہوئی۔ ایک تو خط چھپا دوسرا شمارہ مفت میں ملا تھا۔ (وہ کیسے؟) سرورق اس بار ذرا بھی خوب صورت نہیں تھا۔ پرویز احمد لانگاہ صاحب نے اسٹاف سمیت سب کی دل آزاری کی۔ (وہ کیسے؟) پہلی کہانی پسِ سازش اچھی تھی لیکن کسی معاملے یا بات کو بیان کرنے کے لیے مکالمے اور الفاظ کو خواہ مخواہ طول دی گئی۔ محفوظ طریقہ میں واقعی جاسوسی کے گر سکھلائے گئے، تنگ ناک اسٹار سے معلوم ہوا پہچان کی خاطر کیا کچھ کرنا پڑا، فتنہ پرداز بے وفائی کا شاخسانہ معلوم ہوئی، اناگیر اس ماہ بھی نہ پڑھ سکا، رمضان میں کوشش کروں گا کہ پڑھ لوں۔ آتشِ انتقام اے آر راجپوت کی اچھی کوشش تھی۔ عفریت میں عائشہ چوہدری نے ہمارا ٹائم ضائع کیا۔ جبکہ الاؤ میں شکر رہا کہ ڈاکٹر سیف صحراؤں اور بیابانوں سے نکل کر بغیر کسی دستاویزات کے ممبئی کی طرف آ گئے جہاں رہنے کے لیے گھر تو ملا مگر وہ بھی شاخِ نازک پر آشیانہ والا معاملہ ٹھہرا، اب دیکھتے ہیں کہ انڈین فوجی اس پاکستانی جاسوس (ان کے مطابق) سے کیا معاملہ کرتے ہیں۔ محبت اور مخبری میں نجمہ مودی صاحبہ نے کمال کر دیا، اچھی کہانی رہی۔ دھچکا روایتی کہانی رہی جبکہ عمران قریشی نے معاوضہ لکھ کر جاسوسی ڈائجسٹ کا معاوضہ ادا کر دیا۔ پہلا رنگ اسما قادری نے لکھ کر قربانی جیسے عظیم جذبے کی ترجمانی کی۔ دوسرے رنگ میں خالد شیخ طاہری نے طاقت کا نشہ کیسے ہوتا ہے، ہم پر عیاں کیا۔ سرورق کی کہانیاں اس بار اچھی رہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔ مگر زویا اعجاز، طاہر جاوید مغل اور امجد رئیس صاحب شمارے سے غائب رہے۔ پتا کیا جائے کہ یہ حضرات حاضری کیوں نہیں لگا رہے ہیں۔ کیا ادارے والوں نے معاوضے میں کمی کر دی ہے یا ہم قارئین سے ناراض ہیں۔ اس کے علاوہ نئے نئے لوگ شمارے کے ساتھ جڑ رہے ہیں جو کہ اچھا شگون ہے انٹرسٹ بڑھانے کے لیے۔ نیا کوئی سلسلہ شروع کریں یا پھر سالانہ قیمت کم کر دیں، نہیں تو رائٹرز کا معاوضہ بھی بڑھایا جا سکتا ہے یا پھر ایک چھوٹا سا انٹرویو والا سلسلہ شروع کیا جائے ویسے معروف رائٹر حضرات سے سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی اچھا رہے گا یا آخر میں ایک رنگ کا اضافہ بھی ممکنات میں سے ہیں۔ یہ میرے مشورے ہیں باقی ادارہ اچھا برا جو بھی ہو خود ہینڈل کر سکتا ہے۔ آج کل کافی بیمار ہوں، مشکل سے شمارہ پورا کر کے تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔“ (اللہ تعالیٰ آپ کو جلد کامل صحت عطا کرے)

pklibrary.com

ملیحہ رمشا کا فیصل آباد سے افراتفری نامہ ’’مارچ کا جاسوسی ڈائجسٹ ہوم شفٹنگ کے دوران 25 فروری کو ملا۔ پھر بھی افراتفری میں سارا رسالہ پڑھ کے تبصرہ لکھنے بیٹھ گئے۔ نجمہ مودی کی چہرہ چور، طاقت و انتقام کی اندھی وحشت تھی جو افراتفری میں پڑھی۔ ہیریسن تو ہیرو تھا لیکن وہ بھی افراتفری میں کارلا جیسی وحشی مخلوق کو پکڑنے اکیلا ہی چلا گیا اور جان سے گیا۔ محمد سلیم کردکی کھوٹ میں قاسم اور شعیب نے زن اور زر کے کھوٹ میں افراتفری میں جان دے دی لیکن نازیہ بے چاری کیوں افراتفری میں پاگل ہوئی۔ ترس آیا اس پر۔ طاہر جاوید مغل عمران نو کے ساتھ جوابی کارروائی لے کے آئے۔ تیزاب جیسے بدمعاش کے لیے خانی جیسی رکھیل کیسے اتنی اہم ہو گئی کہ وہ مشاہد جیسے غنڈے سے لڑ پڑا اور ماہین اور صوفیہ کی واپسی افراتفری میں نہایت آسان رہی۔ افراتفری میں اس بات کی سمجھ نہیں آئی اور اچھی بھی عمران کے منہ سے گالی سن کے اچھا نہیں لگا۔ احمد جعفری کی انجام میں اوتے کا اچھا انجام ہوا۔ نبی فردوس کی دشمنِ جاں افراتفری میں اچھی تھی لیکن مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ قاتل کارلوس ہے۔ یعقوب بھٹی کی لہولہان رشتے کافی عجیب تھی لیکن افراتفری میں اچھی تھی۔ بس فائزہ اور ہیرو صاحب کا بغیر شادی کے ایک ساتھ رہنا پسند نہیں آیا۔ (افراتفری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ دونوں بھی افراتفری کا شکار تھے) سرورق کی دوسری کہانی ایچ اقبال کی بھول تماشا اپنی مثال آپ رہی۔ شبانہ اور سلطان کے کرداروں پر افراتفری میں زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ (رائٹر بھی افراتفری کی زد میں تھے نا) شبانہ کو سلطان کو ہی قبول کرنا چاہیے تھا اور سدھرنا چاہیے تھا۔ سلطان نے ماسٹر پیٹرول کو مار کر اصل میں پولیس کا کام آسان کیا تھا۔ چلیں اب افراتفری میں نکتہ چینی کی محفل کی بات کرلی جائے۔ ایمان نے زارا شاہ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ جاب کے لیے مبارک باد ایمان نے۔ بینا راجپوت بھی اپنے جذبات بیان کرتی نظر آئیں۔ صدارت کی کرسی پر کنول براجمان نظر آئیں، مبارک باد۔ ظہیر ملک داد و تحسین کے ٹوکرے بھیجتے نظر آئے۔ انور یوسف زئی بھی بروقت حاضری دیتے نظر آئے۔ ریاست خان دلداری کرتے نظر آئے۔ ماورا عالمگیر اپنی پہلی ای میل شائع ہونے پر خوش نظر آئیں۔ پھر عرفان راجا کی ذرہ نوازی پڑھی۔ محمد ذوالفقار رولا پاتے نظر آئے۔ محمد اقبال کی انٹری پسند آئی۔ باقی خلیل احمد، محمد عثمان خان، بدرالاسلام، انجم فاروق ساحلی اور محمد احسن زمان کے تبصرے بہترین رہے۔ افراتفری میں اب اختتام کرتے ہیں اور اگلے ماہ حاضر ہوتے ہیں۔‘‘

محمد عثمان خان لاہور سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ’’اپریل کا جاسوسی 22 مارچ کو سلطان نیوز ایجنسی سے لیا۔ سرورق کی حسینہ نے ہاتھ چہرے کے آگے رکھا ہوا تھا لیکن پیاری لگ رہی تھی۔ خطوط کی محفل میں سب کے خطوط پسند آئے۔ انور یوسف زئی اور کاشف عبید کاوش کا مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے شکریہ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس سازش پڑھی۔ کہانی دلچسپ تھی۔ شہلا کا مجرمہ نکلنا چونکا گیا۔ محفوظ طریقہ سراغ رسانی سے بھرپور کہانی تھی۔ انگریزی کہانیاں پڑھتے ہوئے کرداروں کے نام ہی نہیں یاد رہتے۔ ٹنگ ٹاک اسٹار کبیر عباسی کی ایک عمدہ تحریر تھی۔ غلام قادر صاحب کی تحریروں میں یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ آتشِ انتقام میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اصل مجرم کون ہے۔ عفریت عائشہ چوہدری کی زبردست تحریر تھی۔ محبت اور مخبری میں مجھے لگا تھا کہ شاید نیلم اور امان بچ جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دھچکا اور معاوضہ اچھی کہانیاں تھیں۔ سرورق کے پہلے رنگ میں کافی عرصے بعد اسما قادری صاحبہ کی تحریر پڑھی۔ کاشف زبیر مرحوم کے بعد اسما قادری وہ مصنفہ ہیں جن کی کہانیاں پڑھ کر میں بور نہیں ہوتا اور روانی سے پوری کہانی پڑھ لیتا ہوں۔ (بہت کرم نوازی ہے) زیرِ نقاب پسند آئی۔ سرورق کے دوسرے رنگ میں خالد شیخ طاہری کی کہانی نجاتِ نیم شب ان کی پہلی کاوش تھی۔ پہلی کاوش کے طور پر اچھی کوشش تھی۔‘‘ (پسندیدگی کا شکریہ)

محمد احسن زمان کا عذرنامہ وزیر آباد سے ’’اس وقت جسم میں اتنی تکلیف ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ منہ کا ذائقہ انتہائی خراب ہے 24 مارچ کو ماموں زاد کی رحلت ہوئی تو آخری رسومات میں شریک ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک بستر سے نہیں اٹھ سکا۔ احباب سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ دواؤں کا استعمال جاری ہے لیکن ہاتھ جوڑ کر درخواست گزار ہوں، احتیاط کیجیے۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ خط شائع کر دیں تو نوازش ہوگی ورنہ سب سے کہہ دیں احتیاط ہی زندگی ہے۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ تبصرہ ادھار رہا۔‘‘ (احسن صاحب، اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یاب کرے، اور آپ معمولاتِ زندگی کی طرف تیزی سے لوٹ آئیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد اسحاق انجم کنگن پور قصور۔ عاتکہ کامران، حیدر آباد۔ کاظم علی، کراچی۔ ماہین حنیف، کراچی۔ احسن خان، پشاور۔ گلزار احمد، لاہور۔

سراغ

شبنم شفیق

ہوس... دولت کی ہو یا عیش و عشرت کی... انسان کو ذلت و رسوائی کی ایسی کھائی تک لے جاتی ہے... جہاں پہنچ کے واپسی کی راہ نہیں رہتی... سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کو صحرا کی ریت سمندر کی لہریں محسوس ہوتی ہیں... ایسے ہی راستوں پر بھٹکنے والی لڑکی کا ماجرا جو آنکھوں میں خواب سجائے چمکتی دمکتی دنیا کا خوب صورت ستارہ بننا چاہتی تھی... مگر فریب کاروں کے مضبوط جال اپنی چالوں کے ساتھ تنے ہوئے تھے... ہوسِ زر اور زن کے مارے ایسے پرندوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے دلفریب جال کے قیدی بن سکیں... دولت کے نشے میں مدہوش ہو جانے والوں کی داستانِ عبرت...

سلگتے خوابوں اور انگارے راستوں کا انتخاب.....

ایک پُرعزم لڑکی کے دلیرانہ اقدامات

''شادو!'' مہرو نے ساتھ چلتی اپنے ہی خیالوں میں گم دلشاد عرف شادو کو آواز دی۔ اُس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ایک ایسی گرما گرم خبر ہے کہ تو اپنے خیالوں کی دنیا سے کرنٹ کھا کر واپس آجائے گی۔'' مہرو نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''جن خیالوں میں، میں ہوں تو ڈھول بھی بجائے تو مجھے فرق نہیں پڑنے والا۔''

''اور اگر تجھے واقعی ہی کرنٹ لگے تو.....'' مہرو نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ دونوں ہی اٹھارہ، انیس برس کی بھرے بھرے جسم کی مٹیاریں تھیں۔ گاؤں کے کتنے ہی بانکے، سجیلے آہیں بھرتے سامنے سے گزر جاتے لیکن وہ کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھیں۔ دونوں ہی گاؤں کے چوہدری علمدار کی حویلی میں وڈی چوہدرائن کی ملازمائیں تھیں۔ کسی کی مجال نہیں تھی جو انہیں ہاتھ بھی لگانے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی دونوں پیدل ہی حویلی کی طرف جا رہی تھیں۔ صبح کے چھ بجنے والے تھے اور آج وہ حویلی کے وقت کے لحاظ سے تھوڑا لیٹ تھیں، انہیں چھ بجے حویلی میں ہونا چاہیے تھا۔

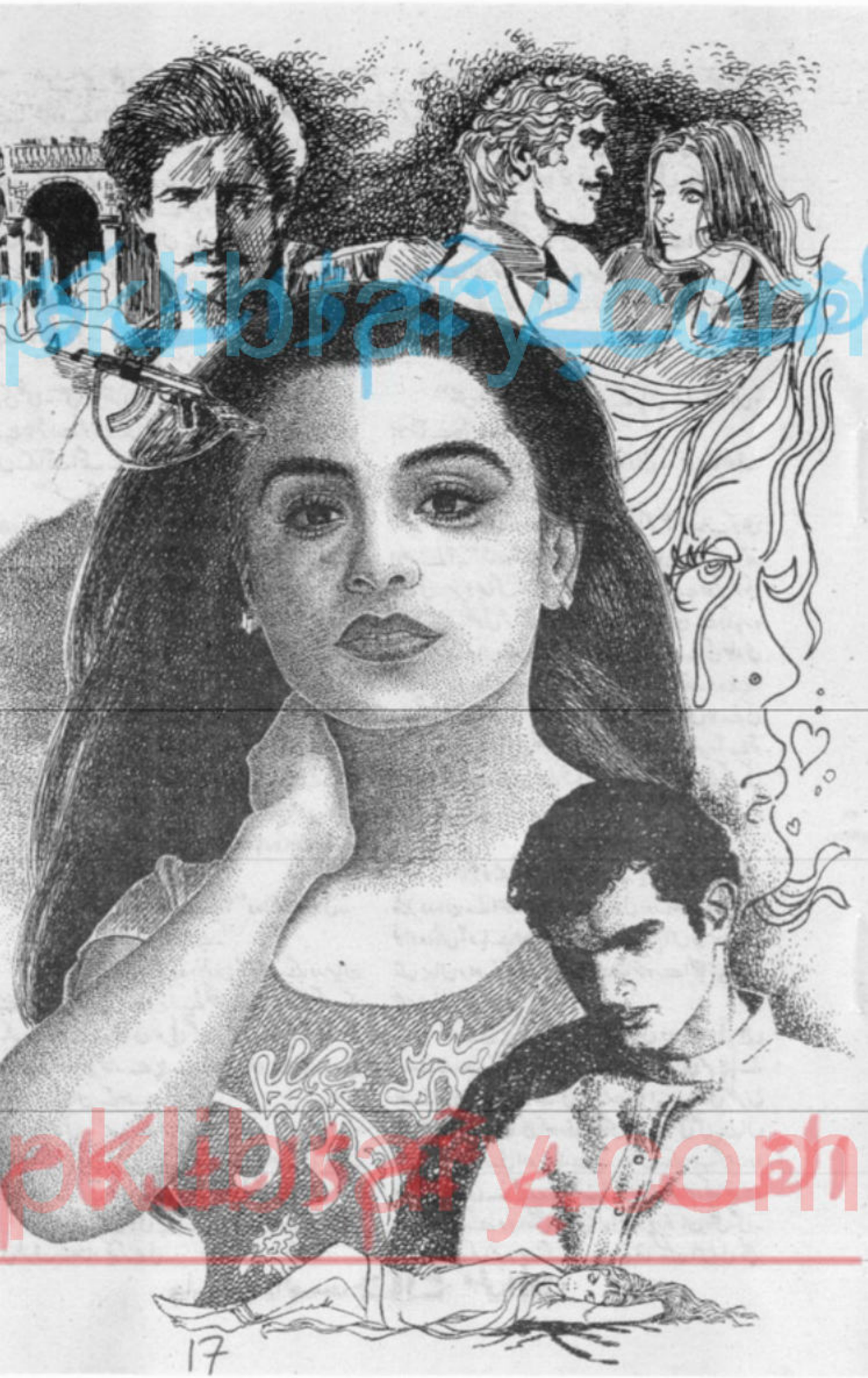

pklibrary.com

''اب بک بھی دے جو دل میں چھپائے کھڑی ہے۔'' شادو نے اس کے رک جانے پر قدرے گھور کر کہا۔

''چھوٹی چوہدرائن کا وڈا پُتر ولایت سے واپس آ گیا ہے۔'' خبر ایک کرنٹ کی طرح ہی شادو کو لگی تھی وہ جو ہر وقت چھوٹی چوہدرائن کے بیٹے کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی، ایک دم سے کھل اٹھی۔ سال پہلے وہ جب حویلی آیا تھی جاتے ہوئے شادو کا دل بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تب سے اب تک وہ اس کے خیالوں میں ہی ڈوبی رہتی تھی اب تو جیسے جھوم اٹھی تھی۔

''کیوں کرنٹ لگا نا۔'' مہرو بھی ایک نمبر کی کائیاں لڑکی تھی۔ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شادو نے اپنے تاثرات کو قابو میں کرنے کی کافی کوشش کی لیکن خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

''کب آئے ہیں چھوٹے چوہدری؟'' وہ لرزتے وجود کے ساتھ بولی۔

''پرسوں رات ہی۔'' مہرو نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور تو مجھے اب بتا رہی ہے۔''

''تجھے بخار بھی تو تھا تین دن سے..... سوچا جب چنگی ہو جائے گی تب بتاؤں گی۔''

''بڑا ظلم کیا تو نے پہلے بتا دیتی تو.....''

''تو تیرا بخار بھی اتر جاتا۔'' مہرو اس کی بات کاٹ کر ہنستے ہوئے بولی تو وہ شرما گئی۔ اس لیے تھوڑے تیز قدم بھی اٹھانے لگی۔

''اب اتنی تیز بھی نہ چل کہ بخار دوبارہ ہو جائے۔'' چوہدرائن دوبارہ چھٹی نہیں دے گی۔''

''اب چھٹی کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''ہاں اب تو طبیب آ گیا ہے۔''

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں گاؤں کے درمیان بہنے والی نہر کے پُل سے گزرنے لگیں۔ پل کراس کر کے کچھ ہی دور چوہدری کی حویلی تھی۔ پل کے پار آتے ہی دونوں کی نظر نہر کنارے پڑے انسانی وجود پر پڑی۔ بے ساختہ ہی چیخ ان کے منہ سے نکل گئی۔

''لاش۔'' مہرو کے منہ سے نکلا۔

''لڑکی کی لاش ہے۔'' شادو لمبی زلفوں کی طرف اشارہ کر کے بولی جو لاش کے گرد پھیلی ہوئی تھیں۔

''بھاگ کہیں کوئی چڑیل نہ ہو۔'' مہرو، شادو کو لاش کی طرف بڑھتا دیکھ کر بولی۔

''چڑیل اس وقت کہاں سے آ گئی۔ آ جا دیکھتے ہیں کس بدنصیب کی ہے۔''

''نہ بابا نہ مجھے تو نہیں دیکھنی۔'' مہرو اچھل کر چار قدم اور پیچھے ہٹ گئی جبکہ شادو تیز قدم اٹھاتی لاش کے پاس گئی اور اسے سیدھا کر دیا۔

''ہائے دیکھ کتنی سوہنی کُڑی ہے۔'' بے اختیار شادو کے منہ سے نکلا تو ہمت کر کے مہرو بھی اس کے پاس آ گئی لیکن فاصلہ رکھ کے۔ اسی وقت لاش کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی۔

''ارے یہ تو زندہ ہے۔''

''چل اٹھا اس کو حکیم صاب کے پاس لے چلتے ہیں، ہو سکتا ہے بچ جائے بے چاری۔''

''نہ بابا نہ میں تو نہیں اٹھانے والی۔'' مہرو کا خوف اب بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''تو تو ہے سدا کی ڈرپوک، جا جا کر حکیم صاب کو ہی اِدھر لے آ۔'' شادو جھنجلا کر بولی اور ساتھ ہی لڑکی کے ہاتھ ملنے لگی۔ مہرو بھاگ کر حکیم کو بلانے چلی گئی۔ بے ہوش لڑکی نے آنکھیں کھول کر شادو کو دیکھا اور پھر اطمینان سے دوبارہ بند کر لیں۔ کہاں چھوٹے چوہدری کا دیدار کرنے کی جلدی تھی اور کہاں وقت اور انتظار لمبا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی لیکن ساتھ ہی فکرمندی سے لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد حکیم بابا اور مہرو آئے تو بڑی مشکل سے تینوں نے لڑکی کو اٹھایا اور حکیم کے گھر کی جانب چل دیے۔

☆☆☆

''شانزہ میں تمہیں آخری مرتبہ یاد دلا رہی ہوں کہ پلیز دو دن کے اندر اپنے رہنے کا کوئی اور بندوبست کر لو، فواد واپس آ رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تم اس کی موجودگی میں یہاں رہو۔'' علینا اپنی دوست شانزہ سے التجائیہ انداز میں بولی۔

''دو دن پورے ہونے میں ابھی دو دن باقی ہیں سوئٹ ہارٹ۔'' شانزہ بظاہر بے فکری سے چیونگم چباتے ہوئے بولی لیکن حالات کی نزاکت کا اسے پوری طرح احساس تھا۔ وہ علینا کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ یہاں بھی وہ اپنی مجبوری اور حالات کی بے بسی کے سبب تھی۔ دو سال پہلے اس نے نیوز رپورٹنگ کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور پچھلے سال سے وہ اچھی خاصی کرائم رپورٹر بن چکی تھی۔ شروع میں کرائم رپورٹنگ محض شوق تھا لیکن اس کی نیچر

چونکہ ایڈونچر اور تھرل کو پسند کرتی تھی اس لیے یہ فیلڈ اب اس کے لیے شوق سے کافی اوپر جا چکی تھی۔ اس فیلڈ میں جہاں نیوز کی دنیا میں شہرت ملتی ہے وہیں انڈر ورلڈ کے لوگ بھی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے تو ایک دور کی ممانی، ماموں کے علاوہ کوئی تھا نہیں اس لیے ابھی تک خاصی ثابت قدمی سے اس فیلڈ میں پاؤں جمائے کھڑی تھی لیکن اب پاؤں کے نیچے زمین ہلنے لگی تھی۔ پہلے گھر میں صرف ٹیلی فون کی حد تک دھمکیاں ملتی تھیں اب کچھ عرصے سے دھمکیاں پریکٹیکل شکل اختیار کر چکی تھیں۔ ماموں کو ایک دن اچانک ہی کچھ نقاب پوش لڑکوں نے گھیر لیا اور اچھی خاصی ٹھکائی کرنے کے بعد دروازے پر بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ گئے۔ اسی طرح ممانی کو بھی بازار میں لڑکوں نے گھیر کر کافی نازیبا حرکتیں کیں جس پر ممانی نے آتے ہی اسے گھر۔ فوراً چھوڑ دینے کا حکم نامہ صادر کر دیا تھا۔

یوں اسے ایمرجنسی میں گھر چھوڑنا پڑا اس لیے اپنی کالج کی واحد دوست علینا کو فون کیا۔ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اسے اپنے فلیٹ پر بلا لیا لیکن ساتھ ہی اپنی پوزیشن واضح کر دی کہ وہ ہفتے سے زیادہ اس کی مدد نہیں کر سکتی کیونکہ فواد ہفتے بھر کے لیے ملک سے باہر گیا تھا اور اب اس کی واپسی میں دو دن رہ گئے تو علینا نے اسے جانے کی یاد دہانی کرانا بہتر سمجھا۔ علینا کی اسٹوری بھی انہی ہزاروں لڑکیوں جیسی تھی جو غربت کی چکی میں پسی ہوتی ہیں۔ ڈھیر سارے بہن بھائی اور غریب باپ کے ناتواں کندھے۔ وہ خوب صورت تھی اور اپنی خوب صورتی اپنے غربت زدہ گھر کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جب اپنی ایک جاننے والی سے ٹی وی میں کام کرنے کی آفر ملی تو وہ گھر کی عسرت زدہ دیوار پھاند کر اونچی اُڑان بھرنے نکل پڑی اور یہ اُڑان گھر سے گھر تک ہی رہی۔ چوہدری فواد کی ایک پروڈکشن کمپنی تھی جس میں ایک اشتہار کی ماڈلنگ کے لیے اسے پیش کیا گیا۔ اشتہار تو اسے نہ مل سکا لیکن فواد چوہدری کا لگژری فلیٹ رہنے کو مل گیا جس میں وہ ابھی تک بغیر شادی کے ہی اس کی بیوی بن کے رہ رہی تھی۔

چوہدری فواد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے چھوٹے موٹے اشتہاری کی نہیں کسی بڑی پروڈکٹ کے لیے ماڈل بنا کر ساری دنیا کو چونکا دے گا۔ لیکن اس کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور اب پچھلے دو سال سے علینا اسی انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر بیزار ہو چکی تھی لیکن واپسی کے دروازے بھی بند تھے۔ یہاں وہ رانیوں کی طرح رہ رہی تھی۔ پورے فلیٹ کی مالکہ بنی ہوئی تھی۔ سُپر ماڈل نہیں بن پائی تھی تو کیا ہوا سُپر گرل تو بنی ہی ہوئی تھی لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ سُپر گرل تب تک ہی ہے جب تک چوہدری فواد کی نظروں کو کوئی اور نہ بھا جائے۔ اسی لیے شانزہ پر ترس کھا کے وہ اسے اپنے فلیٹ تو لے آئی تھی مگر اب اس کی خوب صورتی سے خائف بھی تھی۔ فواد کی واپسی سے پہلے اسے یہاں سے روانہ کر دینا چاہتی تھی۔

شانزہ کو فی الوقت کوئی پناہ گاہ چاہیے تھی اور علینا اپنی واحد جائے پناہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ حالات اور وقت کی نزاکت نے دونوں سہیلیوں کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

''تمہارے اپنے بھی تو سورسز ہیں آخر کرائم رپورٹر ہو، اپنے کسی ساتھی سے کہو تمہیں کرائے پر کوئی گھر لے دیں، آج کل گھر لینا کون سا مشکل کام ہے۔'' علینا جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

''اکیلی لڑکی کو کون گھر دیتا ہے بغیر ضمانت کے، جہاں تک دوستوں کی بات ہے تو تمہارے علاوہ میری کوئی دوست نہیں، آفس میں کچھ لوگوں سے اچھی دعا سلام ہے لیکن کبھی سوچا نہیں کہ کوئی گھر دلانے میں مدد کر دے گا۔'' شانزہ جو گرز چبھتے ہوئے بڑبڑائی لیکن اس کی بڑبڑاہٹ علینا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''کل شام کو یہ فلیٹ تمہیں چھوڑنا ہے اس لیے کوئی بندوبست کر کے ہی آنا۔'' شانزہ باہر جانے کے ارادے سے باہر کی جانب بڑھی تو علینا نے پیچھے سے دوبارہ آواز لگائی۔ وہ ہنستے ہوئے سر ہلا کر چلی گئی جبکہ علینا کے ماتھے پر فکروں کا جال بڑھنے لگا۔ وہ بھی شانزہ کی طرح بے فکری کی زندگی گزارنا چاہتی لیکن فواد چوہدری کے حسین پنجرے میں بے بس پرندے کی طرح بس پھڑ پھڑا کر ہی رہ جاتی۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ فواد کے آتے ہی اس سے دوٹوک بات کرے گی کہ یا تو وہ اسے آزاد کر دے یا پھر عزت دار زندگی جینے دے اسے اپنی بیوی بنائے اور اس کا اعلان بھی کرے۔

☆☆☆

''کہاں مر گئی تھیں تم دونوں، کب کا سویرا ہوا ہے اور تم مٹکتی ہوئی اب آ رہی ہو۔'' وڈی چوہدرائن نے شادو اور مہر کو دیکھتے ہی غصے سے کہا۔

''نکلے تو ہم سویرے ہی تھے پر جی راستے میں مہر

میں ڈوبی لڑکی نظر آ گئی اسے حکیم بابا کے پاس چھوڑ کر آئے ہیں اس لیے دیر ہو گئی، معاف کر دیں۔" مہرو جلدی سے بولی تاکہ متوقع ڈانٹ سے مزید بچا جا سکے۔

"نہ تو حکیم نے زندہ کرنا تھا اس کڑی کو جو اس کے پاس چھوڑ کے آئی ہو، سارے بہانے بجھتی ہوں میں تم دونوں کے، ایک تو پہلے ہی مہارانیوں کی طرح تین دن چھٹی مار کے آئی ہو جیسے زندگی میں پہلی بار بخار چڑھا ہو۔" وڈی چوہدرائن کا غصہ آسمانوں پر تھا۔

"نئی جی کڑی زندہ تھی اس لیے لے کر گئے تھے۔"

"تو اب کیا مر گئی ہے۔"

"نئی چوہدرائن جی اللہ نے اسے دوسری زندگی دی ہے، حکیم بابا کہہ رہا ہے لڑکی ایک دم بھلی چنگی ہے۔" ابھی تک چونکہ مہرو ہی بول رہی تھی اس لیے شادو نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

"وہ بھی ہو گی تم دونوں کی طرح کوئی ڈھیٹ ہڈی، جاؤ دفع ہو جاؤ کام کرو، دھوپ سر پر چڑھ آئی ہے سارے کام ویسے کے ویسے پڑے ہیں، حماد اٹھنے ہی والا ہے اسے گندگی برداشت نہیں ہوتی۔" تیزی سے بولتی چوہدرائن اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور مہرو اور شادو نے پھرتی سے اپنے کام نمٹانے شروع کر دیے۔

"مہرو، چوہدری حماد کے کمرے کی جھاڑ پونچھ میں کروں گی تو کمرا چھوڑ دینا۔" شادو نے مہرو کو یاد دہانی کرائی چونکہ کمروں کی جھاڑ پونچھ اسی کے ذمے تھی۔

"چل ٹھیک ہے جیسے تو کہے پر بے مول ہی نہ پک جانا آگے تو آپ ذمے دار ہے۔" مہرو ایک ٹھہری نظر اس پر ڈال کر دوسرے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ شادو نے بھی لرزتے قدموں سے چوہدری حماد کے کمرے میں قدم رکھا۔ مرد حضرات جب تک کمروں سے باہر نہ آ جاتے انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی پر یہاں کون تھا دیکھنے والا اوپر سے شادو کے جذبات پر کون بند باندھتا۔

کمرے کی دہلیز پر قدم رکھ کر شادو نے جھجکتے ہوئے اندر دیکھا تو بیڈ خالی تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ابھی قدموں سے باہر نکل آئی۔ ابھی وہ صحن کے بیچوں بیچ شش و پنج کا شکار کھڑی تھی جب چھوٹا گیٹ کھلا اور نیلے رنگ کے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس جاگرز پہنے ہوئے اندر داخل ہونے والے کو دیکھ کر اس کی نظریں فرطِ مسرت سے پھیل گئیں۔ اس کے اردگرد جیسے شہنائیاں بجنے لگیں اور وہ یک ٹک اس بانکے سجیلے شہزادے کو دیکھے گئی۔ حماد کو واک کی عادت تھی اب بھی وہ مارننگ واک سے واپس آیا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی شادو پر اس نے ایک نظر بھی نہیں ڈالی اور آرام سے چلتا ہوا برآمدے میں پڑے مونڈھوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ پیدل چلنے کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس پر بہتا پسینا جیسے کوئی شفاف موتی ہوں۔ شادو نے تب تک اسے دیکھا جب تک چھوٹی چوہدرائن اپنے کمرے سے نکل کر اپنے پُتر کے پاس نہ آ گئی۔

"نی مر جانیے، اُدھر کیا کھڑی ہے اِدھر آ یہ جوتے اٹھا اور جا کے کسی لے کر آ۔" اس پر نظر پڑتے ہی چوہدرائن ناگواری سے بولی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور حماد کے جاگرز اٹھانے لگی تو اس نے انکار کر دیا۔

"میں انہیں خود لے جاؤں گا تم بس کسی لے آؤ۔"

"لے جانے دے اسے، یہ کمی کمینوں کے کام ہیں انہیں ہی اچھے لگتے ہیں۔ تجھے کیا ضرورت ہے اپنے ہاتھ میلے کرنے کی۔" ماں بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

"ماں جو گرز میں نے انہی ہاتھوں سے پہنے تھے اور اتارے بھی خود ہیں اب رکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"تو کیا کھڑی باتیں سن رہی ہے جا یہاں سے۔"

"جی اچھا۔" شادو ... یہ کہتے ہی کسی لینے کے لیے کچن کی طرف بھاگی۔

"شادو اور مہرو بتا رہی تھیں کسی بے ہوش لڑکی کو نہر کنارے پڑا دیکھا ہے انہوں نے پھر حکیم اسے اپنے گھر لے گیا۔" وڈی چوہدرائن ویسے تو چھوٹی کو ذرا کم ہی لفٹ کراتی تھی لیکن آج کل چونکہ حماد آیا ہوا تھا اس لیے اس کے سامنے اپنے نمبر بڑھانے کے لیے وہ اکثر ہی چھوٹی کو کسی نہ کسی بہانے بلا لیتی تھی۔

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا پر ہمارے پنڈ کی نہیں ہے، سنا ہے خوب صورت لڑکی ہے اور اس کا لباس بھی قیمتی ہے کسی غریب گھرانے کی نہیں لگتی۔"

"چوہدری کو اس بات کی خبر ہے۔"

"ہاں تھوڑی دیر پہلے بہزاد پُتر آیا، تھا اسے بتایا تھا میں نے اب تک باپ کو بتا چکا ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے باپ کو بتانے کے بجائے لڑکی دیکھنے چلا گیا ہو۔" چھوٹی چوہدرائن چوٹ کرنا نہ بھولی۔ بہزاد کی حرکتوں سے گاؤں کی شاید ہی کوئی لڑکی بچی ہو گی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

''وہی جو آپ کو سمجھ آ گیا ہے۔'' چھوٹی چوہدرائن لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہیں تھی اس لیے منہ پھٹ طریقے سے بولی۔ حماد جو ساری بحث سے لاتعلق بیٹھا تھا۔ اب دونوں کی متوقع لڑائی سے خائف ہونے لگا۔

''پلیز ایک لڑکی کے لیے خود کو کیوں ہلکان کر رہی ہیں۔ کیا وہ اتنی اہم ہے کہ اس کے لیے ہم گھر میں لڑنے لگیں۔''

''لڑائی تو تمہاری ماں کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میری ہی غلطی ہے جو اس سے بات کرنے چلی آئی۔'' چوہدرائن اٹھتے ہوئے بولی۔

''لڑائی تو میں نے بھی نہیں کی بس تمہارے پُتر کے کرتوت.....''

''کیا کرتوت ہیں میرے پُتر کے؟'' چوہدرائن، چھوٹی کی بات کاٹ کر بولی۔ ''حماد پُتر تو باہر رہا ہے تیرے چھوٹوں نے بھی یہاں رہ کر کافی پر پرزے نکال لیے ہیں پہلے اپنے گھر پر نظر ڈالو پھر میرے شیر جوان کی بات کرنا۔''

''گبرو جوان ہے میرا شہزاد لڑکیاں اس کے پیچھے خود ہی منڈلاتی ہیں تو اس کا کیا قصور تیرے پُتر کی طرح ان کی عزتوں کا دشمن تو نہیں بنا ہوا۔''

''چاروں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں زیادہ پارسا نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ آج لڑکیاں پیچھے ہیں، کل وہ لڑکیوں کے پیچھے۔ ہوگا۔''

''بڑی ماں اور چھوٹی ماں ہم سب بڑے ہو گئے ہیں پلیز ہماری خاطر لڑنا بند کریں۔'' شادو سی لیے آتی نظر آئی تو حماد انہیں چپ کرانے لگا۔

حماد نے اپنی ماں کو بمشکل خاموش کرایا۔ شادو سی کا گلاس تپائی پر رکھ کے کھسک گئی۔

''آپ نے بتایا تھا، فواد بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔'' وہ ٹاپک بدلنے کی غرض سے بولا۔

''شہر میں چار چار لڑکیاں تو اس نے رکھی ہوئی ہیں بغیر شادی کے، اب شادی ہو نہ ہو ہمیں کیا.....'' وہ ابھی تک غصے میں تھیں۔

''ہو سکتا ہے شادی کے بعد وہ سدھر جائیں۔'' حماد کن انکھیوں سے ماں کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

''جیسے بڑے والا سدھر گیا ہے ایسے چھوٹا بھی سدھر ہی جائے گا۔'' وہ طنز سے بولیں۔

''کیا یہ سچ ہے کہ بھائی نے چار چار لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں شہر میں؟''

''تجھے ضرورت نہیں ہے اِن باتوں میں پڑنے کی، اپنے باپ کے ساتھ رہ کر زمینوں کے معاملات سمجھا کر کل کو باپ کی جگہ بھی سنبھالنی ہے۔''

''پلیز اماں مجھے زمینوں اور جائداد میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے مجھے دوبارہ یہ نہ کہیے گا۔''

''تو پھر کیا کرنا ہے تجھے، فارغ بیٹھ کر تو کوئی تجھے کھانے نہیں دے گا۔''

''فارغ رہنے کو تو نہیں کہہ رہا میں، شہر میں اپنا بزنس کروں گا۔'' وہ کسی کا گلاس تپائی پر رکھ کر بولا تو ماں کو قدرے مایوسی ہوئی۔

''بزنس میں کیا رکھا ہے صرف دردسری، اپنی زمینوں کا رعب ہوتا ہے چوہدراہٹ ہوتی ہے۔''

''زمینوں کے لیے ہیں نا بہزاد بھائی اور شہزاد، میں تو فواد بھائی کی طرح شہر میں اپنا کام کروں گا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو وہ صرف اس دو ٹکے کی پروڈکشن کمپنی کے ساتھ چمٹا رہے گا تو یہ تمہاری بھول ہے، ہر دوسرے مہینے وہ زمینوں کا حساب لینے آتا ہے جتنی سمجھ بوجھ اس میں ہے زمینوں کی تمہاری سوچ ہوگی، وہ چالاک لڑکا تم سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔''

''اماں قسمت میں جتنا رزق ہے، اس سے زیادہ تو نہ میں لے سکتا ہوں نہ کوئی اور اس لیے پریشان رہنا چھوڑ دیں۔ شہزاد کی کافی دلچسپی ہے، بابا کے ساتھ روز جاتا ہے سیکھ لے گا زمین کے معاملات۔''

''وہ تو میں نے سمجھداری کی جو اُسے تیری طرح پڑھنے ولایت نہیں بھیجا ورنہ وہ بھی بزدلوں کی طرح شہر بھاگ جاتا۔'' اماں غصے سے بولیں تو وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔

''ماں میری پیاری ماں بزدل شہر نہیں گاؤں کا رخ کرتے ہیں۔''

''چوہدریوں کے پُتر جب شہر بھاگیں تو یہ ان کی بزدلی سمجھی جاتی ہے۔''

''میں ساری عمر وہاں تھوڑا ہی رہوں گا، آتا جاتا ہوں گا بلکہ آپ بھی میرے ساتھ شہر میں رہیں گی۔ کوئی ضرورت نہیں اب مزید یہاں رہنے اور بڑی اماں سے لڑنے جھگڑنے کی۔''

''میں تو اپنی چوہدراہٹ چھوڑ کر نہیں جانے والی، شہروں میں رکھا کیا ہے نیند تک نہیں آتی۔ رات کو ساری رات گاڑیوں کا شور سونے نہیں دیتا اوپر سے اتنا دھواں ہوتا ہے کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔'' وہ بیزاری سے بولیں تو

حماد کندھے اچکا کر انہیں دیکھنے لگا۔ انہیں سمجھانا بہت مشکل کام تھا اور یہ مشکل کام اس نے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

حکیم کی بیوی شوہر کے پاس بیٹھی لڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے جب اسے بتایا لڑکی کی یادداشت گم ہو چکی ہے تو پہلے تو وہ پریشان ہوگئی پھر ایک دم سے خوشی کی لہر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''حکیم جی اللہ نے ہماری سن لی ہے۔ میری سونی گود برسوں سے اس سوہنی لڑکی کے انتظار میں ہی خالی تھی، اب تو یہ میری دھی بن کر رہے گی ہمارے پاس۔''

''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں، شادو اور مہرو بڑی چالاک کڑیاں ہیں ابھی تک تو ساری حویلی میں خبر پہنچا چکی ہوں گی۔ چوہدریوں کا پیغام آتا ہی ہوگا۔''

''لڑکی ہمیں ملی ہے چوہدری کو تو نہیں جو وہ اس کی پروا کرے گا۔''

''چوہدری پروا کرے نہ کرے اس کے پُتر تو ہیں نہ پروا کرنے والے، انہوں نے لڑکی کو دیکھ لیا تو بے چاری کہیں کی نہیں رہے گی۔''

''مجھے بھی یہی فکر ستا رہی ہے، چوہدری بہزاد ملا تھا تھوڑی دیر پہلے مجھے جب میں فیاض دودھی کے گھر دودھ لینے گیا تھا اس کے گھر سے نکلتے ہی چوہدری کے لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے گھر کی طرف ہی آرہا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ لڑکی کی حالت بہت خراب ہے، بے ہوش پڑی ہے، کہنے لگا حالت زیادہ خراب ہے تو شہر لے جاتے ہیں، میں نے کہا کہ میں سنبھال لوں گا۔''

''پھر کیا کہا اس نے؟'' اس کی بیوی بے چینی سے بولی۔

''کہنا کیا تھا شام کو آئے گا حال پوچھنے۔'' حکیم منہ بنا کر بولا تو اس کی گھر والی کا چہرہ اتر گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں خوشی پھیلی تھی وہاں اب مایوسی کے بادل چھا گئے۔ لڑکی بظاہر سونے کا ناٹک کر رہی تھی لیکن وہ جاگ رہی تھی اور ان دونوں کی باتیں بھی سن رہی تھی۔ اسے ان دونوں میاں بیوی کی پریشانی نے بے چین کر دیا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے دھی رانی لیٹی رہو، ابھی تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔'' حکیم کی بیوی نے اسے بیٹھے دیکھا تو جلدی سے اس کے پاس آکر بولی۔

''میں ٹھیک ہوں ماں جی۔'' وہ آہستگی سے بولی تو ماں کہنے پر حکیم کی بیوی نے اسے گلے لگا لیا۔ اس سے دیسی دواؤں کی بُو آرہی تھی لیکن یہ اس خوشبو سے زیادہ نہیں تھی جو ایک ممتا کی ہوتی ہے۔

''سوہنا رب تجھے ٹھیک ہی رکھے۔''

''آپ دونوں پریشان نہ ہوں میں آپ کی بیٹی بن کر رہوں گی۔'' اس کے کہنے پر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے۔

''پریشانی چوہدریوں کی نہیں ان کے پُتر کی ہے، وہ سانڈ گاؤں کی لڑکیوں پر نظر رکھتا ہے۔ تجھے تو ویسے بھی مالِ غنیمت سمجھے گا۔''

''تو آپ مجھے اس کے آنے سے پہلے ہی چوہدری سے ملوا دیں، میں انہیں بتا دیتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔''

''بات تو پتے کی، کی ہے دھی رانی تو نے، اگر تیری طبیعت ٹھیک ہے تو چلتے ہیں چوہدریوں کی حویلی۔'' حکیم ..... کی فکر قدرے کم ہوئی تو اس نے خوش ہو کر کہا۔

''میں بھی چلوں گی تم دونوں کے ساتھ۔'' حکیم کی بیوی جلدی سے اٹھ کر چادر پکڑتے ہوئے بولی۔ ایک چادر اس نے لڑکی کو بھی اوڑھنے کو دی۔ پہلے تو لڑکی نے انکار کرنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر اوڑھ لی۔

☆☆☆

''عامر پورے چار دنوں سے تمہیں گھر نہیں مل سکا، اب میرے پاس کل شام تک کا وقت ہے ابھی بھی گھر نہ ملا تو میں کیا کروں گی؟'' شانزہ فکرمندی سے بولی۔ عامر بھی اسی کی طرح ایک کرائم رپورٹر تھا اور وہ شانزہ کو پسند بھی کرتا تھا لیکن شانزہ نے کبھی مثبت ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ فی الوقت اسے ایک اچھا ساتھی سمجھتی تھی۔ اس ردِعمل کے پیچھے عامر کی فیملی بھی تھی جو بیٹے کو بہت امیر گھر میں بیاہنا چاہتے تھے۔ پیسا شانزہ کے اکاؤنٹ میں بھی اتنا تھا کہ وہ بڑی سی کوٹھی خرید کر اپنا بزنس بھی کر سکتی تھی لیکن مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ پہلے اپنے بل بوتے پر کچھ کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے عامر کے یا اس کی فیملی کے سامنے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ کافی پیسے والی ہے۔ اب بھی وہ عامر کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی جب اس کی ماں خاصی ناگواری سے چائے دے گئیں۔ وہ اندر ہی اندر ہنس دی وہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کو پھنسائے ہوئے ہے۔

''کل شام کو گھر مل جائے گا لیکن وہ کرایہ زیادہ مانگ رہے ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ کرایہ تھوڑا مناسب کریں تو تمہیں دلوادوں۔'' وہ اسے چائے پینے کا اشارہ کر کے بولا۔ اپنی ماں کا رویہ اس سے اوجھل نہیں تھا اس لیے اس نے بھی شانزہ سے کبھی اظہارِ محبت نہیں کیا مگر اب جو وہ مجبور و تنہا نظر آئی تو اس کا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنی دلہن بنا کر گھر لے آئے۔ ماں سے مگر وہ لے سکتا تھا لیکن شانزہ کو سمجھانا مشکل تھا۔ اس کے اونچے خیالات سے وہ آگاہ تھا اس لیے فی الوقت خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

''نہیں مجھے چائے نہیں پینی تھوڑا جلدی میں ہوں، نئے گھر کے لیے کچھ ضروری سامان بھی لینا ہے۔'' وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر بولی۔ بلیو جینز پر پنک ٹی شرٹ اور سرخ اسکارف اوڑھے ہوئے تھی مگر سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔

''چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، شاپنگ میں مدد ہی کرواؤں گا۔''

''تمہارا شکریہ عامر لیکن میں علینا کے ساتھ شاپنگ پر جا رہی ہوں۔ وہ مجھے بہتر گائڈ کرے گی کہ ایک گھر کی کیا ضروریات ہو سکتی ہیں۔''

''اوکے میڈم، کرنی تو آپ نے اپنی مرضی ہوتی ہے۔''

''بائے۔'' وہ کہہ کے رکی نہیں، اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آئی اور اب اس کا موڈ علینا کے گھر نہیں اپنے ایک جاننے والے انکل کی طرف جانے کا تھا۔ بیرسٹر لطیف اس کے پاپا کے بہت اچھے دوست تھے اور وہ اکثر ان سے کافی معاملات میں مدد بھی لے چکی تھی۔ ان کی بیٹی پنکی اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ اسی کو ساتھ لے کر مارکیٹ جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ علینا اسے شاپنگ کے لیے صاف انکار کر چکی تھی کہ اسے فواد کی غیر موجودگی میں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چوکیدار اسے خوب پہچانتا تھا اس لیے بغیر روکے گیٹ کھول دیا۔ انکل لطیف کا گھر کسی محل کی طرح شاندار اور کشادہ تھا۔ وہ چاہتی تو یہیں رہ بھی سکتی تھی لیکن اب انکل کا بیٹا باہر سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آچکا تھا اس لیے اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کے گھر میں ٹھہرے۔

''پنکی...!'' گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ پنکی کے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق اسے آواز دینا نہ بھولی۔ اس کے مطابق اسے ریڈی حالت میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ اسے پہلے ہی اپنے آنے کا بتا چکی تھی۔

''کیسی ہو مس پنک؟'' سامنے سے آتے شمروز کی اس پر نظر پڑی تو مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی گلابی رنگت کی وجہ سے وہ اسے اکثر مس پنک کہہ کر بلاتا تھا۔

''کب آئے واپس؟'' وہ انجان بن کر بولی حالانکہ اس کی آمد کا پتا پنکی سے لگ چکا تھا۔

''پانچ چھ دن ہو گئے ہیں۔'' وہ خوشگوار انداز میں بولا۔

''ہوں، تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''کرائم رپورٹر بننے کا ارادہ ہے۔'' وہ برجستگی سے بولا تو وہ ہنس دی۔

''مذاق مت کرو سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں۔''

''مذاق نہیں ہے میں بالکل سنجیدہ ہوں، صبح کو کرائم رپورٹنگ کروں گا سیکنڈ ٹائم ایک دوست..... کے ساتھ پارٹنر شپ پر بزنس کروں گا۔''

''کون دوست۔''

''ہو نہ کرائم رپورٹر جاسوسی سے باز نہیں آؤ گی، ہے ایک دوست میرے ساتھ ہی تعلیم مکمل کی ہے لیکن پاکستان اگلے مہینے آئے گا، ہے تو جاگیردار مگر شہر میں رہنا چاہتا ہے بزنس کرے گا میرے ساتھ۔''

''کس جاگیردار کا بیٹا ہے؟'' اس کا تجسس ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ بولتا کمرے کا دروازہ کھلا اور پنکی آگئی۔

''شکر ہے میڈم آپ کی تیاریاں بھی ختم ہوئیں۔'' وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔

''کہیں جا رہی ہو تم دونوں، میں ڈراپ کر دوں؟''

''نو تھینکس گاڑی ہے میرے پاس۔''

''ہاں، صحافی صاحبہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتیں۔'' پنکی تیز لہجے میں بولی۔ شولڈر کٹ بالوں والی کیوٹ سی پنکی ویسے تو شانزہ سے سال دو سال چھوٹی ہی تھی لیکن دونوں میں بے تکلفی چونکہ زیادہ تھی اس لیے وہ اسے کچھ بھی کہہ لیتی تھی۔

''خوبصورت لڑکیاں نخرے کرتی اچھی لگتی ہیں۔'' شمروز ہنستے ہوئے بولا۔

''بھائی یہ کرائے پر گھر لے رہی ہے اور اکیلی رہے گی۔'' پنکی نے جلدی سے بھائی کو بتایا کیونکہ اس کے لاکھ سمجھانے پر بھی شانزہ ان کے گھر رہنے کو تیار نہیں ہوئی تھی

اوراب چنکی کے بولنے پر اسے گھورنے لگی۔

''ویری بیڈ چنکی، تمہیں آئندہ کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

''تم نے پاپا کو بتانے سے روکا تھا، بھیا کو نہیں۔''

''ہم اس کے کچھ لگتے نہیں ہیں نا اس لیے یہ ہمیں تھوڑا بتائے گی کچھ۔'' شہروز قدرے خفگی سے بولا۔

''ابھی گھر لیا نہیں ہے، ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے یہ تمہارا اپنا گھر ہے جب تک چاہے رہو۔''

''دراصل مجھے گھر اپنے آفس کے قریب چاہیے یہاں سے بہت دور پڑے گا آفس۔'' اس نے جلدی سے عذر تراشا۔

''تم آزاد صحافی ہو تمہیں آفس روز جانے کی کیا ضرورت ہے، جب جانا ہوگا مجھے بتانا لے جاؤں گا، اب میں یہیں تو ہوں۔''

''میری وجہ سے آپ سب لوگ ڈسٹرب ہوں گے، میرا وقت بے وقت آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

''اب ہمارا بھی لگ جائے گا آنا جانا اس لیے تم برائے مہربانی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر آجاؤ۔''

''چلیں چنکی۔'' وہ مزید بحث ترک کر کے بولی۔

''چلی جاؤ، لیکن واپس یہیں آنا ہے ورنہ میں بابا کو بتا دوں گا اور پھر تمہاری خیر نہیں۔'' وہ وارن کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا جبکہ وہ چنکی کے ساتھ مارکیٹ آگئی۔

''چنکی تم اب بڑی ہوگئی ہو، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، تمہارا بھائی نہ ہوتا تو مجھے وہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اب بالکل مناسب نہیں کہ میں وہاں ٹھہروں۔'' گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ چنکی سے بولی۔

''بھیا تمہیں کھا نہیں جائیں گے ویسے بھی وہ بہت سلجھے ہوئے ہیں۔''

''میں نے کب کہا کہ وہ سلجھا ہوا نہیں لیکن ایک لڑکی ہونے کے ناتے مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ میں کسی جوان لڑکے کے گھر میں رہوں۔'' وہ ایک بڑے سے شاپنگ مال میں داخل ہو چکی تھیں۔

''ارے یہ تو مسٹر فواد لگ رہے ہیں، ٹھہرو میں آتی ہوں۔'' چنکی ایک دم سے اسے اَن سنی کرتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی ایک شاپ کے اندر گھس گئی۔

پہلے تو شانزہ نے سوچا کہ اس کے پیچھے جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ چنکی کا انتظار طویل ہوا تو وہ بھی ایک قریبی شاپ میں ونڈو شاپنگ کی غرض سے چلی آئی لیکن اس کا سارا دھیان اس شاپ کی طرف تھا جہاں چنکی گئی تھی۔ فواد کے نام پر وہ چونکی بھی تھی۔ ایک فواد چوہدری کو تو وہ بھی جانتی تھی جو علینا کا شوہر تھا۔ اب یہ ایک اور فواد بھی منظر عام پر آ گیا تھا۔ علینا کے شوہر سے وہ براہ راست تو نہیں ملی تھی ابھی تک لیکن وہ ایک مشہور آدمی تھا اس لیے ٹی وی اخبارات میں اور علینا کے گھر میں رکھی اس کی تصاویر کے ذریعے وہ شکل سے اسے پہچانتی تھی۔

لیکن ابھی ابھی شاپ سے ایک لڑکی کے ساتھ جو نکلا تھا وہ تو ہو بہو فواد چوہدری تھا۔ وہ بُری طرح حیران ہوئی کیونکہ علینا نے کہا تھا کہ اس کا شوہر ملک سے باہر گیا ہے کل تک لوٹے گا لیکن پھر یہ کون تھا؟ کیا وہ اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھے ہوئے تھا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھر رہا تھا۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے اس کے قریب پہنچے تو وہ جلدی سے کپڑوں کے پیچھے ہوگئی لیکن کپڑوں کے ہینگرز کے پیچھے سے بھی وہ انہیں باتیں کرتا صاف دیکھ رہی تھی۔ چنکی کو کچھ پکڑا کر چوہدری فواد مال سے نکل گیا تھا۔

چنکی اب اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی وہ غالباً شانزہ کو ہی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں یہاں ہوں۔'' وہ اس کے پاس جا کر بولی۔

''اوگاڈ میں پریشان ہو رہی تھی کہ تم نجانے کہاں گئیں۔''

''یہ کون تھا؟'' وہ اس کے ہاتھ میں موجود کارڈ پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

''مسٹر فواد کو تم نہیں جانتیں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''او مائی گاڈ اتنی فیس اور ہاٹ پرسنالٹی کو تم نہیں جانتی ہو۔'' وہ اب منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی معلومات سے خائف ہو کر بولی۔

''مجھے تو ہاٹ والی کوئی بات نہیں لگی عام سا شخص ہے۔ اس کے ساتھ یہ لڑکی کون تھی؟''

''شانزہ تمہاری معلومات پر مجھے حیرت ہے، بالکل ہی کچھ نہیں جانتی ہو، یہ سُپر ماڈل مونا ہے، مسٹر فواد کی پروڈکشن کمپنی کے لیے آج کل یہ ماڈلنگ کر رہی ہے۔''

''تم فواد کو کیسے جانتی ہو؟''

''میری یونیورسٹی فیلو بھی اس کے لیے ماڈلنگ کرتی ہے اسی کے ذریعے ایک مرتبہ مسٹر فواد سے ملی ہوں، اُف میں بہت خوش ہوں شانزہ، دیکھنا جلد ہی مسٹر فواد مجھے بھی ماڈلنگ کے لیے کال کریں گے، دیکھو وہ اپنا کارڈ دے کر گئے ہیں۔'' وہ اسے کارڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ اس کا چہرہ

خوشی سے کھلا ہوا تھا جبکہ شانزہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اگر یہ شخص یہیں تھا تو پھر علینا سے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اسے، کوئی گڑبڑ تو ضرور تھی۔

''چلیں کچھ شاپنگ ہو جائے۔'' پنکی کار ڈ اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال کر بولی۔ تو وہ سر جھٹک کر اس کے ساتھ چل دی۔

''تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں کہ تم ماڈلنگ کرنا چاہتی ہو؟''

''پہلے ایسا کوئی ارادہ جو نہیں تھا مگر جب سے اپنی دوست کو یونیورسٹی میں مشہور ہوتے دیکھا ہے تب سے مجھے بھی شوق ہو گیا ہے، بس زیادہ نہیں تھوڑی سی شہرت چاہتی ہوں میری دوست کہتی ہیں کہ میں ایک اچھی ماڈل بن سکتی ہوں۔''

''لیکن یہ فیلڈ اچھی نہیں ہے، تم پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لو پھر اس طرف آنا۔''

''آج کل اچھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی ماڈلنگ کی طرف آ رہی ہیں۔ میں نے شمروز بھائی سے بات کر لی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں۔''

''انکل، آنٹی سے تو بات نہیں کی نا۔''

''ممی، پاپا کبھی اجازت نہیں دیں گے، اُن سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' پنکی قدرے تلخی سے بولی۔

''لیکن انہیں بُرا لگے گا اگر بعد میں پتا چلا تو۔''

''بعد میں پتا چلتا ہے تو چلے..... مجھے کون سا دوبارہ کرنی ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی تو شانزہ فی الوقت خاموش ہو گئی لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے ماڈلنگ سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرے گی۔ اس کے لیے پہلا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ واپسی پر بڑی خاموشی سے اس کے ہینڈ بیگ سے کارڈ اُڑا لیا۔ پنکی کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ شانزہ اس کے بیگ سے کچھ چُرا بھی سکتی ہے۔

☆☆☆

شمروز اس کے منع کرنے کے باوجود اپنے ممی، پاپا کو اس کے الگ رہنے کی بات بتا چکا تھا۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے شانزہ کی ایک نہ چلنے دی اور ناچار اسے ان کی بات ماننا پڑی۔

''بیٹا! پنکی کے ساتھ کمرا شیئر کرنا ہے تو تمہاری مرضی ہے ورنہ اس کے سامنے والا بیڈ روم اب تمہارا ہے۔'' آنٹی نے بڑے پیار سے اسے گلے لگا کر کہا تو پنکی کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ سونے کے لیے رضامند ہو گئی لیکن رہنے کے لیے اس نے الگ کمرے کو ترجیح دی کیونکہ کرائم رپورٹنگ کے حوالے سے اس کی چیزیں اور کاغذات اہم نوعیت کے ہوتے تھے۔ پنکی کی بے پروا طبیعت کی وجہ سے وہ اپنی ذاتی چیزیں اس سے دور ہی رکھنا چاہتی تھی۔

''یہ ہوئی نا بات، اب ہمارے گھر میں رونق آ جائے گی، روز پنکی کی سڑی ہوئی شکل نہیں دیکھنا پڑے گی۔'' شمروز ہنستے ہوئے بولا تو پنکی اسے مارنے کو دوڑی۔ انکل اور آنٹی ..... انہیں پیار سے ہنستے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ شانزہ ان سب سے بے نیاز اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے آج علینا سے ملنے بھی جانا تھا اور اپنا سامان جو تھوڑا بہت وہاں رہ گیا تھا، لے کر آنا تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ علینا کو اس کے شوہر کی حرکت سے آگاہ کرے یا نہیں دونوں ہی صورتوں میں نقصان علینا کا ہی ہوتا۔ بہت سوچ کر اس نے اسے بتانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر انکل آنٹی سے معذرت کر کے علینا سے ملنے چلی گئی۔ علینا کے بعد اسے عامر سے بھی ملنا تھا تاکہ اسے بتا سکے کہ اب اسے گھر کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ فون پر بھی بتا سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے عامر کی والدہ کا ری ایکشن دیکھنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اسے یقیناً اپنی متوقع اور ناپسندیدہ بہو سمجھنے لگی تھیں لیکن ایسا بہرحال تھا نہیں۔

علینا نے اسے اپنے فلیٹ کی چابی دے رکھی تھی اس لیے اندر آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی آئی جو علینا نے اسے عارضی طور پر دے رکھا تھا۔ یہاں آ کر دس منٹ کے اندر اندر اس نے اپنی چیزیں بیگ میں ڈالیں اور ایک آخری نظر کمرے پر ڈال کر نکلنے ہی لگی تھی جب علینا اندر آئی اور جلدی سے اسے تقریباً کھینچتی ہوئی اسی کمرے سے ملحقہ ڈریسنگ روم میں لے آئی۔

''کیا ہوا ہے یہاں کیوں لائی ہو؟'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولی تو علینا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''فواد آیا ہوا ہے بس کہیں نکلنے ہی والا ہے۔ اس کے بعد تم بھی نکل جانا، میں نہیں چاہتی کہ تمہارا اس سے سامنا ہو۔'' وہ جلدی سے بول کر ابھی ڈریسنگ روم سے نکلی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا۔

''پھر تمہارا کیا جواب ہے؟'' یہ یقیناً فواد چوہدری کی آواز تھی جو علینا کو ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔

''تمہاری گھٹیا فرمائش کا جواب نہیں ہے، تمہیں شرم

نہیں آئی مجھے یہ سب کہتے ہوئے۔" علینا غصے سے بولی تو شانزہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ڈریسنگ روم کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں بھی شرم وحیا کے معنی آتے ہیں، پچھلے دو سال سے تمہاری یہ شرم کہاں گم تھی؟"

"آہستہ بولو۔" وہ غرائی۔

"کیوں تمہارا ضمیر جاگ جائے گا، علینا میڈم تمہارے جیسی لڑکیوں کے پاس شرم وحیا ہوتی نہیں ہے، ہوتی تو دو سال سے یہاں میرے ساتھ بغیر شادی کے نہ رہ رہی ہوتیں۔" اس نے جیسے بم پھوڑا تھا۔ شانزہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"میں نے کہا بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ یقیناً شانزہ کی موجودگی کی وجہ سے اسے چپ کرا رہی تھی لیکن فواد اس کی بدتمیزی پر مزید بھڑک اٹھا اور اسے لگاتار دو چار تھپڑ لگا دیے۔ شانزہ نے بمشکل خود کو روکا۔ وہ ان دونوں کی آپس کی لڑائی سے بچنا چاہتی تھی۔

"تمہاری یہ جرأت دو ٹکے کی لڑکی کہ تم مجھ سے، چوہدری فواد سے اس طرح بات کرو، میں تمہارے حسین چہرے کو عبرت ناک بنا دوں گا۔ لوگ تمہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے اس گھٹیا فلیٹ پر، اب تم مزید مجھ پر اپنا حکم نہیں چلا سکتے، میں جا رہی ہوں۔"

"وائے ناٹ تم یہاں سے جاؤ گی لیکن میرے دوست کے فلیٹ پر۔" فواد کا لہجہ زہریلا تھا۔

"کس خوش فہمی میں ہو فواد چوہدری، میں تمہاری بیوی نہیں ہوں جو تمہاری ہر گھٹیا بات مان لوں۔" علینا کی آواز بھی غصے سے تھرا رہی تھی پھر دوسرے ہی پل اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ اس مرتبہ شانزہ خود کو باہر دیکھنے سے نہ روک پائی۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ چونکہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اس لیے اس نے تھوڑا سا سر آگے نکال کر کمرے میں جھانکا۔ فواد کی پشت اس کی طرف تھی اور وہ علینا کو اس کے بالوں سے پکڑے ہوئے تھا اسی لیے علینا کی کراہ نکلی تھی۔

"تمہیں صرف عیش وعشرت سے مطلب ہے نا چاہے میرا فلیٹ ہو یا میرے دوستوں کا، اب تمہیں ہر حال میں وہاں جانا ہے۔"

"چھوڑ دو مجھے کمینے انسان، بے غیرت تم میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔"

"بکواس بند کرو اپنی اور سیدھے طریقے سے تیار ہو جاؤ ورنہ میرے دوست یہیں آ جاتے ہیں، میں تمہیں تحفے کے طور پر انہیں دینے کا وعدہ کر چکا ہوں اب اس سے پھر نہیں سکتا۔"

"کون سا تحفہ؟" وہ غصے سے بولی تھی۔

"میری شادی کا تحفہ ہو تم۔"

"کون سی شادی؟"

"عنقریب ہونے والی ہے۔ دوستوں نے تحفے میں تمہیں مانگا تو میں انکار نہ کر پایا۔" وہ ایک ادا سے بولا تو علینا نے اس کے بازو پر کاٹ لیا اور خود دروازے کی طرف بھاگی لیکن اس سے پہلے ہی فواد نے اسے قابو کر لیا اور پھر اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ جو ہاتھ میں آتا، اسے مار رہی تھی۔

"گھٹیا شخص تم نے میری زندگی تباہ کر دی اور اب خود شادی کر رہے ہو اور بے غیرتی کی انتہا دیکھو مجھے اپنے دوستوں کو دے رہے ہو لیکن میں جیتے جی ایسا ہونے نہیں دوں گی، تمہیں جیل نہ بھیجا تو میرا نام بھی علینا نہیں۔" وہ غصے سے بپھری شیرنی لگ رہی تھی۔ فواد نے اسے بمشکل قابو کیا لیکن اس نے اس پر تھوک دیا۔ جواباً فواد نے اسے زور سے دیوار سے دے مارا۔ علینا کا سر یقیناً پھٹ گیا تھا کیونکہ وہ بغیر کچھ کہے نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"ایک گھنٹا ہے تمہارے پاس، تیار رہنا جانے کے لیے۔" وہ کہہ کر کمرے سے اور پھر فلیٹ سے چلا گیا۔ شانزہ تیزی سے علینا کی طرف بڑھی جبکہ علینا ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔

"علینا۔" وہ پاس آ کر بیٹھی اور اسے ہلایا تو وہ لہرا کے اس کی گود میں آ گری۔ شانزہ نے دیکھا اس کے سر کا پچھلا حصہ پھٹ چکا تھا اور مغز وغیرہ نکل آیا تھا۔ اس نے کانپتے وجود کے ساتھ علینا کی نبض چیک کی، اس کے ناک کے آگے انگلی رکھی لیکن سانسوں کا رشتہ اس کی دوست کے وجود سے نکل چکا تھا۔ اس کا پورا وجود مارے دہشت اور خوف کے لرزنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور فلیٹ سے نکل گئی۔ فلیٹ کی یہ دوسری چابی علینا نے ہی اسے دی تھی جو آج اس کے کام آئی تھی۔ پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا تھا، وہ وہاں سے بھاگنے کا تھا۔ موقع واردات پر اس کا ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فلیٹ سے نکلتے ہوئے بھی اس نے خیال رکھا تھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا، جب کوئی نظر نہ آیا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی اور

پارکنگ سے اپنی گاڑی نکال کر بمشکل انکل لطیف کے گھر تک پہنچی۔

☆☆☆

''نام کیا ہے تیرا؟'' چوہدرائن نے بغور حکیم کے ساتھ آنے والی لڑکی کا جائزہ لیا اور نرمی سے بولی۔ لڑکی کی صورت ہی اتنی موہنی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی آواز میں سختی نہ لا سکی۔

''جی کوئی بھی نام دے دیں اسے تو کچھ یاد نہیں ہے۔'' حکیم کی بیوی بے تابی سے بولی۔

''ہونہہ.....'' چوہدرائن نے گہری سانس لی اور پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھا جیسے فیصلہ کرنا چاہتی ہو کہ اسے کہاں فٹ کیا جا سکتا ہے۔

''کھانا بنانا آتا ہے؟'' چوہدرائن کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں آتا یا یہ بات بھی یاد نہیں ہے؟'' چوہدرائن کو سمجھ نہ آیا تو بولی۔ جواباً وہ مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ بھی چمک دار تھی۔

''اس کو لے جاؤ یہاں سے۔ اس لڑکی کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے، حویلی میں چار چار جوان لڑکے رہتے ہیں، پتا نہیں کون ہے کل کو کسی بااثر فیملی کی وارث نکل آئی تو کون جواب دے گا۔''

''جی، اب آپ ہی اس کی اصل وارث ہیں، ہمارے ساتھ رہی تو نہ جانے اس کا کیا بنے گا۔'' حکیم لجاجت سے بولا۔ چوہدرائن نے وضاحت طلب نظروں سے اسے گھورا۔

''چوہدرائن جی معاف کیجیے گا۔ میں بڑا چھوٹا سا بندہ ہوں کوئی غلط بات نہ منہ سے نکل جائے۔''

''بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''چوہدری بہزاد آئے تھے جی آج لڑکی سے ملنے۔'' حکیم کے بتانے پر چوہدرائن سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''سن لڑکی، کیا واقعی تجھے کچھ یاد نہیں آ رہا یا کسی کا خوف ہے تجھے جو کچھ بتا نہیں رہی ہو؟''

''جی آپ کی قسم مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آ رہا ورنہ میں یہاں نہ بیٹھی ہوتی لیکن جی مجھے آپ سے ایک ریکویسٹ کرنی ہے..... میرا مطلب ہے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔''

''کہو کون رہی ہوں۔''

''آپ پلیز مجھے اپنی اس حویلی میں کوئی بھی کام دے دیں، میں کر لوں گی لیکن مجھے حکیم اور ماں جی کے پاس رہنے دیں ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں ان کی بیٹی بن کر رہنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا ایک ہی دن میں اتنی اپنائیت ہو گئی ہے تمہیں ان سے؟''

''جی انہوں نے مجھے دوسری زندگی دی ہے، ان کا احسان ہے میرے اوپر۔''

''احسان اپنی جگہ لیکن تمہارا وہاں رہنا بھی مشکل ہے کون حفاظت کرے گا تمہاری، حکیم تو تمیں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے اولاد اس کی کوئی ہے نہیں۔''

''جی ہم اس کی حفاظت کر لیں گے۔'' حکیم کی بیوی بولی۔ چوہدرائن نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''راتوں رات لڑکی اغوا ہو جائے گی اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کسی کی جوان دھی کی حفاظت کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

''جی پھر آپ ہی کوئی فیصلہ کر لیں، وڈی چوہدرائن تو یہاں ہیں نہیں۔'' حکیم جلدی سے بولا۔

''وہ ہوتی تو کیا کارنامہ سرانجام دینا تھا اس نے۔'' وڈی چوہدرائن کے نام پر چھوٹی کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''جی میرا مطبل (مطلب) تھا کہ چوہدری اور چوہدرائن تو ہیں نہیں اب آپ نے ہی فیصلہ کرنا ہے جو کریں گی ہمیں منظور ہے۔''

''کیوں ان کی موجودگی میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے، کہنا کیا چاہتے ہو تم؟'' چوہدرائن غصے سے بولی۔

''آپ..... سمجھی نہیں جی، میرا کہنے کا مطبل یہ تھا کہ.....''

''فضول ہانکنا بند کرو، لڑکی کو چھوڑ دو اور جاؤ اپنے گھر جا کر دماغ تیز کرنے کی دوا کھاؤ، کہاں کیا بولنا ہے تمہارے بس سے باہر ہو رہا ہے۔''

''چوہدرائن جی لڑکی کیا ہمارے ساتھ نہیں جائے گی۔'' حکیم کی بیوی ڈرتے ڈرتے بولی۔

''جاتے ہو یہاں سے یا تم دونوں کے دماغ ٹھکانے لگواؤں، پکا دیا ہے تم دونوں نے میرا بھیجا بھی۔''

''معاف کر دیں جی، ہم جاتے ہیں۔'' وہ دونوں تیزی سے بولتے الٹے قدموں لوٹ گئے۔ جاتے جاتے بھی حکیم کی بیوی رک رک کر اسے دیکھ رہی تھی لیکن لڑکی خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

''دیکھو لڑکی چوہدری بہزاد کا معاملہ نہ ہوتا تو میں تمہیں ان کے گھر رہنے دیتی لیکن وہ اب تمہیں سکون سے

ان کے گھر رہنے نہیں دے گا اس لیے تم اب یہیں رہو گی۔"

"لیکن میری تو ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے تو ان کو دیکھا بھی نہیں ہے جی۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"تیرا جو یہ دو آتشہ حسن ہے نا یہی تیرا دشمن ہے، گاؤں کی کوئی ایسی کڑی (لڑکی) نہیں ہے جسے اس نے بے آبرو نہ کیا ہو، بڑا ہی آوارہ لڑکا ہے۔" چوہدرائن منہ بنا کر غصے سے بولی۔

"پھر تو حویلی میں وہ مجھے زیادہ تنگ کرے گا۔" وہ سہمی ہرنی کے مانند لگ رہی تھی۔

"اس کی مجال نہیں جو میری رکھی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے، ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے، تو میرے ساتھ رہے گی میرے کام کیا کرے گی۔"

"جی شکریہ آپ کا، آپ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اب مجھے کسی کا ڈر نہیں۔" لڑکی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"جب تک تجھے کچھ یاد نہیں آجاتا اور تیرے والی وارثوں کا پتا نہیں چلتا تو میرے پاس ہی رہے گی، چل آ تجھے تیرا کمرا دکھاؤں۔" چوہدرائن اٹھی تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ میرا کمرا ہے اور تو میرے ساتھ والے کمرے میں رہے گی ویسے تو یہ کمرا حویلی میں آنے والی مہمان خواتین کے لیے ہے لیکن جب تک تیرا کوئی بندوبست نہیں ہوتا تو ادھر ہی سوئے گی۔" وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اسے لیے اندر آگئی۔ کمرا بہت زیادہ ماڈرن انداز میں سیٹ نہیں تھا لیکن اس میں موجود ساری چیزیں ہی قیمتی تھیں۔ لڑکی نے ستائشی نظروں سے کمرے کو دیکھا اور پھر مشکور انداز میں بولی۔

"میں آپ کی بہت مشکور ہوں مالکن آپ نے مجھے اتنی عزت بخشی۔"

"تجھ میں کچھ خاص بات ہے جو میرا دل نہیں مانا کہ تجھے باقی نوکروں کے ساتھ رکھوں، میرے ساتھ رہے گی تو تجھے کوئی تنگ نہیں کر سکے گا، پرائی امانت ہے، خیر سے واپس اپنے گھر جانا پتا نہیں کس کا خون ہے، اور کن حالات میں یہاں پہنچی ہے کیا نہر میں کسی نے دھکا دیا تھا یا خود چھلانگ لگائی تھی؟" چوہدرائن کا فطری تجسس پھر سے جاگ اٹھا۔

"سوری مجھے کچھ یاد نہیں، میں یہاں کیسے پہنچی ہوں اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟" وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر پریشانی سے بولی۔

"اچھا چل چھوڑ اللہ چنگا کرے گا سب، چل سو جا صبح تیرے لیے کوئی کام دیکھوں گی۔"

"آپ نے میرا نام نہیں رکھا ابھی تک، صبح اگر کسی نے پوچھا تو کیا بتاؤں گی؟" وہ معصومیت سے بولی چوہدرائن کو ہنسی آگئی۔

"جھلی ہے تو بھی رکھ لے کوئی بھی نام۔"

"اگر آپ رکھیں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔" وہ ایک دم سے ان کے بھاری اور موٹے ہاتھ کو پکڑ کر بولی۔ چوہدرائن کی نظریں بلا اختیار اس کی سفید لمبی مخروطی اور صاف ستھری انگلیوں پر پڑیں تو وہ دیکھتی رہ گئی۔

"کتنے صاف اور نرم ہاتھ ہیں تیرے، یہاں کی لڑکیوں کے ناخنوں میں تو ہر وقت گوبر ہی پھنسا رہتا ہے جب کچھ کھانے کو پکڑاتی ہیں بدبو ہی آتی رہتی ہے ان سے۔"

"شکریہ۔" وہ فوراً ہاتھ ہٹا کر بولی۔

"تجھے جب سے دیکھا ہے اپنی چھوٹی بہن صاحبہ یاد آرہی ہے، وہ بھی بالکل تیری طرح خوب صورت اور نازک سی تھی سارا دن بچوں کی طرح پوری حویلی میں چھلانگیں لگاتی پھرتی تھی۔ چالاکی نام کی کوئی شے نہیں تھی اس میں، کبھی کچھ غلط نہیں کرتی تھی بس ایک ہی غلطی کی اس نے اور....." بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں نمی سی آگئی جسے اس نے جلدی سے چھپالیا۔

"کیا غلطی ہوئی اُن سے؟"

"بہت بڑی غلطی کر بیٹھی تھی وہ، گاؤں کی عام کڑیاں (لڑکیاں) ایسی غلطیاں کریں تو کوئی کچھ نہیں کہتا مگر یہی غلطی کسی چوہدری کی بیٹی سے ہو جائے تو اس کی زندگی ہی موت بن جاتی ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی اور پھر بات بدل دی۔

"لے بھلا، میں بھی کیا لے بیٹھی، تو نے نام پوچھا تو صاحبہ یاد آگئی، مجھے تو ایک یہی نام پیارا لگتا ہے اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو یہی رکھتی اب اگر تجھے پسند آئے تو رکھ لینا۔" وہ کہہ کے رکی نہیں باہر چلی گئی۔ چوہدرائن کے جاتے ہی اس نے کندھے اچکائے اور قدرے ناپسندیدگی سے تیز رنگ بیڈ شیٹ کو دیکھا اور پھر اسے اتار لیا۔ سرہانے کے کور بھی اتار کر وہ متوقع نظروں سے الماری کو دیکھنے لگی۔

"بیڈ شیٹس یہیں ہونی چاہئیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھی اور اسے کھولا تو آنکھیں چمک گئیں۔ وہاں واقعی دو تین بیڈ شیٹس رکھی تھیں۔ ان میں سے جو ذرا ہلکے رنگ کی تھی اس نے وہ بچھا دی اور پھر لیٹ گئی۔ اچانک

یاد آیا کہ دروازہ تو کھلا ہے تو فوراً لاک لگایا۔ دروازوں کے لاک یقیناً شہر سے لاکر لگائے گئے تھے، کافی مضبوط لگ رہا تھا۔ دوبارہ بیڈ پر بیٹھنے سے پہلے اس نے نماز پڑھی اور پھر وقت گزاری کے لیے کمرے میں بنی چھوٹی سی الماری سے ایک کتاب اٹھالی۔ یہ احادیث کی کتاب تھی وہ بیڈ پر بیٹھ کر پڑھنے لگی لیکن پھر جلد ہی بند کر دی کوئی بھی حدیث مستند ذرائع سے نہیں لی گئی تھی۔ اس نے کتاب رکھ دی۔ کتنی ہی دیر تک مزید وہ نیند کو بھگاتی رہی پھر جب آدھی رات کا وقت ہو گیا تو اس نے دروازہ اَن لاک کیا اور کھولنے سے پہلے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ باہر نکل کر اس نے اِدھر اُدھر کی سن گن لینے کے ارادے سے کوئی بھی حرکت کیے بغیر چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا پھر ایک اندازے سے حویلی کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن ایسا کرتے وقت وہ کافی سے زیادہ محتاط تھی۔ اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو اس کی معصومیت کا پردہ فاش ہو جاتا اور شاید پھر اسے کوئی کڑی سزا بھی سنا دی جاتی اور ایسا فی الحال وہ چاہتی نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ایسا گوشہ ڈھونڈا جو گیٹ کے قدرے پاس تھا لیکن وہاں کا بلب شاید فیوز.... تھا۔ تیز قدموں مگر بغیر چاپ کے چلتی وہ دیوار کے پاس آ گئی۔ ایک نظر رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ دیوار کی اونچائی بمشکل پانچ سے ساڑھے پانچ فٹ کی تھی اس لیے وہ آسانی سے اسے پھلانگنے میں کامیاب ہو گئی اور ساتھ ہی تیزی سے اپنے مطلوبہ مقام کی طرف بڑھ گئی۔ نہر کنارے پہنچ کر وہ قریبی ایک درخت کے پاس آ کر رک گئی اور ایک مرتبہ پھر خاموشی سے چاروں طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے درخت کی جڑ کے قریب سے ہی مٹی کھودنے لگی۔ کچھ دیر بعد اسے اپنا مطلوبہ بیگ مل گیا۔ بیگ ہاتھ لگتے ہی وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی طرح واپس حویلی میں لوٹ آئی۔ جانتی تھی کہ آج کی رات کے بعد اس طرح حویلی سے نکلنا مشکل ہو گا کیونکہ حویلی کے تقریباً سبھی لوگ سوائے چوہدرائن اور ملازمین کو چھوڑ کے کہیں گئے ہوئے تھے۔ ملازمین بھی مالکوں کی غیر موجودگی میں بے پروا ہو جاتے ہیں اسی لیے باہر جاتے آتے اسے کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا۔

کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور پھر بیگ کھول کر اس میں موجود اپنی چیزوں کو غور سے چیک کرنے لگی۔ اس کا سارا ضروری سامان اس میں موجود تھا۔

اس نے اپنا موبائل بیگ سے نکالا اور بیگ کو اسی طرح دوبارہ بند کر کے الماری میں موجود بیڈ شیٹس کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔

موبائل لیے وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی اور اسے آن کیا، سگنلز کی موجودگی نے اس کا دل خوش کر دیا، ویسے اسے امید تھی کہ موبائل کام کرے گا کیونکہ آج کل تقریباً ہر بڑے چھوٹے گاؤں دیہات میں موبائل ٹاورز کی وجہ سے سگنلز جاتے تھے۔ موبائل آن ہوتے ہی اس نے ڈائلڈ نمبرز میں سے ایک نمبر کو پریس کیا تو کال دوسری طرف جانے لگی۔

''ہائے۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی وہ چہک کر بولی۔

''تو بالآخر تم نے پہلی منزل پار کر لی۔'' دوسری طرف سے ایک مرد کی بھاری آواز آئی تو وہ ہنسنے لگی۔

''صاحبہ جس کام میں ہاتھ ڈالے وہ ہو کر رہتا ہے۔''

''ہونہہ تو صاحبہ نام ہے اب آپ کا۔'' اس مرتبہ مرد حیرانی سے بولا۔

''چھوٹی چوہدرائن نے رکھا ہے، صاحبہ اس کی چھوٹی بہن تھی جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس کے باپ بھائیوں نے اسے مار ڈالا۔'' یہاں آنے سے پہلے چونکہ وہ پورا بائیو ڈیٹا کھنگال کر آئی تھی اس لیے اسے بھی بتانے لگی۔

''اس کا مطلب ہے تم نے چوہدرائن کو قابو میں کر لیا ہے؟''

''بس آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا، چوہدریوں کی ظاہری شان و شوکت کا جنازہ نکال کر ہی آؤں گی۔''

''بس اپنا خیال رکھنا وہاں تمہارے لیے بہت خطرہ ہے۔ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تمہاری اصلیت کی تو تم جانتی ہو نا.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''جانتی ہوں میں، سب کچھ جان کر ہی یہاں آئی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی اور پھر چونک گئی۔ باہر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔

''سنو پھر بات ہو گی ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔'' اس نے جلدی سے کہہ کر کال ڈس کنیکٹ کی اور موبائل کو سائیلنٹ پر لگا دیا۔ کمرے کی لائٹ وہ بیڈ پر لیٹنے سے پہلے ہی آف کر چکی تھی۔ اب موبائل بیڈ کے میٹرس کے نیچے رکھ کر وہ دبے قدموں دروازے کے پاس گئی اور کان باہر کی آوازوں کی طرف لگا دیا لیکن باہر مسلسل خاموشی تھی۔ وہ کچھ دیر مزید انتظار کر کے سر جھٹک کر بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

''اے اللہ میری حفاظت آپ کے ذمے ہے اور مجھے میرے مشن میں کامیابی دینا۔'' سونے سے پہلے وہ دل

سے..... دعا گو ہوئی اور پھر بے خوف ہو کر سو گئی۔

پوری حویلی میں چوہدری فواد کی شادی کی تیاریاں اب عروج پر تھیں، اسی سلسلے میں دو دن سے ساری فیملی شہر میں فواد کے سسرال گئی ہوئی تھی۔ لڑکی کو شادی کی شاپنگ بھی کرانا تھی اور خود بھی شاپنگ کرنی تھی۔ شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے فواد کے لیے وڈی چوہدرائن اپنی بھتیجی بیاہ کر لا رہی تھی۔ بہزاد کے لیے بھانجی لے کر آئی تو بھائی ناراض ہو گیا اب اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ ورنہ وڈی چوہدرائن کے نزدیک دونوں کا کوئی خاص جوڑ نہیں تھا۔ اس کا بیٹا اونچا لمبا گبرو جوان اور یورپ سے ڈگری لے کر آیا تھا جبکہ بھتیجی ایک تو چھوٹے قد کی تھی اوپر سے صحت مند بھی ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی، اس سب سے بڑھ کر اس کے نخرے ہزاروں تھے۔ بس اکلوتی بیٹی تھی اور ساری جائداد کی اکلوتی وارث بھی۔ یہی ایک وجہ تھی اس رشتے کے ہو جانے کی، فواد کو بھی ماموں کی فیکٹریوں اور ملوں میں کافی دلچسپی تھی اس لیے اس نے بھی معمولی سے احتجاج کے بعد ہاں کر دی تھی۔ لڑکیوں کی اسے کمی نہیں تھی۔ بیوی کا کیا تھا لا کر گھر میں ہی تو رکھنی تھی۔ نسل بڑھانے کے لیے ویسے بھی ضروری تھا کہ بیوی خاندانی ہو چنانچہ اس نے بھی جاگیرداروں کی طرح رسمی طریقے سے شادی کی رضامندی دے دی تھی۔

آج گھر والے واپس لوٹے تو جیسے... حویلی کے ملازمین میں پھرتی بھر گئی تھی۔ سب ہی مصروف تھے۔ اپنے اپنے حصے کے کاموں کو نمٹانے کی جلدی تھی۔ ایک صاحبہ تھی جو چھوٹی چوہدرائن کے کمرے میں بیٹھی ان کے کپڑے ہینگروں میں لگا کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ پچھلے دو دن سے چوہدرائن نے اس سے صرف اپنے ذاتی کام ہی لیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اسے اپنی چھوٹی بہن کی جگہ دے چکی تھی اس لیے اس کی نزاکت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے مشکل کاموں سے دور بھی رکھا تھا۔ شادو اور مہرو کو دل ہی دل میں اس سے جلن بھی ہونے لگی تھی لیکن بظاہر اس سے ہنس کر ہی بات کرتی تھیں۔ آخری جوڑے کو ہینگر میں لگا کر رکھ کر وہ مڑی تو چھوٹی چوہدرائن کو گہری سوچ میں ڈوبے پایا، ساتھ ہی چہرے کے تاثرات بھی کچھ خوش گوار نہیں لگ رہے تھے۔

"آپ پریشان ہیں مالکن؟" وہ پاس آ کر بولی۔

"تم مجھے مالکن والکن نہ کہا کرو سکینہ باجی کہا کرو، صاحبہ بھی مجھے میرے نام سے بلاتی تھی۔"

"جی، وہ تو ٹھیک ہے مگر باقی سب کیا سوچیں گے۔"

"باقیوں کو گولی مارو، وہ کرو جو میں کہتی ہوں۔ تمہیں یہاں میں نے رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے سکینہ باجی جیسا آپ کہیں۔" وہ سعادت مندی سے بولی تو چوہدرائن نے بڑی میٹھی نظروں سے اسے دیکھا اسی وقت دروازہ ناک کر کے حماد اندر آ گیا۔ اس پر نظر پڑی تو لمحے بھر کو تو پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے گیا پھر ماں کا لحاظ کر کے خود پر بمشکل قابو پایا اور انہی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر لکھے سوال کو پڑھ کے چوہدرائن اسے صاحبہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں بولی۔

"بیٹا مجھے تو اس میں بیٹی بھی نظر آتی ہے اور تمہاری صاحبہ خالہ بھی اسی لیے میں نے اس کا نام صاحبہ رکھ دیا ہے، تو پتا لگا کیا ہوا ہے اس کے ساتھ اور کہاں سے آئی ہے۔" ماں کے تفصیل بتانے پر اس نے ایک مرتبہ پھر اس شعلۂ جوالہ کو دیکھا۔ وہ معصومیت سے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

"اِدھر آؤ میں تمہاری تصویر لیتا ہوں، اسے اخبار میں دوں گا پھر جو بھی تمہارے جاننے والا ہوا یا ہوئے، ان کا پتا چل جائے گا۔" وہ جیب سے اپنا موبائل نکال کر بولا تو وہ بڑے سکون سے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ تصویر اخبار میں آ جانے سے جہاں اس کے دشمن اس کے موجودہ پتے سے آگاہ ہو جاتے وہیں قریبی جاننے والے بھی پریشان ہو جاتے لیکن وہ پھر بھی مطمئن کھڑی تھی۔ اس کے اطمینان کے پیچھے یقیناً اس کے رسورسز تھے جن پر اسے اعتماد تھا۔ وہ اسی لیے تصویر بنوانے کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ تصویر کسی اخبار میں نہیں چھپے گی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ سب انتظامات کر کے نکلی تھی۔ تصویر اتروانے کے بعد وہ ان ماں بیٹے کو چھوڑ کر باہر چلی آئی اسے شادو وغیرہ سے حماد اور شہزاد دونوں بھائیوں کے شادی میں پہننے والے کپڑے لینے تھے تاکہ انہیں بھی استری کر کے ہینگروں میں لگا کر ان کی الماریوں میں لٹکا دے۔ اس لیے اس کا رخ وڈی چوہدرائن کے کمروں کی طرف تھا جو حویلی کے دوسری سمت بنے تھے انہی کمروں کے آخر میں کچھ فاصلے پر ملازمین کے چار پانچ کمرے تھے۔ شادو اور مہرو ویسے تو روز اپنے گھروں سے حویلی آتی تھیں لیکن دن میں کاموں سے فارغ ہو کر وہ آرام کرنا چاہتیں تو انہی کمروں میں سے ایک میں سو جاتیں۔ عموماً سونے کا وقت انہیں گرمیوں میں ہی ملتا تھا

جب دن لمبے ہوتے تھے۔ سردیوں میں تو دن اتنے چھوٹے پڑ جاتے کہ ان کا کام اکثر گھر جانے تک مکمل بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ ابھی بھی گرمیوں کے اختتام کے دن تھے نہ گرمی پوری طرح گئی تھی نہ سردی نے زور پکڑا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم کو بھلی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے بھی سرخ پھول دار لان کا سوٹ پہنا تھا اور دوپٹا گاؤں کے ماحول کے مطابق سر پر اوڑھ رکھا تھا جو ہوا چلنے سے بار بار اس کے ریشمی بالوں سے ڈھلک جاتا۔ دوپٹا سر کنے سے اس کے بال اُڑنے لگے۔ ماں کے کمرے سے باہر دہلیز پر کھڑا احماد اس کے لمبے بالوں اور پتلی کمر کے پیچ و خم میں کھو گیا۔ وہ جا کیا رہی تھی، دل کی دنیا ہلا رہی تھی۔ اس کا منظر سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ منظر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ سامنے کمروں میں سے ایک کمرے میں جا چکی تھی۔

اُس کے دل نے بے اختیار انگڑائی لی اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے حویلی کے صحن کے بیچوں بیچ لگے بڑے سے درخت کے نیچے رکھی منقش موٹے پائیوں والی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ جب بھی موسم اچھا ہوتا تو حویلی کے افراد یہیں اکٹھے ہو کر چائے وغیرہ پیتے تھے۔ اس نے موبائل نکالا اور گیلری میں پڑی اس کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ بلاشبہ وہ حسین ہونے کے ساتھ بلا کی پُرکشش تھی۔ تصویر دیکھتے دیکھتے وہ اس کے خیالوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

چھوٹی چوہدرائن کے انکار کے باوجود وہ انہیں اپنے ساتھ صبح کی سیر کے لیے حویلی سے باہر لے آئی تھی۔ نہر کنارے چلتے چلتے وہ آموں کے باغ تک آ گئی تھیں۔ آموں کا موسم ختم ہو چکا تھا لیکن گھنے درختوں کی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوا میں چلنے سے چوہدرائن کی طبیعت پر کافی خوشگوار اثر پڑا تھا۔

''کیوں میں نے کہا تھا نا آپ کو مزہ آئے گا۔''

''کہہ تو ٹھیک رہی تھی، نہ آتی تو پچھتاتی، اب تو لگ رہا ہے کمر کی دو انچ چربی تو ضرور کم ہو گئی ہو گی۔'' وہ پسینے سے شرابور بولی تو صاحبہ کو ہنسی آ گئی۔

''یقیناً پگھلے گی چربی، آپ دیکھیے گا کچھ عرصے میں اسمارٹ ہو جائیں گی اور انکل چوہدری آپ کے پاس سے جانے کا نام نہیں لیا کریں گے۔''

''انکل چوہدری، واہ نی صاحبہ تو بھی بڑی مزاحیہ ہے۔'' وہ لفظ چوہدری کے ساتھ انکل لگ جانے سے بے تحاشا ہنسنے لگی۔ صاحبہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ وہ اکثر بے دھیانی میں پڑھے لکھوں جیسی گفتگو کر جاتی تھی جبکہ یہاں آنے سے پہلے اس نے کافی پریکٹس کی تھی کہ وہ اپنی انگلش بولنے کی روانی پر قابو رکھ سکے۔ شہر میں رہنے کی وجہ سے ایسے لفظ بولنا عام بات تھی لیکن گاؤں وغیرہ میں ایسی باتوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

''بس منہ سے ایسے ہی پھسل گیا۔''

''چل اس سے پتا تو چلا کہ تیرا تعلق شہر سے ہی ہے، یہاں گاؤں کی کڑیاں کہاں انگریزی بولتی ہیں۔ سارا دن گائے، بھینسوں کی طرح کام میں جتی رہتی ہیں۔ شام کو بستر پر ٹونی کر لیے سوتی ہیں تو صبح ہی اٹھتی ہیں۔''

''ویسے سکینہ باجی آپ کا دل اندر سے بڑا نرم ہے ورنہ چوہدریوں کی گھر والیوں کے دل تو سنا ہے بڑے سخت ہوتے ہیں۔'' وہ سچائی سے بولی تھی۔ اس کے ذہن میں چوہدرائن کا جو امیج تھا، وہ اس سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

''میری ماں کا مزاج بھی بڑا نرم تھا، ابا جی بڑے سخت گیر اور غصے والے تھے لیکن میری عادت اپنی ماں پر گئی ہے۔''

''آپ کا کوئی بہن بھائی بھی ہے؟''

''بھائی کوئی نہیں، ایک بہن ہی تھی جسے ابا کے بھائیوں نے زمین کی خاطر پکڑ کر مار ڈالا، چوہدری علمدار نے مجھ سے شادی نہ کی ہوتی تو مجھے بھی کسی نہ کسی بہانے سے مار ہی دیتے۔'' وہ قدرے نفرت خیز لہجے میں بولی۔

''کیا چوہدری صاحب کو آپ کے حالات کا علم تھا؟''

''کچھ تھا، کچھ نہیں، زیادہ ہاتھ میرا رشتہ لینے میں ہماری زمین کا ہی تھا، علمدار کو پتا چلا کہ میں اکیلی وارث ہوں تو دھوکے سے شادی کر لی۔''

''دھوکا؟''

''ہاں، اس نے بتایا نہیں تھا کہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ بھی ہے شادی کے بعد ابا جی کو پتا چلا لیکن کافی دیر ہو گئی، گالیاں تو بڑی دیں ابا نے۔''

''اب آپ خوش ہیں چوہدری صاحب کے ساتھ؟'' وہ انہیں کریدنے کی غرض سے بولی۔

''عادتیں تو اس کی ابھی بھی کافی بُری ہیں جو مجھے بالکل پسند نہیں اس لیے میں تھوڑا الگ تھلگ ہی رہتی ہوں مگر ایک اچھی بات ہے کہ جب سے مجھے بیاہ کر لایا ہے جو منہ سے نکالا فوراً پورا کیا، کبھی کسی شے کی تنگی نہیں آنے دی۔''

باتیں چھوڑ کے دونوں اب تیز تیز چلنے لگیں۔

گاؤں کی زندگی کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے، شہر کے ہنگاموں سے دور، پُرسکون اور صاف ستھری فضا، اُجلا اُجلا آسمان۔ ہر چیز ہی انسان کو اپنی دلکشی میں کھو دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ٹھنڈی سانس بھری اور پھر تیز تیز چلتی چوہدرائن کے ساتھ قدم ملانے لگی۔

''سکینہ باجی، میرے پاس تو شادی پر پہننے کے لیے کپڑے ہیں ہی نہیں۔'' حویلی کے قریب پہنچ کر اچانک اسے یاد آیا تو بولی۔

''پتا ہے مجھے شہزاد پُتر ناشتے کے بعد شہر جا رہا ہے، اسے بتایا ہے میں نے تیرے لیے کپڑے لیتا آئے گا۔''

''ٹھیک ہے جی.....'' اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

☆☆☆

شانزہ بمشکل انکل لطیف کے گھر پہنچنے میں کامیاب رہی تھی اور اب شکر کیا کہ اس کا گھر کے کسی فرد سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ سیدھی کمرے میں گھسی اور اپنے لرزتے وجود کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر ایک دم سے اٹھ کر واش روم میں گھس گئی اور کپڑوں سمیت شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ رہ رہ کر اسے اپنی دوست کی کھلی آنکھیں یاد آنے لگتیں اور اس کے سر کے پیچھے سے بہل بہل گرتا خون جیسے اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر یونہی گزر گئی جب اسے یاد آیا کہ اسے پولیس کو اطلاع کرنا چاہیے۔ وہ واش روم سے نکل کر سیدھی ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی پھر کچھ سوچ کر ریسیور اٹھا کر واپس رکھ دیا۔

جلدی سے کپڑے بدل کر وہ اپنی گاڑی کی چابی کمرے میں ہی چھوڑ کر باہر آ گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ کچھ دن اپنی گاڑی گھر میں ہی کھڑی رکھے گی۔ گیراج میں شمروز کی بائیک مع ہیلمٹ کھڑی تھی۔ وہ اسے ہی اسٹارٹ کر کے لے گئی۔ شمروز جب سے مستقل پاکستان لوٹا تھا آتے ہی اپنے لیے مور بائیک خرید لی اسے یہ گاڑی سے زیادہ آرام دہ لگتی تھی۔ اپنے ملک کی بے ہنگم ٹریفک میں گاڑی میں گھنٹوں پھنسنے سے بہتر موٹر سائیکل کا سفر تھا۔ آج یہ شانزہ کو بھی کسی نعمت کی طرح لگی تھی۔ ہیلمٹ کے نیچے اس کا چہرہ وقتی طور پر سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور یہ بات اسے جانے انجانے میں سکون دے رہی تھی۔ گھر سے کافی دور ایک پبلک بوتھ کے قریب بائیک روک کر وہ اندر گھس گئی اور چوہدری فواد کے گھر سے قریب ایک تھانے دار کو قتل کی واردات کی خبر دے دی۔ تھانے دار بار بار اس کا نام اور نمبر پوچھ رہا تھا مگر اس نے فون بند کر دیا اور اب وہ قدرے مطمئن تھی گھر واپس جانے کے بجائے وہ عامر سے ملنے اس کے گھر آ گئی۔

''گھر پر نہیں ہے وہ۔'' اس کی والدہ گیٹ پر ہی اسے دیکھ کر بیزاری سے بتانے لگی۔

''کہاں گیا ہے؟'' وہ ہیلمٹ سر سے اتار کر ان سے پوچھ رہی تھی۔ عامر کی والدہ کو اس کا لڑکوں والا حلیہ ایک آنکھ نہ بھایا اور یہ ان کے انداز سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔

''موبائل پر بات نہیں ہوئی تھی کیا جو مجھ سے پوچھ رہی ہو۔'' وہ بولی تو اس کو ایک دم اپنی بے وقوفی یاد آ گئی۔ وہ ہمیشہ فون کر کے یہاں آتی تھی آج یاد نہیں رہا تھا بے دھیانی میں اِدھر نکل آئی تھی۔

''سوری آنٹی، آپ کو تنگ کیا۔'' وہ فون پاکٹ سے نکال کر بولی اور وہیں کھڑے کھڑے عامر سے بات کرنے لگی۔ عامر کی ماں کچھ دیر تو ناگواری سے اسے دیکھتی رہی پھر زور سے دروازہ بند کر کے بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد شانزہ، عامر کے پاس اس کے آفس میں بیٹھی ساری رُوداد سنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں عامر صاف دیکھ رہا تھا اور ساتھ دل ہی دل میں اس کی بہادری پر داد بھی دے رہا تھا۔

''ہمیں یہ خبر اخبار میں لگانی چاہیے۔'' شانزہ بے تابی سے بات کے اختتام پر بولی۔

''کیا تمہارے پاس علینا کی تصویر ہے؟''

''نہیں، گھبراہٹ میں تصویر لینے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔''

''تمہاری کوئی چیز تو نہیں رہ گئی وہاں؟''

''نہیں، میں پہلے ہی سب کچھ پیک کر چکی تھی تب یہ واقعہ ہو گیا مگر میں اپنا تیار کردہ بیگ اپنے ساتھ ہی لائی ہوں۔''

''فواد چوہدری بہت بااثر بندہ ہے۔ اس سے براہِ راست ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ وہ ہمیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں فکر سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے ہم خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔''

''نہیں، خاموش بیٹھنے کو کس نے کہا، کریں گے اس کے خلاف سب کچھ کریں گے لیکن اپنے ہاتھ پاؤں بچا

کر۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"بہت کچھ لیکن پلیز تھوڑا انتظار کرو۔"

"انتظار۔" وہ تلخی سے بولی۔ "ایسی سچویشن میں انتظار کہاں سے آگیا، ہمیں کوئی فوری ایکشن لینا چاہیے۔"

"اگر اس نے کہا کہ اس نے یہ سب نہیں کیا بلکہ تم نے کیا ہے تو؟"

"وہاٹ ربش....." وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں یہ کیوں کروں گی بلکہ میں تو سارے واقعے کی چشم دید گواہ ہوں۔"

"تمہاری گواہی کو تسلیم ہی نہیں کیا جائے گا، پولیس اور سبھی یہ سوچیں گے کہ تم چوہدری فواد کو پھنسانے کے لیے یہ سب کہہ رہی ہو۔"

"ابھی لاش پولیس کو اس کے فلیٹ سے ملے گی تو وہ کیا جواب دے گا؟"

"اس سے کوئی جواب طلب کرے گا تو وہ جواب دے گا نا۔" وہ اطمینان سے بولا تو شانزہ کا تنا ہوا وجود ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ چوہدری فواد پیسے والا شخص تھا پیسے دے کر آسانی سے پولیس کا منہ بند کر سکتا تھا۔

"میں نے غلطی کی جو پولیس کو اطلاع دی۔ مجھے اپنے میڈیا رپورٹرز اور کیمرامینوں کے ساتھ وہاں جانا چاہیے تھا تاکہ معاملہ دبنے سے پہلے ہی ہائی لائٹ کر سکتی۔"

"جس کو تم غلطی سمجھ رہی ہو، یہی غلطی اب تمہاری بچت کرائے گی۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟" وہ ناسمجھی سے بولی تو وہ اُسے سمجھانے لگا۔ "دیکھو اگر بالفرض تم اس ساری خبر کو ہائی لائٹ کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو چوہدری فواد صرف ایک آدھ دن کے لیے جیل جاتا مگر تم ہمیشہ کے لیے منظر سے غائب ہو جاتیں تمہارے ساتھ ساتھ شاید انکل لطیف کی فیملی کو بھی نقصان اٹھانا پڑ جاتا۔" وہ اسے تصویر کے باقی رخ بھی دکھانے لگا تو وہ غصے سے ہونٹ چبانے لگی۔ انجانے میں سرزد ہو جانے والی غلطی نے فی الوقت اسے کسی بھی بڑے حادثے سے بچا لیا تھا۔ اب اس معاملے میں دوسرے طریقے سے ملوث ہونے کی ضرورت تھی۔

"تو اب لائن آف ایکشن کیا ہونا چاہیے؟" کچھ دیر بعد وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولی۔

"اب کی نا تم نے کام کی بات۔" وہ قدرے مسکرایا۔ "ہم چوہدری فواد کو کچھ اس طرح سے گھیریں گے کہ وہ خود اعتراف کرے گا، یہ کام اس سے سرزد ہوا ہے۔"

وہ دھیرے سے بولا اور پھر وہ دونوں مل کر اپنے لیے ایک لائن آف ایکشن تیار کرنے لگے۔ اگلے دن وہی ہوا جس کی انہیں توقع تھی۔ علینا کی خبر ایک ایسی لڑکی کی حیثیت سے چھپی تھی جو اپنے گھر سے پچھلے دو سال سے لاپتا تھی اور اب اس کی لاش چوہدری فواد کے گھر سے، میلوں دور ایک کچرے کے ڈھیر سے دریافت ہوئی تھی۔ ساتھ ہی خبر لگی تھی کہ لڑکی کے قاتلوں کا فی الوقت پتا نہیں لیکن جلد ہی ان کا پتا لگانے کی سرتوڑ کوشش کی جائے گی۔ شانزہ نے ہاتھ میں پکڑا اخبار اور ٹی وی کا ریموٹ دونوں صوفے پر غصے سے اچھال دیے اور ایک مرتبہ پھر اپنا ابلتا غصہ نکالنے کے لیے اس نے اپنے مخصوص موبائل نمبر سے اسی تھانے کے حوالدار کو ڈھیر ساری گالیاں دے ڈالیں۔ دوسری طرف سے وہ ایک مرتبہ پھر اس کا نام ہی پوچھتا رہ گیا اور اس نے فون بند کر دیا۔

ان کے اگلے چار پانچ دن مسلسل بھاگ دوڑ میں گزرے تھے۔ چوہدری فواد سے متعلق معلومات نے انہیں جہاں چونکایا وہاں سنسنی بھی بھر دی۔ اس وقت بھی رات کے گیارہ بجے تھے اور وہ دونوں عامر کے آفس میں بیٹھے تھے۔ عامر اسے اپنے ریسورسز سے حاصل ہونے والی معلومات اور تصویریں دکھا رہا تھا۔ اس انفارمیشن کے مطابق چوہدری فواد شوبز کے علاوہ دیگر کئی غیر قانونی کاموں اور دھندوں میں بھی ملوث تھا۔ صرف علینا ہی نہیں اس کے ہاتھ مزید تین لڑکیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ ان تینوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی حوالے سے ماڈلنگ کی دنیا سے ہی تھا۔ عامر کے ہاتھ میں موجود تصویروں میں سے ایک تصویر ایسی بھی تھی جس نے شانزہ کو چونکا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ وضاحتی نظریں عامر پر جما کر بولی۔ "یہ تو بڑی گڑبڑ لگ رہی ہے۔" تصویر میں چوہدری فواد ایک دوسرے آدمی کو ایک پیکٹ تھما رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک میز پر اسی طرح کے پیکٹس سے بھرا ہوا ایک قدرے بڑا بریف کیس کھلی حالت میں رکھا ہوا تھا۔

"یہ تو چرس، افیون ٹائپ کوئی چیز لگ رہی ہے۔"

"کوکین ہے۔" عامر آرام سے بولا۔

"کیا؟" وہ ایک مرتبہ پھر سے تصویر دیکھنے لگی۔ یہ تصویر لازماً کسی کاروباری حریف نے لی ہوگی جو اب ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ "یہ کہاں سے آئی؟"

''یہی اب پتا لگانا ہے، مجھے کافی عرصہ پہلے اسی قسم کی بھنک پڑی تھی لیکن میں کچھ دوسرے کاموں میں اُلجھا رہا لیکن اب اس خبیث کو ہم سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔''

''یہ تو بلیک مارکیٹ میں بہت مہنگی بکتی ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ یہ اسے حاصل کہاں سے کر رہا ہے، پہلے مرنے والی تینوں لڑکیوں میں سے دو اس نشے کی زیادتی کا ہی شکار ہوئی ہیں، اس کا مطلب ہے کہ یہ اسے ہمارے ہی ملک کے جوان لڑکے لڑکیوں میں پھیلا رہا ہے، ایسا کرنے کے لیے اس کے یقیناً مضبوط ریسورسز ہوں گے۔''

''اُف ہمیں اس وطن دشمن کا پتا ہی نہ چلتا اگر اس دن میں اس کے فلیٹ پر علینا سے نہ ملنے گئی ہوتی۔'' شانزہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سانس لے کر بولی۔

''کافی دیر ہوگئی ہے اب چلتے ہیں گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''او کے۔'' وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ چلتے اس بلڈنگ سے باہر آگئے۔ شانزہ کے پاس حسبِ معمول بائیک تھی۔

''چلو گاڑی میں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''نو تھینکس، یہ مزے کی سواری ہے آئی ایم انجوائنگ اِٹ۔'' وہ ہیلمٹ چڑھاتے ہوئے بولی تو عامر ہنستے ہوئے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گھر آتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی جب اسے پنکی کے کمرے سے بولنے کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ ٹھٹکنے کی وجہ یہ تھی کہ کل رات بھی تقریباً اسی ٹائم کے لگ بھگ وہ واپس آئی تھی اور اس وقت بھی پنکی کے کمرے سے آواز آرہی تھی۔ وہ پنکی کو کافی عرصے سے جانتی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک رات میں جاگتی نہیں تھی، جلدی سو جاتی ہے۔ فطری جذبے کے تحت اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلی آئی۔ پنکی بیڈ پر الٹی لیٹی کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اسے دیکھا تو مسکرا کر ہیلو کہا۔

''او کے پھر بات ہوگی بائے۔'' وہ سیل فون کان سے ہٹاتے ہوئے بولی اور کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

''اتنی رات گئے تک کس سے بات ہو رہی ہے؟'' وہ روم فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے عام سے انداز میں بولی۔

''چوہدری فواد سے بات ہو رہی تھی۔'' پنکی بولی تو وہ جو پانی کی بوتل منہ سے لگائے پی رہی تھی، اسے بے اختیار اُچھو لگ گیا۔ چوہدری فواد تو شیطان کی آنت کی طرح ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔

''اُف یار کچھ نہ پوچھو کتنی زبردست آواز ہے اس کی، جتنی زبردست شخصیت ہے، اس سے زیادہ اچھا بولتا ہے، دل کرتا ہے بس سنتے جاؤ۔'' وہ خیالوں میں ڈوبی ہوئی بولی جبکہ شانزہ ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

''کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' پنکی اسے ہلاتے ہوئے بولی تو شانزہ کا بے اختیار دل چاہا کہ اسے چوہدری فواد کے بارے میں سب کچھ بتا دے لیکن پنکی کی بے پروا فطرت نے اس کی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ اس مرحلے پر جہاں وہ اسے گھیرنے کے چکر میں تھے، پنکی کو کچھ بتانا بے وقوفی ہوتا۔ وہ کوئی بھی ایسی حرکت کر جاتی جس سے چوہدری جیسا بندہ چونک سکتا تھا۔ صورتِ حال کافی عجیب ہو چکی تھی۔

''چوہدری فواد سے تم دور ہی رہو، وہ اچھا بندہ نہیں ہے۔'' وہ اسے تنبیہ کرنے کی غرض سے بولی۔

''تو ہر بندے کو انویسٹی گیشن اسٹائل سے لو گی تو ایسے ہی ہوگا، اچھا خاصا ہینڈسم چوہدری ہے۔ لڑکیوں کی لائن لگی ہوتی ہے اسے بس ایک دفعہ ہیلو کہنے کے لیے، بٹ یوسی میرا تو اتنا اچھا دوست بن چکا ہے۔''

''وہ اچھا انسان نہیں ہے بس اس بات کو سمجھ جاؤ۔''

''کیوں اس نے کسی کو قتل کر دیا ہے یا کہیں ڈاکا ڈالا ہے جو وہ اچھا نہیں ہے؟'' پنکی کمر پر ہاتھ رکھ کر باقاعدہ بحث پر اتر آئی۔

''مجھے نہیں پتا اس نے کیا کیا، کیا ہوا ہے بس سنا ہے اس کی ریپو ٹھیک نہیں خاص کر لڑکیوں کے معاملے میں۔''

''تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو شانزہ، اگر ایسی کوئی بات ہے تو پلیز بتاؤ۔''

''بس اگر مجھے بہن سمجھتی ہو تو اُس شخص سے دور رہو۔''

''اب تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔'' پنکی تفکر سے بولی تو وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگی۔ ان باتوں نے یقیناً اس کو پریشان کر دیا تھا۔

''مذاق کر رہی تھی تم سے۔''

''اُف اتنا خوفناک مذاق، وہ بھی پنکی جیسی حساس لڑکی سے۔'' پنکی اب اسے گھور کر بولی۔

''جی، خوفناک مذاق وہ بھی پنکی جیسی خواہ مخواہ خود کو حساس شو کرنے والی لڑکی سے۔'' وہ بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی تو پنکی ہنستے ہوئے بیڈ پر لیٹ گئی۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا قسم سے۔''

''او کے سب چھوڑو...... چلو سو جاؤ کافی دیر ہو گئی ہے، مجھے صبح بہت سارے کام کرنے ہیں۔''

''تم نے شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''شادی؟'' وہ حیرانگی سے بولی۔ ''شادی کی بات کہاں سے آ گئی؟''

''شادی کے بغیر ساری زندگی تو نہیں گزارو گی نا کسی سے تو کرنی ہے۔''

''آف کورس کروں گی، مگر جب اس کا وقت آئے گا۔ پہلے تو مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو ہے کچن میں؟'' وہ بوتل فریج میں رکھتے ہوئے فریج خالی دیکھ کر منہ بنا کر بولی۔

''دیکھ لو کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔'' پنکی کی آنکھیں نیند سے بھر چکی تھیں اس لیے وہ کروٹ لے کر بولی۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

☆☆☆

پیٹ پوجا کرتے ہوئے شانزہ، پنکی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اسے چوہدری فواد کی اصلیت بتانے سے رک گئی تھی مگر دل ہی دل میں پشیمان تھی کہ... اس کی اس غلطی کا خمیازہ انجانے میں پنکی کو بھگتنا نہ پڑ جائے، مگر پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دینے لگی کہ آئندہ وہ پنکی کا خیال رکھے گی اور عامر سے اس سلسلے میں بات بھی کرے گی۔

☆☆☆

چوہدری فواد کے شہر سے واپس آتے ہی حویلی میں شادی کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ جہاں باقی ملازمین کے کاموں میں اضافہ ہوا وہیں صاحبہ کی ذمے داریاں بھی بڑھ گئیں۔ اس کے سلیقے اور سجاوٹ کے ذوق کو دیکھ کر وڈی چوہدرائن نے چھوٹی چوہدرائن سے سفارش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے اسے چوہدری فواد کی دلہن کا کمرا تیار کرنے کے لیے بھیج دے۔ چھوٹی چوہدرائن نے بڑی مشکل سے اسے بھیجا۔

''کوئی ضرورت نہیں تمہیں اس چھوٹی ناک والی کے کمرے کو زیادہ سجانے کی، تھوڑی دیر میں ہی بہانہ کر کے واپس آ جانا۔''

''بس سکینہ باجی میں یوں گئی اور یوں آئی۔'' وہ چٹکی بجا کر بولی اور ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی کہ کہیں چوہدرائن اسے پھر سے نہ روک لے۔ چوہدری فواد کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ دل میں خوش بھی تھی کیونکہ یہ اسی کا بچھایا ہوا جال تھا جو وڈی چوہدرائن نے اسے یوں بلوایا تھا۔ وہ سارے دن میں وقتاً فوقتاً وقت نکال کر وڈی چوہدرائن کے پاس بھی تھوڑی دیر بیٹھ آتی تھی۔ ان کو بھی اسی نے کہا کہ اگر وہ سکینہ باجی سے بات کریں تو وہ ان کی دلہن کا کمرا اچھی طرح تیار کروا دے گی۔ اس کے اتنے دن حویلی میں رہنے سے یہ تو سب ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ ایک پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ حماد چوہدری کے اشتہار دینے کے باوجود اس کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ اندر ہی اندر سب ہی خوش تھے، اس کے یہاں رہنے پر سوائے شادو کے۔ شادو کو چوہدری حماد کی اس میں دلچسپی کھٹکنے لگی تھی۔ وہ صاحبہ کے بارے میں تو کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتی تھی کہ وہ کیسی لڑکی تھی مگر چوہدری علمدار کے بیٹوں پر اسے ذرا اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے جب بھی حماد، صاحبہ کے پاس اسے نظر آتا، وہ بہانے سے پہنچ جاتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنا حق دوسروں سے چھیننا جانتے ہیں۔

صاحبہ جس مقصد کے لیے حویلی آئی تھی اسے پورا کرنے کے لیے حویلی کے سبھی لوگوں سے قریب ہونا ضروری تھا۔ اسے جلد از جلد اپنا کام پورا کر کے یہاں سے واپس بھی جانا تھا۔ وہ چوہدری فواد کے کمرے میں داخل ہوئی تو شہزادو وہیں کھڑا کچھ سامان رکھوا رہا تھا۔

''جو چیزیں آپ نے کہیں میں لے آیا ہوں۔'' وہ زمین پر رکھی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا جوان تھا اور اسے پہلے ہی دن صاحبہ بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی عمر ہی ایسی تھی کہ جب ہر جوان لڑکی اچھی لگتی ہے لیکن صاحبہ نے اپنا رویہ شروع سے ہی ایک بڑی بہن کی طرح رکھا تھا اس لیے وہ بھی اب اسے احترام سے بلاتا تھا۔ صاحبہ نے حویلی والوں کو اپنے اعتماد میں کرنے کے لیے فواد کے کمرے کی سجاوٹ کے لیے ڈیکوریشن کی چیزیں خود شہزادو کو لکھوائی تھیں اور وہ بڑی خوشی سے لے کر بھی آ گیا تھا۔

''گڈ بوائے، تم نے دل لگا کر شاپنگ کی ہے۔'' وہ سامان دیکھ کر اسے تعریفی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''کوئی اور کام ہو تو بتا دیں۔'' وہ اس کا احترام کرتا تھا مگر باجی وغیرہ کہنے سے بھی پرہیز ہی کرتا تھا۔ صاحبہ کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ ملازموں کی مدد سے کمرے کی تمام چیزیں بدلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا روپ بدل

گیا۔ اب وہ سائیڈ ٹیبلز کے چھوٹے لیمپس رکھوا رہی تھی جب حماد کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاں اس کی آنکھوں میں حیرانگی تھی وہیں کمرے کی سجاوٹ پر نظر پڑی تو ستائش بھی اُمڈ آئی۔

''یہ سب تم نے کیا ہے؟''

''یس۔'' وہ اُس کی نظروں میں ستائش دیکھ کر جوش سے بولی۔ کمرے کو سدھارنے میں اس کا تقریباً آدھا دن لگ چکا تھا اور اب وہ تھک چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے شادو اور مہرو کمرے میں آئی تھیں اس نے ان سے بھی پوچھا تھا، کمرا کیسا لگ رہا ہے لیکن وہ صرف ناک بھوں چڑھا کے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ اب حماد نے تعریف کی تو وہ پُرسکون ہو گئی۔

''آپ کو اچھا لگا۔''

''اچھا۔'' وہ رک کر بولا۔ ''اچھا بہت چھوٹا لفظ ہے۔ دس از ٹو مچ اچھا۔'' وہ واقعی دل سے بول رہا تھا۔ چونکہ کمرا دلہن کے لیے تیار ہو رہا تھا اس لیے اس نے روایتی سرخ رنگ سے ہٹ کر، پنک اور پرپل کلر کی تھیم رکھی تھی اور اسی رنگ کی مناسبت سے ساری چیزیں منگوائی تھیں۔

''تھینک یو ویری مچ، مجھے پتا تھا آپ کو پسند آئے گا۔'' وہ اپنی رو میں بولی تو وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

''لیکن یہ میرا کمرا تو نہیں ہے۔'' وہ مسکراہٹ چھپا کر بولا۔

''آئی نو، میں نے کب کہا کہ یہ آپ کا ہے۔'' وہ گلدان میں پھول سیٹ کرنے لگی۔

''ہوں، تو میرا کمرا کب سجاؤ گی؟'' وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔

''کیا آپ بھی شادی کر رہے ہیں؟'' وہ پھولوں سے اُلجھی ہوئی سیدھا دل میں اتر رہی تھی۔ اس نے پھولوں کا کلر بھی کمرے کی تھیم کے مطابق رکھا تھا صرف آف وائٹ پھولوں کا اضافہ تھا جو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''شادی شرط ہے سجاوٹ کے لیے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

''نہیں، یہ میں نے کب کہا۔'' وہ پھولوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہو کر بولی۔ وہ جانتی تھی، حماد اسے ہی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا اس لیے اسے دیکھنے سے گریز کیا۔ اسی پل چوہدری بہزاد کو اندر آتا دیکھ کر حماد نے اپنا رخ بدل لیا اور ایک دیوار گیر پینٹنگز پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ ایسے رخ پر تھا کہ اندر آتے ہی اس پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

''آہا، پھول نے پھول پکڑے ہوئے ہیں۔'' آتے ہی وہ اپنے گھٹیا انداز میں بولا۔ ''سنا تھا تم کمرے کی سجاوٹ کر رہی ہو دیکھنے چلا آیا ہوں کہ تمہارے نازک ہاتھ کیا کیا کر سکتے ہیں۔'' اس کے بولنے پر حماد نے آگے بڑھ کر اسے گھورا۔

''اوہو، تو پڑھے لکھے لوگ بھی موجود ہیں۔'' وہ قدرے طنز سے حماد کو دیکھ کر بولا۔ اس سے پہلے کہ حماد کچھ کہتا، بہزاد کی بیوی زرتاج اندر آگئی۔ جب سے صاحبہ حویلی میں آئی تھی وہ اپنے شوہر کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔

''چلیں۔'' وہ دونوں شہر شاپنگ کے لیے جا رہے تھے اس لیے اس وقت زرتاج بھی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ بہزاد خاموشی سے اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''ویسے آپ کی فطرت اپنے دوسرے بھائیوں سے مختلف ہے۔'' وہ بہزاد کے جاتے ہی بولی تو وہ اس کی بات کو نظرانداز کر گیا۔

''تمہارا کتنا کام رہتا ہے؟'' وہ صاحبہ کو زیادہ دیر فواد کے کمرے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے فکرمندی سے پوچھا۔ کمرا کافی کشادہ تھا۔ کمرے کا... تہائی حصہ وہ تیار کر چکی تھی...... باقی کو اگلے دن پر چھوڑ دیا۔

''تھوڑا کام رہتا ہے...... لیکن اب میں تھک گئی ہوں صبح آ کر کر لوں گی۔''

''صبح بھی آنے کی ضرورت نہیں ہے، جتنا کر چکی ہو کافی ہے، یہاں کوئی ایوارڈ نہیں دے گا تمہیں۔''

''ویری سیڈ، میں یہ سب کسی انعام کے لیے تو نہیں کر رہی۔'' وہ بولی لیکن وہ اس کی بات سنے بغیر باہر نکل چکا تھا۔

''اِسے کیا ہوا؟'' وہ آہستگی سے خود سے بولی اور پھر گلدان سینٹرل ٹیبل پر رکھ کے خود بھی باہر نکل آئی۔ چھوٹی چوہدرائن کے برآمدے میں بڑا مزے کا تماشا اس کا منتظر تھا۔ شادو دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی جبکہ حماد لکڑی کے موٹے پائیوں والے بڑے سے تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا اپنے موبائل سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ شادو کے ہاتھ میں موجود دودھ کے گلاس پر نظر پڑی تو اس کا منہ بن گیا۔

''تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے میرے قریب مت کھڑی ہوا کرو، گلاس ٹیبل پر رکھو اور جاؤ۔''

''کیوں جی میں کوئی کرنٹ مارتی ہوں؟'' شادو بڑے ناز و ادا سے بولی۔

pklibrary.com

"مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں جو کہا ہے کرو اور جاؤ۔" وہ سخت لہجے میں بولا تو شادو کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔ آہستگی سے گلاس تخت کے ساتھ رکھی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

"اسے ابالا ہے یا کچا ہی اٹھا لائی ہو؟" وہ پلٹنے لگی تو حماد ایک دم سے یاد آنے پر بولا۔

"مجھے یاد ہے کہ آپ کچا نہیں پیتے اپنے ہاتھوں سے ابال کر لائی ہوں۔"

"ایک گلاس میرے لیے بھی لے آؤ شادو، قسم سے بہت بھوک لگی ہے۔" صاحبہ پاس آکر بولی تو شادو کو غصہ آگیا۔

"نوکر نہیں ہوں تمہاری، جاؤ اور جا کر پی لو۔" حویلی میں چونکہ ملازموں کو کھانے پینے کی روک ٹوک نہیں تھی اس لیے جس کا جب جو دل کرتا، کھا پی سکتا تھا۔

"رہنے دو میں یہی پی لیتی ہوں، میرے لیے ہی لائی ہو نا؟" وہ ٹیبل پر رکھا گلاس پکڑ کر بولی تو شادو چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور گلاس اس سے چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ متوقع حملے کے لیے تیار تھی اس لیے تیزی سے پیچھے ہٹی۔ دودھ چھلک گیا اور حماد کے لباس پر گر گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ شادو نے گرایا ہے۔" صاحبہ معصوم شکل بنا کر جلدی سے بولی۔

"ہائے ربا کتنی چالاک شودھی (لڑکی) ہے۔" شادو کو اب بھی دودھ اس سے واپس لینے کی فکر تھی۔ "چوہدری صاحب اس نے آپ کا دودھ لے لیا ہے۔" وہ ہاتھ نہ آئی تو غصے سے دیکھتے حماد سے بولی۔

"تو اس میں اتنا لڑنے کی کیا ضرورت ہے پینے دو اسے، میرے لیے اور لے آؤ۔"

"ج...... جی۔" شادو کو یقین نہ آیا کہ چوہدری حماد صاحبہ کو ڈانٹے بغیر اس سے دودھ دوبارہ لانے کو کہہ رہا ہے۔ "جی، میں ابھی لائی۔" وہ کہتے ہی غصے سے پاؤں مارتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"تم بیٹھ کر پی لو۔" وہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی صاحبہ سے بولا اور خود وہاں سے اٹھ کر کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صاحبہ آرام سے تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ کون سی کمین تو تھی نہیں جو اسے چوہدریوں سے کسی قسم کا کوئی ڈر ہوتا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شادو ٹھمکے لگاتی پھر سے وارد ہوگئی۔

"ایں...... تجھے شرم نہیں آتی صاحبہ چوہدریوں کے تخت پر بیٹھی ہے۔ میں ابھی وڈی چوہدرائن سے تیری شکایت کرتی ہوں۔" اسے پتا تھا چھوٹی چوہدرائن کی وہ لاڈلی تھی اس لیے بڑی چوہدرائن کی دھمکی دی۔

"تجھے چوہدری حماد اپنے کمرے میں آنے کو کہہ رہے تھے، جاؤ دودھ لے جاؤ اندر... وہیں دے آؤ۔" صاحبہ چویشن کو مزید انجوائے کرنے کے خیال سے بڑے میٹھے لہجے میں بولی۔

"جھوٹ تو نہیں کہہ رہی تو؟" شادو کا چہرہ ایک دم ہی کھل اٹھا۔

"تیری قسم شادو جھوٹ کیوں بولوں گی میں۔" وہ دوبارہ معصومیت سے بولی تو شادو اٹھلاتے ہوئے دودھ کا گلاس لیے حماد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صاحبہ بھی جلدی سے جائے وقوعہ سے فرار ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں اسے حماد کی غصے سے بھری آواز اپنے کمرے تک سنائی دی۔ وہ شادو کے بنا اجازت کمرے میں آنے پر غصے سے باہر ہو رہا تھا۔ چھوٹی چوہدرائن بھی کمرے سے نکل کر باہر آگئی۔ ناچار صاحبہ کو بھی باہر ان کے پاس جانا پڑا۔

"ماں جی اس لڑکی کو سمجھا دیں آئندہ میرے کمرے میں بنا اجازت قدم نہ رکھے۔" وہ ماں کو دیکھ کر بولا۔ اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو چکا تھا۔ شادو کی نظریں زمین پر گڑ چکی تھیں صاحبہ پر نظر پڑی تو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ بڑے غلط وقت پر حماد کے کمرے میں دروازہ کھٹکھٹائے بغیر گھس گئی تھی۔ اندر وہ کپڑے چینج کر رہا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو جلدی سے شرٹ پہن کر غصے سے بولتا باہر آگیا۔ اس لیے اب شادو نے خاموشی میں ہی بہتری جانی۔ وہ کتنی بھی صفائی دیتی غلطی اس سے سرزد ہو گئی تھی۔ وہ دروازے پر پوچھے بغیر اندر جانے کے جرم کی مجرم تو بہرحال تھی۔ صاحبہ اپنی مسکراہٹ دبائے سر جھکائے کھڑی تھی۔

"تو آئندہ میرے پتر کو دودھ دینے نہیں آیا کرے گی، بلکہ ہماری طرف تجھے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" چھوٹی چوہدرائن بیٹے کو غصے میں دیکھ کر جو سمجھ آیا اس کے مطابق بولی۔ شادو کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"غلطی ہوگئی جی معاف کر دیں۔"

"شٹ اپ یو نان سینس، تمہیں کسی نے ابھی تک کمرے میں آنے کی تمیز نہیں سکھائی؟" وہ ابھی تک غصے میں تھا۔

"وہ جی میں سمجھی آپ نے مجھے کمرے میں بلایا

ہے۔"

"کیوں میں نے تمہیں کمرے میں کیوں بلوانا تھا؟" وہ پھر سے تپ کر بولا۔

"مم..... میرا مطلب ہے میں سمجھی دودھ آپ کمرے میں ہی پئیں گے۔"

"کیا ہو گیا ہے اِدھر، کس بات پر اتنا جھگڑا ہو رہا ہے؟" چوہدری فواد اور چوہدری علمدار ابھی ابھی گیٹ سے حویلی میں داخل ہوئے تو آواز سن کر ادھر ہی آ گئے۔

"کچھ نہیں ہوا چوہدری جی، بس گھر کی بات ہے، چل یہاں سے دفع ہو جا۔" چوہدرائن شادو سے بولی تو وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ چوہدرائن نے چوہدری فواد اور اپنے شوہر کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جاؤ صاحبہ، مہرو کو کہو چائے بنا کر لائے۔" چوہدرائن پاس کھڑی صاحبہ سے بولی تو وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

"یہ وہی لڑکی ہے نا جو نہر سے بے ہوش پڑی ملی تھی۔" چوہدری علمدار اس کے جاتے ہی بولا۔

"ہاں، وہی بدنصیب ہے، ابھی تک بے چاری کا کچھ پتا نہیں چلا، حماد پتر نے اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا۔"

"حماد، خبر اخبار میں ہی لگوائی تھی نا کہیں صرف دوستوں کو واٹس ایپ تو نہیں کر دی؟" فواد ہنستے ہوئے معنی خیز نظروں سے پاس بیٹھے حماد سے بولا۔

"چھڈو پتر کیا باتیں لے بیٹھے ہو تم دونوں بھی، پرائی امانت ہے سکینہ اس کا دھیان رکھنا کہیں کوئی اور اونچ نیچ نہ ہو جائے۔" علمدار کہہ تو بیگم کو رہا تھا مگر سنایا بیٹوں کو تھا۔

"نہ جی میں نے تو اسے چھوٹی بہن بنایا ہوا ہے اور بیٹیوں کی طرح خیال رکھتی ہوں، آج تو بڑی چاہت سے فواد پتر کا کمرا سجا کر آئی ہے۔ میں نے دیکھا نہیں ہے پر یقین ہے بڑا اچھا ہی سجایا ہو گا، پڑھی لکھی لڑکی ہے اور کسی اچھے خاندان کی بھی لگتی ہے مجال ہے میں نے اسے اتنے دنوں میں کسی سے بدتمیزی کرتے ہوئے دیکھا ہو۔" چوہدرائن اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی جبکہ حماد اس کی تھوڑی دیر پہلے ہی دودھ پینے والی شرارت یاد کر کے مسکرانے لگا۔

"خیریت تو ہے حمی کس کی یاد آ رہی ہے؟" فواد اس کو اس کے نک نیم سے مخاطب کر کے ہنستے ہوئے بولا۔ تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"آپ بہت چالاک ہیں بھائی۔" دونوں بھائی اٹھ کر باہر آ گئے۔

"لگتا ہے کسی کو دل دے بیٹھے ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بھیا۔"

"کیا پلان ہے فیوچر کا؟"

"آپ کی طرح شہر میں ہی کوئی بزنس کروں گا۔"

"میرے ساتھ ہی کیوں نہیں؟"

"نو تھینکس بھائی، مجھے شوبز سے ایک فیصد بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟"

"لاہور میں دوست ہے میرا اس کے ساتھ بزنس کروں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے شوق پورا کر لو، جب دل بھر جائے تو میرے ساتھ آ جانا۔"

"میں نے کہا نا شوبز سے دلچسپی نہیں ہے مجھے۔"

"شوبز کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے کرنے کو میرے پاس۔"

"اوا چھا کوئی اور بزنس بھی کر رہے ہیں آپ؟" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ابا جی، میں اور بہزاد تینوں مل کر ہی کر رہے ہیں ایک سائڈ بزنس، تمہارا جی جب دوست والے بزنس سے اٹھ جائے یا پھر کچھ اور کرنے کا موڈ ہو تو بتا دینا تو..... تمہیں بھی ساتھ ملا لیں گے۔"

"حیرت ہے مجھے کسی ایسے بزنس کے بارے میں بتایا ہی نہیں کسی نے۔"

"کچھ عرصہ پہلے ہی شروع کیا ہے جب چل گیا تو تمہیں بھی بتا دیں گے۔" فواد جان بوجھ کے اسے بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ جانتا تھا نیا نیا پڑھ کے آیا ہے کسی ایسے ویسے کام میں جلدی انوالو نہیں ہو گا اس لیے آہستہ آہستہ اسے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ حماد مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا جب سامنے سے مہرو اور صاحبہ چائے لیے آتی نظر آئیں۔

"لو آ گئی تمہاری مسکراہٹ چرانے والی۔" فواد بہت کائیاں تھا صاحبہ پر نظر پڑی تو بولنے سے خود کو نہ روک پایا۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے وہ اس طرح کی نہیں ہے۔"

"تو تم اس سے دستبردار ہو رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟" وہ نا سمجھی سے بولا۔

"مطلب اگر تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے اتنی خوب صورت لڑکی میں تو کوئی اور انٹرسٹ لے سکتا ہے۔"

''اب ایسا بھی نہیں کہا میں نے۔'' وہ برجستگی سے بولا تو چوہدری فواد کا زوردار قہقہہ سن کر مہرو اور صاحبہ نے بھی انہیں دیکھا اور چائے لے کر اُدھر ہی آ گئیں۔ جب سے صاحبہ کچن میں گھسی تھی سب کو چائے شہری طریقے سے ملنے لگی تھی۔ وہ چینی دان الگ سے رکھتی تھی تاکہ سب اپنی اپنی مرضی سے چائے میں ملالیں۔

''صاحبہ! اگر تم تھوڑے دن مزید ادھر رہیں تو یہ حویلی ماڈرن ہو جائے گی۔'' فواد بغیر شوگر کے اپنا کپ ٹرے سے اٹھا کر ہنستے ہوئے بولا۔

''کچھ چیزیں ویسے کی ویسے ہی رہتی ہیں چوہدری صاحب، چاہے شہر میں ہوں چاہے گاؤں میں اپنی فطرت وہی رکھتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''ارے واہ تم تو فلاسفر بھی لگتی ہو۔''

''میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں آپ بس دیکھتے جائیں۔'' حماد کے کپ اٹھاتے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ چوہدری فواد کی نظروں نے اس کا دور تک تعاقب کیا۔

''لڑکی گہری ہے حماد۔''

''آپ پھر اسے ڈسکس کرنے لگے، میں نے کہا نا فی الوقت ایسا کچھ نہیں ہے، چلیں آپ کا کمرا دیکھتے ہیں۔'' وہ اسے ساتھ لیے کمرا دکھانے چلا گیا جبکہ صاحبہ چائے چوہدری اور چوہدرائن کو دے کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کی خفیہ جیب میں رکھا موبائل کافی دیر سے وائبریٹ ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی موبائل نکال کر کان سے لگا لیا۔

''آج سارا دن چوہدری فواد کے کمرے کی تلاشی لیتی رہی ہوں کہیں سے کچھ نہیں ملا، بس ایک دراز لاکڈ تھی کل دوبارہ جاؤں گی اور کسی طریقے سے اسے کھول کر چیک کروں گی۔''

''بس جو بھی کرو خود کو خطرے میں نہ ڈالنا، یہ چوہدری ٹائپ لوگ کسی کو غائب کرنے یا مارنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتے۔'' دوسری طرف سے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

''مجھے پتا ہے یہاں کیسے رہنا ہے، ویسے ہی رہ رہی ہوں بلکہ مجھے آج کل بڑا مزہ آ رہا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی اور ساتھ ہی اسے شادو اور چوہدری حماد والا واقعہ سنانے لگی۔

''میڈم صاحبہ اگر آپ اپنے دشمن کم بنائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔''

بولتی آنکھیں

حرص و ہوس کے ہاتھوں ایک معصوم دوشیزہ کی بکھرتی زندگی کے شب و روز کا احوال، آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا کمال

محبت گزیدہ

ماضی کے اوراق پر ایک دلگداز محبت کے غمگین و سنگین واقعات کا احاطہ..... ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کی سحر انگیزی.....

شہ زوز

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، مظہر سلیم ہاشمی، آصفہ ضیا احمد، بابر نعیم، غلام قادر، منظر امام، شبینہ گل، اور شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

''اب پھر سے نصیحت پروگرام نہ کھول لینا مجھے سونا بھی ہے۔ کل سے حویلی میں شادی شروع ہے بہت سے کام کرنا ہیں۔''

''چلو اسی بہانے تم تھوڑی گھر گرہستی ہی سیکھ لوگی۔'' دوسری طرف سے وہ چوٹ کرنا نہ بھولا۔

''تم سے زیادہ ہی آتا ہے سب کچھ۔'' وہ جواباً بولی اور پھر محتاط رہنے کی غرض سے فون آف کر کے دوبارہ اپنے لباس میں چھپا لیا۔

☆☆☆

صاحبہ کے نہ نہ کرنے کے باوجود سکینہ باجی نے اسے شہزاد کے لائے گئے جوڑوں میں سے ایک مہنگا جوڑا پہننے کو دیا۔ وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے آئی تو اپنا آپ بہت مختلف مگر اچھا لگا، چوہدرائن نے اسے اپنے بڑے بڑے جھمکے بھی پہنا دیے۔

''اب یہ بہت زیادہ ہو گیا سکینہ باجی، شادی آپ لوگوں کی ہے اور اتنے مہنگے کپڑے اور زیور میں نے پہن لیا ہے۔''

''ان جھمکوں کو زیور کہہ رہی ہو، باہر نکل کر دیکھنا سب نے کتنا کتنا زیور پہنا ہوگا۔'' وہ خود بھی بھاری سونے کا سیٹ پہنتے ہوئے بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، باقی ملازم کیا سوچیں گے؟''

''انہیں سوچنے دو جو سوچتے ہیں، تم بھلا یہاں ملازم تھوڑی ہو۔'' وہ آرام سے بولی اور پھر اسے لیے وڈی چوہدرائن کے حصے کی طرف آ گئی۔ شہر سے کتنے ہی مہمان چوہدری فواد کی مہندی میں آئے تھے۔ خواتین اور لڑکیوں کے لباس کافی ماڈرن اور مہنگے تھے۔ اسے ذرا حوصلہ ہوا اور وہ سکینہ باجی کے کہنے پر ڈھولکی بجانے والی لڑکیوں میں آ کر بیٹھ گئی۔ چوہدری فواد کو لا کر حویلی کے بڑے سے صحن میں بٹھا دیا گیا تھا اور اب خواتین اس کی مہندی کی رسم کر رہی تھیں۔ شادو اور مہرو وغیرہ سب کو مٹھائی کے ساتھ چائے دے رہی تھیں۔ اسے سجا سنورا دیکھ کر منہ کے بڑے بڑے زاویے بنا رہی تھیں۔ صاحبہ کو بھی ان کی حالت دیکھ کر مزہ آنے لگا اس لیے لڑکیوں کے ساتھ لہک لہک کر گانے لگی۔ آہستہ آہستہ سب عورتیں رسمیں کرنے لگیں۔

☆☆☆

''عامر، پنکی چوہدری فواد میں بہت دلچسپی لے رہی ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہا اسے کیسے اس شخص سے دور رکھوں۔'' دونوں اپنے اپنے حصے کا کام نمٹا کر آئس کیفے ٹیریا میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''وہ اسے کہاں نظر آ گئی؟'' عامر قدرے پریشانی سے بولا تو جواباً وہ اسے ساری بات بتانے لگی۔

''ہم..... اب اس سچویشن کو کیسے ہم اپنے حق میں کر سکتے ہیں۔''

''یہی تو میں سوچ رہی ہوں کہ پنکی کو پتا بھی نہ چلے اور اس ذلیل شخص سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے۔''

''تم پنکی کو ایک گمنام لڑکی کی حیثیت سے فون کرو اور اسے فواد کی چیٹنگ کے بارے میں بتا دو۔'' عامر کچھ دیر بعد اسے مسئلے کا حل بتانے لگا۔

''بات تمہاری دل کو لگ رہی ہے۔ میں بھی چاہ رہی تھی، اسے کسی طرح بتا دوں مگر اس طرح میں فواد کی نظروں میں آ جاتی، پنکی بہت بھولی ہے کچھ بھی اگل سکتی ہے۔''

''ہاں اب جبکہ ہم بہت ہی نازک موڑ پر ہیں۔ ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہیے۔'' عامر بولا اسی وقت شانزہ کا فون بجنے لگا۔

''کس کا فون ہے؟''

''شمروز کی کال آ رہی ہے۔'' وہ لائن بزی کرتے ہوئے بولی۔

''تو اٹینڈ کر لو۔''

''ابھی موڈ نہیں ہو رہا گھر جا کر بات کر لوں گی، فی الوقت سب سے اہم یہ چیز ہے کہ کسی طریقے سے پتا چل جائے کہ کوکین کے دھندے میں فواد کے ساتھ کون کون ملوث ہے اور یہ زہر آ کہاں سے رہا ہے، صحیح پوچھو تو میری تو نیند اڑ گئی ہے جب سے یہ پتا چلا ہے۔''

''میں اسی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں جیسے ہی پتا چلا اس کمینے کی گردن دبوچنے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کریں گے۔''

''میں علینا کی موت بھول نہیں پا رہی ہوں، دل چاہتا ہے اسی زور سے اس چوہدری کے بچے کو بھی دھکا دوں کہ اگلی سانس نہ لے سکے۔'' وہ دل گرفتگی سے بولی۔ عامر اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا۔

''صبح تم کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔''

''چھوڑو پھر بات ہوگی۔''

''نہیں ابھی بتاؤ نا۔'' اس کی طبیعت کی جلد بازی سے وہ آگاہ تھا، جانتا تھا نہ بتایا تو جان نہیں چھوڑے گی۔

''ممی میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''اچھا، یہ تو گڈ نیوز ہوئی۔'' وہ خوشی کا اظہار کرتے

لگی۔ عامر ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ ''کہاں ہو رہی ہے؟''

''دو کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکیوں کے رشتے آئے ہیں۔'' وہ بولا تو وہ ہنسنے لگی۔ اس کے یوں ہنسنے پر وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''یار لڑکوں کے رشتے لڑکیوں کے گھر جاتے ہیں' تمہارے گھر لڑکیوں کے رشتے آئے ہیں۔'' وہ اب بھی ہنسی کو بمشکل روک رہی تھی۔

''تم ہنس رہی ہو۔ میں نے سوچا تھا تمہیں پتا چلے گا تو کہو گی نہیں عامر یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بھی جواباً ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''دیکھو عامر تم اپنے ماں باپ کے اکلوتے ہو، تمہیں اُن کی بات مان لینی چاہیے، شادی تو کرنی ہے، آج نہیں تو کل کرو گے، اچھا ہے ابھی کر لو، وہ دونوں بھی خوشی محسوس کریں گے۔''

''ممی کو تمہارے خیالات کا پتا چلے تو وہ شاید کچھ بہتر سوچنا شروع کر دیں گی۔''

''تمہاری ممی کو میرے جیسی بہو بالکل نہیں چاہیے، جس کا کوئی گھر نہیں، فیملی نہیں اور جو لڑکوں کے حلیے میں رہتی ہو۔''

''تم اپنے خیالات میں تھوڑی لچک پیدا کرو تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔'' عامر کے انداز میں ایک خاموش التجا چھپی تھی جسے وہ ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر گئی۔

''تمہارے والد ٹھیک نہیں رہتے عامر تم اپنے والدین کا واحد سہارا ہو تمہیں شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے، میرے انتظار میں نہ رہنا میرا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی اور اپنا بیگ سمیٹنے لگی۔

''میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی تاکہ تمہاری ممی کو پتا چلے کہ جو وہ سوچتی تھیں ایسا کچھ نہیں تھا۔'' وہ اٹھنے سے پہلے دھیرے سے بولی اور گڈ بائے کہہ کے چلی گئی۔

دو دن بعد وہ اپنا لیپ ٹاپ لیے ٹیرس پر بیٹھی ایک رپورٹ تیار کر رہی تھی جب عامر کی ممی کا فون آیا۔ ان سے پتا چلا عامر پچھلی رات سے گھر نہیں آیا تھا اور وہ بنا کچھ بتائے غائب تھا۔ پریشانی کی وجہ سے وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔ شانزہ نے انہیں تسلی دی کہ جلد ہی وہ اس کے بارے میں پتا لگا کر انہیں بتاتی ہے لیکن اندر سے وہ خود بھی پریشان ہو چکی تھی۔ عامر کے اچانک غیاب سے اس کا دھیان سیدھا چوہدری فواد کی جانب گیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے آفس کولیگز اور جاننے والوں سے عامر کے بارے میں پوچھنے لگی۔ لیکن کسی طرف سے بھی مثبت رسپانس نہ ملا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ فقط عامر غائب تھا۔ اسے بے چینی اور پریشانی نے گھیر لیا۔

''خدانخواستہ وہ کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو، یا اللہ اس کی حفاظت کرنا۔'' وہ دل ہی دل میں بولی اور پھر اسے یاد آیا، دو تین دن پہلے ہی عامر نے اسے اپنے ایک دوست کا نمبر دیا تھا جو اس معاملے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے کال کی لیکن نمبر بند ملا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ وہ اٹھ کر ٹیرس پر ٹہلنے لگی۔ پانچ منٹ بعد ہی عامر کی ممی کی کال پھر سے آنے لگی۔ اس نے فون ریسیو کر کے انہیں پھر سے تسلی دی۔

''آنٹی میں آپ کو فوراً اطلاع کروں گی جیسے ہی مجھے اس کے بارے میں علم ہوا۔'' موبائل میز پر رکھ کے وہ پھر سے ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ..... عامر کے دوست کے نمبر پر دوبارہ کال کی لیکن فون مسلسل آف مل رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے پریشان لگ رہی ہو؟'' شمروز اُسے ٹیرس پر دیکھ کر خود بھی وہیں آ گیا۔

''شمروز، عامر کل سے غائب ہے۔'' شمروز، عامر سے ملا ہوا تھا اس لیے یہ خبر سن کر حیران ہوا۔

''وہ کہاں غائب ہو سکتا ہے؟'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں، بس دعا کرو۔ وہ کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو۔''

''کیسی مشکل؟''

''کرائم رپورٹنگ بڑی ڈینجرس فیلڈ ہے، پچھلے سال ہمارے ایک صحافی کی ڈیڈ باڈی ملی تھی۔ وہ ایک مشہور سیاست داں کی کرائم ہسٹری شیٹ تیار کر رہا تھا۔ بے چارے کی لاش بہت بُری حالت میں ملی تھی۔''

''کیا عامر بھی کسی خاص آدمی کے پیچھے لگا ہوا تھا؟''

''تھا کا صیغہ تو نہ استعمال کرو۔''

''میرا مطلب ہے کہ کیا وہ بھی کچھ اسی ٹائپ کا میٹریل اکٹھا کر رہا ہے؟''

''وہ یہ سب میرے لیے کر رہا ہے۔''

''تمہارے لیے؟'' وہ کرسی پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ جواباً وہ اسے ساری بات بتانے لگی سوائے علینا کی موت کے ورنہ شمروز اسے بھی چوہدری فواد سے دور

رہنے کو کہتا۔

''کوکین اور چوہدری فواد۔'' وہ ان دونوں ناموں پر زور ڈالتے ہوئے بولا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

''تم جانتے ہو چوہدری فواد کو؟'' وہ اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کتنا جانتے ہو تم اُسے؟''

''اس کا بھائی میرا دوست ہے۔''

''کیا یہ وہی دوست ہے جس کے ساتھ تم بزنس کرنے والے ہو؟'' وہ بولی تو اس نے ایک مرتبہ پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا لیکن وہ ساتھ ہی گہری سوچ میں بھی ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کوکین تو بہت مہنگا زہر ہے اگر چوہدری فواد واقعی اس میں ملوث ہے تو اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہوگی۔''

''ہاں، وہ پہلے ہی ایک بااثر شخصیت ہے، حیرت ہے تمہارے دوست نے تم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''ہوسکتا ہے وہ اس بات سے لاعلم ہو۔''

''ہاؤ اِز دس پاسیبل وہ اس کا بھائی ہے۔''

''سگا بھائی نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' وہ دوبارہ کرسی سے ٹیک سے لگا کر بیٹھ گئی۔ ''پلیز کچھ کرو عامر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے اور کچھ عرصے میں اس کی شادی بھی ہونے والی ہے اس کے والد دل کے مریض ... ہیں، یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پائیں گے۔'' وہ بولی تو شمروز اپنے ایک دو جاننے والوں کو فون کرنے لگا۔ اس کا ایک دوست پولیس میں تھا۔ دوسرا آرمی میں میجر تھا، انہی سے وہ مدد لے سکتا تھا۔

''پریشان مت ہو۔ پتا چل جائے گا جلد ہی اُس کا، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سب کو پتا ہے وہ ایک منجھا ہوا صحافی ہے، لوگ میڈیا سے بگاڑ پسند نہیں کرتے۔''

''مجھے بھی یہی امید ہے۔'' شمروز سے بات کر کے وہ قدرے سکون محسوس کر رہی تھی۔ ''شمروز میں چاہتی ہوں میں اپنے طور پر بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔''

''لگتا نہیں ہے، تم ایک کرائم رپورٹر ہو۔''

''کیوں اُن کے سر پر سینگ لگے ہوتے ہیں۔''

''جی نہیں، مگر انہیں اتنی عقل بہرحال ہوتی ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ پہلے ہی ایک صحافی غائب ہے، وہ بچتے ہیں باہر نکلنے سے۔''

''اس طرح ہی تو اس قسم کے لوگوں کو شہ ملتی ہے، گھر میں ہر کوئی چھپ کر بیٹھ گیا تو گمشدہ لوگوں کو تلاش کون کرے گا۔''

''پولیس۔''

''ہماری پولیس؟'' وہ الفاظ پر زور دے کر منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''معاف کرنا میں کوئی غلط بات نہ کہہ دوں، تم جانتے ہی ہو کتنی فارغ ہے۔''

''اچھے لوگ بھی ہیں۔''

''مجھے تو آج تک کوئی نظر نہیں آیا۔''

''تمہیں صحافت میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، تمہیں کیا پتا کتنے ہی اچھے لوگ ہیں جو کرپشن کی اس دلدل میں بھی اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں۔''

''تم یقیناً اپنے دوست کی تعریف کرنا چاہ رہے ہو اور مجھے آٹھ دن نہیں ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔''

''اسی لیے خود کو تیس مار خان سمجھنے لگی ہو، یہاں دس، دس، پندرہ، پندرہ سال کے تجربہ کار صحافی بھی ہیں جو ہر کام کرتے ہیں مشہور بھی ہیں لیکن ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ایسے لوگ بکے ہوئے ہوتے ہیں ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھا صحافی کسی تھریٹ کے بغیر زندگی گزار رہا ہو۔''

''تو تم خود کو اچھا صحافی سمجھتی ہو؟''

''سمجھتی نہیں ہوں، میں آل ریڈی ہوں۔''

''اوکے پھر اسی خوشی میں گرما گرم چائے پلواؤ۔''

''چائے کہاں سے آگئی یہاں۔'' اس کی چائے بنانے سے جان جاتی تھی۔

''تمہارے کام سے آیا ہوں چائے کا ایک کپ تو بنتا ہے۔'' وہ بازو سر کے پیچھے فولڈ کرتے ہوئے گہری سانس لیتے ہوئے اس کے صبیح چہرے کو دیکھ کر بولا۔

''چائے چاہیے..... کون سی جناب، لپٹن ہی تو ہے، لپٹن لیجیے ....'' اسی وقت چائے کی ٹرے تھامے پنکی اوپر آئی۔ اس کے پیچھے انکل آنٹی بھی تھے۔

''چائے حاضر ہے جناب۔'' وہ چائے میز پر رکھ کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر بولی۔

''کیسے ہو بچو، گڈ مارننگ۔'' انکل ان دونوں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔

''الحمدللہ انکل آپ کا کیا حال ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ گھر میں چونکہ وہی دونوں اپنی چابیز پر جاتے تھے اس لیے ویک اینڈ وغیرہ پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھاکشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

''ایک دم فٹ۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اپنی جاندار آواز میں بولے اور پھر اِدھر اُدھر کی گھریلو بات چیت شروع ہو گئی۔

☆☆☆

اسی شام کو عامر واپس اپنے گھر آ گیا تھا، شانزہ کو علم ہوا تو اس کے گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ شہروز نے اسے جانے سے منع کر دیا۔

''لیکن کیوں؟''

''ایک دو دن ٹھہر جاؤ پھر چلی جانا بلکہ تم اس کے گھر جاؤ ہی نہیں آفس آئے گا تو بات کر لینا، جن لوگوں نے اسے اغوا کیا ہوگا، وہ ہو سکتا ہے باقی لوگوں پر بھی چیک رکھے ہوئے ہوں۔'' بات شانزہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس لیے دوبارہ بحث نہیں کی اور پھر جب دو دن کے بعد عامر آفس آیا تو وہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اسے دیکھ کر عامر کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔

''تم کہاں غائب تھے اور یہ چوٹیں کیسے لگیں، میرا مطلب تمہارے چہرے پر اتنے زخم کہاں سے لگے؟''

''چوہدری فواد کے کتوں نے لگائے ہیں یہ زخم اور برائے مہربانی مجھ سے دور رہو ورنہ اس سے زیادہ زخم تمہیں لگیں گے۔''

''عامر تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے بی ہیو کر رہے ہو؟''

''تم جانتی ہو شانزہ میں اپنے ماں باپ کا واحد سہارا ہوں اس لیے مجھ سے آئندہ دور رہنا میں اب کے بعد تمہارے کسی معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے ماں باپ تو زندہ درگور ہو جائیں گے۔'' وہ کافی بدلا بدلا عامر لگ رہا تھا۔

''کیا چوہدری فواد نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے؟''

''میں پہلے ہی تمہیں بہت کچھ بتا چکا ہوں، مزید نہیں بتاؤں گا، شکر کرو میں نے انہیں تمہارے بارے میں نہیں بتایا ورنہ تم یہاں صحیح سلامت نہ بیٹھی ہوتیں اور ایک بات تم نے اچھا کیا دو دن ہمارے گھر نہیں آئیں ورنہ چوہدری فواد کے کتوں کے ہتھے چڑھ جاتیں۔ وہ لوگ سائے کی طرح میری نگرانی کر رہے ہیں اور مجھے آئندہ اس چکر سے دور رہنے کی دھمکی بھی دی ہے۔''

''لیکن تم ان کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟''

''تم اب میرے آفس سے نکل جاؤ، ان کا کوئی نہ کوئی بندہ یہاں بھی میری نگرانی کر رہا ہوگا۔'' عامر بے حد ڈرا ہوا تھا یقیناً چوہدری فواد کے آدمیوں نے کافی بے رحمی سے اسے مارا تھا۔ عامر جیسے بہادر صحافی کی یہ حالت دیکھ کر وہ الٹے قدموں لوٹ آئی اور اب شہروز کو سب کچھ بتا رہی تھی۔

''تم کچھ دن اس سارے معاملے سے دور رہو، میں اپنے ذرائع سے پتا لگاتا ہوں اور اس معاملے کی تہ تک پہنچتا ہوں۔''

''اُف مجھے تو ابھی تک عامر کے رویے پر حیرت ہو رہی ہے وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔'' وہ صدمے میں بیٹھی تھی۔

''اپنی جان سب کو عزیز ہوتی ہے اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید ایسے ہی ری ایکٹ کرتا۔''

''لیکن اس نے بتایا نہیں کہ کن حالات میں اسے اغوا کیا گیا تھا۔''

''میرا خیال ہے ابھی اِن باتوں کو چھوڑو۔ چیزوں کو نارمل ہونے دو سب پتا چل جائے گا۔''

''او کے۔'' وہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی لیکن اندرونی خلفشار نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

☆☆☆

''تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔'' شام کو شہروز اس کے کمرے میں آتے ہی بولا تو وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

''کوکین کے کاروبار کا تعلق چوہدری فواد کے گاؤں سے جڑا ہوا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں، کیا یہ لوگ وہاں اسے تیار کرتے ہیں؟''

''نہیں، وہاں بھی پیکنگ کی شکل میں ان تک پہنچتی ہے لیکن کہاں سے اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔''

''تو کیا اس کی فیملی بھی ملوث ہے اس دھندے میں۔''

''سب کا تو پتا نہیں لیکن بڑا بھائی اور باپ وہاں پر کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہاں سے وہ مال سپلائی کرتے ہیں اور شہر میں اس کا اپنا نیٹ ورک ہے۔''

''اس کا مطلب ہے گاؤں جانا چاہیے۔''

''بالکل وہاں جائے بغیر صورتِ حال واضح نہیں ہو سکتی۔''

''تو ٹھیک ہے، میں وہاں جاؤں گی۔'' وہ بے خوف لہجے میں بولی۔

''نہیں تمہارا وہاں جانا خطرناک ہے، میں کسی اور سے مدد لینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''اس طرح تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، میں تو صحافی ہوں پکڑی بھی گئی تو کوئی نہ کوئی بات بنالوں گی۔''

''ایک تو تم بات کو سمجھے بغیر ہر معاملے میں کودنے کی کوشش کرتی ہو، تم ایک لڑکی ہو..... وہاں جانا تمہیں خطرے میں ڈال دے گا۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور اگر تم اسی طرح ان معاملات میں انوالو ہوتے رہے تو عامر کی طرح تمہارا بھی وہی حال کریں گے ساتھ میں انکل، آنٹی اور پنکی بھی سفر (Suffer) کریں گے۔''

''حماد میرا دوست ہے۔ میں اس کے توسط سے وہاں جاؤں گا اور بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا، اس لیے میرا وہاں جانا مناسب ہے۔''

''بالکل نہیں، تم یہاں رہ کر مجھے سپورٹ کرنا، میں وہاں حویلی کی ملازمہ کی حیثیت سے گھس کر ان کی اصلیت کا پردہ چاک کروں گی، مجھ پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا جبکہ تمہارا وہاں زیادہ قیام انہیں چونکا دے گا۔''

''تم جاؤ گی تو میں مسلسل یہاں پریشان رہوں گا، یہ ممکن ہی نہیں کہ میں تمہیں یوں اکیلے وہاں جانے دوں۔''

''تم انکل کے اکلوتے بیٹے ہو، تمہیں کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی، میرا کیا ہے جس کی مجھے فکر ہو گی اس لیے میں وہاں جاؤں گی۔'' وہ دونوں بحث کرنے لگے اور بالآخر کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد یہ طے پایا کہ شانزہ وہاں جاسوسی کی غرض سے جائے گی جبکہ شہروز اسے باہر سے ہر طرح کی سپورٹ فراہم کرے گا۔ شہروز کو بھی اپنے دوست پر بھروسا تھا کہ عنقریب وہ بھی واپس آنے والا تھا۔ اس کے حویلی میں قیام تک شانزہ اپنا کام نمٹا لیتی۔ حماد کی موجودگی میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکتا تھا، یہ شہروز کو یقین تھا اس لیے انہوں نے وہاں جانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

☆☆☆

''خیر سے حماد پتر اپنی پڑھائی پوری کر آیا ہے اب اسے اپنے کاروبار کی طرف لاتے ہیں۔'' چوہدری علمدار حقے کے کش لیتے ہوئے پاس بیٹھے چوہدری فواد اور بہزاد سے بولا۔ وہ تینوں چوہدری کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فواد کی دلہن حویلی آ چکی تھی۔ شادی کا ہنگامہ سرد پڑا تو چوہدری کو اپنے نئے کاروبار کی فکر لگ گئی۔

''ابھی حماد کو اس سب سے دور ہی رہنے دیں۔ نیا نیا باہر سے پڑھ کر آیا ہے اگر اسے اس دھندے کا پتا چلا تو کہیں سب کچھ جوش میں آ کر تلپٹ ہی نہ کر دے، تھوڑا شہر میں سر کھپانے دیں جب ذرا سیانا ہو جائے گا تو اسے بھی اس کام میں لے آئیں گے۔'' فواد اپنی ذہانت کی وجہ سے چوہدری علمدار کا چہیتا تھا۔ اس لیے وہ اس کی بات کو توجہ سے سنتا تھا اور عمل بھی کرتا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' چوہدری خاموش بیٹھے بہزاد سے بولا جو پہلے ہی حماد سے چڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے صاحبہ ابھی تک اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کا کسی پر دل آ گیا ہو اور وہ اسے حاصل نہ کر پایا ہو۔

''صحیح تو کہہ رہا ہے فواد اُسے ابھی دور ہی رکھیں، سارا دھیان تو اس کا شہری چھوکری میں لگا رہتا ہے، بزنس کیا خاک سنبھالے گا۔''

''اور مجھے لگتا ہے تمہارا دھیان ان دونوں پر لگا ہوتا ہے۔'' فواد طنز سے باز نہ آیا۔ عمر میں وہ بہزاد سے ایک سال چھوٹا تھا مگر ذہنی اعتبار سے اس سے آگے تھا اس لیے اس کا احترام بھی نہیں کرتا تھا۔

''پنڈ کی کوئی کڑی نہیں ہے جسے تو نے بخشا ہو اب اس کڑی کے پیچھے نہ پڑ جانا اگر حماد کا اس پر دل آ گیا ہے تو کرنے دے اس کو بھی دل پشوری۔'' چوہدری علمدار دوبارہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے اسے نصیحت کرنے لگا تو بہزاد کا موڈ آف ہو گیا۔

''یہ دونوں ولایت سے پڑھ کر کیا آئے ہیں، آپ ان کے نیچے لگ گئے ہیں ابا، میری اوقات کیا ہے آپ کی نظر میں، جب دل چاہا بے عزت کر دیا۔'' بہزاد دل میں کوئی بات نہیں رکھتا تھا، ہر بات منہ پر کرنے کا عادی تھا۔

''نہ پُتر تو تو میرا شیر ہے، فواد کا کیا ہے کبھی کبھار پنڈ آ جاتا ہے میرا سارا کام تو تو سنبھالے ہوئے ہے، تیری کیا حیثیت ہے میری نظر میں، یہ سارا پنڈ جانتا ہے۔'' چوہدری علمدار فوراً پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ چار جوان..... بیٹوں کا باپ تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ جانتا تھا کہاں کس سے کیا بات کرنی ہے اور کہاں بات کو چھپانا ہے۔ چاروں بیٹوں کو ہاتھ میں رکھنے کے گر سے وہ واقف تھا۔

''کیا بنا اُس شہری صحافی کا جو تیری ٹوہ میں لگ گیا تھا؟'' چوہدری علمدار بات کا رخ بدلتے ہوئے فواد سے بولا۔

''اس کی تو ایسی حجامت بنائی تھی میرے گارڈز نے کہ کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر توبہ کر رہا تھا کہ آئندہ اس بارے

میں سوچے گا بھی نہیں۔"

"کسی ہور کو تو نہیں بتایا اُس نے؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، یہ صحافی لوگ بڑے کیڑے ہوتے ہیں جہاں کوئی خبر ملے اسے مرچ مسالا لگا کر اپنے نمبر بڑھانے اور نوکری مضبوط کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اس کے ساتھ کوئی اور نہیں ہوگا ویسے میں نے اس کی نگرانی بھی کروائی تھی ہفتہ دس دن، مجال ہے جو نوکری کے علاوہ کہیں نکلا ہو یا اس سے کوئی ملنے آیا ہو۔"

"پھر بھی اس کو بھولنا مت، کسی بھی وقت چار پیسوں کے لیے بک جائے گا۔"

"اس کے پاس اتنے ثبوت نہیں ہیں کہ مجھے پھنسا سکے لیکن پھر بھی میں اسے اپنی نظروں میں رکھوں گا، ابھی بھی صرف اس لیے چھوڑا تھا کہ صحافی بندہ ہے، ایک کو مار دیا دس پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے اب تم گھر جاؤ تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی، میں تھوڑی دیر اور بیٹھوں گا، منشی سے شادی پر ہوئے خرچوں کا حساب کتاب لینا ہے۔" چوہدری علمدار دوبارہ حقے کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ دونوں اٹھ کر اپنی جیپ میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کیا تجھے واقعی وہ بلبل پسند آ گئی ہے؟" راستے میں فواد بھائی کے بگڑے تاثرات کو دیکھ کر بولا۔

"وہ پسند کیے جانے کے قابل ہے، ماں کو پتا نہیں اپنی بھانجی میں کیا نظر آیا جو میرے سر پر تلوار کی طرح لٹکا دی ہے نہ شکل، نہ زیادہ جائداد، تیری تو فیر موجیں ہیں۔ ماموں کے سارے کاروبار کا وارث بن گیا ہے۔"

"میں بھی اسی لیے مانا ہوں ورنہ اس بلبل کے سامنے تو اماں کی بھانجی بھتیجی دونوں پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔"

"تو کیا تیرا ابھی اس پر دل آ گیا ہے؟"

"اس کی خوب صورتی اور ادائیں قیامت خیز ہیں مگر میں حماد کی وجہ سے اس سے دستبردار ہو چکا ہوں۔" فواد صاف گوئی سے بولا۔

"تو کیا حماد اُس سے شادی کرے گا؟"

"لگتا تو ایسے ہی ہے کیونکہ بڑا پاکباز عاشق دکھائی دے رہا ہے، شادی کے بغیر مولانا ہاتھ نہیں لگائے گا۔" فواد قہقہہ لگاتے ہوئے حماد کی شرافت کو نشانہ بنا کر بولا۔

"مولانا وہ ہے میں نہیں ہوں، اسے ہاتھ لگائے بغیر حماد کے کمرے کی زینت نہیں بننے دوں گا۔" بہزاد خباثت سے بولا۔

"حماد کو شہر جانے دے تب تک انتظار کر، بڑا اوکھا لڑکا ہے کہیں ہاتھ نہ اٹھا لے۔"

"اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا ایسی جرأت نہیں اس کی کہ مجھ سے بات بھی اونچے لہجے میں کرے۔" بہزاد کے غصے کو دیکھ کر فواد نے مزید بولنے سے گریز ہی کیا ورنہ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ کس میں کتنا دم خم تھا۔

☆☆☆

حویلی کے سارے افراد اور ملازم چوہدری کے ڈیرے پر آئے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے لیا گیا تھا۔ فواد اپنی دلہن کے ساتھ ہنی مون پر جانے والا تھا اس لیے ان کے جانے سے پہلے سب نے یہاں آؤٹنگ کا پروگرام رکھا تھا۔ ملازم آتے ہی کھانے پکانے میں لگ گئے۔ خواتین ملازماؤں نے مالکوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام کر دیا اور اب سب کو درختوں سے اتارا ہوا تازہ موسمی پھل پیش کیا جانے لگا۔ فواد کی بیوی ثنا کا رنگ گورا تھا۔ نیا نیا شادی کا روپ بھی تھا اوپر سے کام سے بھرے ہوئے کپڑے پہنے وہ مغرور سی اپنی ساس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ چھوٹی چوہدرائن بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ ایسے باتیں کرنے کا نادر موقع وہ ضائع کیسے کر سکتی تھیں۔

"ہائے تھوڑا قد اونچا ہوتا تو قسم سے جچتی لگتی۔" وہ ثنا کے زیورات اور کپڑوں کی تعریف کے بعد افسوس سے بولی۔ ثنا نے قدرے نخوت سے اسے دیکھا۔

"آنٹی لمبا قد تو آپ کا بھی ہے اب جسم موٹاپے کا شکار ہو کر کتنا بے ڈھنگا لگ رہا ہے۔ مجھے تو اپنا یہی قد پسند ہے شہر میں تو اتنے ہی قد کا فیشن ہے۔"

"ہاں تمہارے خاندان میں واقعی ہی فیشن ہوگا باجی زرینہ کا قد بھی تو چھوٹا ہی ہے۔" وہ وڈی چوہدرائن کا نام لے کر بولی تو وڈی چوہدرائن کسمسا کر بیٹھ گئی۔ دل تو اس کا چاہ رہا تھا دل بھر کر اس کی بے عزتی کرے مگر موقع محل دیکھ کر خاموش ہی رہی۔

مرد حضرات نزدیک ہی شکار پر نکل گئے جبکہ صاحبہ حویلی کی ایک اور ملازمہ رانو کے ساتھ ڈیرے سے متصل سیبوں کے باغ میں کسی تازہ سیب اتار رہی تھی۔ بظاہر وہ درخت پر چڑھی ہوئی تھی لیکن اس کی نظریں باریک بینی سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے خیال میں ڈیرے سے یا اس کے اطراف سے اسے اپنی مطلوبہ چیز کا پتا لگ سکتا تھا۔ چوہدری لوگ اپنے زیادہ تر خفیہ کام

ڈیرے وغیرہ پر ہی کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بھی قدرے پُرجوش تھی کہ کوئی نہ کوئی سراغ تو اسے مل ہی جائے گا۔

''صاحبہ باجی کب سے ٹوکری پکڑے تھک گئی ہوں اور سیب اتارو نا۔'' کافی دیر کے انتظار کے بعد رانو بیزاری سے بولی تو وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور جلدی سے دو چار سیب مزید اتار کر اس کی ٹوکری میں پھینک دیے۔

''تم ٹوکری اندر لے جاؤ میں مزید چیک کرتی ہوں کسی درخت پر پکے ہوئے سیب ہیں تو اتار لیں گے۔'' وہ اسے یہاں سے بھیجنا چاہ رہی تھی۔ کب سے بور ہوتی رانو فٹافٹ ٹوکری اٹھا کر ڈیرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے جاتے ہی وہ جلدی سے درخت سے اتری اور باغ کے اندر سے ہی ڈیرے کے پچھلے حصے میں آ گئی۔ ڈیرا بڑی خوب صورت جگہ کو دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف نہر بہتی تھی اور اس کے اطراف میں پھلوں کے باغات تھے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، مرغیوں کی آوازیں اور جنگلی کبوتروں کی غٹرغوں وہ کچھ دیر کے لیے تو اپنے اردگرد پھیلی قدرتی خوب صورتی کو دیکھ کر جیسے کھو سی گئی۔ جہاں تک نظر جا رہی تھی۔ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ گاؤں کا مخصوص ماحول تھا لیکن اس سے پہلے چونکہ اس نے کوئی گاؤں دیکھا نہیں تھا اس لیے اس کے لیے ہر چیز ہی سحر انگیز تھی۔ وہ تھوڑا اور آگے بڑھی تو سبزے میں زمین پر پڑی سفید چیز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے جلدی سے گھاس پیچھے کی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ ایک چھوٹی سی سفید پاؤڈر سے بھری تھیلی تھی۔ اس نے جلدی سے کھول کر تھوڑا سا پاؤڈر چکھا اور ساتھ ہی تھیلی کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ کوکین تھی مگر یہاں پڑی کیا کر رہی تھی۔ اچانک ہی اس کا دل جوش سے بھر گیا۔ وہ تھیلی لازماً کسی سے لے جاتے ہوئے گری ہوگی۔ اس کا مطلب تھا قریب ہی اور تھیلیاں بھی ہوں گی لیکن کہاں؟ یہ سوال اس کے دماغ میں مسلسل گھومنے لگا۔ آج خواتین کی ڈیرے پر آمد کی وجہ سے یہاں مرد ملازمین نہیں تھے۔ اسی لیے اسے بھی آزادی سے ہر چیز کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ڈیرے کی شمالی دیوار کے پاس سوکھی پرالی کے بڑے بڑے ڈھیر تھے۔ وہ ان کی اوٹ میں رہتے ہوئے اس سے آگے بنے کمروں میں چلی آئی لیکن ہر جگہ دیکھ لینے کے باوجود اسے کوئی بھی مشکوک چیز یا کمرا نظر نہیں آیا تھا اور پھر ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک ہی خیال اس کے ذہن میں آیا کہ لازماً ڈیرے میں کوئی تہ خانہ ٹائپ جگہ ہوگی جہاں کوکین اسٹور کی جاتی ہوگی اور اب وہ اپنے اردگرد تہ خانے میں جانے والا خفیہ راستہ ڈھونڈنے لگی۔ یہ ایک ہی سیدھ میں بنے ہوئے تین کمرے تھے جسے اس نے ممکن حد تک کھنگال ڈالا مگر تہ خانے وغیرہ کا سراغ نہیں مل سکا۔ اس کا زیادہ دیر یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ حویلی کی خواتین میں سے کوئی بھی اسے کسی بھی وقت یاد کر سکتی تھی۔ خاص خطرہ اسے سکینہ باجی کی طرف سے تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلی جاتی تو فوراً اسے آوازیں دینے لگتی تھی۔ وہ واپسی کے ارادے سے پلٹی تو اچانک اس کی نظر پرالی کے قدرے چھوٹے ڈھیر پر پڑی۔ کمرے میں پرالی کا کیا کام تھا جبکہ باہر بھی اس کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے تھے۔ وہ جلدی سے پرالی کو سائڈ پر ہٹانے لگی اور پھر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، پرالی کے نیچے لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تھا جس کے اوپر دو موٹی موٹی لوہے کی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ لازماً تہ خانے کا راستہ تھا۔ اس نے جلدی سے لکڑی کے تختے کو کنڈیوں کی مدد سے پکڑ کر ہٹایا۔ چوبی تختہ کافی بھاری تھا، اسے پسینا آ گیا مگر کسی نہ کسی طریقے سے وہ اسے ہٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک نظر اندر کا جائزہ لے کر اس نے تختہ دوبارہ اس کی جگہ پر کر دیا اور پھر اس کے اوپر پرالی کا ڈھیر بھی ویسے ہی سجا دیا جیسے پہلے پڑا تھا۔ کمرے کا جائزہ لے کر وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور تھوڑی دیر میں وہ دوبارہ سیبوں کے باغ میں کھڑی تھی۔ اس نے تہ خانے کو اندر سے دیکھنے کا پروگرام رات پر رکھ دیا۔

ایک درخت کے نیچے ٹوکری پڑی تھی لیکن رانو غائب تھی وہ یقیناً اسے ہی ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اس نے آرام سے ٹوکری اٹھائی اور اسے لے کر اندر آ گئی۔ مزید سیب توڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے ہی وہ ضرورت سے زیادہ اتار چکی تھی۔

''لو آ گئی صاحبہ۔'' اس پر نظر پڑی تو چھوٹی چوہدرائن بول پڑی۔ ''کہاں گئی تھی کب سے تجھے رانو ڈھونڈ رہی ہے۔''

''فواد بھائی کی دلہن کے لیے اچھے اچھے سیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر اتار رہی تھی۔''

''پر ٹوکری تو تیری خالی ہے۔'' شادو اسے نیچے دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

''سیب دوسری ٹوکری میں ہیں، یہ تو وہاں خالی پڑی تھی اندر لے آئی ہوں۔'' وہ ٹوکری سائڈ پر رکھتے ہوئے بولی اور چھوٹی چوہدرائن کے پاس ہی بیٹھ گئی اور ساتھ ہی سامنے طشتری میں رکھا دھلا ہوا سیب اٹھا کر کھانے لگی۔ شنا

کے ساتھ ساتھ زرتاج نے بھی ناگواری سے اسے دیکھا۔

''تم حویلی کی ملازمہ ہو اس لیے ملازموں کی طرح ہی رہا کرو، تمہاری جرأت کیسے ہوئی تم ہمارے ساتھ آکر بیٹھو اور پھر ٹرے سے سیب بھی اٹھا کر کھانے لگو؟'' ثنا تحکمانہ انداز میں بولی تو جہاں سکینہ باجی نے اسے غصے سے دیکھا وہیں وڈی چوہدرائن کو بھی اس کا انداز بُرا لگا۔ صاحبہ کے بارے میں سبھی جانتے تھے کہ وہ حویلی کی ملازمہ نہیں تھی۔ اپنے شوق کی خاطر وہ ملازماؤں کے ساتھ مل کر کچھ کام کر لیتی تھی مگر ثنا کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا۔ وہ اسے کام کرتے دیکھ کر ملازمہ ہی سمجھی تھی مگر صاحبہ چونکہ اپنی تھوڑی دیر پہلے والی کامیابی پر بہت خوش تھی اس لیے بُرا مانے بغیر سیب واپس رکھ دیا۔

''سوری چھوٹی دُلہن غلطی ہوگئی۔''

''یہ جھوٹا سیب اٹھاؤ یہاں سے، تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی ہے۔'' ثنا نے کہا تو اس نے دوبارہ سیب اٹھالیا اور پھر سے شکریے کے ساتھ کھانے لگی۔

''میں نے تمہیں اسے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔'' اسے اطمینان سے کھاتا دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکی بلکہ اسے اپنی توہین سمجھنے لگی۔

''تو کیا اللہ کے رزق کو پھینک دوں؟'' وہ آنکھیں پھیلا کر معصومیت سے بولی۔

''ہاں، پھینک دو مگر یہ تمہارے کھانے کے لیے نہیں ہے۔''

''سوری یہ میں نہیں کروں گی۔'' وہ آرام سے کہتی دوبارہ سے کھانے لگی۔ اب دونوں چوہدرائن کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''بس کرو ثنا، طریقے سے بات کرو، یہ حویلی کی کوئی ملازمہ نہیں ہے۔'' وڈی چوہدرائن نے سرزنش کی۔

''تو کون ہے پھر؟'' ثنا نے اس کے سراپا پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور سوال کیا۔ جواباً زرینہ بیگم اسے صاحبہ کی حویلی میں موجودگی کی کہانی سنانے لگی جبکہ سکینہ باجی ناگواری سے ثنا کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں اچھا نہیں لگا تھا ثنا کا صاحبہ سے اس طرح بات کرنا۔ ساری کہانی سن کر ثنا دوبارہ ایک ادا سے اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''یعنی اس حویلی میں تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''تم سے تو اعلیٰ نسل کی ہوگی اس لیے ذرا تمیز سے بات کرو میری صاحبہ سے۔'' اب کے سکینہ باجی اپنا غصہ برداشت نہ کر سکی۔

''میری صاحبہ۔'' وہ لفظ میری صاحبہ پر چونک اٹھی۔

''خیریت ہے آنٹی مالِ غنیمت میں آنے والی کو بہو بنانا ہے کیا؟''

''بہو، تمیز سے بات کرو، حویلی کے کچھ آداب ہیں جتنی جلدی ہو سکے، انہیں سیکھ لو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' زرینہ باجی قدرے اونچی آواز میں بولی۔ ثنا رکنے کے بجائے مزید سر اٹھا رہی تھی جبکہ زرتاج نے اس طرح بات کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی تھی۔

''حیرت ہے ایک ایسی لڑکی کو مجھ پر ترجیح دی جا رہی ہے جو کسی کی کچھ نہیں لگتی۔'' ثنا لاڈلی بیٹی تھی کسی سے دبنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''پھر بھی اسے دل پر راج کرنا آتا ہے تمہاری طرح بدتمیز نہیں ہے۔'' سکینہ باجی اب رکنے والی نہیں تھی۔ ''واہ زرینہ باجی دو دن کی دلہن کی زبان دیکھی ہے، لگتا ہے بھائی کے پیسے کے سوا کچھ نہیں دیکھا آپ نے، چلو صاحبہ اٹھو یہاں سے، گھٹیا لوگوں کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ان کے اٹھتے ہی ناچار صاحبہ کو بھی اٹھنا پڑا۔ اس وقت مرد حضرات بھی اپنے اپنے شکار کیے پرندوں کے ساتھ لوٹ آئے، ماحول کی گرما گرمی ان سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

''فواد، مجھے ابھی میرے گھر چھوڑ کر آئیں۔'' فواد کو دیکھتے ہی ثنا غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

فواد نے حیرت سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا اور قریب آگیا۔ ''خیریت ہے، جاتے وقت تو سب ٹھیک چھوڑ کر گئے تھے ہم۔''

''میں اس حویلی کی بہو ہوں اور میرا مقابلہ اس دو ٹکے کی لڑکی سے کیا جا رہا ہے۔'' وہ بغیر لحاظ کے صاحبہ کی طرف انگلی کرتے ہوئے بولی جبکہ صاحبہ اسے سرد نظروں سے گھور رہی تھی۔ ''آخر اس کی حیثیت ہی کیا ہے حویلی میں جو چھوٹی ماں نے اسے مجھ سے اعلیٰ نسل کی کہا ہے؟''

''اوپُتر کیا ہو گیا ہے حوصلہ کرو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل بُرا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' چوہدری علمدار نے معاملے کو سلجھانے کے لیے ٹھنڈے دل سے کہا۔

''چھوٹی بات، مائی فٹ، آج اس لڑکی کی حیثیت واضح ہو گی یا پھر مجھے کمتر کہنے والوں کو مجھ سے معافی مانگنا ہو گی۔ دوسری کوئی صورت نہیں کہ میں یہاں رکوں۔'' وہ غصے کی زیادتی سے اپنے آپ سے باہر ہو رہی تھی۔

''کنٹرول یور سیلف ثنا۔'' فواد نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے خاموش کرانا چاہا۔

''یہ لڑکی حویلی کی ملازمہ نہیں ہے تو پھر اسے ابھی چلتا کریں آخر یہ کس بنا پر حویلی میں رہ رہی ہے؟''

''مجھے حویلی میں رہنے کا شوق نہیں ہے آپ اپنی حویلی سنبھال کر رکھیں۔'' صاحبہ اس کی مسلسل بدتمیزی سے کھول اٹھی تھی۔ ''کیا میں حویلی سے جانے کے لیے آزاد ہوں؟'' اس کی مخاطب سکینہ باجی تھی۔

''میرے جیتے جی تمہیں حویلی سے کوئی نہیں نکال سکتا، جہاں تک تمہاری اس حویلی میں حیثیت کی بات ہے تو آج سے تم میرے پُتر حماد کی منگ بن کر رہو گی۔'' سکینہ باجی نے بم ہی پھوڑا تھا۔ ہر کوئی حیرت کی زیادتی سے اسے دیکھ رہا تھا جو اَب صاحبہ کو سینے سے لگائے پیار کر رہی تھی۔ صاحبہ بظاہر اس کے کندھے سے لگی کھڑی تھی مگر اندر ہی اندر پیچ و تاب بھی کھا رہی تھی۔ سکینہ باجی کو بم پھوڑنے کی عادت تھی۔ اسے اس کے اس طرح منگنی کے اعلان پر حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی چاہت سے وہ اسے دیکھتی تھی۔ عنقریب ایسا کر ہی دیتی۔ اصل پریشانی اسے یہ تھی کہ آج منگنی کا اعلان کرنے والی کل شادی ہی نہ کر دے۔ اس کی یادداشت کا ڈراما اب بند ہونے ہی والا تھا۔

''جوان پُتر ہے سکینہ ہم اس کی رضامندی کے بغیر کوئی اعلان نہیں کر سکتے۔'' چوہدری علمدار کو بات پسند نہ آئی تو کہنے لگا۔ اس پر سکینہ باجی نے اسی وقت بیٹے کی رضامندی پوچھ لی۔

''کیوں حماد پتر تجھے اس رشتے پر اعتراض ہے؟'' ماں کے پوچھنے پر وہ گڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگا۔ اسے صاحبہ پسند تھی مگر یوں اس طرح سب کے سامنے کچھ کہنا اسے کافی عجیب لگ رہا تھا۔

''رشتے راہ چلتے تو طے نہیں ہوتے حویلی چلتے ہیں مل بیٹھ کر سوچ لیجیے گا کیا کرنا ہے۔'' فواد نے صورتِ حال کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے کہا اور پھر واقعی بات وہیں رک گئی۔ ثنا کا چہرہ ابھی بھی تنا ہوا تھا۔ ایک غصیلی نظر صاحبہ پر ڈال کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ماحول چونکہ بدمزہ ہو گیا تھا اس لیے مزید آؤٹنگ کا پروگرام ختم کر کے سب حویلی لوٹ آئے۔

☆☆☆

رات کو حویلی کے سبھی بڑے چوہدری علمدار کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔ دن میں جو بات سکینہ باجی کے منہ سے نکل گئی تھی مقصد اسی پر بات چیت کرنا تھا۔ چوہدری علمدار ابھی تک اکھڑے انداز میں چھوٹی چوہدرائن سے بول رہا تھا کہ اسے اس طرح حویلی کے ملازموں کے سامنے ایسا اعلان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کا بیٹا ولایت سے پڑھ کر آیا تھا صرف صاحبہ کی شکل دیکھ کر شادی کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ شہر سے اپنی فکر کے کسی خاندان سے بہو لانا چاہتا تھا۔

''سکینہ تمہیں سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے تھی۔ بچی بے چاری کو خواہ مخواہ حماد پتر سے جوڑ دیا اب ہاں کریں گے تو حویلی کی ناک نیچی ہو جائے گی نہ کریں گے تو بچی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔''

''میں نے جو کہا، سوچ سمجھ کر کہا، مجھے نہیں لانی شہر سے کوئی بہو آپ کی طرح، پیسے کو چاٹنا ہے جو لڑکی میرے بیٹے کے جوڑ کی ہی نہ ہو۔'' سکینہ باجی ابھی بھی اپنی بات پر ڈٹی تھیں۔

''اب کون سا جوڑ ہے دونوں کا، اونچا لمبا گبرو جوان ہے تیرا اور بیاہنا چاہتی ہے اس لڑکی سے جس کے آگے پیچھے کا کچھ پتا ہی نہیں۔''

''اماں یہ حسب نسب کو چھوڑیں، حماد کی مرضی پوچھ لیں جو کہتا ہے وہ کر لیں، پیسے کی کمی تو نہیں ہے نا ہمیں۔''

''اور اگر لڑکا نہ مانا پھر؟'' زرینہ بیگم جلدی سے بولی۔

''تو بحث ختم۔'' فواد بیزاری سے بولا۔

''پھر لڑکی یہاں نہیں رہ سکے گی۔'' زرینہ بیگم جہاندیدہ انداز سے بولی۔

''تو کون سا اس کے جانے سے حویلی کے کام رک جائیں گے۔''

''پھر وہ بے چاری جائے گی کہاں؟'' سکینہ باجی تڑپ کر بولی۔

''اسے شہر میں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں، ہو سکتا ہے اس کی یادداشت واپس آ جائے۔'' چوہدری علمدار بولا۔

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، اب مجھے اس میں اپنی صاحبہ نظر آتی ہے وہ یہاں سے گئی تو میں بھی جاؤں گی۔'' سکینہ باجی دوٹوک انداز میں بولی۔

''تم دونوں نے سوچ لیا ہے کہ بہو میں اپنی مرضی سے لاؤں گی، میری رضا پوچھنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا تم دونوں کو۔'' چوہدری علمدار چڑ کر بولا۔

''حماد پُتر سے پوچھ لیں اُسے یہ رشتہ منظور بھی ہے یا

نہیں۔'' زرینہ بیگم چالاکی سے بولی۔ جانتی تھی ولایت پلٹ حماد لڑکی بھی اپنے معیار کی ہی پسند کرے گا۔ کچھ دیر میں حماد کو بلایا گیا۔

''ماں، صاحبہ میں کوئی خرابی نہیں، اچھی لڑکی ہے وہ' پر ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' حماد بولا تو چوہدری علمدار نے خوشی سے بیٹے کو پشت پر تھپکی دی۔

''پتر تو اس رشتے پر نہ مانا تو کل سے صاحبہ بھی یہاں نہیں رہ سکے گی۔'' سکینہ باجی نے التجا بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

''کیوں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''تو رشتے پر تیار نہیں تو وہ یہاں کیسے رہ سکتی ہے، سارے ملازموں کے سامنے تیری ماں نے رشتے کا اعلان کیا تھا اب وہ بے چاری کس منہ سے یہاں رہے گی، گاؤں میں ایسی باتوں کو بُرا مانا جاتا ہے۔'' زرینہ بیگم نے ہمدردانہ انداز میں اسے سمجھایا اس کے لہجے میں چھپی مکاری سکینہ باجی سے چھپی نہیں تھی۔

''مائی گاڈ، آپ لوگ نہ جانے کون سی دنیا میں رہتے ہیں، رشتہ نہیں ہوگا تو اس بے چاری کو یہاں سے دربدر کر دیا جائے گا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''یہ حویلی کے رسم و رواج ہیں، جس لڑکی سے رشتہ نہیں ہو سکتا اس کا یہاں رہنا بیکار ہے، لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، اس طرح کی باتوں سے حویلی کی عزت پر فرق آتا ہے۔''

''یعنی میری ابھی اس سے منگنی نہیں ہو گی تو اسے یہاں سے نکال دیا جائے گا؟''

''تو تجھے یہی تو سمجھا رہے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے میں اس منگنی کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بولا تو چوہدری اور وڈی چوہدرائن کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا جبکہ فواد لاتعلقی سے بیٹھا اپنے موبائل پر آنے والے میسجز چیک کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صاحبہ، حماد کے دل و دماغ پر کسی نشے کی طرح چڑھ چکی تھی اب اس نشے کا واحد حل یہی تھا۔

''تجھے ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے پُتر، تیری ماں کی عادت ہے جذباتی ہونے کی۔'' چوہدری جھٹ سے بولا۔

''میں ترس نہیں کھا رہا ہوں، دل سے کہہ رہا ہوں، مجھ سے رشتہ جوڑ کے اگر اسے رہنے کو یہ حویلی مل جائے تو میں سمجھوں گا میں نے کچھ اچھا کام بھی کیا ہے۔'' وہ فی الوقت شادی جیسے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اس کے انکار سے وہ لوگ صاحبہ کو یہاں سے نکال دیتے یہ بات بھی اسے گوارا نہیں تھی۔ اس کے حُسن کا جادو تو ویسے بھی اس پر چل چکا تھا۔ اس رشتے میں اس کے نزدیک کوئی حرج نہیں تھا۔ چوہدری علمدار کچھ دیر مزید بیٹھا اسے زمانے کے اتار چڑھاؤ سمجھاتا رہا مگر وہ بھی سکینہ کا بیٹا تھا۔ جو کہہ دیا تھا اس پر قائم تھا۔ چوہدری غصے سے بڑبڑاتا وہاں سے چلا گیا۔ کچھ یہی صورتِ حال زرینہ بیگم کے ساتھ بھی تھی۔

''ڈونٹ بی اپ سیٹ، نئی نئی خبر ہے آہستہ آہستہ ہضم ہو جائے گی، تو وہ کر جو تیرا دل کہہ رہا ہے۔'' فواد نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی جبکہ سکینہ باجی کے چہرے کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔

اپنے کمرے میں بیٹھی صاحبہ نے جیسے ہی یہ خبر سنی، اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کا آج رات ڈیرے پر جانے کا ارادہ تھا مگر حویلی میں یہ نیا شوشہ اٹھ گیا تھا۔

''کیا ہوا صاحبہ باجی آپ خوش نہیں ہیں۔'' اسے پریشان دیکھ کر رانو جو جھوم رہی تھی، رک گئی۔

''خوش۔'' اس نے لفظ خوشی کو اپنے اندر ڈھونڈا تو اسے کچھ نظر نہ آیا۔

''کیا چوہدری حماد نے خود رشتے کے لیے ہاں کی ہے؟''

''تو ہور کیا میں نے خود ساری باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں۔''

''رانو، چوری چھپے باتیں سننا بُری بات ہے۔'' وہ اسے گھور کر بولی۔

''نہ سنتی تو اب آپ کو کون بتاتا؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ اس کی عقل مندی پر چہرے پر مصنوعی ہنسی لا کر بولی۔ ''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''وہ کون..... چوہدری حماد۔'' رانو شریر لہجے میں بولی۔

''ہاں وہی لاٹ صاحب۔''

''پہلے تو وہ رشتے پر راضی نہیں ہوئے پر جب آپ کے حویلی سے نکالنے کی بات ہوئی تو مان گئے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرانگی سے بولی۔ جواباً رانو نے اسے ساری بات بتا دی۔

''ہوں، تو مجھ پر ترس کھایا ہے نواب صاحب نے؟''

''نہ جی ایسے نہ کہیں، بڑے پیار سے دیکھتے ہیں

آپ کو وہ۔'' رانو نے فٹ سے حماد کی طرف داری کی تو اس نے اسے بھگا دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ اس صورت حال سے پریشان ہرگز نہیں تھی۔ اس کی بلا سے حویلی والے جو مرضی کرتے رہتے اسے بس ایک آدھ دن یہاں رہنا تھا، تہ خانہ مل چکا تھا۔ اب اسے اندر سے دیکھ کر اپنا اطمینان کرنا تھا کہ وہاں واقعی کوکین اسٹور کی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ راتوں رات یہاں سے فرار ہو جاتی مگر اب اس نئے شوشے کی وجہ سے وہ رات کو ڈیرے پر نہیں جا سکتی تھی، سب کا دھیان فی الوقت اسی کی طرف تھا۔ ایسے میں وہ ڈیرے پر جانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

☆☆☆

پنکی اپنے کمرے میں قدرے پریشان بیٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اسے کسی لڑکی نے کال کی تھی اور ایسی بات بتائی تھی کہ وہ حیران تو ہوئی ہی تھی ساتھ خوف زدہ بھی ہو گئی تھی اور اب وہ بے تابی سے شانزہ کے گھر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ شانزہ گھر کی چھت سے اسے فون کر کے آدھا گھنٹا مزید وہاں رک کے نیچے اتر آئی اور اب اس کا رخ پنکی کے کمرے کی طرف تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی دہلا دینے والی باتوں سے پنکی یقیناً خوف زدہ ہو گئی تھی۔ یہ اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی پنکی اس کی جانب لپکی۔

''شانزہ مجھے تم سے ایک بات کہنی تھی۔''

''خیریت؟'' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں شانزہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

''ایک لڑکی نے مجھے فون کیا تھا۔''

''تو؟''

''وہ چوہدری فواد کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی۔''

''کیا؟'' شانزہ اپنے جوگرز اتارتے ہوئے بظاہر عام سے لہجے میں بولی۔

''کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔''

''اور تم نے مان لیا؟''

''وہ بتا رہی تھی کہ انتہائی فلرٹ آدمی ہے۔ دو تین فلینس لے رکھے ہیں اس نے جہاں وہ لڑکیوں سے شادی کے بغیر ہی رہ رہا ہے۔''

''شوبز میں تو ایسا چلتا ہی ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''اس سے بھی خطرناک ایک اور بات ہے۔'' پنکی بولی تو شانزہ اُسے سوالیہ انداز سے دیکھنے لگی۔

''وہ لڑکیاں بیچتا بھی ہے اور جو نہ مانے انہیں مار بھی دیتا ہے۔'' وہ پھریری لے کر بولی۔

''کون تھی وہ لڑکی اور اُسے یہ سب کیسے پتا ہے؟''

''وہ اس لڑکی کے ساتھ پہلے تو خود وقت گزارتا رہا پھر اپنے دوستوں کو اسے تحفے میں دے دیا اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ وہ خودکشی کر لے گی لیکن اس سے پہلے وہ مجھے سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔''

''تم نے اسے خودکشی سے روکا نہیں؟'' شانزہ فریج سے آئس کریم نکالتے ہوئے بولی بمقصد اس سے اپنا چہرہ چھپانا تھا کیونکہ اب ہنسی کنٹرول کرنا اسے مشکل ہو رہا تھا۔ پنکی تو اس کے اندازوں سے بھی زیادہ ڈرپوک اور سادہ تھی۔

''روکا تھا مگر وہ بہت دل برداشتہ لگ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے بات کرنے کے بعد خودکشی کر چکی ہو گی۔''

''او، ویری سیڈ، ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''تم اس کا نمبر نوٹ کرو اور اس کی لوکیشن کا پتا لگا کر اسے وہاں سے بازیاب کرانے کی کوشش کرو نا۔''

''او کے، گیو می ہر نمبر۔'' اس کے پوچھنے پر پنکی نے اسے نمبر بتایا۔ شانزہ نے اس کے سامنے ہی کال کی، نمبر بند مل رہا تھا۔ پنکی کی تسلی کی خاطر اس نے دو تین مرتبہ کال کی لیکن نتیجہ وہی تھا۔

''او، لگتا ہے وہ مر گئی ہے۔'' پنکی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے قدرے روہانسی ہو کر بولی۔

''ڈونٹ یو وری میں اس نمبر کی لوکیشن چیک کرواتی ہوں۔'' شانزہ نے اس کے سامنے ہی اپنے ایک آفس کولیگ کو فیک کال کی اور اسے لوکیشن چیک کرنے کو کہا۔

''بی نارمل بے بی ایسے معاملات میں ایسے تو پھر ہوتا ہے نا۔''

''شکل سے کتنا ڈیسنٹ نظر آتا ہے چوہدری فواد مگر اندر سے کتنا کرپٹ انسان ہے۔'' پنکی لڑکی کی موت کو دل سے لگا بیٹھی تھی۔ شانزہ کی نظروں کے سامنے علینا کی شکل لہرا گئی۔ اس کی دوست چوہدری فواد کی درندگی کا نشانہ بنی تھی۔ وہ اسے قطعاً معاف کرنے والی نہیں تھی۔

''جو لڑکیاں شوبز کی چکاچوند روشنیوں سے امپریس ہو جاتی ہیں، انہیں یہ اندازہ لگانے میں بہت دیر ہو جاتی ہے کہ یہ روشنیاں اُن دیکھی دلدل کی طرف جانے کا راستہ ہوتی

ہیں اور جب اس چیز کا علم ہوتا ہے، بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، وہ دلدل میں گردن تک دھنس چکی ہوتی ہیں وہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔"

"تم بھی اس دن شاید مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے لیکن پھر شاید میرا موڈ دیکھ کر بات چینج کر دی تم نے۔"

"ہاں سنا ہے میں نے بھی یہ سب، تمہارا انٹرسٹ چوہدری فواد میں دیکھا تو تمہیں فوراً آگاہ کرنا چاہا لیکن اُس دن تمہارا موڈ کچھ اور ہی تھا۔"

"میں تو بس تھوڑی سی ماڈلنگ کرنا چاہتی تھی لیکن شکر ہے مجھے اس کی اصل صورت نظر آ گئی۔"

"دیٹس گڈ، ناؤ لیو ایوری تھنگ، چلو آئس کریم کھالو۔"

"نہیں پلیز میرا موڈ نہیں ہو رہا، تم پلیز چیک کرو لوکیشن ٹریس ہوئی کہ نہیں، ہو سکتا ہے ہماری اس کوشش سے اس لڑکی کی جان ہی بچ جائے۔"

"ابھی تو بتایا ہے کچھ وقت لگے گا یقیناً لوکیشن مل ہی جائے گی۔" شانزہ اپنی آئس کریم میں بزی تھی جبکہ پنکی زخمی بلی کی طرح کمرے میں چکر لگانے لگی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد شانزہ نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے دوبارہ فون کیا اور کچھ دیر تک بات کر کے پنکی پاس آ گئی۔

"لوکیشن چوہدری فواد کے فلیٹ کی ہی ہے، میرے کولیگز وہاں گئے ہیں مگر فلیٹ بالکل خالی ہے اندر کوئی بھی نہیں۔"

"انہیں کہو اچھی طرح چیک کریں، ہو سکتا ہے کوئی تہ خانہ وغیرہ ہو جہاں اسے قید رکھا گیا ہو۔"

"ہنی سب چیک کیا ہے۔ اب وہاں کچھ نہیں ہے ایسے بااثر لوگ منٹوں میں لاش غائب کروا دیتے ہیں۔"

"او مائی گاڈ انہوں نے لاش غائب بھی کر دی۔" پنکی باقاعدہ رونے لگی تھی اور پھر شانزہ کا اگلا پورا گھنٹا اسے پُرسکون کرنے میں لگ گیا۔

"ہائے گرلز، پزا کھانے کا موڈ ہے تو تیار ہو جاؤ صرف دس منٹ میں چلیں گے۔" اچانک دروازہ کھول کر شمروز نے اندر جھانکا اور انہیں دعوت دی۔

"دس منٹ کم ہیں تیاری کے لیے۔" شانزہ جلدی سے بولی۔

"تمہیں لہنگا نہیں پہننا ہے جو ٹائم زیادہ چاہیے ٹھیک پندرہ منٹ بعد گیراج میں۔" وہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

"ہُرے چلو جلدی کرو تیار ہو جاؤ۔" شانزہ اس کا موڈ چینج کرنا چاہ رہی تھی اس لیے ایکسائٹڈ ہو کر بولی۔

"تم چلی جاؤ، میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے۔"

"کل تم پزا کھانے کے لیے شمروز کی منتیں کر رہی تھیں اب میڈم کا موڈ نہیں۔"

"وہ لڑکی بے چاری مر چکی ہے اور تمہیں پزے کی سوجھ رہی ہے۔" پنکی اس پر افسوس کرنے لگی۔

"تو کیوں اُس گھٹیا شخص کے جال میں پھنسی تھی اب مر چکی ہے تو اس کا افسوس ہم کیوں کریں؟"

"انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"تم یہاں بیٹھو اور انسانیت کے غم میں گھلتی رہو، میں جا رہی ہوں پزا کھانے پہلے ہی مشکل سے کنجوس آدمی نے آفر کی ہے۔" شانزہ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلی آئی پنکی کی حالت کافی پتلی ہو چکی تھی اس کا منظر سے ہٹنا ہی صحیح تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جب وہ تیار ہو کر گیراج میں آئی تو پنکی بھی وہاں موجود تھی۔

"مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔" اس کے پوچھے بغیر وہ وضاحت دینے لگی۔

"اِٹس اوکے، لائف میں سب چلتا ہے، شمروز سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔"

"میں پاگل نہیں ہوئی ابھی، ڈانٹ نیڈ ٹیچنگ مجھے اُس سے۔"

"گڈ۔" وہ کہتے ہوئے پنکی کے ساتھ شمروز کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"آج تو حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے تم نے۔" وہ شمروز سے بولی جو گاڑی ریورس کر کے گھر سے باہر لے آیا تھا۔

"آج ہمارا برتھ ڈے ہے، سوچا غریبوں کو کھانا کھلا دوں۔"

"غریبوں؟" وہ چلائی تھی۔ "اب ہم غریب ہو گئے؟"

"شکل سے ہی داتا دربار کے باہر بیٹھی فقیرنیاں لگتی ہو۔"

"اور خود کو دیکھا ہے کبھی آئینے میں، صومالیہ سے آئے قحط زدہ نمائندے لگتے ہو۔"

"اف میری اسمارٹنس سے اتنی جلن۔" وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔

"اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے سے جلن

ہونے لگے۔"

"مجھے غصہ دلانے کی کوشش ہرگز نہ کرے کوئی، ورنہ میرا شاہی موڈ بدل بھی سکتا ہے۔"

"لگتا ہے تمہیں پتا چل گیا ہے کہ تمہاری جیب خالی ہے۔"

"تو کیا پزے کا بل تم ادا کرنے والی ہو؟" وہ ایک دم بولا۔ شانزہ اسے گھورنے لگی۔

"اس خاتون کے چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟" وہ پنکی کو مسلسل خاموش دیکھ کر بولا۔

"اس نے ابھی ابھی ایک بھوت دیکھ لیا ہے۔"

"فار گاڈ سیک شانزہ مذاق مت کرو، میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔" پنکی خفگی سے بولی۔

"آج جب یہ ہمیں آئس کریم کھلائے گی تو اس کا موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" شہروز بولا۔

"اف اللہ کن ندیدوں کے ساتھ بیٹھ گئی ہوں، کھانے کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے تم دونوں کو؟"

"موڈ آف نہ کرو پنکی آج میرا برتھ ڈے ہے یار۔"

"ٹھیک ہے تو وعدہ کرو آج ہمیں پزا ہٹ میں ڈانس کر کے دکھاؤ گے۔"

"ڈانس.....؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں۔"

"برتھ ڈے ہے تمہارا ڈو سم تھنگ اسپیشل۔" شانزہ ہنستے ہوئے بولی۔

"پاگل نہیں ہوا ہوں ابھی۔" وہ پارکنگ میں گاڑی لگانے لگا۔

اندر آ کے انہوں نے اپنی پسند کا پزا آرڈر کر دیا تھا۔ شانزہ نے بغور پنکی کو دیکھا تو اس کا موڈ پہلے سے بہتر لگا۔ شہروز سے طنز و مزاح کا اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ پنکی کا موڈ بحال ہو سکے اور وہ کسی حد تک کامیاب رہی تھی۔

☆☆☆

صاحبہ ناشتے کے بعد اپنا کمرا سیٹ کر رہی تھی جب سکینہ باجی اس کے پاس چلی آئی۔

"سکینہ باجی آپ؟"

"اب باجی نہیں ماں کہنا شروع کر دو۔" وہ بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولی اور پھر..... اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈبے کو کھول کر موٹے موٹے کنگنوں کی جوڑی نکالی اور اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود اس کی نازک کلائیوں میں ڈال دیے۔

"ہمارے خاندانی کنگن ہیں، صرف حویلی کی بہوؤں کو ڈالے جاتے ہیں، بھائی تو میرا کوئی تھا نہیں، ابا نے مجھے دے دیے پر اب اس کی اصل حق دار تم ہو۔"

"مگر مجھے نہیں لگتا سکینہ باجی کہ میں اس کی اصل حق دار ہوں۔" وہ کنگن اتارنے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب انہیں اپنی بانہوں سے نہ اتارنا یہ اچھا شگن نہیں ہوتا، مجھے پتا ہے میرا پتر تجھے بھی پسند ہے اب یہ نخرے بند کرو۔"

"آپ سمجھ نہیں رہی ہیں، آپ کا بیٹا مجھ پر ترس کھا کر شادی کرنا چاہتا ہے، یہ تو ان کے ساتھ زیادتی ہوگی نا؟"

"تجھے کس نے کہا کہ وہ تجھ پر ترس کھا رہا ہے؟"

"بس خبر مجھ تک پہنچ ہی گئی ہے۔" وہ رخ موڑ کر چادر طے کرنے لگی مگر سکینہ باجی باہر چلی گئی۔

"واہ یہ اچھی زبردستی ٹھہری۔" وہ پھر سے کنگن دیکھنے لگی، اچھی خاصی مالیت کے کنگن تھے اور وہ آرام سے پہنا کر چلی گئی۔

"کیا ادائیں ہیں چوہدریوں کی۔" اسی وقت دوبارہ سکینہ باجی، حماد کا ہاتھ پکڑے..... اندر آ گئی۔

"لو آ گیا ہے یہ..... اس سے خود ہی پوچھ لو کتنا ترس کھایا ہے اس نے تم پر۔" وہ اسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ جانتی تھی جو کام ان سے نہیں ہوگا بیٹا منٹوں میں کر لے گا۔

"اس حویلی میں رہنا میری مجبوری نہیں ہے اس لیے آپ کو مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے کھڑا دیکھ کر وہ بے مروتی سے بولی۔

"تمہیں کس نے کہا میں نے تم پر ترس کھایا ہے؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"بس پتا چل گیا۔" وہ گردن اکڑا کر بولی۔ "لیکن آپ کو پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ مجھے بھی یہ رشتہ قبول ہے یا نہیں۔"

"ہمارے یہاں لڑکیوں کی رائے نہیں لی جاتی، جو پسند آ جائے بس اسی سے شادی کر لی جاتی ہے۔" وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دلچسپی سے دیکھتا ہوا بولا۔

"آپ وہاں بھی کھڑے ہو کر بات کر سکتے ہیں، اتنا پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے اتنا قریب دیکھ کر اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ پیچھے جانے کے بجائے مزید قریب آ گیا۔ یہ احساس بڑا فرحت بخش اور اچھوتا تھا کہ وہ اب اس کی منگ تھی دل خود بہ خود ہی اس کے قرب کی تمنا میں ہمکنے لگا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے، میری مرضی ہے جہاں مرضی کھڑا ہو کر بات کروں۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا لیکن وہ اسے دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

''او کے، ایز یو وش لیکن مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔''

''تو شادی کر کون رہا ہے؟'' وہ بولا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی، اس کا چہرہ تذبذب کا شکار تھا۔

''کیا مطلب ہے؟'' اسے ایک دم علینا یاد آ گئی جو بغیر شادی کے چوہدری فواد کے ساتھ رہتی رہی تھی لیکن وہ اپنے ساتھ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گی۔

''مطلب وہی جو تمہیں سمجھ آیا ہے۔''

''تو پھر آپ کی مدر مجھے یہ کنگن کیوں ڈال کر گئی ہیں؟''

''یہ ہمارے خاندانی کنگن ہیں جو حویلی کی بہو کو ڈالے جاتے ہیں۔'' وہ آرام سے اس کا بازو پکڑ کر بولا تو اس نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑانا چاہا لیکن گرفت مضبوط تھی وہ کلائی چھڑا نہ پائی۔ حماد اسے سرزنش کرنے لگا۔

''بُری بات ہے، مجھے انہیں دیکھنے دو۔''

''انتہائی بُرے شخص ہیں آپ خود ہی کہہ رہے ہیں، شادی نہیں کروں گا ساتھ زبردستی بھی کر رہے ہیں۔'' بہادر ہونے کے باوجود وہ اندر سے ڈرنے لگی تھی۔ زور لگا کر دوبارہ بازو چھڑانے لگی۔

''شادی ابھی نہیں ہوگی صرف منگنی ہوگی۔''

''لیکن مجھے یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''تم سے کون پوچھ رہا ہے؟'' وہ اس کے چہرے کی سرخی کو نظر انداز کر کے اس کی کلائی کے کنگن سے کھیلنے لگا۔

''میں سمجھتی تھی آپ باقیوں سے مختلف ہوں گے مگر آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ بس ایک روایتی چوہدری ہیں۔''

''اماں نے مجھے کہا کہ ان کی بہو کو سمجھاؤں کہ میں نے تم... پر ترس نہیں کھایا ہے اور میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔''

''اب جا کر میری طرف سے انہیں بتا دیجیے گا کہ مجھے یہ رشتہ قبول نہیں ہے، میں گاؤں کی اَن پڑھ جاہل لڑکی نہیں ہوں جس کے ساتھ کوئی بھی زبردستی کر لے۔''

''آہستہ بولو اماں نے سن لیا تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''اچھا ہے وقت پر ٹوٹ جائے۔'' وہ بے رخی سے بولی۔

''احسان فراموش لڑکی۔''

''میں نے کسی کی منتیں نہیں کی تھیں کہ مجھ پر احسان کیا جائے۔'' وہ بولی تو اس نے آہستگی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''اماں سے خود بات کرو، میں کم از کم ان کا دل توڑنا نہیں چاہتا۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا تو وہ ایک ٹک اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ زبردستی کرے گا مگر وہ اس کی سوچ کے ہمیشہ برعکس کرتا تھا اور یہی بات اسے غصہ دلاتی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی سکینہ باجی کے سامنے انکار نہ کر سکی۔

دو دن بعد ان کی منگنی کی رسم تھی اور یہ رسم گھر کے سبھی افراد کے سامنے ہوئی۔ ان دونوں کو ڈبل صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ سکینہ باجی نے بیٹے اور بہو کو ایک دوسرے کی انگوٹھیاں پکڑا دی تھیں۔ پہلے حماد نے اسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس نے ایک نظر اس طرح دار حسینہ کو دیکھا جو گلابی رنگ کے فینسی لباس میں گلابی تتلی ہی لگ رہی تھی۔ اس کا ہوش رُبا حسن سب کو متاثر کر رہا تھا۔ حماد دل ہی دل میں اپنی برتری پر خوش تھا۔ وہ جو تنہائی میں انکار کرتی تھی سب کی موجودگی میں اقرار کی مجسم تصویر بنی بیٹھی تھی لیکن اس کا ناراض اور خفا خفا انداز بھی اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ سر جھکائے بیٹھی اس لڑکی کے لیے دل کے دروازے کھلنے لگے تھے اور وہ تھی کہ ناراض بیٹھی اس کی تڑپ کو مزید سلگا رہی تھی۔ سکینہ باجی نے صاحبہ کو اشارہ کیا کہ انگوٹھی کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔

''بڑی جلدی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ جسے فقط وہی سن سکی۔ ''آپ کا بھی تو یہی حال ہے۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ حماد نے آہستہ آہستہ انگوٹھی پہنانی شروع کی۔

''یار پہنا بھی دے، ہاتھ اکیلے میں جا کر پکڑ لینا۔'' فواد مذاق کرنے لگا تو اس نے جلدی سے انگوٹھی آگے کر دی۔ ڈائمنڈ کی انگوٹھی جسے آج ہی وہ شہر جا کر لایا تھا، اس کے ہاتھ میں کسی جگنو کی طرح چمک رہی تھی۔ اب اس کی باری تھی اور وہ ہاتھ آگے نہیں کر رہا تھا۔

''کمینہ شخص۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کچھ کہا تم نے؟''

''فالتو وقت نہیں ہے۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ پائی تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ صاحبہ نے جلدی سے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ سب نے ان دونوں کو اور خصوصاً چھوٹی چوہدرائن کو مبارک باد دی۔

رسم کے بعد سب کا منہ میٹھا کروایا گیا تو سکینہ، چوہدری علمدار کے پاس آگئی۔ ”آپ ابھی تک ناراض بیٹھے ہیں۔ بیٹے کو مبارک باد بھی نہیں دیں گے۔“

”تو خوش ہے تو میں کب تک ناراض بیٹھوں گا۔“ وہ مفاہمت آمیز انداز میں بولا تو چھوٹی چوہدرائن نے رب کا شکر ادا کیا۔

”دیکھا ہے دونوں کی جوڑی کتنی سوہنی لگ رہی ہے۔“

”ہاں کُڑی چن دا ٹوٹا ہے حماد پُتر کا صحیح جوڑ ہے۔“ چوہدری دل سے بولا تھا جبکہ انہیں خوشی خوشی باتیں کرتا دیکھ کر ثنا کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس کے غصے میں کہی ہوئی بات کو چھوٹی چوہدرائن نے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ صاحبہ اس کی برابری پر آبیٹھی تو اس کی برداشت جواب دینے لگی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”مجھے بڑی ذلت سے دوچار نہ کیا صاحبہ تو میرا نام بدل دینا۔“ وہ زیور غصے سے اتارتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکنے لگی۔

رسم ختم ہوتے ہی کب سے خود پر ضبط کیے بیٹھی صاحبہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور آتے ہی انگوٹھی اور کنگن اتار کر رکھ دیے۔ آج کی شام پھر سے ضائع ہو چکی تھی۔ اسے بات بہ بات غصہ آرہا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر ہی اس کی منگنی کر دی گئی تھی۔ ایسے موقع پر ماں باپ ہوتے تو سچویشن مختلف ہوتی۔ وہ بیٹی کی مرضی کے بغیر کسی کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتے مگر یہاں وہ ان جاہل قسم کے چوہدریوں میں آکر پھنس گئی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ لاک کر لیا اور لیٹ گئی۔ وہ ابھی شمروز کو فون کر کے ساری صورتِ حال بتانا چاہتی تھی مگر باہر بھی جاگ رہے تھے۔ ان کے اِدھر اُدھر ہونے تک اسے انتظار کرنا تھا۔ اس منگنی کی اہمیت اس کے نزدیک ذرہ برابر نہیں تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں بار بار اسے ماں باپ یاد آنے لگے تھے۔ آنکھیں بار بار بھیگ جائیں۔ باہر سب کے سامنے وہ آنسو چھپا رہی تھی اب یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا تو آنسوؤں کو آزادی مل گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کتنی دیر روتی رہی۔ اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ آنکھیں پونچھتی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی
شمارہ مئی 2021ء کی جھلکیاں

عہد ساز
اس نے وہ تاریخی کارنامہ انجام دیا جسے دنیا کبھی بھلا نہ پائے گی

پہاڑوں کی قسم
ناقابلِ تسخیر چوٹیوں کو سر کرتے کرتے وہ پہاڑوں میں کھو گیا

لیجنڈ
پاکستان کی ان شخصیات کا ذکر جنہوں نے انتھک محنت سے شہرت پائی

نیا نام
ایک ایسی سچ بیانی جسے آپ نم آنکھوں سے پڑھیں گے فخر محسوس کریں گے

بڑھاپے کا عشق
زندگی کو کھیل سمجھنے کا قصہ، لیکن اس کا فیصلہ درست تھا

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات
بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں، آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے۔

ہوئی اٹھ کر دروازہ کھولنے لگی۔
''صاحبہ باجی چھوٹی چوہدرائن آپ کو کھانے پر بلا رہی ہیں۔''
''مجھے بھوک نہیں ہے انہیں کہو وہ میرا انتظار نہ کریں کھانا کھالیں۔'' وہ باہر آئے بغیر بولی۔ تو رانو چلی گئی۔ وہ ابھی بیڈ تک ..... نہیں آئی تھی کہ دوبارہ دستک ہوئی اور پھر دروازہ کھول کر کوئی اندر آ گیا۔
''میں نے کہا نا رانو مجھے کھانا نہیں کھانا۔''
''کیوں بھوک اُڑ گئی ہے کیا؟'' آنے والا حماد تھا جس نے دروازہ لاک کر دیا اور لائٹ جلائی۔ اس کی سرخ آنکھوں پر نظر پڑی تو وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔
''کیا ہوا رو رہی ہو؟''
''نہیں آپ کو ایسا لگ رہا ہے، مجھے بس نیند آ رہی ہے۔'' وہ چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلا جائے اسی لیے آہستگی سے بولی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اتنے نزدیک بیٹھنے پر وہ سمٹ گئی۔
''مجھ سے ڈر لگتا ہے؟'' وہ اس کی کیفیت کو انجوائے کرنے لگا۔
''میری آپ سے صرف منگنی ہوئی ہے شادی نہیں، پلیز مجھ سے فری ہونے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں بس لمحے بھر کو دیکھ پائی تھی۔
''میں نے فری ہونے والا کون سا مظاہرہ کیا ہے؟''
''آپ دور بھی بیٹھ سکتے ہیں۔''
''اور اگر نہ بیٹھوں تو؟''
''شروع سے ڈھیٹ ہیں، کوئی نئی بات کریں۔''
''میں صبح شہر جا رہا ہوں، کچھ دن لگ جائیں گے۔''
''تو میں کیا کروں؟'' اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ بلا ٹل رہی ہے۔
''تم بس اپنا خیال رکھنا۔''
''وہ تو آپ کے کہے بغیر بھی رکھتی ہوں۔''
''حویلی کے مردوں سے زیادہ بات چیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''تو میں کون سا اُن کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلتی ہوں روز۔''
''کھیلنا بھی نہیں ہے۔'' وہ اس کی بات کا بُرا منائے بغیر بولا۔
''آپ سے منگنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب میں آپ کا حکم بھی مانوں گی، میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔''
''تمہارے دل کی ایسی کی تیسی، خبردار جو آئندہ اپنے دل کا کہا مانا، بات صرف میری مانی جائے گی۔'' دل اپنی خوب صورت منگیتر کو دیکھ کر مغرور ہونے لگا تھا۔ صاحبہ نے بے ساختہ اسے دیکھا اور پھر پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ وہ آنکھوں میں سارے جہاں کا پیار سموئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کتنی ہی ساعتیں گزر گئیں۔ دل عجیب لے پر جھومنے لگا۔ صاحبہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اس شخص کی قربت سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ جب بھی قریب آتا، اس کے ہوش و حواس پر چھا جاتا تھا۔
''تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟'' اس کے خالی ہاتھ کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔
''اتار دی ہے۔''
''کیوں؟''
''تھک گئی تھی، سونا چاہتی تھی اس لیے اتار دی۔ عادت نہیں ہے سوتے وقت کچھ پہننے کی۔'' وہ نظریں چُرائے جواب دینے لگی۔
''لاؤ مجھے دو کہاں ہے۔'' وہ بولا تو وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ شاید اپنی انگوٹھی واپس لینے آیا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر انگوٹھی رکھ دی۔ اس سے عجیب انسان اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی دوبارہ اس کی دودھیا مخروطی انگلی میں پہنا دی پھر ہاتھ کی پشت کو اپنے تپتے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب یہ ہاتھ خالی نظر آیا تو بہت بُرا سلوک ہوگا تمہارے ساتھ۔'' وہ کہہ کے چلا گیا اور وہ اپنے ہاتھ میں ہونے والی سرسراہٹ کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ کتنی ہی دیر اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر اٹھی۔ لائٹ آف کی اور دروازہ لاک کر کے لیٹ گئی۔ شمروز کو فون کرنے کا ارادہ ترک کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے دھڑلے سے وہ دشمن جاں آن وارد ہوا تھا۔ وہ جاتے جاتے اسے آگاہ کر گیا تھا کہ وہ اَن چاہی نہیں تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کی محبت میں فنا ہو جاتی مگر وہ شانزہ تھی جو صاحبہ کا نقاب اوڑھے ایک اہم مقصد کے لیے یہاں آئی تھی۔ اتنی آسانی سے کوئی اسے زیر نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی شہر جا چکا تھا۔ شانزہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی غیر موجودگی میں حویلی کی فضا کافی بہتر لگ رہی تھی۔ سکینہ باجی نے اسے مکھن سے چپڑا

پر اٹھانا شتے میں کھانے کو دیا تو وہ نہ نہ کرتی رہ گئی مگر انہوں نے بھی کھلا کر دم لیا۔

''چڑی جتنی جان ہے تمہاری، رج کے (دل بھر کے) کھایا کر، حماد پتر واپس آئے تو تیری صحت دیکھ کر حیران رہ جائے۔''

''اور پھر کہے کہ یہ موٹی بھینس کون ہے۔ مجھے نہیں شادی کرنی اِس سے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''زبان دی ہے، بڑا پکا ہے اپنی بات کا، ایک دفعہ جو کہہ دیتا ہے پوری کر کے چھوڑتا ہے۔''

''تعریف کر رہی ہیں یا ڈرا رہی ہیں؟''

''بھولی ہے تو بھی صاحبہ، لڑکیاں تو ایسی باتوں سے خوش ہوتی ہیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''نہیں، خیر صاحبہ اتنی ڈرپوک نہیں ہے، میں بس مذاق کر رہی تھی۔''

''اس مذاق کو اپنے تک ہی رکھنا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، اب تو گھر کی مالکن بننے والی ہے۔ ملازموں سے کچھ کہنے یا فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ کمی کمین لوگ بات کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔''

''او کے سکینہ باجی آج کے لیے اتنی ہی ڈوز کافی ہے۔'' وہ پیار سے انہیں دیکھ کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں حکیم جی کے گھر تھوڑی دیر کے لیے جا سکتی ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے چلی جا۔ ساتھ میں رانو کو لے جانا اور جلدی واپس آنا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' وہ تیار ہونے کمرے میں چلی آئی۔ شہزاد کے شہر سے لائے کپڑوں میں سے ایک اچھا سا جوڑا پہنا اور پھر رانو کے ساتھ حکیم ..... کے گھر آ گئی۔ حکیم اور اس کی بیوی اسے بیٹی بنا چکے تھے۔ اسے دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جانتے تھے کہ اب وہ حماد کی منگیتر بن چکی ہے اس لیے اس کے یوں آنے پر بے یقینی مگر خوشی سے دیکھ رہے تھے۔

''میری دھی رانی اپنے میکے آئی ہے۔ میں کھانا بناتی ہوں کھا کر جانا۔''

''ٹھیک ہے ماں جی آپ کھانا تیار کریں، میں کھانا کھا کر ہی واپس جاؤں گی۔'' وہ آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی تو رانو نے اسے حیرانگی سے دیکھا۔ حویلی سے وہ اسے یہ کہہ کر ساتھ لائی تھی کہ بس آنا جانا کریں گے اور اب پاؤں پسار کر بیٹھ گئی تھی۔

''صاحبہ باجی اتنی دیر سے جائیں گے تو وڈی چھوٹی دونوں چوہدرائن ناراض ہو جائیں گی۔ حویلی کی مالکنیں اتنی دیر کسی گاؤں والے کے گھر نہیں بیٹھتی ہیں۔''

''کچھ نہیں ہوتا رانو سکون سے بیٹھو، زندگی کو انجوائے کرنا بھی سیکھو۔''

''جی آپ تو اب مالکن بن گئی ہیں ہم تو جی ٹھہرے کمی کمین، نوکری چھوٹ گئی تو کیا کریں گے؟''

''اف تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے آج آفس نہ گئیں تو نوکری ختم، بھئی یہ حویلی کی نوکری ہے کوئی بھی تمہیں نہیں نکالے گا اتنے کام کرتی ہو بعد میں کام کون کرے گا؟''

''گاؤں وچ بہت لڑکیاں ہیں جو مر رہی ہیں چوہدریوں کی حویلی میں کام کرنے کے لیے آج میں نکلی نہیں کل دو جی آ جائے گی۔'' رانو تیزی سے بولی۔

حکیم ..... کی بیوی کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھی اور اسے فراغت ہی فراغت تھی اس لیے وہ رانو سے باتیں کرنے لگی۔

''تم نے پڑھائی کیوں نہیں کی؟''

''ابے کے پاس اتنے پیسے ہوتے تو میں حویلی میں نوکر تھوڑی ہوتی۔''

''کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے؟''

''کوئی نہیں میں اکیلی ہی ہوں۔''

''کیا.....؟'' وہ باقاعدہ حیران ہوئی۔ ''تم اکیلی ہو اور پھر بھی تمہارا ابا تمہاری پڑھائی کا خرچہ نہیں اٹھا پایا؟''

''جی کونسا اپنی ہے، چوہدریوں کی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے ٹھیکے پر ابے کے پاس۔ سال کے بعد اتنی گندم اور پیسے مل جاتے ہیں کہ بس سارا سال کھانا نہیں مانگنا پڑتا کسی سے۔'' رانو سادگی سے بولی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ گاؤں کے چوہدری ایسے ہی اپنی چوہدراہٹ قائم رکھتے تھے۔ گاؤں میں اچھا اسکول بننے ہی نہیں دیتے تاکہ کل کو بچے پڑھ لکھ کر اپنا حساب کتاب نہ کرنے بیٹھ جائیں۔ سالہا سال سے ان کے کمی کمین غریب سے غریب تر ہی ہوتے جاتے ہیں۔ وہ بے چارے کبھی اس قابل ہی نہیں ہو پاتے کہ اپنے قرض ہی اتار سکیں۔ ان کی نسلیں چوہدریوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتی ہیں جنہیں وہ جہاں چاہیں جیسے چاہیں نچا سکتے ہیں۔ انیس علم ..... ہے جہاں گاؤں میں شعور آیا وہیں ان کی چوہدراہٹ ختم ہو جائے گی۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تمہاری شادی کب

ہو رہی ہے، کہیں کوئی رشتہ وغیرہ طے ہوا ہے؟'' وہ بولی تو رانو باقاعدہ دوپٹے میں منہ دے کر شرمانے لگی۔ شانزہ نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''کون ہے وہ ہیرو جس کے ذکر پر ہی شرمانے لگی ہو؟''

''میرے ماے کا پُتر ہے رفیق نام ہے اس کا۔''

''کرتا کیا ہے؟''

''چوہدریوں کے ڈیرے پر ہی کام کرتا ہے۔'' وہ بولی تو شانزہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''کیا کام کرتا ہے وہ وہاں؟''

''وہ دن میں تو ایک دو کام ہی کرتا ہے اصل کام اس کا رات کو ڈیرے کی پہرے داری کرنا ہے۔''

''کیوں.....؟ میرا مطلب ہے پہرے داری کیوں کرتا ہے؟''

''صاحبہ باجی ڈیرے کی دن کو بھی نگرانی ہوتی ہے اور رات کو بھی آٹھ دس بندے پہرا دیتے ہیں۔''

''آٹھ دس بندے؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''اتنے بندے کیوں؟ پہرے کے لیے تو ایک دو بھی کافی ہوتے ہیں۔''

''پہلے تو دو بندے ہی پہرا دیتے تھے۔ پچھلے سال سے ایک دم ہی زیادہ بندے رکھ لیے ہیں چوہدری صاحب نے پہرے کے لیے۔''

''کیوں کوئی خاص وجہ ہے؟''

''پتا نہیں جی کس لیے اتنا پہرا بڑھایا ہے۔''

''تو پوچھا نہیں کبھی اپنے ہیرو سے تم نے؟''

''پوچھا تھا ایک مرتبہ..... کہہ رہا تھا چوہدریوں نے ایک نیا کاروبار شروع کیا ہے اس کے لیے پہرا بڑھایا ہے۔''

''کون سا کاروبار؟''

''کاروبار تو مجھے پتا نہیں پر پہرے کے لیے کچھ بندے شہر سے بھی لائے گئے ہیں جو بندوقیں پکڑ کر ہر وقت چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ بڑی خوفناک شکلیں ہیں جی ان کی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''وہ.....'' بات کرتے کرتے وہ رک گئی پھر جھجکنے لگی۔ ''ڈیرے پر دیکھا تھا انہیں۔''

''تم رات کو ڈیرے پر گئی ہو کبھی؟''

''نن..... نہیں میرا مطلب ہے۔'' وہ بوکھلا گئی تھی۔

''تم رفیق سے ملتی ہو؟'' معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تو رانو کی نظریں جھک گئیں۔

''ہوں..... اتنے پہرے میں ملتے کیسے ہو تم دونوں؟'' وہ اصل بات کی طرف آئی۔ ''کیا وہاں کوئی خفیہ جگہ بھی ہے؟''

''آپ پہلے قسم کھایئے کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی۔''

''نہیں بتاؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ڈیرے کے قریب ہی ہے وہ جگہ۔''

''کہاں؟'' جہاں تک اسے یاد تھا ڈیرے کے اردگرد تک کافی دور تک سیبوں کے باغات تھے۔ نزدیک کوئی بھی دوسری عمارت نہیں تھی۔

''ڈیرے سے تھوڑا دور ہی چھوٹا گودام ہے وہاں۔''

''پر مجھے تو نظر نہیں آیا لیکن اتنا چھپا کر کیوں بنایا گیا ہے گودام؟'' وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولی تو رانو نے کہا۔

''وڈے چوہدری نہیں چاہتے کہ گاؤں کے لوگوں کو اس کا پتا چلے۔ وہاں نیا کاروبار جو کر رہے ہیں پنڈ میں سوجن (دوست) سو دشمن ہوتے ہیں کوئی اٹھ کے ساتھ والے پنڈ کے چوہدریوں کو بتا آیا تو وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' رانو اپنی سمجھ کے مطابق بولی تو اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

''آپ نے وعدہ کیا ہے باجی کسی کو بتائیں گی نہیں۔''

''بالکل مجھ پر بھروسا رکھو میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' پھر بولی۔ ''اچھا اب تم جاؤ دو گھنٹے تک مجھے لینے آ جانا۔'' اس کے کہنے پر رانو چلی گئی۔ شانزہ اس کے جاتے ہی پہلے اپنی تسلی کے لیے حکیم کی بیوی کے پاس کچن میں آ گئی۔ وہ کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اسے مصروف دیکھ کر وہ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ یہ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل مختصر سا گھر تھا۔ ایک کمرے میں دونوں میاں بیوی رہتے تھے جبکہ دوسرے کمرے کو حکیم نے اپنی حکمت کی دکان بنایا ہوا تھا۔ وہ جب یہاں لائی گئی تو اسے حکیم نے اسی کمرے میں رکھا تھا۔ وہیں پر اس نے دوسری دواؤں کے ساتھ ایک خاص شیشی بھی پڑی دیکھی تھی۔ آج اس کا یہاں آنے کا مقصد اس شیشی کو چرانا تھا۔ چوری اس لیے کہ اس کے کہنے پر حکیم اس کو وہ شیشی دینے والا نہیں تھا۔ دے بھی دیتا تو اس کے لیے اس کی وجہ بھی پوچھتا اور وجہ بتانے سے وہ قاصر تھی۔ اس لیے شیشی کو چوری کرنا ہی بہتر سمجھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے شیشی مطلوبہ جگہ کے آس پاس ہی پڑی مل گئی۔ اس نے جلدی سے اسے اپنے لباس

میں چھپالیا اور پھر کمرے سے نکل کر سیدھا حکیم کی بیوی کے پاس آگئی جو صحن میں ایک طرف بنے خالی چھت کے کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ وہ اس سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔

حکیم گھر سے تھوڑی دیر کے لیے غیر حاضر تھا۔ وہ غالباً کسی مریض کا پتا پوچھنے گیا ہوا تھا۔ شانزہ کو ان دونوں کی بے لوث محبت نے ہی یہاں رکنے پر مجبور کر دیا تھا اسی لیے وہ کھانے کے لیے وہاں رک گئی تھی تاکہ برسوں سے اولاد کے لیے ترسی ہوئی ایک ماں کو کچھ دلی اور ذہنی تسکین پہنچ سکے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس بات پر حویلی میں کافی واویلا مچے گا مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ حویلی میں اس کا قیام مختصر ہی رہ گیا تھا۔ ایک آدھ دن میں وہ یہاں سے جانے والی تھی بلکہ آج رات ہی اگر اسے موقع مل جاتا تو کل وہ یہاں سے کسی کو بتائے بغیر ہی نکل جاتی۔ مقصد پورا ہونے کے بعد یہاں مزید رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وجہ سے اسے اپنی انگوٹھی یاد آگئی۔ اس نے سوچ لیا تھا جانے سے پہلے وہ بہانے سے دونوں چیزیں سکینہ باجی کے پاس رکھوا دے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے جانے کے بعد لوگ سمجھیں کہ وہ یہاں سے کچھ چُرا کر بھاگی ہے۔

☆☆☆

حماد اور شمروز اپنے نئے آفس میں بیٹھے تھے۔ آفس بلڈنگ کے لیے یہ جگہ کچھ دن پہلے شمروز نے ہی کرائے پر لی تھی۔ ابھی حماد اور وہ یہی ڈسکس کر رہے تھے کہ اس جگہ کی مارکیٹ ویلیو چونکہ اچھی تھی اس لیے اسے فوراً سے پیشتر خرید لیا جائے تاکہ جگہ مہنگی ہونے سے پہلے وہ اس کے خریدار بن جائیں۔ بلڈنگ کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا۔ حماد کے یہاں آنے سے پہلے شمروز یہ سارے کام شروع کر چکا تھا۔

''یار بڑی بھوک لگی ہے۔'' حماد بولا تو شمروز گھڑی دیکھنے لگا۔ ''چلو گھر چلتے ہیں۔ آج تمہارے لیے مما نے خود کھانا تیار کیا ہے۔''

''تو چلو پھر نکلتے ہیں۔'' حماد اٹھتے ہوئے بولا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شمروز کے ساتھ اس کے گھر میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ ان کے آتے ہی مسز لطیف نے کھانا لگوا دیا تھا۔ شمروز کے ساتھ وہ پچھلے سال بھی ان کے گھر آچکا تھا اس لیے وہ اس سے اچھی طرح واقف تھیں۔ کھانے کی ٹیبل پر پنکی بھی موجود تھی جبکہ بیرسٹر لطیف کسی دوست کی طرف انوائٹڈ تھے۔ پنکی خاصی بے تکلفی سے اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے وہ مہذب سا چوہدری بہت اچھا لگا تھا۔

''حماد بیٹا شادی کا کوئی پروگرام ہے ابھی یا نہیں؟'' مسز لطیف نے پوچھا تو وہ ہنس کر انہیں دیکھنے لگا اور ساتھ ہی اپنا انگوٹھی والا ہاتھ اٹھا کر دکھایا۔ ''ابھی پرسوں ہی اچانک منگنی ہوئی ہے اس لیے آپ لوگوں کو انوائٹ نہیں کر سکا مگر شادی پر ضرور بلواؤں گا۔'' اس کے بتانے پر شمروز چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ شانزہ حویلی میں ہی تھی اور ایسی کسی بات کا اس نے ذکر نہیں کیا تھا۔

''گاؤں میں ہی ہوئی ہے یا لڑکی شہر کی ہے؟''

''دونوں ہی باتیں ہیں۔ منگنی گاؤں میں ہی ہوئی ہے اور لڑکی شہر کی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو اس نٹ کھٹ حسینہ کی یاد میں کھو گیا۔

''اچھا لڑکی والے گاؤں گئے ہوئے تھے؟'' مسز لطیف اپنی سمجھ کے مطابق بولیں تو ہنستے ہوئے وہ انہیں صاحبہ کی وہاں آمد اور منگنی تک کی کہانی سنانے لگا۔ وہ جیسے جیسے بول رہا تھا، شمروز کا چہرہ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ اسے شانزہ پر اچنبھا ہوا کہ وہ اسے بتائے بغیر یہ سب کچھ کیسے کر سکتی تھی۔ اس کا کھانے سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اچھا خاصا دوست بھی برا لگنے لگا جبکہ اس کی کیفیت سے بے خبر حماد اپنی رو میں صاحبہ کے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے اس نے حویلی میں تبدیلیاں کی ہیں کہ ہر کوئی اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

''تو کیا آپ کی مما نے زبردستی آپ کی منگنی کر دی؟'' پنکی تجسس سے پوچھنے لگی۔

''پلاننگ تو اچانک ہی ہوئی تھی مگر مجھ سے پوچھ کر منگنی کی رسم ہوئی۔''

''تو کیا صاحبہ بھی راضی ہو گئی تھی؟''

''اتنا خوبرو چوہدری مل رہا تھا، راضی کیسے نہ ہوتی۔'' مسز لطیف بولیں۔

''نہیں، وہ آسانی سے راضی نہیں ہوئی تھی بلکہ اماں اور مجھے اسے قائل کرنا پڑا تھا۔'' حماد بولا۔ تو شمروز کو اردگرد سب دھواں دھواں لگنے لگا۔ اسی وقت شمروز کے سیل فون پر شانزہ کی کال آنے لگی۔ اس نے اس کی ایک خوب صورت سی پروفائل پکچر لگائی ہوئی تھی۔ کال آتے ہی اس کی تصویر بھی اس کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی مگر آج یہ تصویر بھی جیسے آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اس نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

''اگر اس کی یادداشت واپس آگئی تو وہ کیا کرے گی؟'' پنکی اس کی اسٹوری میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھی۔

''میں تو چاہتا ہوں شادی سے پہلے اُسے سب کچھ یاد آجائے تاکہ نئی زندگی کی شروعات اس اطمینان کے ساتھ ہو کہ بیوی اپنی ہی رہے گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ مسز لطیف نے اسے سوئٹ ڈش بھی سرو کی۔

''اف میرا بہت دل چاہ رہا ہے صاحبہ سے ملنے کو۔'' پنکی مچلتے ہوئے بولی۔ اسے علم نہیں تھا کہ صاحبہ دراصل شانزہ تھی جسے وہ اپنی بھابی بنانے کے خواب دیکھتی تھی اور اس حوالے سے بھائی کو چھیڑتی بھی رہتی تھی۔ ''آپ گاؤں کب جارہے ہیں؟''

''بس آنے والے ویک اینڈ پر جاؤں گا چلنا ہے تو شمروز اور تم تیار رہنا اکٹھے ہی چلیں گے۔'' وہ بولا تو پنکی جلدی سے مسز لطیف کو دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے، دونوں بہن بھائی چلے جانا۔''

''ہُرا..... تھینکس مما۔'' وہ ماں سے لپٹ گئی جبکہ شمروز ان سے معذرت کر کے باہر نکل آیا۔

شانزہ کی بار بار کال آرہی تھی وہ یقیناً کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی وہ غصے سے بولنے لگی۔

''کب سے فون کر رہی ہوں، تم ہو کہ بزی کر دیتے ہو۔''

''تمہارے فیانسی سے بات کر رہا تھا اس لیے فون بزی کرنا پڑا۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تو دوسری طرف وہ کچھ دیر تو خاموش رہی پھر اسے وضاحت دینے لگی کہ کن حالات میں یہ منگنی ہوئی تھی اور کس طرح مجبوراً اسے انگوٹھی پہننی پڑی۔ اس کی بات سن کر شمروز کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے لیکن اسے شانزہ پر ابھی بھی غصہ تھا کہ اس نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔

''آج تو بات ہو رہی ہے، پہلے کیسے بتاتی؟''

''کل بھی تو بتا سکتی تھیں اور جس دن شوق سے انگوٹھی پہنی تھی اس دن بھی تو بتا سکتی تھیں۔'' وہ چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔

''یہ کوئی اتنی اہم خبر نہیں تھی کہ فوراً سے پیشتر تمہیں بتاتی کل پرسوں تک واپس آنے والی ہوں، میرے نزدیک اس انگوٹھی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' وہ بولی تو وہ قدرے مطمئن ہو گیا ورنہ کچھ دیر پہلے تک اسے ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔

''مگر حماد تمہیں بُری طرح مس کر رہا ہے۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکا تو دوسری جانب پھر لمحاتی خاموشی چھا گئی اور اس کے بعد وہ بات بدل کر اسے اپنی تازہ رپورٹ دینے لگی۔ اس کی باتیں سن کر شمروز کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''گڈ! تم تو بہت تیز جا رہی ہو۔''

''بس میں کل رات ڈیرے پر جاؤں گی اور وہاں کی تصویریں لے کر تمہیں واٹس ایپ کر دوں گی۔ اس کے بعد واپس آجاؤں گی۔''

''اپنا خیال رکھنا، ڈیرے پر اگر تم کسی کی نظر میں آگئیں تو جانتی ہو بہت بُرا ہوگا۔'' شمروز نے اسے تنبیہ کیا لیکن اس کا اپنا دل عجیب وسوسوں میں پڑ گیا تھا۔ وہ بس شانزہ کو اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس وقت کو بھی کوس رہا تھا جب اس نے اسے گاؤں بھیجا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا..... سوائے انتظار کے کیا ہو سکتا تھا۔

''کس سے بات ہو رہی ہے؟'' حماد اس کے قریب آکر بولا تو وہ کھٹک گیا اور پھر جلدی سے کال آف کر دی۔

''ویسے ہی ایک جاننے والے سے بات ہو رہی تھی۔ تم نے کھانا کھا لیا؟''

''سوئٹ بھی لے لی اور اب واپس بھی جانا چاہتا ہوں۔'' حماد نے اس سے اجازت لی اور اپنے بھائی فواد کے ایک فلیٹ میں سونے کے لیے آگیا۔ یہ فلیٹ فواد نے اسے رہنے کے لیے دیا تھا کہ جب تک وہ شہر میں رہے اسی میں رہے۔ حماد نے بھی سوچا جب تک اپنا فلیٹ خرید نہیں لیتا اس میں رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا جبکہ سکینہ باجی نے اس کے یہاں رہنے پر کافی احتجاج کیا تھا۔

''نہ پُتر اس کے ساتھ نہ رہنا۔ نہایت ہی لفنگا نکلا ہے۔ تجھے بھی اپنے رنگ میں نہ رنگ دے۔''

''میری پیاری اور بھولی ماں ایسا کچھ نہیں ہوگا ویسے بھی آپ نے میری منگنی تو کر دی ہے اب میری مجال ہے جو کسی اور کو دیکھوں۔''

''دیکھنا بھی نہیں۔ رج کے سوہنی لڑکی پسند کی ہے تیرے لیے، آس پاس کے کسی پنڈ میں ایسی بہو نہیں ہوگی۔'' وہ بڑی چاہت سے بولی تھیں اور اس نے بڑے پیار سے ماں کو دیکھا تھا اور دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ صاحبہ کے علاوہ اب اس کی زندگی میں کوئی دوسری لڑکی نہیں آئے گی۔ اب بھی بیڈ پر لیٹا وہ اسی قاتل حسینہ کو تخیل کی آنکھ سے حویلی میں چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

انتقام، چاہت اور نفرت کی مثلث کے
مزید سنسنی خیز واقعات آئندہ ماہ

بھٹکے مسافر

مظہر سلیم ہاشمی

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان صحیح جگہ پر غلط وقت پر پہنچ جاتا ہے... اور ماحول میں بکھری سنگینی کا حصہ بن جاتا ہے... ایک آوارہ گرد نوجوان کی مشکل جو اچانک ہی ایسی افتاد کا شکار ہو گیا جس سے اس کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا...

غیر سازگار ماحول کا شکار ہو جانے والے نوجوان کی دلچسپ کتھا.....

انسان راستے سے بھٹک جائے تو راہ دشوار ہو جاتی ہے اور جب راستہ مشکل ہو جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچنا بھی کارِ دارد بن جاتا ہے۔

میں اس وقت جس شاہراہ پر تھا، اُس پر انسان بھٹک کر شاید ہی منزل تک پہنچتا ہے۔ کوئی ذی ہوش شخص تو موٹروے کو چھوڑ کر ایسی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کراچی جانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی راہیں اختیار

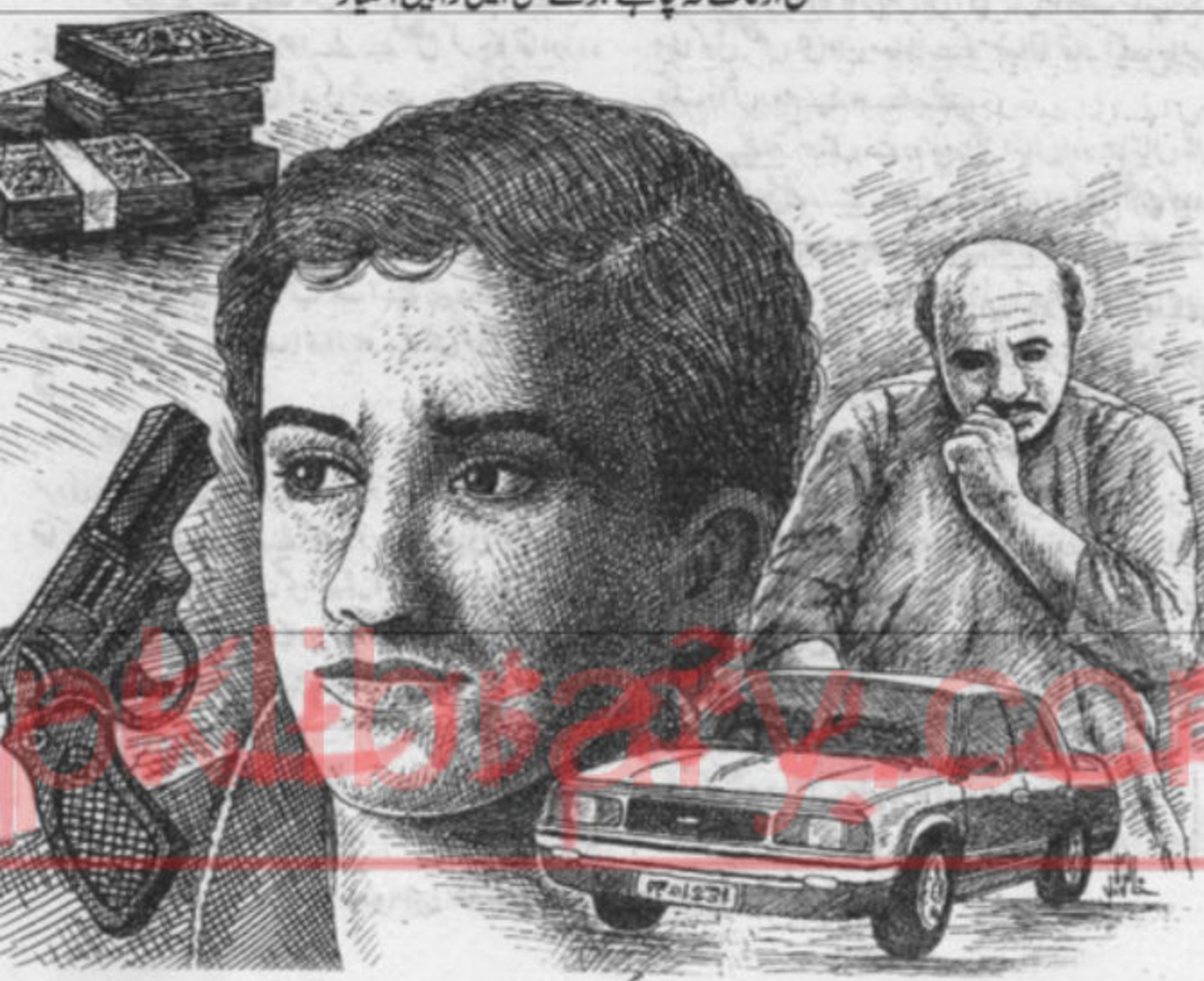

کرنی پڑتی ہیں اور آپ غلط جگہ پر غلط وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ چھ دن کے سخت محنت طلب کام کے بعد میں آج جب حیدرآباد سے کراچی کے لیے روانہ ہونے لگا تو میرے ایک ہم پیشہ نے درخواست کردی کہ میں اسے ٹھٹھہ تک لفٹ دے دوں۔

تھکن کے باعث میرا اس جانب سے واپسی کا قطعاً ارادہ نہیں تھا اور ایک بار تو میرے من میں آیا کہ نرمی سے انکار کردوں لیکن میرے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ میں انکار نہیں کرسکا۔ آخر کل کو مجھے بھی تو کوئی مدد مانگنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی تو وہ بھی احسان فراموشی سے یقیناً اجتناب برتتا۔

میرے پاس ایک ذاتی پوٹوہار جیپ تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے بجائے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا اور اب اسی پر واپسی تھی۔ ہم رات آٹھ بجے کے بعد روانہ ہوئے لیکن خراب سڑک اور کھمبا گوٹھ پر ایک گنے کی ٹرالی الٹ جانے کی بدولت پونے گیارہ بجے تک ہی ٹھٹھہ پہنچ پائے۔

''آؤ جناب آپ کو گرما گرم کھانا کھلاؤں۔'' میں نے جب اپنے کولیگ کو اس کے گھر کے پاس اتارا تو وہ خوش اخلاقی سے مجھے دعوت دینے لگا۔

''نہیں شکریہ۔'' میں نے نرمی سے انکار کیا۔

اگرچہ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے لیکن میں اپنی بیگم کو واپسی کے حوالے سے مطلع کرچکا تھا اور وہ بھی اتنے دنوں بعد میری آمد کی شدت سے منتظر تھی۔ اب اگر میں وہاں کھانا کھالیتا تو خواہ مخواہ بیوی کی ناراضی مول لینا پڑتی۔ ویسے بھی مجھے کورنگی میں اپنے گھر تک جانا تھا اور امید تھی کہ اگر کوئی ناگہانی نہ پیش آئی تو اگلے دو گھنٹے میں وہاں بہ آسانی پہنچ جاتا۔ تب تک اپنے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کے رقص سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

جنوری کے آخری دن چل رہے تھے۔ دن میں تو سردی مذاق ہی لگتی تھی لیکن رات کو موسم اتنا سرد ضرور ہوجاتا تھا کہ مجھ جیسے کراچی والے بھی بہ آسانی رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ رات نسبتاً تاریک تھی کیونکہ آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں حتی الامکان تیز رفتاری سے اپنی جیپ کو دوڑاتا ہوا جب گھارو تک پہنچا تو ہلکی بارش کا آغاز ہوگیا۔ مجھے اپنی رفتار آہستہ کرنا پڑی۔ سردی کے باوجود میں نے اپنے ساتھ والی کھڑکی کا شیشہ کھول دیا تاکہ اس بوندا باندی سے محظوظ ہوسکوں۔ بارش کا موسم ہمیشہ سے ہی میری کمزوری رہا ہے۔

جیپ میں بہترین ساؤنڈ سسٹم موجود تھا۔ میں نے یو ایس بی میں کئی گانے بھر رکھے تھے اس لیے اسے اسٹارٹ کیا تو موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔

''بارش میں..... ہم تم..... دل سے پوچھو۔ کیا کریں؟'' گلوکار کی آواز تو اچھی تھی ہی لیکن موسم کی مناسبت سے گانا چلنے پر مجھ میں بھی الگ ہی قسم کی ترنگ پیدا ہوگئی اور میں ساتھ ساتھ ہی گنگنانے لگا۔

سرد ہوا، ہلکی پھلکی پھوار اور موسیقی کے شاندار ملاپ سے حظ کشید کرتے ہوئے میں جیپ کو مدھم رفتار سے چلا رہا تھا۔ سامنے ایک پیٹرول پمپ نظر آیا اور میں اسے نظرانداز کرکے نکل ہی جاتا کیونکہ میری جیپ میں کراچی پہنچنے تک کا ایندھن موجود تھا کہ میری نظر اس... شاپ پر پڑی جہاں جلی حروف میں لکھا تھا۔

''گرما گرم چائے دستیاب ہے۔''

یکلخت ہی چائے کا تصور ذہن میں آتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایسے لاجواب تحفے پر میں نے رب کا شکر ادا کیا اور جیپ لے جاکر پارکنگ میں روک لی۔

وہاں پہلے سے ایک پرانی سوزوکی الف ایکس کھڑی تھی۔ پیٹرول پمپ پر کوئی موجود نہیں تھا، شاید یہاں بارہ بجے کے بعد اکا دکا گاڑیاں ہی آتی تھیں اور نک شاپ میں بیٹھا کوئی شخص ہی ان معاملات کو سنبھالتا تھا۔ ایک جانب پبلک واش روم بنے ہوئے تھے۔

نیچے اتر کر میں نے دو چار انگڑائیاں اور جمائیاں لیں تاکہ مستقل بیٹھے رہنے سے ہونے والی بدن کی اینٹھن کو دور کرسکوں۔ اپنی لیدر جیکٹ کی زپ بند کرکے اردگرد کا جائزہ لینے پر مجھے ایک قدرے نئے ماڈل کی مارگلہ کار بھی پمپ کے ساتھ موجود نظر آئی۔ پیٹرول کی تو مجھے چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن چائے کی طلب ایسی تھی کہ میں جیپ کو لاک کرکے تیزی سے نک شاپ کی جانب بڑھ گیا۔ دھندلے شیشوں سے مجھے اندر موجود لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں بارش کی ہلکی پھوار سے لطف اندوز ہوتے اور اپنے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے خراماں خراماں چلتا ہوا نک شاپ کے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔

وہاں موجود پستول بردار ایک ناٹے، موٹے، گنجے شخص کو دیکھنے سے قبل ہی مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ وہاں کا کشیدہ ماحول ساری کہانی بیان کررہا تھا۔

طوفان سے پہلے طاری ہونے والی خاموشی چھائی

ہوئی تھی۔ اعصاب چٹخا دینے والے ماحول کو دیکھ کر ایک بار تو میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ واپسی کی بھی قطعاً گنجائش نہیں تھی کیونکہ چائے کی دُھن میں، میں اندھا دھند کئی قدم اندر داخل ہو چکا تھا اور میرے پیچھے موجود دروازہ بند ہو گیا تھا۔

وہ موٹا گنجا چپس کے پیکٹوں والے ریک کے ساتھ ٹھہرا تھا اور اس نے پستول اپنے جسم سے چپکا کر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اس کے نشانے پر مجھے دو افراد نظر آئے جو اس سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ ایک کاؤنٹر کے آگے اور دوسرا کاؤنٹر کے پیچھے۔ تھوڑا غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ لمبی نال والی پستول کا رخ کاؤنٹر کے سامنے کھڑے شخص کی جانب تھا۔ اس موٹے گنجے نے پستول کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی حالانکہ اب وہ اپنی گردن آدھی گھما کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔

میں بھی اچانک رک گیا۔ میرے دونوں بازو میرے پہلوؤں سے چپکے ہوئے تھے۔ میں ساکت ہو کر اس خطرناک صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔

وقت بھی جیسے تھم گیا تھا۔ چار ذی نفس ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے تھے لیکن بولنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہو رہی تھی اور نہ ہی حرکت کرنے کی۔ باہر بارش تیز ہو گئی تھی اور پانی کے گرتے قطروں کی جلترنگ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''آہم۔'' پستول بردار ہلکا سا کھانسا تو خاموشی ٹوٹی لیکن ماحول کے تناؤ میں یکلخت ہی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

وہ شدید سانولی رنگت کا حامل ایسا شخص تھا جو آلو کی طرح ہر جانب سے عجیب طرح بڑھا اور پھیلا ہوا تھا۔ عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہو گی لیکن گنجے پن کے باعث اپنی عمر سے بڑا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ماتھے پر تیوریاں چڑھائے اُس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی جبکہ چھوٹی چھوٹی سی بھوری آنکھوں سے غیظ و غضب کی لہریں نکل رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا لڑکا اکیس بائیس سال کا تھا اور اس نے اپنے لمبے بالوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ پیٹرول پمپ کے مونوگرام والی پیلی شرٹ پہنے وہ لڑکا بار بار گھبراہٹ کے مارے اپنے لبوں پر زبان پھیرتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا۔ اس کے چہرے پر خوف سے زیادہ پریشانی تھی جس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

کاؤنٹر کے سامنے کھڑے شخص کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ، ایک خوبرو جوان تھا۔ پر اُس کی نگاہیں پستول پر ایسے جم کر... رہ گئی تھیں جیسے اُسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ اُس کا سرخ و سپید چہرہ اس وقت زرد پڑ چکا تھا۔ ایسے موسم میں بھی پسینہ اس کی پیشانی سے ہوتا ہوا ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا۔ خوف اُسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا اور میں جیسے اس کا ڈر دیکھ سکتا تھا۔ باسی گوشت میں پڑ جانے والے کیڑے جیسے کلبلاتے ہیں ویسے ہی اس کے پسینے سے شرابور چہرے کے پیچھے خوف لہراتا محسوس ہو رہا تھا۔

''ناجی۔'' وہ تکلیف کے عالم میں جیسے گویا ہوا۔

''ناجی، تمہیں اللہ کا واسطہ گولی مت.....''

''بکواس بند کرو۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے اس نام سے پکارنے کی؟'' پستول بردار جسے 'ناجی' کہہ کر پکارا گیا تھا، اتنے غصے سے غرایا کہ نوجوان کو اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔

''میری بات سنو..... ناجی..... مم..... میرا مطلب نذیر صاحب۔'' خوبرو نوجوان نے گھگیاتے ہوئے کہا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے جو بھی کیا، وہ سب نورین کے کہنے پر کیا تھا۔''

''شٹ اَپ۔ اپنی بکواس بند کرو۔'' نذیر نامی شخص اتنی شدت سے چلایا کہ اس کی آواز پھٹنے لگی۔

ایک لمحے کے لیے نوجوان خاموش ہی ہو کر رہ گیا۔

''تم۔'' نذیر عرف ناجی اب مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم ذرا اِس طرف آجاؤ تاکہ میں تمہیں صحیح طرح دیکھ سکوں۔''

میں کاؤنٹر کے قریب ہو گیا۔ میں نے یہ عمل اطمینان اور آہستگی سے کیا اور تبھی میری نگاہ ایک وجود پر پڑی جو بے حس و حرکت کاؤنٹر کے پیچھے پڑا تھا۔ یہ غالباً پمپ پر کام کرنے والا لڑکا تھا کیونکہ اس نے بھی مخصوص مونوگرام والی پیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے کاؤنٹر کے پیچھے ٹھہرے لڑکے کی پریشانی کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ وہ یقیناً اپنے ساتھی کے بے سدھ ہونے کی وجہ سے ہلکان ہو رہا تھا۔ مجھے ان جواں سال لڑکوں پر ترس آیا جو غالباً مالک کی عدم موجودگی میں اس بیہودہ صورتِ حال کا شکار ہو گئے تھے۔

''آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟'' میں نے قدرے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا کیونکہ یہ اندازہ تو میں لگا ہی چکا تھا کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات نہیں ہے۔ عموماً لٹنے والے اور لٹیرے ایک دوسرے کے واقف کار نکل بھی آئیں تو انہیں پیار کے ناموں سے نہیں پکارتے۔

''میں اس حرامزادے کی جان لے لوں گا۔'' نذیر نامی گنجے موٹے نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔ ''بس یہی ہورہا یہاں پر۔''

''اور تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے نرمی سے سوال کیا۔

''یہ خبیث نہ صرف میری بیوی کو بھگا لے گیا بلکہ میری ساری جمع پونجی بھی لے اُڑا۔ سب کچھ لوٹ لیا اس نے میرا۔'' سب کچھ کے الفاظ کہتے ہوئے نذیر کے لہجے میں جو ملال تھا، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اسے اپنی رقم سے زیادہ اپنی بیوی کے جانے کا غم ہے۔

''ناجی..... ایسا نہیں ہے۔'' نوجوان پھر گھگیانے لگا۔ ''تم میری بات تو.....''

''میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ اس نام سے مجھے مت پکارو۔'' نذیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے میں کہا۔

غالباً اس نام سے اس کی تلخ یادیں وابستہ تھیں اس لیے بار بار 'ناجی' پکارے جانے پر وہ آپے سے باہر ہوجاتا تھا۔

اس بات پر خوبرو نوجوان اپنے سر کو مایوسی سے جھٹک کر رہ گیا۔ اس کا ہلتا ہوا سر ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی فیوز بلب کھمبے سے جھول رہا ہو۔ خوف، مایوسی اور تھکن اس کے چہرے سے ہی مترشح تھی۔

''وہ کہاں ہے، عاقب؟'' ناجی نے پہلی بار نوجوان کا نام لیا۔

''کک..... کون؟'' عاقب نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ ''نورین؟''

''ہاں، ہاں، رذیل شخص۔ میں اپنی بے وفا بیوی کے متعلق ہی پوچھ رہا ہوں۔'' ناجی غرایا۔

''مم..... میں نہیں جانتا۔'' عاقب نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''بکواس مت کرو۔ وہ کمینی تمہارے ساتھ ہی میری ساری رقم لے کر بھاگی تھی۔'' ناجی نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی غصے سے کہا۔ ''بڑی مشکل سے تم لوگوں کا سراغ لگایا ہے میں نے۔ تمہارے گھر میں تو وہ نہیں تھی۔ جب تم وہاں سے نکلے تھے تو پورا گھر تاریک تھا اور نورین اندھیرے میں رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اُسے تو تاریکی سے ڈر لگتا تھا۔''

آخری بات کہتے ہوئے ناجی کی آواز رُندھ سی گئی۔ شاید اسے یقین ہی نہیں تھا کہ جس سے وہ اتنی محبت کرتا تھا، وہ ایسی دھوکے باز نکلے گی۔

''تم نے..... تم نے مجھے گھر میں دیکھا تھا؟'' عاقب نے پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ سوال کیا۔

''اور کیا..... میں نے تمہیں وہاں دیکھا اور پھر تقریباً بیس بائیس کلومیٹر پیچھا کرتا رہا۔'' ناجی نے رعونت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے خیال میں کیا میں کوئی جن بھوت ہوں جو اچانک سے نمودار ہوجاؤں گا؟''

''تم..... تم ہماری جاسوسی کررہے تھے؟ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے؟ اُف خدایا۔'' عاقب کی رنگت مزید پیلی پڑتی جارہی تھی۔

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' ناجی اس کی بات سمجھتے ہوئے بیک وقت خجالت و غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم جیسے بے غیرت نے میری بیوی کو بھگانے کا جرم کیا ہے اور الزام تراشیاں بھی مجھ پر کررہے؟ میں وہاں تب پہنچا تھا جب تم وہاں سے نکل رہے تھے۔ وہ پرفیکٹ ٹائم تھا۔ تمہیں کیا لگا تھا کہ پنجاب سے بھاگ کر سندھ پہنچ جاؤ گے تو تمہارا کوئی سراغ نہیں لگا پائے گا؟ نذیر احمد تو خیبر سرکاری ملازم ہے، وہ تو کسی طرح تمہارے لیے خطرہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی کہاں اتنی پہنچ کہ تمہاری گرد کو بھی پا سکے؟ کمزور، بے بس۔ بیوی کی ہر بات ماننے والا پاگل ناجی۔ ایسے ہی سوچتے ہو نا؟''

عاقب نے جواب میں اتنی تیزی سے انکار میں سر ہلایا کہ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے اور چہرے سے اِدھر اُدھر گرنے لگے۔

''ایسا نہیں۔'' بات جیسے اس کے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

''ایسا ہی ہے۔'' ناجی نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اس پر جنون سوار ہو۔ ''تم مجھے بے وقوف سمجھ کر چھوڑ آئے تھے لیکن دیکھ لو میں نے تمہارا دو مہینے سے کم وقت میں سراغ لگا لیا۔ اب میں تم دونوں کی جان لے لوں گا۔''

''بند کردو یہ کہنا۔'' عاقب چلّا اٹھا۔ ''تم..... تم ایسے شخص نہیں ہو جو کسی کی جان لے سکے۔ مجھے بخش دو۔''

''مانگو، اپنی جان کی بھیک اور گڑگڑا کر مانگو۔ لیکن میں تمہیں معاف کرنے والا نہیں ہوں۔'' ناجی نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

عاقب کی پتلی حالت مزید خراب ہوگئی۔ اس نے سہارا لینے کے لیے کاؤنٹر سے ٹیک لگالی اور منہ سے لایعنی آوازیں نکالنے لگا جیسے مرنے سے پہلے ہی اس پر موت کی

کیفیت طاری ہوگئی ہو۔ موت کا خوف کئی لوگوں کو معذور و محتاج کر دیتا ہے وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ عاقب نامی خوبرو نوجوان بھی اس وقت اسی موت کے ڈر کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہو اور وہ اب گرا کہ تب گرا۔

''نورین کہاں ہے؟'' ناجی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''مم..... میں نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم نذیر صاحب۔'' عاقب پیلی پڑتی رنگت کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''نورین مجھے بھی چھوڑ کر چلی گئی۔ چند دن قبل وہ ساری رقم اٹھا کر کہیں بھاگ گئی۔''

''یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ تیس لاکھ کیش اور دس تولے سونے میں سے پچھلے دو ماہ میں کچھ بچ بھی گیا تھا جو وہ لے کر بھاگ گئی؟'' ناجی کے انداز میں حیرت اور افسوس شامل تھا۔ ''مجھے تو یہ لگا تھا کہ تم دونوں نے عیاشی میں سب اُڑا دیا ہوگا۔ خیر مجھے رقم کی پروا بھی نہیں ہے۔ میں تو بس انتقام لینا چاہتا ہوں۔ جب تک تم دونوں زندہ ہو، مجھے چین نہیں آئے گا۔ میری روح کو تسکین تم دونوں کی موت سے ہی ملے گی۔''

''ایسا مت کہو۔ میں تمہاری ساری رقم لوٹا دوں گا۔'' عاقب کے لہجے میں ایسی تڑپ تھی کہ جیسے وہ جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو آمادہ ہو اور کوئی بھی بات ماننے کے لیے تیار ہو۔

''پیسے نہیں چاہئیں مجھے۔ تم دونوں کی موت چاہیے۔ تم ہو ہی اس قابل۔'' ناجی غرا کر رہ گیا۔

عاقب کی حالت اس کی باتیں سن کر خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی کوئی بات، کوئی وعدہ ناجی پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔

دوسری جانب ناجی تھا جو بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا اور شدت سے ان کی موت کا خواہاں تھا۔

کسی کی موت کی خواہش کرنے میں اور اُس کی جان لینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ دونوں اپنی نوعیت میں بالکل ہی الگ چیزیں ہیں۔ ناجی کا پستول بالکل تیار تھا اور ایک ذرا سا ٹریگر دبانے کے بعد اس سے نکلنے والی گولی عاقب کا کام تمام کر سکتی تھی۔ ایک جذباتی مظاہرے میں وہ خود کو اس نہج پر تو پہنچا چکا تھا کہ کسی بھی وقت اپنے مخالف کی جان لے سکتا تھا لیکن وہ اپنے انداز و اطوار میں کہیں سے بھی

دماغ

دماغ ہمارے جسم کا اہم ترین حصہ ہے جو ہماری ہر خفیف ترین حرکت کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہمارے سوتے جاگتے، چوبیس گھنٹے کام کرتا رہتا ہے۔ ہم جسم کو آرام دے لیتے ہیں لیکن دماغ کے لیے آرام کا کوئی لمحہ نہیں ہوتا۔ یہ ہماری پیدائش سے لے کر اس وقت تک کام کرتا رہتا ہے جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی۔

داؤد خیل سے ریاست علی خان کا تجزیہ

استاد صاحب نے کلاس کے بچوں کو بتایا کہ ہر بات کو کہنے سے پہلے سو تک گنتی گن لی جائے۔''

ایک دن استاد صاحب نے دیکھا کہ ایک ننھا سا بچہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ اچانک وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''اٹھانوے، ننانوے، سو، سر آپ کے کوٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔''

انتخاب، کاشف حسین، بھکر

تاخیر

ایک کمپنی کے بڑے آفیسر نے ایک ضروری کاروباری خط ایک دوسری کمپنی کے منیجر کو لکھا۔ اتفاق سے خط لکھنے کے بعد ڈاک میں ڈالنے سے پہلے اس آفیسر کا انتقال ہو گیا اور خط دراز میں رکھا رہ گیا۔ انتقال کے چند روز بعد جب آفیسر کے سیکریٹری نے ان کے کاغذ دیکھے تو اسے یہ خط بھی ملا۔ سیکریٹری نے سوچا۔ اب اس کو ڈاک کے حوالے کر دینا چاہیے۔ لیکن ڈاک میں ڈالنے سے پہلے اس نے خط کے آخر میں اپنے صاحب کی طرف سے یہ جملہ بھی لکھ دیا۔

''خط بھیجنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ لکھنے کے بعد میرا انتقال ہو گیا تھا۔''

انتخاب، محمد اسحاق انجم، کنگن پور ضلع قصور

ایک قاتل کی خُو نہیں رکھتا تھا۔

ایسی صورتِ حال میں میرا کئی بار کا تجربہ تھا کہ آپ کو قاتل کی نگاہیں دیکھنی چاہئیں۔ ایسے لمحات میں انسان کی آنکھیں اس کی روح کا دروازہ بن کر دل کا حال بیان کر دیتی ہیں اور کسی بھی قاتل کی خونی آنکھوں اور معصوم صفت انسان میں فرق کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔ موت کی روشنی پھیلانے والی آگ ایسے لوگوں کی آنکھوں میں سلگتی ہوئی بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے جو کسی کی جان لے سکتے ہیں۔ اور میں نے نذیر احمد عرف ناجی کی آنکھوں میں اس آگ کو مفقود پایا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس آتشِ اجل کی عدم موجودگی نے ناجی کو کم خطرناک بنا دیا تھا۔ وہ جس طرح کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اس میں انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ کوئی بھی جذباتی لمحہ اس کے اندر آگ بھڑکانے کا سبب بن سکتا تھا اور اس کی سفید ہوتی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے سے گولی چل سکتی تھی۔ ایک لمحے کا عمل اور اس کا ردِعمل ہوتا اور اُس کے ساتھ ہی ایک قیمتی جان چلی جاتی۔ یہ جان کسی کی بھی ہو سکتی تھی۔ ناجی کوئی ماہر نشانے باز نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے پستول سے نکلی گولی عاقب کے یا کاؤنٹر کے پیچھے ٹھہرے نوجوان کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ یا شاید میری بھی۔

''وہ میرا سب کچھ تھی۔'' ناجی تقریباً بلک اٹھا تھا۔ ''میری نوکری، میرے پیسے، حتیٰ کہ میری زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔''

وہ بولنے پر آمادہ دکھائی دیتا تھا اس لیے میں خاموشی سے اسے سننے لگا۔ بولنے سے اس کے اندر کا غم کم ہوسکتا تھا اور اگر اُس کا غم و غصہ کم ہو جاتا تو وہ شاید اپنے قتل کے ارادے سے بھی باز آسکتا تھا۔

''آخر قصور کیا تھا میرا؟'' ناجی کی آواز رو دینے والی ہو چکی تھی۔ ''میں مانتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہے اور میں موٹا، گنجا اور بدصورت ہوں۔ لیکن ان باتوں کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے نکاح کیا تھا اُس سے۔ اور اُس نے پوری خوش دلی سے مجھے قبول کیا تھا۔ وہ مجھ سے واقعی محبت کرتی تھی۔ چاہے تھوڑی ہی سہی لیکن میں نے اس کی محبت کو محسوس کیا تھا۔ باپ اس کا تھا نہیں اور اس کی ماں نے بھی رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ شادی سے پہلے میں نے ذاتی طور پر مل کر اس کی رضامندی بھی لی تھی۔ اُسے مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا... پھر ایسا دھوکا کیوں دیا مجھے؟''

ناجی کی حالت واقعی ایسے نوعمر عاشق کی سی ہو رہی تھی جس سے اس کی محبت چھن جائے اور اسے کوئی راہ دکھائی نہ دے رہی ہو۔ راستے سے ''بھٹکے مسافر'' بھی شاید ایسی ہی کیفیت کا شکار ہوتے ہیں۔

''دیکھو، وقت بدل جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اسے تم سے محبت نہ رہی ہو۔'' میں نے رسان سے کہا۔

''محبت نہ رہی ہو؟'' ناجی نے بے یقینی سے پوچھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں بے یقینی سی تیر رہی تھی۔ ''محبت نہیں بھی رہی تھی تو مجھے چھوڑ دیتی۔ مجھ سے طلاق مانگ لیتی۔ مجھے اس طرح دھوکا دے کر اس حرام زادے کے ساتھ فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

ناجی کی ذہنی رو ایک بار پھر الٹ گئی تھی۔

''یہ سب اسی رذیل شخص کا کیا دھرا ہے۔'' اُس نے عاقب کی جانب پستول کی نال بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''اس جیسے گورے چٹے مُنڈے گھریلو عورتوں پر اپنی وجاہت کے جال پھینک کر پھنساتے ہیں۔''

''نہیں..... ایسا نہیں ہے۔'' عاقب بے ساختہ ہی موت کے خوف سے چلّا اٹھا۔ ''مم..... مم..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب نورین کا ہی آئیڈیا تھا۔''

''بکواس بند کر کمینے۔'' ناجی چلّایا۔ ''یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم نے ہی اسے ورغلایا تھا ورنہ وہ تو سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ تم نے اسے برباد کر دیا بلکہ ہم دونوں کی ہی زندگی برباد کر دی۔ گھر گھر پھیری لگا کر چیزیں بیچنے والے سیلز مین۔ نجانے کتنی ہی خواتین کو تو نے گمراہ کیا ہوگا؟ تجھ شیطان کو وہ کافی نہیں تھیں جو تو نے میری نوری کو بھی راہ سے بھٹکا دیا۔''

میں دیکھ سکتا تھا کہ اب ناجی خود کو شش کر رہا تھا کہ اسے اتنا غصہ آجائے کہ وہ بنا سوچے سمجھے ٹریگر دبا دے۔ ایک بار تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ اس پر چھلانگ لگا کر اُسے قابو کرلوں۔ لیکن خود کو اس ارادے سے باز ہی رکھا۔ ہم دونوں کے بیچ کافی زیادہ فاصلہ.... تھا اور ایک عدد پستول بھی موجود تھا جس کی گولی کھانے کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ایک دوسری راہ بھی تھی۔ میں نے وہی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''نذیر احمد عرف ناجی صاحب، اپنا یہ پستول میرے حوالے کردیں۔'' میں نے حتی الامکان نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ مجھے یوں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دیکھتا رہا جیسے اسے میری بات سمجھ ہی نہ آئی ہو۔

''میں نے کہا اپنا پستول مجھے دے دو۔'' میں نے اپنی بات دہرائی تو اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اب اسے میری بات سمجھ آئی ہو۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں میری جانب کیں۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''اپنا پستول مجھے دو۔ یہ نہ ہو کہ تم کچھ ایسا کر بیٹھو جس کی تلافی ناممکن ہو جائے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''نہیں، میں پستول نہیں دے رہا۔ تم اپنی بکواس بند کرو۔'' اُس نے انکار کیا۔

''تم کسی کو جان سے نہیں مارنا چاہتے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں۔ انہیں اس کی قیمت چکانا ہی پڑے گی۔ میں ان دونوں کی جان لے کر ہی رہوں گا۔'' وہ ایسے لہجے میں بولا جیسے مجھ سے زیادہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان کی جان لیے بغیر بھی یہ اپنے جرائم کی سزا پا سکتے ہیں۔ تم سیدھا ان پر پولیس کیس کر دو اور جیل کی چکی پسواؤ۔''

''جیل؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ''وہاں انہیں بھیجنے کا کیا فائدہ؟ میرے ساتھ جو سلوک انہوں نے کیا ہے، اس حساب سے تو جیل کی سزا ناکافی ہو گی۔''

''لگتا ہے تم نے کبھی جیل کو اندر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی قیدیوں کی حالتِ زار سے واقف ہو۔'' میں نے استہزائیہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے یہ سب؟'' وہ بیک وقت حیرانی و پریشانی سے بولا۔ ''کون ہو تم؟''

وقت آ گیا تھا کہ میں سچ سے پردہ اٹھا دیتا۔ اب خاموش رہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ لوہا گرم تھا اور میں موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چوٹ نہ لگاتا تو یہ میری کوتاہی ہوتی۔

''میں پولیس والا ہوں۔'' میں نے اپنی اصلیت بتائی۔

میرے انکشاف پر وہاں موجود تینوں باہوش لوگوں کا ردِعمل چونک جانے والا تھا۔

ناجی کے چہرے پر یقین و بے یقینی کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے ٹھہرے لڑکے کی آنکھوں میں امید جاگ اٹھی تھی جیسے کسی مسیحا کو دیکھ لیا ہو۔ خوبرو نوجوان عاقب کی حالت میں البتہ کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی بھی پیلی رنگت اور پسینے سے شرابور پیشانی کے ساتھ جیسے موت و زندگی کے بیچ لرزتے پُل پر جھول رہا تھا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' ناجی نے بے یقینی سے کہا۔

''اور میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ میں نے پوچھا۔

ناجی نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بس کھانس کر ہی رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بات اس کے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی ہو۔

''اسسس۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم کون ہو۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔'' ناجی نے گلا صاف کرنے کے بعد بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ اس کے انداز میں اب پہلے والی گھن گرج مفقود تھی۔

''یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں تمہیں عاقب کو گولی مارنے سے نہیں روک سکتا۔'' میں نے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں تمہاری بے وفا بیوی کو گولی مارنے سے ضرور روک سکتا ہوں۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں مسلح نہیں ہوں۔''

میری طرف سے پہنچائی گئی جذباتی چوٹ نے اپنا اثر دکھایا تھا اور اپنی بیوی سے انتقام نہ لے سکنے کی بات نے ناجی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔

میرے مسلح ہونے کی بات مبنی بر جھوٹ تھی لیکن میں نے اس کا اچھا نتیجہ نکلتے دیکھ کر اس جھوٹ کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

''اگر تم اب عاقب کو قتل کر دیتے ہو تو پھر مجھے بھی تمہیں گولی سے اُڑانا پڑے گا۔ اِدھر تم نے عاقب پر فائر کیا اُدھر ہی میں تم پر گولی چلا دوں گا اور تم ایک مردے سے زیادہ نہیں رہو گے۔ کیا تم اپنے ہاتھوں اب اپنی موت کا سامان کرنا پسند کرو گے؟''

''مم..... مجھے پروا نہیں۔'' ناجی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں پروا ہے مسٹر نذیر ناجی۔ میں تمہارے چہرے پر کھنڈی ہوئی بے بسی کی کیفیت دیکھ سکتا ہوں۔ تم اگر مرنے کا فیصلہ کر بھی چکے ہو تو کم از کم یہاں تو نہیں مرنا چاہتے۔" میں نے اس کی بات کی تردید کی۔

معدوم پڑتی آتشِ اجل اس کی آنکھوں میں دور کہیں رقصاں تھی لیکن ہاں۔ اُن آنکھوں میں اُس کی اپنی ذات کے لیے موت جیسا کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اُس کے پلان میں مرنا بالکل بھی شامل نہیں تھا۔ وہ صرف اذیت چاہتا تھا۔ نورین اور عاقب کے لیے شدید ترین تکلیف جیسی وہ اپنی ذات کے لیے محسوس کر رہا تھا اور غالباً نورین سے شدید محبت کے بعد بے وفائی کا جھٹکا اس کے لیے موت جیسی اذیت کا ہی سبب بنا تھا۔

"لیکن۔" ناجی کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر اپنی بات مکمل کرنے لگا۔ "میں بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ کسی اور کو تکلیف پہنچائیں گے تو پلٹ کر خود ان کے اوپر بھی آسکتی ہے۔"

مایوسی اُس کے وحشت زدہ چہرے پر اتر آئی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ میری باتیں اُس پر اثر کرنے لگی ہیں۔

"تم نے بدلہ لے تو لیا۔" میں نے کہا تو وہ مجھے چونک کر ایسے دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی بے وقوفی کی بات کر دی ہو۔

"یہ ذرا عاقب کی حالت تو دیکھو۔ کیسی جاں بہ لب کیفیت سے گزر رہا ہے؟" میں نے اپنی بات سمجھانے کا آغاز کیا۔ "موت آئی نہیں اور یہ مرنے والا ہو چکا ہے۔ اگر تم نے اسے گولی مار دی تو یہ اس اذیت سے باہر نکل آئے گا۔"

میری بات سن کر ناجی ایسے سیدھا ہو گیا جیسے اس پر ادراک کے نئے در وا ہو گئے ہوں۔ اُس نے اپنا پستول بھی قدرے جھکا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اب وہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا ہے۔

"تم مرنا نہیں چاہتے ناجی۔" میں نے زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "مان جاؤ ناجی۔ تم کم از کم اس شخص کے لیے نہیں مرنا چاہتے۔"

"میں نہیں مرنا چاہتا۔" ناجی نے بے ساختہ کہا۔

"اور تم یہ بھی نہیں چاہتے کہ کاؤنٹر پر ٹھہرا لڑکا یا پھر میں تمہاری چلائی ہوئی گولی... کا شکار ہو جائیں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم نے ایک بار گولی چلا دی.....

.....تو وہ یہ نہیں دیکھے گی کہ کسی معصوم کو لگ رہی ہے یا پھر گناہ گار کو۔ کیا تم کسی معصوم کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔" ناجی نے تیزی سے کہا۔ "میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔"

میں پہلے ہی محتاط انداز میں اس کی جانب دو قدم لے چکا تھا۔ میں نے ایک اور قدم اٹھایا جو پہلے والے قدموں سے بڑا تھا۔ پستول کی نال ابھی تک عاقب کے سینے کی طرف تنی ہوئی تھی۔

میرے اعصاب سخت کشیدہ ہو رہے تھے۔ نظریں ناجی کی انگلی پر ٹکی ہوئی تھیں جو کہ ٹریگر پر ابھی تک سختی سے جمی ہوئی تھی۔ میرے حلق سے ایک گہری سانس نکل گئی جب میں نے اس کے پستول پر گرفت ڈھیلی پڑتے دیکھی۔ اُس نے اپنی شہادت کی انگلی ٹریگر سے ہٹا لی تھی۔

"نذیر صاحب، یہ پستول مجھے دے دیں۔" میں نے اپنا طرزِ تخاطب تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی ردِعمل نہ دیا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہو چکا ہو۔

میں نے ایک اور قدم اس کی جانب بڑھایا اور اپنا ہاتھ آگے کی جانب پھیلا دیا۔

"پستول مجھے پکڑا دیں۔ آج رات کسی کو نہیں مرنا ہے۔ نہ آپ کو، نہ مجھے اور نہ ہی عاقب کو۔" میں نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔ "ضد نہ کریں اور یہ پستول مجھے دے دیں۔"

میں نے ایک اور قدم اس کی طرف اٹھایا۔ یکلخت ہی تمام غصہ، نفرت، انتقام کی خواہش اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ جیسے کسی نے سلیٹ کو گیلا کپڑا مار کر صاف کر دیا ہو ویسے ہی ناجی پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے پستول کو میری جانب بڑھا دیا۔ وہ اب مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے پستول اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔

صورتِ حال بغیر کسی خون خرابے کے ہی سنبھل گئی تھی۔

"یا اللہ خیر شکر۔" کاؤنٹر کے پیچھے ٹھہرا لڑکا ایک گہری سانس لیتے ہوئے منمنایا اور نیچے بیٹھ کر اپنے ساتھی کے گال تھپتھپاتے ہوئے اُس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

عاقب کی حالت ابھی بھی خراب تھی لیکن اب وہ پہلے

سے بہتر محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر سے ٹیک لگالی کہ کہیں گر ہی نہ جائے۔ کمزور آواز میں اس نے ناجی کو دو چار گندی گالیاں بھی دیں لیکن اس کی تباہ شدہ کیفیت کے باعث وہ بے اثر ہی محسوس ہوئیں۔ وہ بھی مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

میں اُسے نظرانداز کرتا ہوا ناجی کے پاس پہنچا اور اسے بازو سے پکڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے لے آیا۔ وہاں پڑے ایک اسٹول پر اسے بٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ خوابیدہ نظروں سے اب اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور بار بار اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر بھی کر رہا تھا۔

اپنی ذات میں گم، غم زدہ اور بالکل ہی ٹوٹا پھوٹا، بکھرا انسان اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔

''پولیس کو فون کرو۔'' میں نے کاؤنٹر والے لڑکے کو کہا جو اَب اپنے ساتھی کے ہوش میں آنے پر اسے پانی پلا رہا تھا۔ ''یہاں پر جو بھی قریبی تھانہ ہے، اسے فوراً کال کرو۔''

''پولیس چوکی یہاں پاس ہی ہے، میرے پاس ان کا نمبر بھی ہے۔ میں انہیں فون کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا موبائل فون کاؤنٹر کی ایک دراز میں سے نکالتے ہوئے کہا تو میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

''اُن سے کہنا کہ اگر کوئی ایمبولینس دستیاب ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی بھی میڈیکل ٹیم کو ساتھ لے کر آئیں۔'' میں نے لڑکے کو ہدایات دیں۔

''ٹھیک ہے سر۔'' وہ احترام سے بولا اور پھر یکلخت ہی چلّایا۔ ''اوئے...... اوئے رکو۔ سر وہ دوسرا بندہ جا رہا ہے۔''

میں نے مڑ کر داخلی دروازے کی جانب دیکھا۔ عاقب موقع کا فائدہ اٹھا کر دروازے کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا اور باہر نکلنے ہی والا تھا۔

''اس کا خیال کرنا۔'' میں نے لڑکے کو ناجی کے بارے میں کہا اور تیزی سے عاقب کے پیچھے بھاگا۔

میں جب تک باہر پہنچا تب وہ اپنی مارگلہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا جو پمپ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے بیٹھ کر گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے روک دیا تاکہ وہ اسے لاک نہ کر سکے۔

''تم کہیں نہیں جا رہے ہو عاقب۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم۔ تم مجھے یہاں نہیں روک سکتے۔'' وہ ہکلایا۔

''تیری ایسی کی تیسی۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں۔''

میں نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اس نے زور آزمائی کر کے مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن میرا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے ایک بار اس کا سر پکڑ کر دروازے سے ٹکرا دیا تو وہ چکرا کر ہی رہ گیا۔

''آہ!'' وہ کراہ اٹھا اور مزاحمت تقریباً ترک کر دی۔

میں نے تیزی سے اگنیشن میں لگی چابیاں نکال لیں تو اس کی رہی سہی جان چھڑانے کی کوشش بھی ختم ہو گئی۔

''نکل باہر۔'' میں نے ایک گالی دے کر کہا کیونکہ اسے سادہ زبان سمجھ نہیں آرہی تھی۔

وہ لرزتا کانپتا باہر نکلا۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اس لیے گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شدید خوف امنڈ آیا تھا۔

''کس بات کی جلدی تھی تجھے۔'' میں نے اس کی گدی پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میں کون سا تیرے پیچھے پستول لے کر آیا تھا جو ایسے دُم دبا کر بھاگ رہا تھا؟''

''مم...... میں کوئی نہیں بھاگ رہا تھا۔'' وہ بے ربط انداز میں بولا۔

''جو حالت ناجی کا پستول دیکھ کر ہو رہی تھی تیری۔ وہی حالت اب ہو رہی ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بلکہ تیری حالت تو اُس وقت سے ہی خراب ہے جب میں نے بتایا تھا کہ میں پولیس والا ہوں۔ اور ابھی بھی تو کسی خارش زدہ کتّے کی طرح کانپ رہا ہے۔ بتا کیا مسئلہ ہے تجھے؟''

اُس نے اپنے منکے جیسا سر انکار میں ہلا دیا۔ اب بھی وہ مجھ سے نظریں چُرا رہا تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے تھے؟ اس جگہ آنے کا کوئی مقصد تو ہو گا۔'' میں نے ایک خیال کے تحت اُس سے قدرے نرمی سے پوچھا۔

''مم... مجھے پیٹرول بھروانا تھا گاڑی میں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ناجی نے کہا تھا کہ وہ پچھلے بیس بائیس کلومیٹر سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ تمہیں اپنے گھر کے پاس کوئی پیٹرول پمپ نہیں ملا جو اتنی دور تک ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس ویرانے میں چلے آئے؟''

وہ بُری طرح سے سر ہلانے لگا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ

بھی اب اس کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

''تمہیں پتا ہی نہیں چلا ہوگا کہ پیٹرول ختم ہونے والا ہے۔'' میں نے ذہن کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ ''اور ایسا اُس وقت ہی ممکن ہے جب تمہارا دماغ کسی اور مسئلے میں بری طرح سے اُلجھا ہو۔''

میری بات سن کر عاقب کی زرد پڑی رنگت بالکل ہی لٹھے کی طرح سفید ہوگئی۔ خوف اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔

''یقیناً آج رات تمہارے گھر پر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے جس کے نتیجے میں تم ایسے بولائے پھر رہے ہو۔'' میں نے اپنا تجزیہ جاری رکھا۔ ''تم اس بات سے بھی خوفزدہ ہوگئے تھے جب تمہیں پتا لگا کہ ناجی نے تمہارے گھر میں جھانک کر دیکھا تھا۔''

میں نے آگے بڑھ کر مارگلہ کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ نشست اور فرش خالی تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میں گاڑی کی عقبی سمت کی جانب بڑھ گیا۔ چابیاں ابھی تک میرے ہاتھ میں تھیں اس لیے ڈکی کھولنے میں بھی کوئی دشواری نہ تھی۔

''نہیں۔'' عاقب میری پیش رفت دیکھ کر چلّایا۔

وہ لڑکھڑاتا ہو مجھ تک پہنچا اور مجھے گھونسا مارنے کی ناکام کوشش کی۔ میں جُھکائی دے کر ایک جانب ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے دھکا دے کر ہٹانے کی کوشش بھی کی لیکن میں تب تک چابی قفل میں ڈال کر گھما چکا تھا۔ ایک ہلکی سی کلک ہوئی تو میں نے ڈکی کا دروازہ کھول کر اوپر کی جانب اٹھا دیا۔

پلاسٹک کے تھیلوں اور بوسیدہ کپڑوں میں لپٹی وہاں ایک لاش موجود تھی۔

زندگی سے عاری ایک زرد رنگ کی کلائی والا ہاتھ میرے سامنے تھا۔ بے جان انگلیاں مڑی تڑی تھیں۔ میں نے پلاسٹک کے تھیلوں کو ذرا سا ہٹایا تاکہ لاش کا چہرہ دیکھ سکوں۔ وہ ایک عورت کی لاش تھی۔

چہرہ بدرنگ ہوکر رہ گیا تھا۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو۔

''یہ نورین ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں لے کر جا رہے تھے اس کی لاش کو؟ کسی ویرانے میں اسے دفن کرنے کا ارادہ تھا یا پھر بے گور و کفن ہی کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنا چاہتے تھے؟''

عاقب میرے سامنے گھگیانے لگا۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی زخمی جانور چلا رہا ہو۔

''مم...... میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔'' وہ اپنے بے تحاشا رونے دھونے کے دوران بمشکل بولا۔ ''ہماری رقم کے معاملے پر لڑائی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے زیورات نہیں بیچنا چاہتی تھی اور مجھے اس بات پر غصہ آ گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ خدا کی قسم۔ میرا اُسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا اور وہ وہیں زمین پر ڈھیر سا ہوگیا۔ میرے سامنے وہ بے بسی سے ٹانگیں پھیلائے گیلے فرش پر بیٹھا تھا اور اپنے متوقع انجام کا سوچ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ بس سانسوں کا زیر و بم اس کے سینے کے ابھار سے محسوس ہو رہا تھا۔ بارش کب کی رک چکی تھی لیکن نسبتاً سرد موسم کے باوجود اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پسینے سے شرابور تھا۔ آنسوؤں نے پسینے میں مدغم ہوکر اس کے چہرے پہ عجیب نشان سے بنا دیے تھے۔

میں نے اُس سے نظریں ہٹا کر ٹک شاپ کی دھند آلود کھڑکی کی جانب دیکھا۔

''بیچارہ ناجی۔'' میرے ذہن میں سوچ ابھری۔ ''وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بے وفائی کی قیمت چکائے۔ لیکن جتنی محبت کا وہ مارا تھا شاید نورین کی لاش دیکھ کر اپنے حواس ہی گنوا بیٹھتا۔''

زندگی کے سفر میں بار بار ہم سفر بدلنے والے منزل پر پہنچنے کے بجائے اکثر اوقات بھٹک کر اپنا ہی نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ میں اس بات سے واقف نہیں تھا کہ ناجی کی بے پناہ چاہت، محبت اور دی گئی عزت کو نجانے کس جذبے کے تحت روند کر نورین نے عاقب کو ہمراہی بنایا تھا لیکن یہ بات واضح تھی کی راہ سے بھٹکنے کے بعد اُسے اس چیز کی قیمت اپنی جان دے کر ہی چکانی پڑی تھی۔

میں گاڑی کی ڈکی کے پاس آیا اور اس زرد لاش پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد ڈکی کا دروازہ بند کر دیا۔ میرا کام اب بس اتنا رہ گیا تھا کہ پولیس کے آنے کا انتظار کرتا اور انہیں بیان دینے کے بعد اپنی راہ لیتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ آپ غلط جگہ پر غلط وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حالات سازگار ہو جاتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو ہوگئے تھے البتہ ناجی، نورین اور عاقب جیسے بے منزل مسافروں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی تھی......

❖❖❖

خودپرستی... انسان کو مغرور اور بے حس بنا دیتی ہے... ایسے ہی ایک جاہ طلب اور خودغرض شخص کی کہانی... اس کی خودکشی نے سب کو ششدر کر دیا تھا... قتل اور خودکشی کے درمیان انکے کیس کی از سرِ نو تحقیقات...

ذہین اور بے غرض سراغرساں کی عملی کاوش.....

ایک اور ایک گیارہ

سیریناراض

''میرے پاس ایک انشورنس کلیم آیا ہے اور تمہیں اس کی تحقیقات کرنی ہیں۔ میرے خیال میں تمہارے لیے یہ اپنی ذہانت آزمانے کا بہترین موقع ہے۔'' جیکسن بولارڈ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''اس میں مرنے والے کو بند کمرے میں گولی لگی۔''

کوئن کینن نے سوچا، ذہانت؟ اور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس طرح کے مبینہ مشکل جرائم کا سراغ لگانا اس کی خاصیت تھی۔

''کون قتل ہوا ہے اور کن حالات میں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ قتل کا کیس نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''بالکل لیکن انشورنس کلیم کرنے والے کو اس سے اختلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حادثاتی طور پر گولی چل گئی۔''

''کیا متوفی نے کوئی خط چھوڑا؟''

''نہیں لیکن سب لوگ ایسا نہیں کرتے۔''

''میرا خیال ہے کہ سرکاری طور پر اسے خودکشی قرار نہیں دیا گیا۔ ورنہ تم مجھے فون نہ کرتے۔''

پولارڈ کا منہ بن گیا۔ وہ گریٹ ویسٹرن انشورنس میں بیمہ کے دعوؤں کی جانچ پڑتال پر مامور تھا اور اس کی بدمزاجی مشہور تھی۔ اسی لیے اسے کوئن کا تبصرہ پسند نہیں آیا۔ وہ رکھائی سے بولا۔

''پولیس ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکی کہ یہ خودکشی ہے یا حادثہ۔ وہ اسے اتفاقی حادثے کا نام دے رہے ہیں۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں اس کی تصدیق کروں کہ متوفی نے خودکشی کی ہے؟''

''بالکل۔'' پولارڈ نے کہا۔ ''اس صورت میں انشورنس کا دعویٰ مسترد ہو جائے گا اور گریٹ ویسٹرن انشورنس ایک بڑی رقم کی ادائیگی سے بچ جائے گی۔ تمہیں معلوم ہے کتنی؟ بیس ہزار ڈالر۔''

''خاصی معقول رقم ہے۔ مرنے والے کا نام؟''

''الفریڈ لانگ ریس۔ ریٹائرڈ زندگی بسر کررہا تھا۔ اسے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ کاغذ کے کارخانے کا مالک تھا۔''

کوئن نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا۔ ''اس کی موت کب ہوئی؟''

''دو دن پہلے۔'' پولارڈ نے کہا۔ ''اخبار میں ایک مختصر اطلاع کے سوا کچھ شائع نہیں ہوا۔ اس کے بھانجے نے پولیس کو تفصیلات ظاہر کرنے سے منع کردیا تھا۔''

''اس کی بیمہ پالیسی سے کون مستفید ہوگا؟''

''اس کا بھانجا فلپ شیرون۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی وارث نہیں۔ لانگ ریس کی بیوی دس سال پہلے مرچکی تھی اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''شیرون نے دعویٰ داخل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔''

''نہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لانگ ریس زندگی میں کسی کو اپنی دولت میں حصہ نہیں دینا چاہتا تھا۔''

کوئن نے اپنا کان کھجاتے ہوئے کہا۔ ''گولی کہاں چلی تھی؟''

''لانگ ریس کے گھر کی لائبریری میں۔''

''اس وقت وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا؟''

''نہیں، اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔''

''یہ واقعہ دن میں کس وقت پیش آیا؟''

''رات تقریباً ڈھائی بجے کے قریب۔''

''تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں؟''

''بالکل، تین گواہوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ان میں بھانجا، گھریلو ملازم گریگ اور لانگ ریس کی سیکریٹری ایرلین شامل ہیں۔ یہ تینوں اس کے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خانساماں اور ملازمہ بھی ہیں لیکن وہ رات کو چلے جاتے ہیں۔''

''تم نے کہا گواہ؟''

''ہاں، جب انہوں نے فائر کی آواز سنی تو لائبریری کے دروازے کا تالا توڑا گیا۔ وہ تینوں اندر داخل ہوئے اور انہوں نے کھڑکیوں کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد پولیس نے بھی کھڑکیاں دیکھیں۔''

''لاش کہاں تھی؟''

''آتش دان کے سامنے فرش پر۔''

''پستول اس کے ہاتھ میں تھا؟''

پولارڈ تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔ ''نہیں، وہ لاش سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔''

''اوہ، کون سا ہتھیار تھا؟''

''اس کا اپنا بڑے سائز کا پستول۔''

''زخم کہاں لگا؟''

''اس کے سینے پر۔''

کوئن نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''پستول سے خودکشی کرنے والے عام طور پر اپنے سر میں گولی مارتے ہیں۔''

''لیکن ہمیشہ نہیں۔''

''جب دوسرے لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو کیا لانگ ریس مرچکا تھا؟''

ایک بار پھر پولارڈ ہچکچایا۔ ''نہیں، لیکن اس کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ مرگیا۔''

''کیا اس نے ان چند سیکنڈ کے دوران کچھ کہا؟''

''وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا جس کا کوئی مطلب نہیں۔''

''اور وہ کیا الفاظ تھے؟''

''پک اپ اسٹکس۔''

کوئن نے وہ جملہ دہرایا۔ ''کیا اس نے یہی الفاظ کہے تھے؟''

''دو مردوں اور ایک عورت نے یہی سنا تھا۔''

''اور کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''نہیں، بلاشبہ آخری وقت میں زبان سے یہی کچھ نکلتا ہے۔''

کوئن ایک بار پھر کان کھجانے لگا۔ پولارڈ نے کہا۔ ''کیا تم اس کی تحقیقات کرنے پر راضی ہو؟''

''ہاں، تمہیں میری فیس کے علاوہ اخراجات دینا ہوں گے۔ مجھے مدعی اور گھر کے دوسرے افراد کے بارے میں معلومات کے علاوہ ایک تعارفی خط بھی درکار ہوگا۔''

''خط کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم اس کام کے لیے تیار ہو جاؤ گے اس لیے میں نے فلپ شیرون کو تمہارا نام دے دیا تھا۔ صرف یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تمہارا کام اسے خودکشی ثابت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''میں یہ بات یاد رکھوں گا۔''

لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ خودکشی میں سر پر گولی ماری جاتی ہے۔ سینے پر زخم لگنا ایک انہونی بات ہے پھر یہ کہ مرنے والے نے خودکشی کرنے کے لیے رات ڈھائی بجے کا وقت کیوں منتخب کیا پھر یہ کہ مرتے وقت کوئی پک اپ اسٹکس جیسے الفاظ ادا نہیں کرتا جب تک ان کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ اگر ان تینوں خلاف قاعدہ باتوں کو یکجا کیا جائے تو لگتا یہی ہے کہ الفریڈ لانگ ریس نے خودکشی نہیں کی۔

☆☆☆

سینا گنگنا رہی تھی۔ ''ون ٹو، بکل مائی شو۔ تھری فور، شٹ دی ڈور۔''

''یہ کیا ہے مائی ڈیئر؟''

''ایک پرانی نظم، فائیو سکس، پک اپ اسٹکس۔''

کوئن نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے یہ نہ بتانا کہ ایک شدید زخمی مرتے وقت ایک نرسری کی نظم کا حوالہ دے رہا ہوگا۔''

''میں صرف اس کی ممکنہ وضاحت کر رہی تھی۔''

جیکسن پولارڈ سے ملاقات کے بعد جب کوئن نے سینا کو اس نئے کام کے بارے میں بتایا تو یہ اسے بہت دلچسپ اور چیلنجنگ لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا کوئن اسے اپنے ساتھ لانگ ریس کے گھر لے جائے گا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا اور اس طرح کی گتھی کو سلجھانے کے لیے ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔

ویسے تو کوئن اپنے طور پر ہی تحقیقات کرنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن وہ سینا کو انکار نہ کر سکا کیونکہ اب ان دونوں کے درمیان محض پیشہ ورانہ تعلق نہیں رہا بلکہ وہ ایک دوسرے میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور ان کی عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ ویسے بھی وہ اسے جتا چکی تھی کہ وہ اس طرح کے پیچیدہ کیس حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لہٰذا کوئن نے اسے اس مہم میں شامل کر لیا اور دونوں نے ان معلومات پر تبادلۂ خیال کیا جو جیکسن پولارڈ نے فراہم کی تھیں۔ جب وہ لانگ ریس کے گھر جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہوئے تو کوئن نے ایک بار پھر ان باتوں کا جائزہ لیا۔

اس کے بھانجے کے مطابق متوفی حاکم مزاج، کنجوس اور رازداری برتنے والا شخص تھا۔ اس کی واحد خوبی اپنے خاندان سے وفاداری تھی۔ وہ اس جگہ کنجوسی سے کام نہ لیتا جہاں اس کی اپنی دلچسپی ہوتی۔ اس نے قدیم تاریخ اور یونانی دیومالائی داستانوں سے متعلق نایاب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اس موضوع پر کتاب بھی لکھنی شروع کر دی تھی۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ کبھی افسردگی یا مایوسی میں مبتلا نہیں ہوا جس کے نتیجے میں وہ خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھاتا۔

فلپ شیرون کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ غیر شادی شدہ اور ناکام بزنس مین تھا۔ مالی پریشانی کے علاوہ وہ جوئے اور عورتوں کا رسیا بھی تھا۔ انہی کمزوریوں کی وجہ سے وہ اپنے ماموں کے گھر پناہ لینے پر مجبور ہوا جہاں وہ گزشتہ تین سال سے رہ رہا تھا۔ لانگ ریس نے اس شرط پر اس کے قیام وطعام کی ذمے داری قبول کی تھی کہ وہ اپنی بری عادتیں ترک کر کے کوئی ملازمت تلاش کرے۔ شیرون کے پاس ان شرائط کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماموں کی وصیت کے مطابق سب کچھ اسی کو ملے گا۔

ایرلین گزشتہ برس اس گھر میں آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ الفریڈ کی فرم میں سیکریٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اس کی نئی ذمے داریوں میں الفریڈ کی کتابوں کے ذخیرے کی کیٹلاگ تیار کرنا۔ اس کے خطوط اور کتاب کے مسودے

کو صاف کر کے لکھنا شامل تھا جبکہ فلپ شیرون کا خیال تھا کہ وہ اس کے ماموں کی محبوبہ ہے حالانکہ ان دونوں کی عمروں میں تقریباً چالیس سال کا فرق تھا۔ اس کے خیال میں ایرلین اس تعلق سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ الفریڈ اس کے ساتھ فراخ دلی اور مہربانی سے پیش نہیں آتا تھا پھر وہ کیوں اس گھر میں رہ رہی تھی۔

گھریلو ملازم گریگ پچاس سالہ کنوارا تھا اور لانگ ریس کے ساتھ کئی سالوں سے رہ رہا تھا۔ بظاہر الفریڈ کا رویہ اس کے ساتھ بھی حقارت آمیز تھا پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ایک طویل عرصے سے وہاں رہ رہا تھا۔

ٹیکسی گولف اسٹریٹ پر مڑی تو سبینا کی اچانک ہی ہنسی چھوٹ گئی۔ کوئن نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ”میں کچھ سوچ رہی تھی۔“ سبینا نے کہا۔ ”پک اپ اشکس کی ایک عجیب وضاحت۔ کیا تم سننا چاہو گے؟“

”ضرور۔“

وہ دوبارہ ہنسی۔ ”فرض کرو کہ لانگ ریس کو واقعی قتل کیا گیا اور وہ مرتے وقت قاتل یعنی فلپ شیرون کا نام لینا چاہ رہا تھا۔“

”اس جملے کا اشارہ شیرون کی طرف کیسے ہو سکتا ہے؟“

”مسٹر لانگ ریس کے پاس یونانی دیومالائی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور ان داستانوں میں جو ملاح نئی لاشوں کو دریا کے پار لے کر جاتا ہے۔ اس کا نام کیرون تھا جو شیرون سے ملتا جلتا ہے۔ پک اپ اشکس، کا مطلب ہے پک اپ شیرون۔“

کوئن نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور مجھے تمہاری صلاحیتوں کا بھی اعتراف ہے لیکن بہتر ہو گا کہ ہم ان الفاظ کے بارے میں کوئی ذہنی مشقت نہ کریں۔“

لانگ ریس ہاؤس خاصا بڑا محل نما مکان تھا جس کے چاروں طرف لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ مرکزی عمارت تک جانے کے لیے دو رویہ سڑک تھی جس کے دونوں گیٹ آدھے کھلتے تھے۔ ٹیکسی پورچ میں جا کر رکی جہاں گھر کے ملازم گریگ نے ان کا استقبال کیا۔ اگر اسے ایک کے بجائے دو سراغ رسانوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی ہو گی تب بھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

کوئن نے اپنا اور سبینا کا تعارف کروایا اور اسے دونوں کے تعارفی کارڈز پکڑا دیے۔ گریگ نے احتراماً سر ہلایا اور انہیں اندر لے گیا۔ راستے میں اس نے کوئن کے استفسار پر بتایا کہ فی الوقت وہ اور ایرلین ہی مکان میں موجود ہیں۔ شیرون صبح سویرے ہی تدفین کے انتظامات کے سلسلے میں چلا گیا تھا اور اس کی واپسی جلد متوقع تھی۔

گریگ نے بتایا کہ ایرلین اپنے کمرے میں ہو گی۔

کوئن چاہتا تھا کہ وہ اور سبینا اس سے ملنے سے پہلے لائبریری دیکھ لیں اور گریگ سے کچھ گفتگو بھی ہو جائے۔

وہ ایک بڑے ہال سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رک گئے جس میں شاہ بلوط کی لکڑی کے دو دروازے لگے ہوئے تھے۔ ”یہی ہے لائبریری“ گریگ نے کہا۔

دونوں دروازوں کے درمیان چھ انچ کا خلا تھا اور اس میں سے دھات کا ایک بل کھایا ہوا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ کوئن نے ایک دروازہ کھولا اور دیکھا کہ اندر کے سوراخ میں ایک پیتل کی چابی ٹیڑھی ہو کر باہر کی جانب نکلی ہوئی تھی۔

”دروازہ کس طرح کھولا گیا؟“ اس نے پوچھا۔

”پارلر کے آتش دان کی کرچھی سے۔“

”تالا تم نے توڑا تھا؟“

”نہیں، مسٹر شیرون نے۔ میں نے انہیں کرچھی لا کر دی تھی۔“

”کیا فائر کی آواز سن کر سب سے پہلے وہی آیا تھا؟“

”جی جناب، جب میں نیچے آیا تو وہ دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔“

”اور ایرلین؟ وہ کب آئی؟“

”دروازہ توڑنے کے فوراً بعد۔“

جب کوئن تالے کا معائنہ کر چکا تو گریگ انہیں کمرے کے اندر لے گیا اور دیوار میں لگا ہوا ایک سوئچ آن کر کے فانوس روشن کر دیا۔ وہ ایک بڑا اور اونچی چھت والا کمرا تھا۔ دو دیواروں میں کتابوں کے شیلف لگے ہوئے تھے۔ تیسری دیوار کے بڑے حصے کو پھول دار ریشمی پردے نے ڈھانپ رکھا تھا اور صرف ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ چوتھی دیوار میں اینٹوں سے بنا ہوا آتش دان تھا جو بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ اس کا ماربل سے بنا ہوا کارنس خالی تھا۔ آتش دان کے فرش کے باہر پیتل کے اوزار اور تھوڑی سی لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں دو آرام کرسیاں، دو لیمپ، ایک بڑی پڑھنے کی میز اور دو کرسیاں بھی تھیں۔

گہرے براؤن رنگ کے قالین پر اب بھی خون کے دھبے نظر آ رہے تھے گو کہ انہیں صاف کرنے کی کوشش کی گئی

تھی۔ کوئن کو ایک آرام کرسی کے قریب خون کا دھبا نظر آیا جو ایک لکیر بناتا ہوا تین فٹ تک چلا گیا تھا جبکہ آتش دان سے پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا دھبا بھی نظر آرہا تھا۔ اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ لانگ ریس زخمی ہونے کے بعد رینگتا ہوا اس جگہ سے دور ہو گیا تھا جہاں اسے گولی لگی لیکن اس کا رخ دروازے کی طرف نہیں تھا، کیوں؟

کوئن نے گریگ سے پوچھا۔ ''جب تم لوگ اندر آئے تو لاش کہاں پڑی ہوئی تھی؟'' گریگ نے دوسرے دھبے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ کمر کے بل لیٹا ہوا تھا یا الٹا؟''

''وہ منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔''

''اور پستول کہاں تھا؟''

''اس کے پھیلے ہوئے بازو سے کچھ فاصلے پر۔''

''کتنا فاصلہ؟ کچھ انچ، ایک فٹ یا اس سے بھی زیادہ؟''

''تقریباً بارہ انچ۔''

سینا نے کوئن کی طرف دیکھ کر آہستہ سے سر ہلایا۔ اس نے بھی خون کی لکیر اور پستول کی جگہ پر غور کیا تھا۔ اگر گولی خود چلائی جاتی تو پستول کو چار فٹ دور جا کر گرنا چاہیے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ لانگ ریس پستول کی طرف بڑھ رہا ہو شاید اپنے آپ کو دوسری بار گولی مارنے کے لیے لیکن یہ بھی مشکل لگ رہا تھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ پستول مسٹر لانگ ریس کا تھا۔'' کوئن نے کہا۔ ''کیا وہ اسے یہیں رکھتا تھا؟''

''نہیں، اپنے بیڈروم کی دراز میں۔''

''اس نے دم توڑنے سے پہلے پک اپ اشکس، کے الفاظ ادا کیے تھے؟''

''جی جناب۔''

''اور تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ ان کا کیا مطلب تھا؟''

''نہیں، اس نے پہلے کبھی ایسا جملہ نہیں کہا۔''

''اس نے یہ الفاظ کس طرح ادا کیے تھے؟'' سینا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک ساتھ یا الفاظ کے درمیان وقفہ تھا؟''

گریگ نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آخری لفظ سے پہلے وقفہ تھا۔''

''پک اپ..... اشکس۔''

''ہاں۔''

''جب اس نے یہ الفاظ ادا کیے تو کیا اس وقت بھی وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا؟''

''اس نے اپنا بازو اٹھایا جیسے وہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اسے مشکل پیش آئی۔ اگلے لمحے وہ دم توڑ چکا تھا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے خودکشی کی؟'' کوئن نے پوچھا۔

''مجھے یہ ناممکن لگتا ہے۔ مسٹر لانگ ریس مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ میں نے انہیں کبھی پریشان یا دل شکستہ نہیں دیکھا۔''

''دوسرے لفظوں میں وہ زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا؟''

''جی جناب، یہ یقیناً ایک حادثہ ہے۔''

''کیا اسے نصف شب کے قریب لائبریری میں جانے کی عادت تھی؟''

''میرے علم میں نہیں۔ وہ عموماً دن کے وقت لائبریری میں آتے تھے۔''

''کیا تم اس کی کوئی وضاحت پیش کر سکتے ہو کہ وہ رات ڈھائی بجے پستول لے کر لائبریری میں کیوں آیا؟''

''نہیں۔'' گریگ نے کہا۔ ''سوائے اس کے کہ کوئی آواز سن کر ان کی آنکھ کھل گئی ہو اور وہ تحقیق کے لیے نیچے آئے ہوں۔''

''کیا کبھی تمہارے گھر یا اس علاقے میں رات کے وقت کوئی چوری ہوئی؟''

''نہیں لیکن مسٹر لانگ ریس اپنی کتابوں کی حفاظت کے بارے میں فکرمند رہتے تھے کیونکہ ان میں کچھ کتابیں بہت قیمتی اور نایاب ہیں۔''

''کیا تم نے گولی چلنے سے پہلے کچھ اور آوازیں سنی تھیں؟''

''نہیں جناب۔ میں فائر کی آواز سن کر ہی بیدار ہوا تھا۔''

''تمہارا کمرا کہاں ہے؟'' سینا نے پوچھا۔

''شمال کی طرف دوسرا۔''

''مسٹر شیرون اور مس ایرلین کے کمرے کہاں ہیں؟''

''جنوب میں مسٹر لانگ ریس کے بعد دو کمرے چھوڑ کر اور مس ایرلین کا مسٹر لانگ ریس کے برابر والا کمرا ہے۔''

''کیا اس مکان میں کوئی عقبی یا بغلی زینہ بھی ہے؟''

''یس میڈم، جنوب کی جانب عقب میں۔''

''کیا لائبریری کا دروازہ ہمیشہ رات میں مقفل رہتا ہے؟'' کوئن نے پوچھا۔

''صرف دروازہ ہی نہیں بلکہ دونوں کھڑکیاں بھی۔'' گریگ نے کہا۔ ''لیکن صرف رات میں ہی نہیں بلکہ مسٹر لانگ ریس کی غیر موجودگی میں بھی لائبریری کا دروازہ اور کھڑکیاں مقفل ہوتی تھیں۔''

''کیا مس ایرلین کے پاس دروازے کی چابی ہوتی ہے؟''

''نہیں، لائبریری کی چابی صرف مسٹر لانگ ریس کے پاس ہوتی تھی۔''

''تم اپنے مالک کے بارے میں کیا محسوس کرتے تھے؟''

گریگ یہ سوال سن کر حیران رہ گیا۔ ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ وہ کنجوس اور سخت مزاج تھا۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔ بعض اوقات وہ بہت سخت گیر ہو جاتے تھے۔''

''لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم یہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ تمہیں یہاں کام کرتے ہوئے کتنے سال ہو گئے؟''

''میں نو سال سے یہاں کام کر رہا ہوں۔'' گریگ نے کہا۔ ''ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں دوسری ملازمت تلاش کرتا۔ مجھے ایک آرام دہ کمرا ملا ہوا ہے اور کام بھی کچھ زیادہ نہیں۔''

کوئن سمجھ گیا کہ صرف اتنی بات نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''اگر اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے تو وہ بھی بتا دو۔''

''بہت بہتر، مسٹر لانگ ریس نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اپنی وصیت میں میرے لیے ایک معقول حصہ رکھا ہے۔ وہ سخت گیر ضرور تھے لیکن انہیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی۔''

''اس لیے تمہیں اس سے کوئی عداوت نہیں تھی؟''

''بالکل نہیں۔''

''کیا مسٹر شیرون یا مس ایرلین کی اس سے کوئی دشمنی تھی؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم ان سے ہی پوچھ لو۔''

سبینا نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تو کوئن نے گریگ سے کہا کہ وہ ایرلین کو بلائے۔ وہ پارلر میں اس کا انتظار کرے گا۔

جب وہ اور سبینا اکیلے رہ گئے تو انہوں نے لائبریری کا تفصیل سے معائنہ کیا۔ سبینا پہلے پڑھنے کی میز پر گئی اور کوئن کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹانے لگا۔

دونوں کھڑکیاں پیتل کے فریم میں فٹ تھیں اور ہر ایک میں دو دروازے لگے ہوئے تھے۔ ان فریموں کو بولٹ لگا کر ٹائٹ کیا گیا تھا اور ان میں چھوٹی ناب لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں کے دروازے باہر کی جانب کھلتے تھے۔ کوئن نے تین مرتبہ ناب گھما کر چٹخنی ہٹائی۔ اس نے پوری کھڑکی کو اوپر سے نیچے اور پھر لکڑی کے فریم کو دیکھا۔ اس کے بعد اس نے باہر سر نکال کر نیچے دیکھا۔ دونوں کھڑکیوں کے نیچے بارہ انچ چپ بورڈ کا بارڈر بنا ہوا تھا۔ اسے چپ پر کوئی نشان نظر نہیں آیا۔

وہ دوسری کھڑکی کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے دیکھا کہ سبینا اب آتش دان کے پاس کھڑی چولھے کی اینٹوں کو دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کوئی باہر کا فرد چمنی کے راستے اندر آیا ہو پھر وہ سیدھی ہوئی اور قریبی بک شیلف پر چلی گئی۔

دوسری کھڑکی بھی پوری طرح مقفل تھی۔ کوئن نے چٹخنی ہٹائی اور دونوں دروازے کھول دیے۔ تبھی اس نے لکڑی کی چوکھٹ کے باہر والے حصے پر ایک ہلکا نشان دیکھا جیسے نرم لکڑی کو کھرچا گیا ہو۔ وہ گہرا اور لمبا نہیں لیکن تازہ تھا۔

کھڑکی کی چوکھٹ پر کوئی نشان نہیں تھا لیکن جب اس نے بائیں ہاتھ کے فریم کے اوپری کونے پر ہاتھ رکھا تو اس کی انگلی لکڑی کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے ٹکرائی۔ اس نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر اسے اٹھا لیا۔ وہ ابھی اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ سبینا نے اسے آواز دی۔

''جان، یہاں آؤ۔ یہ دیکھو۔''

اس نے وہ ٹکڑا اپنی جیب میں رکھا۔ کھڑکی بند کی اور سبینا کے پاس چلا گیا جو ایک بک شیلف پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کی جلد والی کتاب اور دوسرے میں دو ضرب دو کا سفید کارڈ تھا۔ کوئن نے دیکھا کہ اس کتاب پر سنہرے حروف میں مقدس بائبل لکھا ہوا تھا۔

''ان الماریوں میں قدیم تاریخ یا یونانی دیومالا کے علاوہ یہ واحد کتاب ہے۔'' سبینا نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے اسے نکال لیا۔ یہ کارڈ اس کے اندر ہی تھا۔''

سبینا نے وہ کارڈ اسے پکڑا دیا۔ وہ ایک کم قیمت کارڈ

تھا اور دیکھنے میں کافی پرانا لگ رہا تھا اور اس پر آڑی ترچھی تحریر میں لکھا ہوا تھا RL4692618356۔

''تم اس سے کیا سمجھ رہے ہو؟'' سینا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''دو حروف اور نمبروں کی ایک قطار۔ اس کی ضرور کوئی اہمیت ہے ورنہ اسے بائبل میں نہ رکھا جاتا۔''

''شاید یہ انجیل کا کوئی حوالہ ہو۔''

''ایسا لگتا نہیں ہے۔''

''کیا بائبل پر بھی کچھ لکھا ہوا ہے؟''

''نہیں، یہ پرانا نسخہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ لانگ ریس کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا۔''

''کارڈ بھی پرانا ہے۔ شاید پرانے مالک نے اسے بائبل میں رکھا ہو۔''

''یا مسٹر لانگ ریس نے۔'' سینا نے کہا۔ ''اگر یہ اس کی ہینڈ رائٹنگ ہے، دوسری کتابوں میں بھی نسبتاً نئے کارڈز ہیں جن پر خریداری کی تاریخ، کتاب کی قیمت اور دیگر حوالے درج ہیں۔ ان سب کی ہینڈ رائٹنگ ایک جیسی ہے لیکن بائبل والے کارڈ سے مختلف۔''

''ان کتابوں کی فہرست بنانے کی ذمے داری مس ایرلین کی تھی؟''

''ہاں۔''

''کیا اس کے علاوہ بھی تمہیں کچھ ملا؟''

''میز کی دراز میں اس کتاب کا مسودہ ملا جو مسٹر لانگ ریس لکھ رہے تھے۔''

کوئن نے کارڈ واپس کر دیا لیکن سینا نے اسے بائبل کے بجائے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ شاید وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی لیکن کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر کچھ کہنا اس کی عادت میں شامل نہیں تھا۔

ایرلین پارلر میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ گریگ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھے ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ایرلین سنہرے بالوں والی جوان خوب صورت عورت تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ تمہیں کون سی بات بتاؤں جو تم پہلے سے نہیں جانتے۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''مسٹر لانگ ریس نے ارادتاً یا حادثاتی طور پر اپنے آپ کو گولی ماری۔ کیا بظاہر ایسا نہیں لگتا؟''

''کیا ایسا ہی ہے؟'' کوئن نے کہا۔

''لائبریری کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ مسٹر شیرون، گریگ اور مجھے اس کا یقین ہے۔''

''سب سے پہلے کس نے کھڑکیاں چیک کیں؟''

''مجھے یاد نہیں۔ اس وقت افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔''

''کیا دونوں کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے؟''

''ہاں، مسٹر لانگ ریس ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ رات کے وقت کھڑکیوں پر پردے ہوں۔''

''کیا کھڑکیاں دن میں بھی بند رہتی ہیں؟''

''عام طور پر بشرطیکہ موسم بہت گرم نہ ہو۔''

''کیا اس کی موت والے دن کسی وقت کھڑکیاں کھولی گئی تھیں؟''

''نہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اس واقعے سے کھڑکیوں کا کیا تعلق ہے؟''

سینا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''آتش دان میں آگ کب جلائی گئی تھی؟''

''آگ؟ سال کے ان دنوں میں؟''

''سال میں کسی بھی وقت؟''

''کبھی نہیں جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ مسٹر

ویرانے میں ٹرک میں ڈیزل ختم ہو گیا۔ آخری پیٹرول پمپ وہ دس بارہ کلو میٹر پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ میجر ملکھا سنگھ نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھالی اور ٹرک میں موجود پندرہ جوانوں کو حکم دیا کہ ٹرک کو دھکا دے کر واپس پیٹرول پمپ تک لے جائیں۔

پہاڑی ڈھلان پر چڑھتے چڑھتے وہ سب بے حال ہو گئے۔ فوجی ٹرک بہت وزنی تھا۔ ملکھا سنگھ اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے اپنے جوانوں کو ہشکارتے اور جوش دلاتے رہے۔

پیٹرول پمپ آ ہی گیا۔ ٹرک کی ٹینکی بھروانے کے بعد ڈرائیور نے رسانیت سے میجر ملکھا سنگھ کے کان میں کہا۔ ''سر! خالی کین میں بھی ڈیزل بھروا لیں..... کہیں نہ کہیں کام آ جائے گا۔''

''وہ تو پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔'' میجر نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''میں نے کسی آڑے وقت کے لیے اسے سپلائی کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔''

کوہاٹ سے ندیم علی شاہ بنوری کا تعاون

لانگ ریس کا خیال تھا کہ دھوئیں سے ان کی کتابیں خراب ہوسکتی ہیں اور ویسے بھی گھر میں سینٹرل ہیٹنگ ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی اہمیت ہے۔"

"شاید نہ ہو۔ میں نے اس لیے پوچھا کہ چولھا بالکل صاف نظر آرہا تھا۔" کیا مسٹر لانگ ریس نے حال ہی میں تمہیں مایوس کیا تھا؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔ وہ عام طور پر ایسا ہی سلوک کرتے جیسے میں نے کچھ غلط کر دیا۔ وہ اپنی مرضی کا کام چاہتے تھے کہ سب کچھ ایک خاص طریقے سے کیا جائے۔"

"کیا اس کے ساتھ تمہارے اچھے تعلقات تھے؟"

"ہاں۔"

"کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا؟"

"وہ فراخ دل نہیں تھے۔" ایرلین نے کہا۔ "شاید تمہیں یہ بات پہلے سے معلوم ہو کہ ہمارے درمیان کبھی میری تنخواہ یا کسی اور معاملے پر بحث نہیں ہوئی۔"

"تو تم اپنی پوزیشن سے مطمئن تھیں؟"

"ہاں، کوئی دوسری ملازمت ملنا اتنا آسان نہیں جس میں قیام وطعام کی سہولت ہو۔"

"مسٹر لانگ ریس کی وفات کے بعد کیا تم یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہو؟"

"کل یا پرسوں۔ اب میرے یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں۔" ایرلین نے کہا۔ "مسٹر شیرون کو یقیناً میری خدمات کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

سینا اس سے اس کے کام کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ کوئن نے گریگ کو ڈیوڑھی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ ملازم نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

"جی جناب؟"

"گریگ مجھے بتاؤ کہ مسٹر لانگ ریس کی وفات کے بعد سب سے پہلے کس نے لائبریری کی کھڑکیاں چیک کیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں فوراً ہی پولیس کو فون کرنے چلا گیا تھا۔"

"لیکن کیا تم نے واپس آنے کے بعد چٹخنیاں دیکھی تھیں؟"

"جی ہاں، وہ سب پوری طرح بند تھیں جیسا کہ مسٹر شیرون نے بتایا تھا۔"

"کیا تمہیں اس کی بات پر شبہ تھا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ جب ہم پولیس کا انتظار کر رہے تھے تو میں کھڑکیاں دیکھنے چلا گیا۔"

کوئن نے کہا۔ "ایک بات اور۔ کیا یہاں ایسا کوئی کمرا ہے جس میں جھاڑو، ماپ اور ایسی ہی گھریلو استعمال کی چیزیں رکھی جاتی ہوں؟"

"جی جناب، وہ کمرا کچن کے پیچھے ہے۔"

"مجھے وہاں لے چلو۔"

گریگ نے ایسا ہی کیا اور کوئن کو وہاں چھوڑ کر چلا آیا۔ کوئن کو اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ چیز اسے کیبنٹ کی دراز میں مل گئی۔ اس نے اسے اپنی جیب میں رکھا اور واپس پارلر میں آگیا۔

وہاں ایک اور شخص موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "گڈ آفٹرنون مسٹر کوئن۔ میں فلپ شیرون ہوں۔"

"کیا حال ہے مسٹر شیرون؟"

"اس کا انحصار اس سوال کے جواب پر ہے جو تمہاری بہت ہی خوب صورت ساتھی نے مجھ سے پوچھا ہے۔ کیا تم مطمئن ہو کہ میرے انکل کی موت ایک اتفاقی حادثہ تھی؟"

کوئن نے کہا۔ "نہیں، ہم بالکل مطمئن نہیں ہیں۔"

شیرون کا رویہ بدل گیا۔ "لیکن یہی ایک معقول وضاحت ہے۔ اس نے خودکشی نہیں کی۔ وہ کبھی اپنی زندگی کا خاتمہ نہ کرتا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ اس نے خودکشی کی یا اس کی موت ایک حادثہ تھی، اسے قتل کیا گیا ہے۔"

ایرلین نے ہلکی سانس لی۔ شیرون کے چہرے پر بے یقینی نظر آنے لگی۔ یہاں تک کہ گریگ بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ صرف سینا نے سر ہلایا اور مسکرانے لگی۔

"قتل۔" شیرون نے کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ لائبریری میں اکیلے تھے اور دروازہ کھڑکیاں بند تھیں۔"

"ہاں، جب اس کی لاش ملی تو وہ اکیلا ہی تھا لیکن اس وقت نہیں جب اسے گولی لگی اور دونوں کھڑکیاں مقفل نہیں تھیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے خود کھڑکیاں چیک کی تھیں۔"

"کیا تم انہیں چیک کرنے والے پہلے شخص تھے؟"

"مجھے یاد نہیں۔ شاید میں ہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی اہمیت ہے۔"

کوئن نے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی اور ایرلین سے پوچھا۔ "عام طور پر مسٹر لانگ ریس کس طرح کھڑکیاں مقفل کرتے تھے؟ کیا وہ ناب پوری طرح گھماتے یا محض

دروازے کا ہینڈل کھینچ لیتے تھے؟"

"مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ میں اس وقت لائبریری میں نہیں ہوتی تھی۔"

"تم نے بتایا کہ اس روز دن میں کھڑکیاں بند تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس نے بعد میں کسی وقت بے پروائی سے ہینڈل کھینچ کر انہیں بند کیا ہوگا لیکن ایک کھڑکی میں ایسا نہیں ہوا۔ اس کے دونوں دروازے باہر کی جانب سے کسی اور طرح بند کیے گئے تھے۔"

"کیا مطلب؟" شیرون نے پوچھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" کوئن نے کہا۔ "میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

جب وہ سب لائبریری میں اکٹھے ہو گئے تو وہ مذکورہ کھڑکی پر گیا۔ اس نے چٹخنی ہٹائی اور دونوں پٹ کھول دیے۔ اس نے چوکھٹ کے بیرونی کنارے پر لگے ہوئے نشان کی طرف اشارہ کیا پھر اس سیاہ ٹکڑے کے بارے میں بتایا جو فریم کے اوپری حصے پر لگا ہوا تھا۔

"شیرون نے کہا۔ "کیسا ٹکڑا؟"

کوئن نے اسے ایک مثلث نما چھوٹا ٹکڑا دکھایا جو اسے کمرے کی دراز سے ملا تھا۔ اس نے اسے اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ربر ہے اور یہ دروازے کو روکنے یا کھلا رکھنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک دروازے کے اوپری اور دوسری نچلے حصے میں لگائی گئی۔ ان کی وجہ سے ہینڈل کھینچنے کے باوجود کھڑکی کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا۔"

"میں نے ہینڈل نہیں کھینچے تھے اور جب پولیس آئی تو بولٹ اپنی جگہ پر تھے۔"

"جس نے پہلے کھڑکیاں چیک کیں، اسی نے ہینڈل گھمایا ہوگا۔"

شیرون نے کہا۔ "پھر وہ پہلا آدمی میں نہیں تھا۔"

"کیا پولیس نے کھڑکیاں کھولیں؟"

"نہیں۔"

"میرا خیال ہے نہیں۔ لہٰذا ان کے جانے کے کچھ دیر بعد بھی یہ ٹکڑے اپنی جگہ لگے رہے پھر انہیں چوری چھپے نکال کر اس کمرے میں رکھ دیا گیا جہاں سے یہ مجھے ملے۔"

"حیرت کی بات ہے۔ ہم میں سے کوئی یہ چالبازی کیوں کرے گا؟"

سبینا نے کہا۔ "تمہارے انکل کے سیف کی تلاشی لینے کے لیے۔"

کوئن سمیت سب لوگوں کے سر اس کی جانب گھوم گئے۔

"وہاں کوئی سیف نہیں ہے۔" ایرلین نے کہا۔

"تمہارے آنے سے پہلے مسٹر لانگ ریس نے کئی سال قبل ایک خفیہ سیف نصب کروایا تھا۔ اتفاقاً یا اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے اس کا انکشاف ہو گیا جس کسی نے بھی اسے قتل کیا۔ وہ اس سیف کے بارے میں جانتا تھا اور اس میں مقفل کسی چیز کے لیے بہت زیادہ خواہش مند تھا۔"

"وہ کون ہے؟"

"تم، مس ایرلین۔"

"میں؟" سیکریٹری کی زوردار آواز سنائی دی۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر الزام لگانے کی؟"

اس عورت کا غصہ بناوٹی تھا۔ کوئن فوراً ہی سمجھ گیا۔ اسے پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔ سبینا نے کہا۔ "تم نے اپنا زیادہ وقت اس کمرے میں گزارا۔ یقیناً مسٹر لانگ ریس ہمیشہ وہاں نہیں ہوتے تھے۔ تمہارے لیے اس روز اکیلے میں کھڑکیاں کھولنا، اس کے ذریعے باغ میں جانا اور فریم میں ڈورا سٹاپرز لگانا بہت آسان تھا۔ تم نے گولی کی آواز سن کر فوراً کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ تمہیں کھڑکی سے باہر کودنے، ڈورا سٹاپرز نکالنے اور اپنے کمرے تک جانے اور گاؤن پہننے میں کافی وقت لگ گیا۔"

"تمہارے پاس ان باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"ہمیں بہت جلد ثبوت مل جائے گا بشرطیکہ میرا اندازہ غلط نہ ہو۔"

شیرون نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ منحوس سیف کہاں ہے؟"

"پک اپ انکس۔" سبینا نے کہا۔

"کیا؟"

"مسٹر لانگ ریس انہی الفاظ کے ذریعے اس سیف کی موجودگی اور جگہ کے بارے میں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ رینگتا ہوا وہاں تک گیا جہاں اس کی لاش ملی تھی۔ اس نے اپنا بازو اٹھا کر اشارہ کیا۔ اس نے مس ایرلین کا نام لینے کے بجائے یہ الفاظ ادا کیے کیونکہ اسے سیف میں جس چیز کی بھی تلاش تھی وہ اس کو مجرم ثابت کر دیتی۔ اس رات اسے اس چیز کو ہٹانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ یہ کام پچھلے دو دنوں میں کر سکتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ لائبریری کا دروازہ زیادہ دیر بند نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے غیر ضروری طور پر خطرہ مول نہیں لیا۔ تم یا گریگ سیف

کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ پولیس کو بھی وہ نہیں ملی اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اور میرا ساتھی اس سیف کو دریافت کرلیں گے۔ وہ معاملہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرسکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی مطلوبہ چیز ابھی تک سیف میں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، مس ایرلین؟"

اس عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے گھورنے کے انداز سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ شیرون نے سبینا سے کہا۔ "میں ابھی تک ان تین لفظوں کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"پک اپ..... اسٹکس۔ آخری دو الفاظ کے درمیان وقفہ ہے۔ اگر تمہارا انکل کچھ دیر اور زندہ رہتا تو اس میں ایک چوتھے لفظ کا بھی اضافہ ہوجاتا' پک اپ..... اسٹکس .....ووڈ۔"

سبینا آتش دان کے چولھے کے پاس گئی۔ "یہاں نصف درجن جلانے کی لکڑیاں رکھی ہوئی ہیں اور انہیں استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ ایرلین نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس چولھے میں کبھی آگ نہیں جلائی گئی۔ ان لکڑیوں کو یہاں رکھنے کا مقصد کچھ چھپانا تھا۔"

کوئن نے سوچا کہ اسی لیے سبینا آتش دان میں دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ اس کے مشاہدے اور قیاس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر کچھ لکڑیاں ہٹائیں تو اسے وہاں دو مربع فٹ کا خلا نظر آیا۔ جسے ایک دھاتی پلیٹ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اسے اٹھانے اور ہٹانے کے لیے اس کے سرے پر انگلی کے برابر ایک سوراخ تھا۔ اس کے نیچے ایک سیف کو مضبوطی سے گاڑ دیا گیا تھا جس میں ایک کمبی نیشن ڈائل لگا ہوا تھا۔

شیرون نے پوچھا۔ "اسے کمبی نیشن کے بغیر کیسے کھولا جاسکتا ہے؟"

"مجھے کمبی نیشن معلوم ہے۔" سبینا نے کہا۔ "یہ مجھے وہیں سے ملا جہاں ایرلین نے رکھا تھا۔"

اس نے وہ کارڈ دکھایا جو بائبل میں رکھا ہوا تھا اور بہ آواز بلند اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگی۔ "RL4692618356 یہی کمبی نیشن ہے۔ RL کا مطلب پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب گھمانا ہے اور نمبروں کی ترتیب یہ ہے، دائیں جانب 46 پھر بائیں جانب 9 دائیں جانب 26 بائیں جانب 18 دائیں جانب 35 اور بائیں جانب 6۔"

کوئن نے کارڈ لیا اور اسی ترتیب سے ڈائل گھمایا۔ سیف بڑی آسانی سے کھل گئی۔ اس کے اندر لانگ ریس کی وصیت، تھوڑی سی نقد رقم اور ایک لفافہ جس میں دستاویزی ثبوت تھا کہ ایرلین نے کمپنی کی ملازمت کے دوران دو ہزار ڈالر چوری کیے تھے۔ یہ ثبوت اسے جیل بھیجنے کے لیے کافی تھا۔

"وہ بلیک میلر اور اذیت پسند تھا۔" ایرلین نے روتے ہوئے کہا۔ "اس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ معمولی معاوضہ دے کر مجھ سے کام لیتا رہا اور جب اس کا دل چاہتا وہ میرے کمرے میں آجاتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ ثبوت مجھے محض اذیت دینے کے لیے ہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ میں کبھی یہ سیف نہیں کھول سکتی۔ اگر یہ ثبوت میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں یہاں سے چلی جاتی لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ اس کی بے پروائی کی وجہ سے پستول میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے مجھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی اور اسی کشمکش میں گولی چل گئی اور وہ مرگیا۔ مجھے اس کے مرنے کی خوشی ہے۔"

کوئن نے گریگ سے کہا کہ وہ فوراً پولیس کو فون کرے۔ پھر وہ ایک دوسری ٹیکسی میں مارکیٹ اسٹریٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں سبینا نے کہا۔

"شیرون ہماری بہت تعریف کررہا تھا۔"

"اسے کرنی بھی چاہیے کیونکہ یہ قتل کا کیس ہے اور اب انشورنس کمپنی کو بیمہ کی پوری رقم ادا کرنا ہوگی۔"

"پولارڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اور وہ اس کے بعد بھی تمہیں مزید کام دیتا رہے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم شہر کے بہترین اور سب سے زیادہ قابلِ اعتبار سراغ رساں ہو۔"

"اس کامیابی کا کریڈٹ تمہیں بھی جاتا ہے۔ تم نے ہی پک اپ اسٹکس، کا معما حل کیا تھا۔"

"یہ ہماری مشترکہ کوشش ہے۔" سبینا نے کہا۔ "اگر تم ڈورا سٹاپر کا پتا نہ لگاتے تو کھڑکی کھلنے کا راز سمجھ میں نہ آتا۔"

"کیوں نا اس کامیابی کا جشن منایا جائے؟" کوئن نے کہا۔ "ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے۔"

"اور اس کے بعد؟" کوئن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ اس کے قریب ہوگئی اور اپنا بازو اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

کوئن نے آنکھیں بند کرلیں اور آنے والے رنگین لمحات کے تصور میں کھو گیا۔

❖❖❖

انعام

تنویر ریاض

خوش قسمتی کا ساتھ طویل ہو تو کیا ہی بات ہے... یکایک اس کے ساتھ انہونی ہوتی... قدرت مہربان ہوئی اور حصولِ زر کا انتظام ہو گیا... ستاروں کی چمکتی دنیا کے اسرار... جہاں شکم کی آگ بجھانے کے لیے ہر روز ایک نیا الائو جلانا پڑتا تھا... ایک مزاحیہ کردار ادا کرنے والے فنکار کی جہدِ مسلسل... دوبارہ کھڑے ہونے کے لیے اسے ایک جاندار کردار کی اشد ضرورت تھی...

دولت و شہرت کی چاہ میں اقدامِ قتل کے مرتکب کا سنسنی خیز احوال.....

موسی روز نے اپنے اپارٹمنٹ میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اس ڈر سے فون اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ کہیں یہ سیمی کے ہوٹل سے نہ آیا ہو۔ ایک گھنٹا پہلے وہ وہاں یہ پوچھنے گیا تھا کہ کیا انہیں ایک اور کاؤنٹر مین کی ضرورت ہے۔ اسے اپنی گزر اوقات کے لیے کچھ تو کرنا تھا کیونکہ کومیڈی کی مانگ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے تین ماہ پہلے آخری شو کیا تھا۔

"یہ بینک میں ڈاکا ڈالنے سے تو بہتر ہے۔" اس نے

بڑبڑاتے ہوئے فون اٹھایا۔ وہ ذہنی طور پر یہ ملازمت کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ''موسی بول رہا ہوں۔''

''موسی! میں صبح سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔'' یہ اس کے ایجنٹ کی سیکریٹری برٹ تھی۔

''میں گھر میں نہیں تھا۔ بولو! کیا بات ہے؟''

''ڈینی تم سے ملنا چاہتا ہے۔'' ڈینیل بلوم شروع سے ہی اس کا ایجنٹ تھا۔

''کیا اس کے پاس میرے لیے کوئی کام ہے؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ اس نے تمہیں دفتر میں بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔''

فون رکھنے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈینی بھی اس سے پیچھا چھڑا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو موسی روز کا بطور کومیڈین کیریئر ختم ہو جائے گا۔ اسے شبہ تھا کہ کوئی ایجنٹ اس پرانے وقتوں کے مزاحیہ اداکار کو قبول کر پائے گا۔

ڈینیل بلوم ٹیلنٹ ایجنسی کا دفتر مین ہٹن فلیسٹرون بلڈنگ کی پندرھویں منزل پر تھا۔ موسی دروازے پر دستک دیے بغیر اندر چلا گیا۔ برٹ حسب معمول اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''ہائے موسی!'' اس نے رسمی انداز میں کہا پھر اس نے فون اٹھا کر ڈینی کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس نے مجھے کیوں بلایا ہے؟'' موسی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''جیسا کہ تمہیں پہلے بتایا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' برٹ بولی۔

''اس نے صرف یہ کہا کہ وہ تم سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔''

بلوم کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے موسی کو دیکھتے ہی کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

''ڈینی! کیا ہو رہا ہے؟'' موسی نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں ایک ساتھ کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''اس اپریل میں ستائیس سال ہو جائیں گے۔''

''موسی! میرے پاس تمہارے لیے ایک زبردست کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ستائیس سالوں میں یہ سب سے بڑا موقع ہے۔ کیا تم نے کبھی لائیڈ براؤن کا نام سنا ہے؟''

''وہ جو ہینڈ لیڈر ہے؟''

''نہیں۔ اس کا نام لیس براؤن ہے۔ لائیڈ براؤن اس کاروبار میں نیا ہے اور وہ کومیڈی شارٹ فلمیں بنانے کے لیے لاس اینجلس میں ایک بالکل نیا اسٹوڈیو شروع کر رہا ہے۔''

''کومیڈی شارٹ فلمیں؟ میں سنتا رہتا ہوں کہ اس کا زمانہ ختم ہو گیا۔''

''کسی نے لائیڈ براؤن کو یہ بات نہیں بتائی کیونکہ وہ ایک بالکل نیا آپریشن شروع کر رہا ہے اور اس کام کے لیے اس کے پاس کافی پیسا ہے۔ اس کے باپ کا کیلی فورنیا میں میٹ پیکنگ کا بہت بڑا بزنس ہے لیکن لائیڈ کو اس کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ فلمیں بنانا چاہتا ہے اور ایسے منجھے ہوئے اداکاروں کی تلاش میں ہے جو بہت زیادہ ایکسپوز نہ ہوئے ہوں۔''

اگر آسکر ایوارڈ میں سب سے کم ایکسپوز ہونے والے ایکٹر کی کیٹیگری ہوتی تو موسی کے خیال میں وہ ہر سال اس کے لیے نامزد ہوتا۔

''اس نے تمہیں ایڈمرل براڈوے ریویو میں بوڑھے اسکاٹش لارڈ کے کردار میں دیکھا تھا۔'' ایجنٹ نے کہا۔

''اسے تو تقریباً ایک سال ہو گیا۔'' موسی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں یاد رکھا۔ تم نے اس پر اپنا تاثر قائم کیا اور اب وہ تمہیں لے کر ایک کومیڈی شارٹ فلم بنانا چاہ رہا ہے۔''

''کیا میرا اس میں مرکزی کردار ہو گا؟'' موسی نے پوچھا۔

''بالکل! وہ ایلوی فیلڈ اور بجوئے بیل کو لے کر دوسری شارٹ فلموں کی پلاننگ بھی کر رہا ہے لیکن وہ ان کی اپنی سیریز ہوں گی۔''

''ڈینی! مجھے تفصیل بتاؤ۔''

''پہلے تمہاری فلم کی دو ریلیں شوٹ ہوں گی۔ اگر ان میں تمہاری پرفارمنس اچھی ہوئی تو براؤن تم سے دو سال کا معاہدہ کرے گا جس کے تحت تمہیں ہر سال آٹھ فلمیں کرنا ہوں گی۔''

''ان دو ریلوں کا کیا معاوضہ ملے گا؟''

''ایجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ساڑھے تین۔''

''ساڑھے تین سو؟ ڈینی! یہ تو بہت کم ہیں۔''

"نہیں۔ تین ہزار پانچ سو ڈالر۔"

موسی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "صرف دو ریلوں کے؟"

"تمہیں صرف ایک ہفتہ کام کرنا ہوگا اور جب سیریز چل جائے گی تو تمہیں ایک سال میں آٹھ فلمیں کرنا ہوں گی اور ہر فلم کا معاوضہ پچیس ہزار ڈالر ہوگا۔"

موسی اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ "دو سال کا معاہدہ اور ہر فلم کے پچیس ہزار۔ جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہ ان کا ارادہ بدل جائے۔ مجھے کہاں دستخط کرنے ہیں؟"

گھر آنے کے بعد موسی نے اپنی بیوی ایتھل کو فلوریڈا فون کر کے یہ خبر سنائی کیونکہ اس کی بیاسی سالہ ماں اسپتال میں تھی اس لیے اس نے کچھ روز مزید وہاں رکنے کا فیصلہ کرلیا۔ گو کہ یہ خبر سننے کے بعد اسے اطمینان ہوگیا کہ اب اسے رات میں اچھی نیند آئے گی۔ اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "اب تم بڑے مووی اسٹار بن گئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیک رسل کی خاطر مجھے چھوڑ دو۔"

پانچ دن بعد موسی لاس اینجلس ائرپورٹ پر اترا۔ ایک سیاہ فام شخص شوفر کی کیپ اور جیکٹ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے موسی کا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر روز! میں تمہارے لیے کار لے کر آیا ہوں۔"

"شکریہ۔ تم مجھے موسی کہہ سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک عجیب نام ہے۔"

"شفٹی سے زیادہ نہیں۔" شوفر نے کہا۔

"شفٹی؟"

"میرا نام شفٹی گیئرمین ہے۔"

"اوہ، میں سمجھ گیا کیونکہ تم ڈرائیور ہو اور گیئر بدلتے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" گیئرمین نے کہا۔ "میرا اصل نام لائیڈ گیئرمین ہے لیکن جب میں نے فلموں میں کام شروع کیا اور نام بنانے کی خاطر مسلسل شفٹیں کرتا رہا تو میرا نام شفٹی پڑ گیا۔"

"کیا تم ایک اداکار بھی ہو؟"

گیئرمین کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "بہت جلد سابق اداکار ہونے والا ہوں۔ حالیہ دنوں میں کام کی بہت کمی ہوگئی ہے لہٰذا میں اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کے لیے کچھ بھی کرلیتا ہوں۔"

انہیں ہالی ووڈ کے سینٹ موریس ہوٹل پہنچنے میں پینتالیس منٹ لگے جہاں لائیڈ براؤن نے موسی کے لیے کمرا بک کروایا تھا۔ "میں کل صبح نو بجے تمہیں اسٹوڈیو لے جانے کے لیے آؤں گا۔" گیئرمین نے کہا۔

"شکریہ شفٹی۔" موسی نے جواب دیا۔ "میں لاس اینجلس میں نیا ہوں۔ کیا تمہیں کچھ ٹپ دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

سینٹ موریس ہوٹل مہنگا اور پرتعیش نہ ہونے کے باوجود مناسب تھا۔ وہاں سڑک کے پار ہی ایک عمدہ ہسپانوی ریستوران بھی تھا جہاں کم پیسوں میں موسی کو اچھا کھانا مل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایک اسکرپٹ ملا۔ اسے ایک جورو کا غلام ٹائپ شوہر کا کردار کرنا تھا جو ریس میں ایک بڑی رقم جیت جاتا ہے لیکن اپنی بیوی کو نہیں بتاتا کیونکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر دوبارہ جوا کھیلا تو وہ اسے چھوڑ دے گی۔ یہ ایک دلچسپ کردار تھا اور اس میں اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا کافی موقع نظر آیا۔ یہ کردار اس کی عمر اور جسمانی ساخت کے حوالے سے بھی فٹ بیٹھتا تھا۔

اس کی یادداشت بہت اچھی تھی اس لیے اس نے دوسرے روز شفٹی کے آنے سے پہلے اپنی لائنیں یاد کرلیں۔ شفٹی اسے مقررہ وقت پر لینے آگیا۔ موسی کو اسٹوڈیو دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی۔

"یہ ہالی ووڈ کا سب سے پرانا اسٹوڈیو ہے۔" گیئرمین نے بتایا۔ "مسٹر براؤن نے اسے حال ہی میں خریدا ہے۔"

وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو ایک دراز قد شخص نے اس کا استقبال کیا۔ "مسٹر روز! میں لائیڈ براؤن ہوں۔" اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی۔" موسی نے رسماً کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دوسرے لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔"

وہ اسے ایک ساؤنڈ اسٹیج پر لے گیا جہاں کسی مکان کے کمروں کے سستے سیٹ بنے ہوئے تھے۔ وہاں پہلے سے کئی لوگ موجود تھے۔ ان میں ریڈیو اور کومیڈی فلموں کی اداکارہ ایلوی فیلڈ اور جوئے بیل شامل تھے۔ جوئے نے قیمتی سوٹ، پینٹ اور چشمہ لگا رکھا تھا اور وہ مزاحیہ اداکار کے بجائے کوئی بینکر لگ رہا تھا۔ ایلوی نے گرم جوشی سے موسی کا استقبال کیا جبکہ بیل نے صرف سر ہلایا۔

"موسی! یہ ہمارے ڈائریکٹر ہیڈ ڈینٹ اور رائٹر ایلس کولنز ہیں۔" براؤن نے کہا۔ ڈائریکٹر کی عمر تقریباً ساٹھ سال اور سفید بال تھے جبکہ کولنز چالیس کے لگ

بھگ۔ اس نے ایک اسپورٹس جیکٹ اور سیاہ سوئٹر پہن رکھا تھا۔

''اب ہم سب یہاں موجود ہیں۔'' پروڈیوسر نے کہا۔ ''ہم یکے بعد دیگرے تین فلمیں شوٹ کریں گے۔ پہلی موسی کے ساتھ، دوسری میں ایلوی اور تیسری میں جوئے ہوگا۔''

''اسے پہلی فلم کیوں دی جارہی ہے؟'' جوئے بیل نے موسی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ یہ نیویارک سے آیا ہے اور تم دونوں یہیں رہتے ہو۔'' براؤن نے جواب دیا۔ ''مجھے پبلسٹی فوٹوز کے لیے تم تینوں کو اکٹھے کرنا تھا لیکن مسٹر روز کو پہلی فلم دی جارہی ہے تاکہ وہ اپنا کام ختم کرکے گھر واپس جاسکے۔''

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟'' ایلوی نے پوچھا۔ ''ان فلموں کو کون ریلیز کرے گا؟''

''یہ موٹوگرام کے ذریعے ریلیز کی جائیں گی۔'' براؤن نے جواب دیا۔

''موٹوگرام؟'' بیل چلایا۔ ''مجھے کسی نے یہ نہیں بتایا۔ میں نے تین سال پہلے ان کے ساتھ ایک فلم کی تھی اور میں اب بھی سوتے میں چلانے لگتا ہوں۔''

''جوئے! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس ملک میں کتنے لوگ ان کی فلمیں دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں؟'' بیڈ ڈینٹ نے کہا۔

''لیکن یہ صرف شروعات ہے۔'' براؤن بولا۔ ''میرے ذہن میں اس سے بڑا منصوبہ ہے۔ سنیما میں ان فلموں کی نمائش کے بعد جب تمہیں پہچان مل جائے گی تو لوگ تمہیں ٹی وی پر بھی دیکھنا چاہیں گے۔ اب سب کچھ ٹی وی پر ہی دیکھا جاتا ہے چاہے وہ لائیو شو ہو یا کوئی پرانی فلم۔''

وہ دن دور نہیں جب ریکارڈ شدہ پروگرام ٹی وی کی ضرورت بن جائیں گے اور لائیو شو کے بجائے وہ پروگرام دکھائیں گے جو خاص طور پر اس میڈیم کے لیے تیار کیے گئے ہوں۔ میں اس معاملے میں پہل کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے کبھی سرخیل بننے کے بارے میں نہیں سوچا۔'' موسی بولا۔

موسی کی شوٹنگ دوسرے روز شروع ہوئی لیکن عین وقت پر ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا جب موسی کی بیوی کا کردار کرنے والی اداکارہ ڈورتھی لین سیٹ پر آئی۔ وہ بہت کم عمر تھی اور موسی کی بیوی کے بجائے بیٹی لگ رہی تھی۔

''یہ کس نے مذاق کیا ہے؟'' اس نے ڈائریکٹر سے پوچھا۔ ''میں اس کی بیوی کا رول نہیں کرسکتی۔ اسکرپٹ کے مطابق مجھے اس کا بوسہ لینا ہوگا۔''

''میں تمہیں یاد دلادوں، ڈورتھی!'' ڈائریکٹر نے کہا۔ ''کہ تم نے معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔''

''ہاں۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ میں اپنے ایجنٹ مائرون کو فون کرنے جارہی ہوں۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے سیٹ سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد موسی نے پوچھا۔ ''کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کتنا عجیب لگتا اگر اس کی شادی میرے جیسے آدمی سے ہوجاتی۔''

''اوہ میرے خدا! تم نے وہ فلم نہیں دیکھی جس میں درمیانی عمر کے مردوں کی محبوبہ کا رول نوجوان اداکارائیں کرتی ہیں۔ کیا انڈسٹری میں درمیانی عمر کی اداکارائیں موجود نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا تضاد دلچسپ نظر آتا ہے۔ ڈورتھی بھی یہ رول کرنے پر راضی ہوجائے گی۔ وہ صرف نخرے کررہی ہے۔''

پندرہ منٹ گزر گئے لیکن اداکارہ سیٹ پر واپس نہیں آئی۔ ڈینٹ اس کے انتظار میں فلور پر ٹہلتا رہا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ''ٹھیک ہے۔ بہت ہوگیا۔'' پھر اس نے معاون ہدایت کار سے کہا۔ ''جیک! ڈورتھی کو تلاش کرو اور اس سے کہو کہ وہ فوراً سیٹ پر آجائے۔''

دو منٹ بعد ڈورتھی سیٹ پر واپس آئی۔ ڈینٹ نے پوچھا۔ ''کیا ہم کام شروع کرسکتے ہیں؟''

''تم جو چاہو کرو۔'' ڈورتھی نے کہا۔ ''میں جارہی ہوں۔''

''یہ کیا حماقت ہے؟''

''میرے ایجنٹ کا کہنا ہے کہ اگر میں یہ رول نہیں کرنا چاہتی تو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیونکہ ہم نے ایک چھوٹی مچھلی کو دریا سے نکال لیا اور وہ اپنے آپ کو بگ ڈیوس سمجھنے لگی ہے۔ مت بھولو کہ تم نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔''

''اس کے بارے میں ایجنٹ کا کہنا ہے کہ مجھ سے غلط بیانی کی گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور سیٹ سے باہر چلی گئی۔

''پُرسکون ہوجاؤ۔'' موسی نے کہا۔ ''ایسی کئی ایکٹریسز ہیں جو یہ رول کرسکتی ہیں۔''

''اس ایکٹریس کے ملنے تک میرا شوٹنگ شیڈول بگڑ

جائے گا۔"

لائیڈ براؤن اچانک وہاں آ گیا۔ "جیک نے بتایا ہے کہ یہاں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہاری دریافت ڈور تھی لیکن واک آؤٹ کر گئی۔" ڈینٹ نے اسے بتایا۔

"کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟"

"وہ ایسا کر سکتی ہے یا نہیں، اس کا تعین ہونا ابھی باقی ہے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ ایسا کر چکی ہے اور ہمیں آج کی شوٹنگ منسوخ کرنا پڑے گی۔"

"کیا اس کے بغیر شوٹنگ نہیں ہو سکتی؟"

"اس کے بغیر میں کیا شوٹ کروں؟ اس سین میں موسی کے ساتھ اس کی جوڑی ہے۔ مجھے ایک دوسرے اداکار کی ضرورت ہے۔"

"ہمارے پاس پہلے ہی دوسرا اداکار ہے۔" موسی نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔ "شفٹی گیرمین کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تم اپنے ڈرائیور کی بات کر رہے ہو؟" براؤن نے کہا۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ اداکار بھی ہے۔"

"ایک نیگرو تمہاری بیوی کا رول کیسے کر سکتا ہے؟" ڈینٹ نے اعتراض کیا۔

"میں اپنی بیوی کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ تمہیں ایک دوسرے اداکار کی ضرورت ہے اور شفٹی بھی ایک اداکار ہے لہٰذا وہ ایک دوست و ساتھی کارکن یا ایک پوسٹ مین کا رول کر سکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے میں نے اپنی جیت کے بارے میں بتا دیا اور ہم دونوں اسے میری بیوی سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"لیکن اس کے باوجود ہمیں بیوی کی ضرورت ہوگی۔" براؤن نے کہا۔

"ہاں! لیکن اس طرح ہمیں ایک دن مل جائے گا۔ آج ہم موسی اور شفٹی کے ساتھ شوٹنگ کر سکتے ہیں اگر شفٹی ایسا کرنے پر تیار ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کر لے گا۔" موسی نے کہا۔ "اسے اپنی فیملی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔"

جیک کیلون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مونوگرام اس فلم کو دیہی علاقوں میں ریلیز کرے گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہاں کے شائقین ایک سفید فام اور نیگرو کو اسکرین پر ایک ساتھ دیکھنا پسند کریں گے؟"

"جیک بینی اور روچسٹر کے بارے میں کیا کہو گے؟" براؤن نے پوچھا۔

"میرے خیال میں یہ ایک زبردست آئیڈیا ہے۔" موسی نے کہا۔

"مسٹر جیک!" براؤن نے کہا۔ "مسٹر گیرمین کو لے کر آؤ۔"

"اس کے بعد کولنز کو بھی تلاش کرنا۔" ڈینٹ نے کہا۔ "لگتا ہے کہ اسے کچھ سین دوبارہ لکھنے ہوں گے۔"

ایلس کولنز کے آنے سے پہلے گیرمین وہاں پہنچ چکا تھا اور حیران نظر آ رہا تھا۔ جب رائٹر کو موسی کے آئیڈیا کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ جانتے نہیں کہ اس سے اسکرپٹ کی روانی متاثر ہوگی؟"

"اگر مجھے روانی چاہیے ہوتی تو کسی بینڈ لیڈر کو بلاتا۔" ڈینٹ نے کہا۔ "میں کومیڈی چاہتا ہوں۔"

"مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

"تمہارے پاس سوچنے کے لیے اتنا وقت ہے کہ گیرمین کا میک اپ مکمل ہو جائے۔ اس کے بعد ہم شوٹنگ شروع کر دیں گے۔"

"اتنی جلدی کیوں ہے؟ براؤن کے پاس بہت پیسا ہے۔ وہ ایک مہینے کے لیے بھی شوٹنگ روک سکتا ہے۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم فوراً کام شروع کر دو۔" ڈینٹ نے کہا۔

"تم میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے۔"

"یہ ہو چکا ہے۔ موسی! کیونکہ یہ تمہارا آئیڈیا ہے تو اس کی مدد کیوں نہیں کرتے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ کیا کرنا ہے؟"

کولنز نے موسی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، میرے ساتھ آؤ موسی!"

وہ اسے ایک دفتر میں لے گیا جس کے دروازے پر "رائٹرز روم" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں تین میزیں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کولنز کے سوا کوئی نہ تھا۔

"یہاں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟" موسی نے پوچھا۔

"صرف میں۔" کولنز نے جواب دیا۔ "براؤن مزید فلمیں بنانے میں سنجیدہ ہے اس کے لیے کچھ اور رائٹرز

رکھے جائیں گے۔'' اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک میز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ اب تم انچارج ہو اس لیے مجھے بتاؤ کہ میں اس چھتیس فٹ کے اسکرپٹ کی کس طرح دوبارہ تشکیل کروں کہ اس میں ایک نیا ذیلی پلاٹ شامل ہوجائے؟''

''دیکھو مسٹر کولنز! میں اسکرین رائٹر نہیں ہوں۔'' موسی نے کہا۔ ''اور میں کسی دوسرے کے کام میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا لیکن میں جو سمجھ رہا ہوں وہ یہ کہ چند ابتدائی مناظر میں جب میں اپنی رقم چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں تو وہ میں شفٹی کے ساتھ کروں۔''

''اس کا تمہارے کردار سے کیا تعلق ہوگا؟''

''میں نہیں جانتا۔ وہ کوئی دوست یا پوسٹ مین بھی ہوسکتا ہے.....''

''اگر اسے ٹیکسی ڈرائیور کا کردار دیا جائے جو تمہیں ریس کورس سے گھر لے کر آتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''بالکل!''

''ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں تاکہ تم اپنا کام شروع کرسکو۔''

وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ہیڈ ڈینٹ، شفٹی سے باتیں کر رہا ہے۔

''کولنز کے پاس ایک زبردست آئیڈیا ہے۔'' اس نے انہیں بتایا۔ ''شفٹی اس ٹیکسی ڈرائیور کا رول کرے گا جو مجھے ریس کورس سے گھر لے کر آتا ہے۔''

''مجھے یہ آئیڈیا پسند آیا۔'' ڈینٹ نے کہا۔ ''خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہم اس کے لباس کو استعمال کرسکتے ہیں۔ سر پر ٹوپی رہنے دو لیکن کوٹ اور ٹائی اتار دو۔''

''لیکن میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے مکان میں کیوں جاؤں گا؟'' شفٹی نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' ڈینٹ چلایا۔ ''اسی لیے ہم نے اس رائٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

''اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' موسی نے کہا۔ ''میں ریس کورس سے واپس آتا ہوں لیکن میرے پاس جیتی ہوئی رقم کے بڑے نوٹ ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور کو دینے کے لیے ایک یا دو ڈالر نہیں ہیں اس لیے مجھے ان کی تلاش میں گھر کے اندر جانا پڑتا ہے۔''

''اور میں کرایہ لینے کے لیے اس کے ساتھ جاتا ہوں۔'' شفٹی نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

''اور جب تم دونوں گھر میں داخل ہوتے ہو تو موسی کی بیوی بھی آجاتی ہے اور تمہاری کوشش ہوتی ہے کہ اسے رقم کے بارے میں پتا نہ چلے۔ وہ برابر والے کمرے میں آگئی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کس صورت حال میں پھنس گئے ہو۔ تم صرف کرایہ لینا چاہتے ہو تاکہ واپس جاسکو۔'' ڈائریکٹر نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''کیا میں کولنز کو یہ سچویشن بتادوں؟'' شفٹی نے پوچھا۔

''نہیں! ہمیں شوٹنگ شروع کرنا ہے۔ تم دونوں اس منظر کے لیے کچھ مکالمے سوچ لو۔''

جب کیمرا اسٹارٹ ہوا تو موسی ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے بنڈل لے کر داخل ہوا۔ اسے کسی برتن کی تلاش تھی جبکہ شفٹی اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ اس نے یہاں کہیں ریزگاری رکھی ہوئی ہے۔'' موسی نے برجستہ کہا۔ ''میں اسے گروسری کے لیے ہر ہفتے پچاس سینٹ دیتا ہوں۔''

''او کے۔'' ڈینٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''تم دروازے کھلنے کی آواز سن رہے ہو، وہ گھر آگئی ہے۔''

''جلدی کرو۔'' موسی نے کہا۔ ''ہمیں اس رقم کو چھپانا ہے۔''

''تم پیسے ڈھونڈ رہے ہو اور رقم بھی چھپا رہے ہو۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنا ذہن بنالو۔''

موسی اور شفٹی کے درمیان برجستہ جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ایک مرحلے پر موسی آتش دان پر جھکا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ''جج کارٹر! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟'' ایک اور مرحلے پر وہ چلایا۔ ''چھپ جاؤ۔ چھپ جاؤ۔'' اور شفٹی کو سیٹ پر ایک لیمپ نظر آگیا۔ اس نے اس کا شیڈ کھینچا اور اپنے سر پر رکھ لیا۔ موسی نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اسے نہیں دیکھ رہا، پھر جیسے ہی شفٹی نے شیڈ ہٹایا تو موسی نے ایک سیب اٹھایا اور اسے اچھالنے لگا۔ شفٹی نے بھی اپنے سر کو اوپر نیچے کرنا شروع کردیا۔

یہ مضحکہ خیز حرکات سینما میں بیٹھے تماشائیوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرسکتی تھیں۔ موسی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

''کٹ۔'' ڈینٹ چلایا۔

''مجھے افسوس ہے بیڈ! اگر میں نے شاٹ خراب کیا ہو۔'' موسی نے کہا۔

''نہیں۔ تم نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ اس منظر کو دیکھ کر

تماشائی بے اختیار قہقہے لگائیں گے۔ تم دونوں مل کر بہت اچھا کام کرسکتے ہو۔ چلو، اب ہم ایک وقفہ لیتے ہیں۔'' ڈینٹ نے کہا۔

لائیڈ براؤن جو یہ شوٹ دیکھ رہا تھا، آگے بڑھا۔

''مسٹر گیئرمین! میرے دفتر میں چلو۔ مجھے تم سے طویل المیعاد معاہدے کے بارے میں بات کرنا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ اب ہم دونوں کو ایک ڈرائیور کی ضرورت ہوگی۔'' موسی نے کہا۔

''نہیں۔'' گیئرمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری وجہ سے مجھے دوبارہ کیمرے کے سامنے آنے کا موقع مل رہا ہے اس لیے جب تک تم لاس اینجلس میں ہو، میں ہی تمہارا ڈرائیور رہوں گا۔''

اگلے روز موسی اور شفٹی نے اسٹوڈیو آتے ہوئے سفر کے دوران اس دن کی شوٹنگ سے متعلق آئیڈیاز پر تبادلۂ خیال کیا کیونکہ ایلس کولنز نے بیوی کے کردار کو مختصر کردیا تھا اس لیے ایلوی فیلڈ اسے کرنے پر تیار ہوگئی۔

اس سے اگلے روز شفٹی وقت سے پہلے موسی کے ہوٹل پہنچ گیا تھا کہ وہ دونوں راستے میں کہیں رک کر ناشتا کرسکیں لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی جب دو جگہ پر ویٹرز نے انہیں ناشتا دینے سے انکار کردیا۔ ان کا رویہ دیکھ کر موسی بھی پریشان ہوگیا لیکن جب انہوں نے اسٹوڈیو پہنچ کر کام شروع کیا تو ان کی پرفارمنس دیکھ کر سب لوگوں کے خدشات دور ہوگئے لیکن بدقسمتی سے چوتھے روز شفٹی مرگیا۔

☆☆☆

سارجنٹ چارلی موبرے فلموں میں دکھائے جانے والے سراغ رسانوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے ہیٹ پہنا ہوا تھا اور نہ ہی اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس وقت سیٹ پر موجود تھے جب یہ حادثہ ہوا۔'' اس نے موسی سے کہا۔ وہ ساؤنڈ اسٹیج کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہاں! میں اس وقت اپنے ڈائریکٹر بیڈ ڈینٹ، ایوی فیلڈ اور کریو کے ساتھ سیٹ پر تھا۔''

''تم اپنے الفاظ میں بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟''

''اس سین سے پہلے میں نے گزشتہ روز ریس میں جیتی ہوئی رقم چھپانے کے لیے نوٹوں کا بڑا بنڈل ایک گلدان میں ڈالا تھا۔ آج صبح جب شوٹنگ شروع ہوئی تھی تو میں نے مسٹر گیئرمین سے وہ بنڈل نکالنے کے لیے کہا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ گلدان میں ڈالا تو وہ اس کے اندر پھنس گیا کیونکہ وہ عام لوگوں کی نسبت بہت بڑا ہے۔ اچانک ہی اس نے چلّانا شروع کردیا جیسے اسے کوئی تکلیف ہورہی ہو۔ بالآخر اس نے وہ گلدان ایک میز پر مارا، کیونکہ وہ مٹی کا بنا ہوا تھا اس لیے فوراً ہی ٹوٹ گیا۔ اس کے پورے ہاتھ میں مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ انہوں نے اسے کئی مرتبہ کاٹا تھا۔ فوراً ایمبولینس بلائی گئی لیکن اس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ میرا خیال ہے کہ ان مکڑیوں نے گلدان میں جالا بنالیا تھا۔''

''اس رقم کا کیا بنا؟''

''کون سی رقم؟''

''وہی جو گلدان میں رکھی گئی تھی۔''

''میں نے نہیں دیکھی۔ لیکن تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسے وہیں ہونا چاہیے۔''

''تم بلیک وڈوز کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں، صرف نام سنا ہے۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ کالی مکڑیاں مل کر نہیں رہتیں۔''

''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر ایک کالی مکڑی گلدان میں چلی گئی اور اسے مناسب وقت مل گیا تو وہ انڈے دیتی ہے جن میں سے چھ یا آٹھ بالغ ہوجاتے ہیں۔''

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ کسی نے وہاں جان بوجھ کر مکڑیاں چھوڑیں؟''

''لگتا تو یہی ہے۔ ہمیں گلدان کے ٹکڑوں کے پاس سے ایک ٹشو پیپر ملا ہے جس پر ٹیپ کے نشانات ہیں، جسے ہمارے خیال میں گلدان کو سیل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ مکڑیاں گلدان سے باہر نہ آسکیں جب تک کہ کوئی اسے توڑ نہ دے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان مکڑیوں کو نقصان پہنچانے کے لیے وہاں جان بوجھ کر ڈالا گیا۔''

''کون شفٹی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا؟''

''کیا کوئی تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟''

''کیوں؟''

''اسکرپٹ کے مطابق جب گیئرمین تمہارے سر پر گلدان مارتا تو اس سین میں تمہارا کام ختم ہوجاتا۔ اس کا مطلب ہے کہ مکڑیاں اس کے بجائے تمہیں کاٹنے کے لیے گلدان میں ڈالی گئی تھیں۔''

''اوہ میرے خدا!''

''کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''اگر جانتا تو اس سے دور ہی رہتا۔''

''میں نے سنا ہے کہ گیرمین پہلے اس فلم کی کاسٹ میں شامل نہیں تھا۔''

''ہاں۔ ایک اداکارہ فلم چھوڑ کر چلی گئی اور اس کی جگہ شفٹی آ گیا۔ یہ آئیڈیا میرا ہی تھا۔''

''تو حقیقت یہ ہے کہ وہ تم سے یہ فلم چھین رہا تھا۔ کیا تمہیں اس سے پریشانی نہیں ہوئی؟''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میری جن دوسرے لوگوں سے بات ہوئی، ان کا یہی خیال ہے کہ وہ فلم کا بڑا اسٹار بننے جا رہا تھا۔ تم نے اسے کس طرح محسوس کیا؟ ممکن ہے کہ تم اس سے انتقام لینا چاہ رہے تھے؟''

''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے اس گلدان میں مکڑیاں ڈالی تھیں تو میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ وہ میرا دوست تھا۔''

سراغ رساں مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں قائل ہو گیا کہ تم نے یہ نہیں کیا۔ بس مجھے یہی پوچھنا تھا۔ اگر اس کے علاوہ تمہارے ذہن میں کوئی بات آئے تو تم ہم سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

اختتام ہفتہ وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں آرام کرتا رہا۔ فلم کی شوٹنگ روک دی گئی تھی اور اس سے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا تھا تاوقتیکہ لائیڈ براؤن کے وکیل پروڈکشن بند ہونے کے نقصانات کا جائزہ اور کاسٹ اینڈ کریو کو ادائیگی کا طریقہ کار وضع نہ کر لیں۔

پیر کے روز موسی کے پروڈیوسر نے چرچ لے جانے کے لیے ایک کار بھیجی جہاں شفٹی گیرمین کی آخری رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ چرچ میں آدھے حاضرین سیاہ فام تھے جو ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف لائیڈ براؤن، بیڈ ڈینٹ، ایلس کولنز، جیک کیلون، ایوی فیلڈ اور کریو کے چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو سب سیاہ فام تھے۔

موسی نے شفٹی کی بیوی کو سیاہ لباس اور نقاب کی وجہ سے فوراً پہچان لیا۔ وہ اپنے پانچ بچوں کے ہمراہ آئی تھی۔ موسی نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''مادام! میرا نام موسی روز ہے اور مجھے شفٹی کی ناگہانی موت پر بہت صدمہ ہوا۔ ہماری چند روز قبل ہی ملاقات ہوئی تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم دوست بن گئے تھے۔''

''مسٹر روز! مجھے امید تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔'' ماریا گیرمین نے کہا۔ ''تم نے ہی اسے دوبارہ فلم میں کام کرنے کا موقع دیا۔ وہ بہت خوش تھا۔''

''تم کس طرح یہ صدمہ برداشت کر رہی ہو؟''

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں تم سے تنہائی میں بات کر سکتی ہوں؟''

''بالکل۔''

وہ اسے ایک الگ کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا پھر اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے ایک خط نکال کر موسی کو پکڑا دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''کالوں کے لیے ہالی وڈ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب تمہارا دوست بھی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ بات یاد رکھنا۔''

یہ خط پڑھ کر موسی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عبارت کے نیچے کسی کا نام نہیں بلکہ پرنٹنگ کر اس کی تصویر تھی جو کالوں سے نفرت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

''یہ مجھے ڈاک سے موصول ہوا ہے۔ لفافے پر میرے شوہر کا نام لکھا ہوا ہے لیکن بھیجنے والے کا نام اور پتا نہیں ہے۔''

''شاید اس نے سمجھا ہوگا کہ تمہارا شوہر ابھی تک زندہ ہے۔ کیا تم نے یہ خط پولیس کو دکھایا؟''

''پولیس ایک مرے ہوئے نیگرو کی پروا نہیں کرتی۔''

''میں سراغ رساں موبرے سے بات کرتا ہوں، شاید وہ کچھ کر سکے۔''

''اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال تھا کہ پہلے تم اس معاملے کو دیکھو کیونکہ تم نے ہی میرے شوہر کی مدد کی تھی۔''

موسی نے کہا۔ ''کیا یہ خط میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں؟''

''کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں خط لکھنے والے کو جانتا ہوں اور یہ غالباً وہی شخص ہے جس نے گلدان میں مکڑیاں رکھی تھیں۔''

''کیا تم پولیس سے رابطہ کرو گے؟''

''بالآخر کرنا ہی ہوگا، لیکن پہلے میں اپنے طور پر یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ صرف یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ میرا اندازہ کتنا درست ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد وہ دونوں ہال میں واپس آ گئے۔ موسی نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہونے لگے تو وہ خاص طور پر ایک شخص کے پاس گیا اور

سرگوشی میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ تم ہی تھے۔ تم اس کے قاتل ہو۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور اپنے ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ چال کامیاب رہی تو شام کو ہی اس مفروضے کا ثبوت مل جائے گا۔

ہوٹل واپس آیا تو اسے بیوی کا ٹیلی گرام ملا۔ اس کی ساس کا انتقال ہو گیا تھا۔ موسی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا پولیس کو خط کے بارے میں بتا دے لیکن اگر اس کا مفروضہ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟

سورج غروب ہونے پر وہ کمرے سے باہر نکلا اور لابی میں جا کر ڈیسک کلرک کو بتایا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہے اور سڑک کے پار واقع ریستوران میں چلا گیا۔ اسے بھوک نہیں تھی لیکن وہاں بیٹھنے کے لیے کچھ منگوانا ضروری تھا۔ اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور باقی پیک کروالیا۔ جب ویٹرس بل لے کر آئی تو اس نے کہا۔ ''معاف کرنا۔ کیا مجھے کافی کا ایک اور کپ مل سکتا ہے اور کیا مزید کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، جب تک ہمیں میز کی ضرورت نہ ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

موسی کافی پینے کی آڑ میں وہاں مزید ایک گھنٹا بیٹھا رہا۔ باہر پوری طرح اندھیرا پھیل چکا تھا تاہم وہاں سے ہوٹل بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے مزید کافی منگوائی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے ایک سائے کو ہوٹل کے داخلی دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے سیاہ سوئیٹر، پتلون اور سر پر ہیٹ کو آگے کی طرف جھکا رکھا تھا۔ وہ سایہ دروازے کے پاس رکا لیکن اندر جانے کے بجائے مڑا اور آگ لگنے کی صورت میں ہنگامی راستہ تلاش کرنے لگا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس جانب بڑھ گیا۔

موسی بھی جلدی سے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر موسی اس سائے کو دیکھنے لگا جو سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل کی کھڑکی سے اندر جا چکا تھا۔ موسی نے سڑک پار کی اور دوڑتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

وہ سیڑھیوں کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچا اور احتیاط سے راہداری میں جھانکا۔ وہ سایہ اس کے دروازے پر کھڑا تالے سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا اور آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ موسی نے اس کے تعاقب میں اندر جانے کی کوشش نہیں کی اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر دروازہ کھلا تو موسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہائے۔ تم میرا انتظار کر رہے تھے؟''

وہ موسی پر جھپٹا۔ موسی اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے سینے پر گھونسا مارا۔ وہ نیچے گرا۔ موسی نے لائٹ جلائی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ سچ نہ ہو لیکن ہر چیز تمہاری طرف اشارہ کر رہی تھی۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' فرش پر پڑے ہوئے آدمی نے کہا۔

''یقیناً تم نہیں جانتے۔ تم میرے کمرے میں یونہی چلے آئے یا پھر کسی ناول پر ریسرچ کر رہے ہو؟'' ایلس کولنز آہستہ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے کوئی چیز تمہیں بے ہوش کرنے سے نہیں روک سکتی۔''

''مجھے یقین نہیں کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ مجھے اپنا دفاع

معصوم خواہشات

ہر نوجوان کی صرف چھ خواہشات ہوتی ہیں۔
ایک عدد خوب صورت اور تابع دار بیوی۔
دو عدد پیارے پیارے بچے۔
تین بیڈ روم کا اپنا مکان۔
چار پہیوں والی نئی نویلی کار۔
پانچ دن کھلنے والا دفتر، دو دن چھٹی۔
چھ ہندسوں میں تنخواہ۔

تاخیر

''آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟'' بیوی نے بڑے ارمان سے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''جتنا..... جتنا شاہ جہاں اپنی محبوب ملکہ کو چاہتا تھا۔''

''پھر آپ میرے مرنے کے بعد میری یاد میں تاج محل بھی بنوائیں گے؟''

''ضرور..... میں نے تو پلاٹ بھی بک کرا لیا ہے۔ تم ہی دیر کر رہی ہو۔''

لاہور سے ڈاکٹر ارسلان کی معصومیت

کرنا آتا ہے۔ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"ممکن ہے کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہو۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تمہاری ایسی کوئی نیت نہیں۔ تم مجھے مارنے کے لیے اپنے ساتھ کالی مکڑیاں لے کر آئے ہو۔ وہی مکڑیاں جو تم نے اس روز شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے گلدان میں ڈالی تھیں۔"

"تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔"

"پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ آج جب میں نے شفٹی کی سروس کے موقع پر تمہیں بتایا کہ تم نے اس کا قتل کیا ہے تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم مجھے بھی مارنے کی کوشش کرو گے اور تم یہاں آ گئے۔ تم پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کیوں نہیں کر لیتے؟ میں سمجھتا ہوں کہ تم شفٹی کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ تمہارا ارادہ صرف اسے خوفزدہ کرنے کا تھا۔ اسی لیے تم نے اس کی بیوی کے بجائے اس کے نام خط بھیجا تا کہ وہ خوفزدہ ہو کر فلم چھوڑ دے اور تمہیں اپنا اصلی اسکرپٹ تبدیل نہ کرنا پڑے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے کراس کی تصویر صرف شفٹی کو خوفزدہ کرنے کے لیے لگائی تھی۔ اس کی بیوی کو یقین ہے کہ KKK نامی تنظیم اب بھی موجود ہے۔ یہ سفید فام دہشت گردوں کا گروپ ہے جو کالوں کے علاوہ یہودیوں، مسلمانوں اور مہاجرین سے نفرت کرتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ اس تنظیم کا کوئی وجود ہے۔ خاص کر کیلی فورنیا میں۔"

"تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔" کولنز نے کہا۔ "دراصل اب ان کا ہیڈ کوارٹر میرے آبائی شہر میں ہے اور میں سولہ سال کی عمر میں اس کا رکن بن گیا تھا اور اب میں اس کا سربراہ بننے والا ہوں۔"

کولنز نے باتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا پھر موسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "پھر اسٹوڈیو میں کچھ غیر متوقع واقعات ہوئے۔ وہ بے وقوف اداکارہ فلم چھوڑ کر چلی گئی اور تم اس کی جگہ اپنے دوست کو لے آئے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ایسی فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں جس میں ایک گورے اور کالے کو برابر دکھایا گیا ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟ نہ صرف یہ کہ میں سربراہ بننے کی دوڑ سے باہر ہو جاتا بلکہ مجھے غدار قرار دے کر تنظیم سے خارج کر دیا جاتا۔"

کولنز نے باتھ روم کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اسی لمحے موسی کو احساس ہوا کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ دراصل اس نے اپنا اُسترا سنک پر چھوڑ دیا تھا۔

"تم فلم چھوڑ سکتے تھے۔" موسی نے کہا۔ "یا نائل پر اپنا نام نہ دیتے۔"

"اگر مجھے پیسوں کی شدید ضرورت نہ ہوتی تو میں فلم چھوڑ دیتا۔ جہاں تک نام نہ دینے کا تعلق ہے تو یہ بات نہیں چھپ سکتی تھی اور تنظیم کو پتا چل جاتا کہ میں یہ فلم لکھ رہا ہوں کیونکہ جوئے بیل نے ہی مجھے یہ فلم دلوائی تھی۔"

"اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"اس کا شمار تنظیم کے مرکزی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اخبار میں گیرمین کی موت کی خبر پڑھنے کے بعد مجھے فون کر کے پوچھا کہ کیا اس میں میرا ہاتھ ہے؟ اور پھر مجھے مبارک باد دی۔"

"اسی لیے وہ شفٹی کی سروس میں نہیں آیا لیکن تم وہاں کیوں موجود تھے؟"

"تا کہ میری غیر موجودگی سے کسی کو شک نہ ہو۔" کولنز نے کہا پھر وہ باتھ روم کے قریب چلا گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہاری نظریں میرے اُسترے پر ہیں۔" موسی نے کہا۔ "تم مجھے قتل کر کے بچ نہیں سکتے۔"

"کیوں نہیں بچ سکتا؟" کولنز نے جواب دیا اور باتھ روم میں گھس گیا پھر چند سیکنڈ بعد ہی ہاتھ میں استرا پکڑے واپس آ گیا۔ وہ بے ڈھنگے طریقے سے موسی پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا جو پہلے ہی فرش پر گر گیا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور کولنز کا بازو پکڑ کر اسے دور ہٹا دیا۔ اس طرح اسے کھڑے ہونے کے لیے کافی وقت مل گیا۔

موسی بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اس طرح کی اچھل کود نہیں کی تھی۔ وہ ایک بار پھر کولنز کے سامنے آیا جس نے دوبارہ اس پر حملہ کرنے کے لیے اُسترا گھمایا۔ وہ موسی کے اتنے قریب تھا کہ اس مرتبہ اسے اس کی آستین پھاڑنے کا موقع مل گیا۔ موسی نے چھلانگ لگائی اور دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے چلایا۔ "کوئی ہے؟"

کولنز اس کے پیچھے آیا اور ایک ہاتھ سے گردن پکڑ کر اس کا چہرہ زخمی کرنے کی کوشش کی لیکن موسی اس کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم وہ زیادہ دیر اسے نہیں روک سکتا تھا لہٰذا اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنی بائیں ٹانگ اٹھائی اور پوری قوت سے کولنز کو دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پیچھے کی طرف ڈگمگایا اور بستر پر جا گرا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اُسترا زمین پر گر گیا۔ موسی نے اس کا دستہ پکڑا اور باتھ روم میں

پھینک دیا۔

اسی لمحے سارجنٹ موبرے پستول ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہوٹل کا نائٹ منیجر بھی تھا۔ ''کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' سارجنٹ نے حکم دیا۔

''تمہیں آنے میں کافی دیر لگی۔'' موسی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہم نے پولیس کو اسی وقت فون کر دیا تھا جب کلرک نے تمہیں سیڑھیوں کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔'' منیجر نے کہا۔

''ٹریفک بہت زیادہ تھا۔'' موبرے بولا۔ ''لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم نے معاملات اپنے کنٹرول میں رکھے۔ کیا یہی وہ شخص ہے؟''

''ہاں۔''

''تم میں سے کوئی بھی کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔'' کولنز نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا ''میں یہاں روز سے اسکریٹ پر بات کرنے آیا تھا۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی تلخی ہوگئی اور..... آہ!'' اس نے اپنی گردن پر ہاتھ مارا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے کندھے پر کالی مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔

''ایمبولینس بلاؤ۔'' وہ چلایا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم دوبارہ یہی طریقہ اختیار کرو گے۔'' موسی نے کہا۔ ''تم نے میرے تکیے کے نیچے مکڑیوں کی تھیلی رکھ دی تاکہ جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹوں تو یہ مکڑیاں میرا کام تمام کر دیں۔''

''ہاں، اب خدا کے واسطے مجھے اسپتال پہنچا دو۔''

منیجر فون کرنے کے لیے گیا اور سارجنٹ نے پاؤں سے مکڑیوں کو مارنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

''میری واقعی یہ خواہش تھی کہ ایسا نہ ہو۔'' لائیڈ براؤن نے کہا۔ وہ اس وقت اپنے یونٹ کے لوگوں کے ساتھ ہالی وڈ بلے وارڈ کے ایک ریستوران میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس میز پر موسی، ایوی فیلڈ، بیڈ ڈینٹ اور ماریا گیرین بھی موجود تھی تاہم جوئے بیل اس لنچ میں شریک نہیں ہوا۔ درحقیقت اسے کئی دنوں سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ایجنٹ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ ایلس کولنز ابھی تک اسپتال میں تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد ہی اسے جیل بھیجا جاتا۔

''میرے وکیل نے مشورہ دیا ہے کہ فی الحال ہمیں یہ پروجیکٹ بند کر دینا چاہیے۔'' براؤن نے کہا۔ ''میں نے یہ آئیڈیا ترک نہیں کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں، میں تم سب کو کام پر واپس بلا سکوں گا۔ یہ تمہارے معاوضے کے چیک ہیں۔''

موسی نے اپنا لفافہ کھولا۔ اس میں ساڑھے اٹھائیس ہزار ڈالر کا چیک رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

''مسز گیرین!'' براؤن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں تمہارے نقصان کا ازالہ تو نہیں کر سکتا لیکن مجھے امید ہے کہ تم یہ حقیر نذرانہ قبول کر لو گی۔''

ماریا نے لفافہ کھولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خوشی سے چلائی۔ ''اوہ میرے خدا!''

ویٹر نے آ کر کہا۔ ''مسٹر براؤن! تمہارے لیے ایک فون کال ہے۔''

''میرے وکیل کا ہوگا۔'' براؤن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد موسی بولا۔ ''اب مجھے بھی گھر واپس جانا چاہیے۔ بیوی کو میری ضرورت ہے۔ اس کی ماں کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔''

بیڈ ڈینٹ بولا۔ ''بہت افسوس ہوا لیکن موسی، میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بیوی کو تفریح کی ضرورت ہے۔''

''وہ پہلے سے ہی فلوریڈا میں ہے۔''

''میں لاس اینجلس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''وہ کس لیے؟''

''ناسور برادرز نے مجھے ریس کورس کے حوالے سے ایک فلم کی پیشکش کی ہے اور اس میں ایک دلال کا مزاحیہ رول بھی ہے جو ریس کے ٹکٹ بیچتا ہے۔ یہ صرف دو ہفتوں کا کام ہے لیکن اس کے لیے ایک ایسے اداکار کی ضرورت ہے جو لوگوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دے۔ جس طرح ایک جادوگر اپنے ہیٹ سے خرگوش نکالتا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ اگلے مہینے شروع ہوگی۔ میں نے سوچا کہ اگر تمہارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے تو تم ہالی وڈ کی ایک اور فلم کر لو اور اس بار اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آؤ۔''

''خرگوش کی حد تک ٹھیک ہے لیکن مکڑیاں نہیں۔ بیڈ! تم خود ایک دلال ہو۔ مجھے تمہاری پیشکش منظور ہے۔''

اس نے شفقی کے ساتھ بھلائی کی تھی جس کا اسے انعام مل گیا۔

❖❖❖

klibrary.com

تیرہویں قسط

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میرا نام علی زین ہے۔ صحرائے چولستان میں وارد ہوتے ہی میں مقامی غنڈوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھے زخمی کر کے بستی چراغ شاہ میں میرن شاہ کے ڈیرے پر لے آئے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا وہ غلط فہمی اور جلد بازی میں کسی دوسرے بندے کو اغوا کر کے لے آئے ہیں جبکہ مجھے اسی بستی اور ڈیرے پر جانا تھا۔ میں نے اپنا تعارف سروے آفیسر کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا حاکم تھا۔ میرے رہنے کا بندوبست اسی کے ڈیرے پر ہوا تھا۔ اس بستی میں میرے بچپن کی یادیں بکھری تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کے دوست سانول اور ساوری کے علاوہ کئی دوسرے بھی یاد تھے۔ اگلے ہی دن معلوم ہوا کہ جس کے دھوکے میں مجھے اغوا کر کے لائے ہیں، وہ نزدیکی بستی کا ایک فرد بخاور تھا، جن کے ساتھ ان کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ میرن شاہ بجائے وہاں کا سروے کروانے کے، مجھے خرگوش کے شکار پر لے گیا۔ اسی رات بارڈر پار سے کچھ لوگ میرن شاہ سے ملنے آئے ہیں۔ جو سخت غصے میں تھے اور میرن شاہ پر قتل کا الزام لگایا جس سے وہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ اسی رات ڈیرے پر میری ملاقات میرن شاہ کی خودسر بہن پیروزاں سے ہوئی جو اپنے بھائی سے بھی زیادہ ظالم تھی۔ اگلی رات ڈیرے پر کچھ لوگ حملہ آور ہوئے جن میں ایک اس کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا اور دو شدید زخمی ہو گئے یہیں سے میرے بارے میں شک ہوا کہ میں کوئی آفیسر نہیں۔ مجھے جلد ہی ایک مقامی نوجوان زمان موہل سے بہت ساری معلومات ملنے لگی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا کہ پیروزاں اور میرن شاہ روہی کے علاقے میں کیسے اپنی حاکمیت بنائے ہوئے تھے۔ دونوں بہن بھائی اپنے اپنے طور پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، دونوں ایک دوسرے کے راستے میں نہیں آتے لیکن اپنی اپنی حاکمیت مضبوط بنا رکھی تھی۔ میری ساوری سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پیروزاں ایک ''ڈائن'' اور مرد مار قسم کی عورت ہے۔ وہ مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ روہی میں بارڈر پار سے کئی لوگ آتے تھے جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ پیروزاں نے راجھستان کے کئی بندے مروا دیے تھے۔ رتو بھوہڑ سے بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے۔ مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں کتنی وسعت رکھتی ہے اور کس قدر طاقتور ہے۔ مجھ پر راجھستانی حملہ کرتے ہیں، جس میں، میں بچ جاتا ہوں۔ اس حملے میں پیروزاں کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات اس نہج پر آ پہنچتے ہیں کہ میں نے پیروزاں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ساوری اس رات پیروزاں کو بچا لیتی ہے اور مجھے اس کے ڈیرے سے جانا پڑتا ہے۔ میرے لاہور والے دوست روہی آ کر میری مدد کرتے ہیں اور میرن شاہ کے کئی لوگ ہمارے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔ میرن شاہ سے میری جنگ لکھی تھی۔ میں پوری پلاننگ کے ساتھ میرن شاہ کو اس کے گھر سے نکال کر بستی میں اس جگہ لایا جہاں کبھی اس نے میرے ماں، باپ اور بہن کو قتل کیا تھا۔ میں نے میرن شاہ کو اس کی ماں کے سامنے آگ لگا کر بے رحمی سے قتل کر دیا۔ میرن شاہ کے قتل کے بعد میرا وہاں رہنا مشکل تھا۔ پیروزاں اور اس کے طاقتور ساتھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مجھے گھیر کر مار دیں۔ دشمن کا دشمن، دوست کی بنا پر رتو بھوہڑ اور چاچا سائیں نے میری مدد کی۔ یہاں تک کہ پیروزاں کے ساتھ جنگ جیسی صورتِ حال بن گئی۔ پیروزاں نے فورسز کا سہارا لیا تو چاچا سائیں اور رتو بھوہڑ کی مدد سے میں سرحد پار راجھستان پہنچ گیا۔ مجھے ایک سرحدی بستی میں پناہ ملی تھی۔ مجھے وہاں کا کھیا قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہاں سے چاچا سائیں کا بیٹا بخاور مجھے بچا کر اودھے رام کے پاس لے گیا۔ اودھے رام ایک مجرم تھا جو اپنے ہاں پناہ لینے والوں سے جرم کرواتا تھا۔ اودھے رام سے ملاقات کے بعد مجھے ٹاسک دیا گیا کہ جیسلمیر میں موجود ایک بزنس مین کو قتل کرنا ہے۔ میں جیسلمیر پہنچ چکا تھا۔ مانسی نامی لڑکی کے ساتھ مل کر میں نے بزنس مین کا کام تمام کر دیا۔ مادھو نامی ایک خانہ بدوش کے ہاں پناہ لینا پڑی جہاں بھارتی آرمی آن پہنچی۔ وہاں سے بھی فرار ہونا پڑا۔ اسی جرم کی دنیا میں مجھے نیا ٹاسک سونپ دیا۔ اس بار دو لڑکیوں کو اغوا کرنا تھا۔ رتنا اور ششما نامی لڑکیوں کو میں نے اغوا کر کے ایک ویرانے میں پہنچا دیا تھا، جہاں میرے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ مگر میں رتنا اور ششما کو بچا کے جودھ پور لے گیا۔ رتنا اور ششما خود جرم کی دنیا کی بڑی کھلاڑی تھیں۔ وہیں پر مجھے ''کلیان جی'' نامی ایک مجرم تنظیم کا پتا مل گیا۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ پوجا نامی لڑکی دراصل کلیان جی کی ایجنٹ ہے۔ میں نے خود کو اس سے بچایا میں اسے اغوا کر کے قتل کرنا چاہتا تھا مگر قتل نہیں کر پاتا۔ پوجا کا ساتھی پرتاب راؤ، ان دونوں لڑکیوں کو غداری کی پاداش میں قتل کروانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ کلیان جی کے ڈانڈے تو ریاستی خفیہ تنظیم سے ملتے ہیں، اس تنظیم کو چلانے والوں میں راکیش ورما بھی شامل تھا۔ جودھ پور میں خود کو بچاتے ہوئے مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہیں سے مجھے ایک مددگار سے شراوجی نامی آدمی سے پرتاب راؤ کے بارے میں خبر ملی۔ میں اس کے تعاقب میں دیوگڑھ جا پہنچا۔ دراصل وہاں پر رانی بھاگ وتی اور پرتاب راؤ کے درمیان دشمنی چل رہی تھی۔ اس نے رانی بھاگ وتی کی طرف سے پرتاب راؤ پر حملہ کیا۔ ریتو نامی ایک بازی گر لڑکی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اپنی کارروائیوں سے میں نے پرتاب راؤ کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرتاب راؤ خود ریاستی ایجنٹ تھا اور کلیان جی نامی خفیہ تنظیم کا رکن

جس نے ڈاکٹر کامران ملک اور اس کی بیوی فائزہ ملک کو اپنی نجی جیل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کو بازیاب کروایا۔ یہاں سے مجھے پتا چلا کہ کلیان جی نامی تنظیم کا وجود کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پرتاب راؤ کے قتل کی پاداش میں مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، آرمی فورس تعاقب میں تھی۔ ایک سادھو مائی نامی عورت کی مدد سے میں جے پور جا پہنچا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا کے مصداق میں جے پور میں پھنس گیا۔ ایک مقامی تنظیم نے اس شرط پر مجھے بھارت سے نکالنے کی ہامی بھری کہ میں ستیہ رام نامی شخص کو قتل کردوں۔ بھلا نامی آئی ٹی ایکسپرٹ کی مدد سے میں نے ان لوگوں کو قتل کر دیا۔ وہی بھلا مجھے دوبارہ جیسلمیر تک لے گئی جہاں بھارتی فورسز انتظار میں تھیں۔ وہاں بھی حالات خراب تھے۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا مگر بختاور کی مدد سے میں واپس روہی آن پہنچا۔ روہی میرا ٹارگٹ پیروزاں تھی جو میرے لیے پہلے ہی جال بچھائے بیٹھی تھی۔ پیروزاں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کی مدد کو راجستانی دشمن اور بھارتی ایجنٹ آ گئے۔ یہاں ایک نئی کشمکش کا آغاز تھا۔ یہاں تک کہ بختاور کی مدد سے ہم نے پیروزاں کو اغوا کر لیا۔ ساوری اپنے انتقام کے باعث پیروزاں کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ساوری کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر میں نے اپنا ماضی بتایا کہ کس طرح بستی چراغ شاہ سے بھاگا اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اب تک کی زندگی کیسے گزری۔ چاچا عبدالمجید جس نے ہر پل میری راہنمائی اور مدد کی، وہ روہی میں آ گیا تھا۔ ہم نے سانول اور رحماں کی شادی کر دی تھی۔ اسی شادی پر ناچنے والی لڑکی ردمی سے چھوٹو رام جیسا بدمعاش سامنے آ گیا تھا، جس کے ڈانڈے جرم کی دنیا میں بہت دور تک جاتے تھے۔ چھوٹو رام محض ایک پرزہ تھا۔ اصل بیوپار کرنے والے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے ساتھ زبردست ٹاکرا ہوا۔ ہم شہر آ گئے۔ اب کلیان جی نامی تنظیم کا کھوج لگانا تھا۔ اس سلسلے میں پوجا راہنمائی کر سکتی تھی مگر وہ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ ابھی ہماری سمجھ سے دور تھا۔ پوجا سے ملاقات طے ہو چکی تھی۔ پوجا پر تشدد کرنے کے بعد کچھ باتیں پتا چلیں۔ میں اس پر اعتماد کرنے پر تیار نہ تھا۔ مگر چاچا عبدالمجید کے کہنے پر اس کی جاں بخشی دی۔ اب اس کے اور میرے ارادے خطرناک صورت اختیار کر گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں شہباز کی کیفیات سمجھ رہا تھا کیونکہ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کچھ دیر پہلے میں جس رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا، اس سے میری ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ شہباز نے بڑے تحمل سے مجھے احساس دلایا تھا کہ میں خطرناک حد تک تیز رفتاری سے گاڑی بھگا رہا ہوں۔ وہ لمحہ ایسا ہی تھا، میں خود سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ایک خودکش حملہ آور کیسی بھیانک تباہی مچاتا ہے۔ اگر کوئی گنہگار ہو تو اس کی سزا بنتی ہے لیکن جو کسی بے گناہ کو مارے، وہ انتہائی ظالم ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسانیت سے ہوتا ہے، نہ ہی کسی دین دھرم سے۔ وہ بس ایک وحشی جانور ہوتا ہے، میں جس قدر اس تباہی کو محسوس کر رہا تھا، اسی قدر رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اس وقت ہم سگیاں پُل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شہباز کا رابطہ اپنے لوگوں کے ساتھ تھا، جو انتہائی برق رفتاری سے سگیاں پُل کے پاس کھوکھر کے ڈیرے کے اردگرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہمارا ان کا فاصلہ چند منٹ کا تھا کہ اچانک شہباز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اوئے غضب ہو گیا، وہ نکل پڑا ہے۔“

”کون، وہ خودکش......“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں، وہ موٹر سائیکل پر ہے، اس کے ساتھ ایک آدمی ہے، جس کے پاس ریموٹ ہے۔“ اس نے سیل فون پر دیکھتے ہوئے یوں تیزی سے کہا جیسے خودکلامی کر رہا ہو۔ پھر میری طرف سیل فون کی اسکرین کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھ، یہ ہے ان دونوں کی تصویر......“

میں نے دیکھا، بائیک پر دو بندے بیٹھے جا رہے تھے۔ ان کی شکل تو دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن ان کے کپڑوں سے انہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ میں نے تصویر پر ایک نگاہ دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ کیسے پتا چلا؟“

”یہ عدیل نے بھیجی ہے، تفصیل نہیں بتائی ابھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دم سے کہا۔ ”لو اس کا وائس میسج بھی آ گیا۔“ اس نے وائس میسج چلایا۔ عدیل کہہ رہا تھا۔

”شہباز بھائی، ہمارے پہنچتے ہی یہ دو بندے کھوکھر ڈیرے سے نکلے ہیں، تین بندے اندر ڈیرے میں بھی تھے، ہم نے پوچھا تو انہوں نے صاف انکار کیا۔ پھر ہمیں تھوڑی سختی کرنا پڑی۔ ایک کو مرتا ہوا دیکھ کر باقی دو نے سب کچھ بک دیا کہ وہی لڑکا خودکش حملہ آور ہے جو پیچھے بیٹھا ہے اور جو بائیک چلا رہا ہے اس کے پاس ریموٹ ہے۔ اب سلمان اور میں ان کے پیچھے ہیں۔ وہ اس وقت ہمارے آگے جا رہے ہیں۔“

”انہیں گولی مت مارنا، آبادی سے دور لے جانا ہے،

اپنی لوکیشن بھیجتے رہو، میں قریب ہوں۔'' شہباز نے کہا اور واٹس میسج بھیج دیا۔

''اوماما سیدھی کال کر۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''بس ذرا صبر کر..... لوکیشن آنے دے۔'' اس نے تحمل سے کہا اور مجھے اشارے سے رکنے کو کہا، میں نے سڑک کنارے گاڑی کھڑی کردی۔ وہ جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا اور گاڑی بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ابھی جوہر ٹاؤن تک پہنچنے میں انہیں تھوڑا وقت لگے گا۔ یہی کوئی بیس منٹ، اسی دوران میں اسے 'ٹھاپ' لوں گا، تم فکر نہ کرو، بس یہ کرو، تمہارے پسٹل میں گولیاں ختم نہیں ہونی چاہئیں۔'' اس نے خالص لاہوری لہجے میں کہتے ہوئے فون ڈیش بورڈ پر نصب کردیا۔ میں خاموش ہوگیا۔

وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کرتا ہوا چلتا چلا جارہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ خودکش حملہ آور کسی نہ کسی طرح آبادی سے باہر نکل جائے، پھر انہیں قابو کیا جاسکتا ہے۔ قابو کیسے کرنا تھا، اس کا کوئی منصوبہ میرے دماغ میں نہیں تھا۔

''باقی سارے.....'' میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی پیچھے ہیں، شکر کرو وہ آبادی سے دور رہ کر ہی جوہر ٹاؤن پہنچنے کی کوشش میں ہیں، اب انہیں راوی کی طرف لے جانا ہوگا۔'' اس نے کہا اور سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگادی۔

میرا خون تیزی سے گردش کررہا تھا لیکن میں بے بس تھا، دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر وہاں تک پہنچ جاؤں جہاں وہ خودکش حملہ آور جارہا تھا۔ تھوڑا سا ہی سہی، وقت ملنے کے باعث ایک دم سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے خودکش بمبار کو آبادی سے باہر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تو ٹھیک کیا تھا، وہ ایسا ہی علاقہ تھا۔ دریائے راوی کے بے آباد کنارے پران کا ڈیرا تھا۔ اب وہاں سے وہ جوہر ٹاؤن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس طرح وہ محفوظ طریقے سے اور جلدی پہنچنے والے تھے۔

یہ لاہور کا مضافاتی علاقہ تھا جہاں اتنا رش نہیں تھا۔ شہباز نے اچانک گاڑی ایک چھوٹی سی گلی میں ڈال دی۔ یہ بہت بڑا رسک تھا اور دیوانگی کی انتہا، اگر کہیں بھی آگے رکاوٹ آجاتی تو یہاں سے نکلنا انتہائی مشکل تھا۔ ایسے سنسنی خیز لمحات میں اسے ٹوکنا بھی پاگل پن تھا۔ اگلے تین منٹ بعد میرا خیال غلط ثابت ہوا، یہ اگر تنگ گلی تھی تو چھوٹی سی بھی تھی۔ شہباز نے گھوم کر پیچھے جانے کے بجائے، شارٹ کٹ مارا تھا۔ سامنے ایک سوڈا واٹر کا ڈپو نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑی سی گلی دکھائی دی۔ جس میں وہی موٹر سائیکل سوار جا رہے تھے، جن کی تصویر ہم تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکے تھے۔ شہباز کے جبڑے بھنچ گئے اور میرا خون بھی کھولنے لگا۔ یہ جذباتیت کا نہیں، حوصلے، صبر اور عقل سے کام لینے کا وقت تھا۔

شہباز نے گاڑی ان کے قریب کردی پھر ان کے اتنا قریب لے گیا کہ موٹر سائیکل چلانے والے نے ایک بار شہباز کی طرف حیرت سے دیکھا۔ تبھی شہباز نے کھڑکی سے سر نکال کر تیزی سے کہا۔

''اوئے، اتنی دیر کردی تم لوگوں نے، چلو میرے پیچھے آؤ۔''

موٹر سائیکل چلانے والے نے تعجب سے شہباز کو دیکھا اور حیرت انگیز لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟''

''اوئے دیر ہوگئی ہے، میں تجھے شارٹ کٹ سے لے جانے آیا ہوں، تیز چل ذرا۔'' شہباز نے باہر دیکھتے ہوئے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

میں نے بیک مرر میں دیکھا، وہ موٹر سائیکل سوار ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ میں نے اپنے اردگرد کا ماحول دیکھا۔ ہمارے دائیں جانب راوی کا خشک اور کیچڑ ملے دریا کا تھوڑا سا پانی تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سامنے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر موٹروے کا پل دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی میں نے شہباز سے کہا۔

''بس شہباز، یہیں پران کا کام کرتے ہیں۔''

''چل تیار ہوجا۔'' اس نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا اور گاڑی کی رفتار کم کرتا چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ موٹر سائیکل ان کے برابر آگیا تو شہباز نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اونچی آواز میں کہا۔

''اوئے سن..... وہ سامنے اندر بائیں طرف سڑک جا رہی ہے نا، اس طرف چلو، میں اب تمہارے پیچھے ہوں، سب سنبھال لوں گا، پیچھے کی فکر مت کرنا، اگر آگے کہیں ذرا سی بھی گڑبڑ لگے تو سر پر ہاتھ پھیر دینا، میں سنبھال لوں گا، تم کو بس نکلنا ہے اور ٹارگٹ تک پہنچنا ہے، بس اب فوراً نکلو۔''

''اوکے۔'' موٹر سائیکل والے نے کہا تو ہم سمجھ گئے وہ ہمارے ٹریپ میں آگئے ہیں۔ جیسے ہی شہباز نے گاڑی کی رفتار کم کی، میں سن روف کھول کر کھڑا ہوگیا۔ اسی لمحے میں

نے اپنے پیر سیٹ پر جمائے اور پسٹل سیدھا کر کے تاک کر نشانہ لیا اور پھر یکے بعد دیگرے فائر کرتا چلا گیا۔ شہباز نے کسی ممکنہ دھماکے کی وجہ سے گاڑی کو بریک لگا دیے۔ دھماکا تو نہیں ہوا لیکن موٹر سائیکل ڈگمگائی اور وہ دونوں گر گئے۔ پیچھے بیٹھے خودکش حملہ آور کو گولی لگ گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس وقت تک خطرناک نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ ریموٹ سے خودکش جیکٹ نہ پھاڑتا۔

میرے پسٹل کا میگزین ختم ہو گیا تھا۔ میں نے جذبات میں ساری گولیاں چلا دی تھیں۔ جب تک میں نے میگزین بدلا، موٹر سائیکل چلانے والا گر کر اٹھ چکا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر دریا کی جانب لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ خودکش حملہ آور وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ شہباز نے گاڑی نیم دائرے میں گھما دی اور خودکش حملہ آور سے تو دور ہوتا چلا گیا لیکن دریا کی جانب بھاگتے ہوئے شخص کے قریب ہونے لگا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیے۔ تیسری یا چوتھی گولی اس کی کمر پر لگی، وہ لہرایا اور کیچڑ میں گر گیا۔ میں نے سارا میگزین اسی پر خالی کر دیا۔ میں جب واپس سیٹ پر آ کر بیٹھا تو میرے پورے بدن سے پسینا پھوٹ چکا تھا۔ میرے حواس بے قابو ہو رہے تھے۔ لاشعوری طور پر میں چاہتا تھا کہ وہ بم پھٹ جائے کیونکہ گرے ہوئے شخص اور خودکش حملہ آور کا فاصلہ کافی تھا۔

شہباز گاڑی روک چکا تھا۔ میں تیزی سے اترا اور گرے ہوئے شخص کی طرف دوڑا۔ اس کے پاس پہنچا تو وہ سسک رہا تھا۔ میں اس کی تلاشی لینے لگا۔ میں نے لاشعوری طور پر تیزی سے پوچھا۔

"ریموٹ...... کہاں ہے۔ کہاں ہے ریموٹ......؟"

"کک...... کچ...... کی...... ے...... رے...... پاس......" اس نے ہولے ہولے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے یوں اشارہ کیا جس کی مجھے ذرا بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا بلکہ جنونی انداز میں اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی پتلون والی جیب میں سے ایک چپٹی سی شے نکلی۔ وہ بالکل ایسا ہی ریموٹ تھا جیسے کسی کار کا ہوتا ہے۔

"کچھ نہیں کرنا علی......" میرے پیچھے سے شہباز کی آواز ابھری۔ میں نے مڑ کر دیکھا، کافی لوگ وہاں آگئے تھے۔ وہ شاید مختلف محکموں سے تھے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا، میں تیزی سے اٹھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا تب ہی چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کی اور شہباز

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو

کانچ محل

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری......

رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور

عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان

بہت جلد سسپنس کے صفحات کی زینت

کو چلنے کا اشارہ کیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں وہ بولے۔
''اب اس خودکش کو بھول جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے، حبیب کھوکھر تک پہنچنے کی کوشش کرو۔''
''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے پوچھا۔
''اسے پتا چل گیا ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے اور.....'' چاچا نے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔
''اتنی جلدی کیسے؟''
''پہلے ڈیرے پر چھاپا پڑنے کی اطلاع ملی اور پھر خودکش کے پیچھے چھوڑے بندوں نے اطلاع دی ہے۔ شکر کرو وہ ڈر کر بنا فائرنگ کیے پلٹ گئے، ورنہ اب تک..... خیر، حبیب کھوکھر جنازہ چھوڑ کر نکل گیا ہے۔'' چاچا نے تیزی سے بتایا۔
''وہ نظر میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تھوڑی دیر پہلے نظروں میں تھا، لڑکے بتا رہے ہیں کہ اب وہ غائب ہے۔ کچھ لڑکے اس کے پیچھے گئے تو ہیں لیکن حبیب کھوکھر ان کے بس کی بات نہیں، تم دونوں پہنچو، تمہیں سراغ مل جائے گا۔'' چاچا نے متوحش لہجے میں کہا۔
''او کے، ہم نکل رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے دیکھا، شہباز موٹروے کے نیچے سے بائیں جانب گھومتی ہوئی سڑک کے قریب پہنچ چکا تھا، میں نے اسے چاچا کی بات سمجھائی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔

☆☆☆

حبیب کھوکھر جس تیزی سے جنازہ گاہ سے نکلا تھا، اسی تیزی سے لڑکوں کی نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گیا تھا۔ پوچھنے پر یہی معلوم ہوا کہ وہ پارکنگ تک تو نگاہوں میں تھا، وہاں پہنچ کر کہیں غائب ہو گیا۔ حبیب کھوکھر کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، اس نے ایسے ہی کاموں میں ساری زندگی گزاری تھی۔ اگر وہ ایسا شاطر اور زیرک دماغ نہ رکھتا تو لاہور کے انڈرورلڈ میں کب کا کہیں کھو چکا ہوتا۔
''اب کیا کریں؟'' شہباز نے جھلا کے کہا۔
''کوئی بات نہیں، کہاں جائے گا۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''ابھی تو چلا گیا ہے، اُسے تلاش کرنے میں جو خجالت اٹھانی ہے، میں اس سے کتراتا ہوں۔'' اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تو میں اسی پُرسکون لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔
''تم پھر ایسا کرو، یہاں گاڑی روکو، اتر کر ٹیکسی لو اور سیدھے گھر پہنچ جاؤ، میں آجاتا ہوں۔''
''اوہ، واہ اوئے، ماما تیرے مشورے.....'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا پھر اس نے اکتاہٹ کو ایک لمحے ہی میں اُڑا کر رکھ دیا۔
''کیوں، اچھا نہیں لگا یہ مشورہ؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
''ابھی تو کچھ کھانے کو من کر رہا ہے، بول بھوک لگی ہے تمہیں؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے ہمارے درمیان پہلے کوئی بات نہیں ہوئی۔
''لگی تو ہے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔
''چل پھر پہلے کھانا کھاتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔ وہ اسی روڈ پر سیدھا چلتا چلا گیا۔ میں خاموش رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک اوپن ائر ریستوران میں جا رکا۔ گاڑی پارکنگ میں لگا کر ہم فریش ہوئے اور گاڑی کے قریب ہی پُرسکون جگہ پر جا بیٹھے۔ دھوپ اتنی نرم تھی جیسے ملائم سی چادر ہو۔
''بڑی نرم دھوپ ہے۔'' میں نے یونہی کہا تو شہباز ہنستے ہوئے بولا۔
''تمہیں تو نرم ہی لگنی ہے، تم ہو روہی کے رہنے والے، تم تو گرمیوں میں بھی کمبل لے کر سوتے ہو۔''
''چلو مجھے تو پتا ہے کہ میں روہی کا ہوں لیکن تمہارا تو پتا ہی نہیں، تم کہاں کے ہو۔'' میں نے اس کے شرارتی جملے کا جواب دیا تو وہ ایک دم سے بجھ گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی شرارتی چمک ایک دم سے مدھم ہو کر رہ گئی۔ مجھے لگا جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ یقیناً میں نے انجانے میں کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ میں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا،
''تم نے کچھ دیر پہلے کھوکھر کے ڈیروں کے بارے میں پوچھا تھا، پتا چلا، کہاں کہاں ہیں اُس کے ڈیرے؟''
''کھوکھر اتنا پاگل نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی ڈیرے پر جائے گا، اس نے بچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں گی۔ وہ ضرور کہیں ایسی جگہ پر ہو گا جہاں پر کسی کا دھیان بھی نہ جا سکے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''تو پھر کہاں جا سکتا ہے؟'' میں نے یونہی بات بڑھانے کو پوچھا۔
''چاچا کو فون کر، پوچھ کیا بنا اُس کا، میرا خیال ہے اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔'' اس نے اپنی رائے دیتے

ہوئے کہا۔

''یار پہلے کھانا کھا لیں، پھر پوچھ لیتے ہیں، کوئی ایمرجنسی ہوئی تو خود ہی کال کر لیں گے۔'' میں نے کاملی سے کہا تو اس نے کاندھے اُچکا دیے۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا تو میں نے کہا۔

''یار اُس کے فون نمبر سے کوئی سراغ مل سکتا ہے؟''

''یار تم حبیب کھوکھر کو بہت ایزی لے رہے ہو۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، ملک زاہد اور ملک حامد کو اس راہ پر لگانے والا یہی حبیب کھوکھر ہی ہے، ورنہ ان دونوں بھائیوں کی کیا مجال تھی۔'' شہباز نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں مانتا ہوں، اس کے ذرائع بہت ہوں گے، اس کی رسائی بھی بڑی ہوگی، وہ زیرِ زمین لوگوں میں بھی گہرائی رکھتا ہوگا لیکن اس کا وجود تو ہے نا، وہ اسی زمین پر سانس لے رہا ہوگا، وہ کہاں.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا۔

''نہ یار، ابھی مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، جو تم کہہ رہے ہو، مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے، ذرا سانس لو، سکون سے کھانا کھاؤ، پھر اسے ہی تلاش کرنا ہے، کہیں نا کہیں سے مل جائے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایک دم سے یوں ہو گیا تھا جیسے اس پر اوس پڑ گئی ہو۔ اس کی وجہ کیا تھی، میں وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے جو جگت لگائی ہے اس کا ردِعمل ہے۔ کھانے کے دوران بھی اس کا موڈ ایسے ہی رہا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ اس وقت ہم چائے کے انتظار میں تھے جب میں نے بڑے محتاط انداز میں نرمی سے پوچھا۔

''تم میری بات سے ناراض تو نہیں ہو گئے ہو؟''

''کون سی بات؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی جو میں نے کہی تھی کہ.....'' میں نے کہا تو میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''ارے نہیں یار، یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا، میرا اپنا گھر تھا، یہیں لاہور کے مضافات میں، ایسی بات نہیں، میں دراصل کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''ایسا کیا سوچ رہا ہے، میں تو تیرا موڈ دیکھ کر بہت کچھ سوچنے لگا ہوں، ایویں ای گندے گندے خیال آ رہے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے کرسی کے ساتھ ٹک گیا، کچھ لمحے یونہی ہنستے رہنے کے بعد اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ نہیں، میں کچھ دوسرا سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا تو اس نے میری جانب دیکھا، چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد جذباتی لہجے میں بولا۔

''شانزے، میں شانزے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، بہت پاگل ہے وہ، اسے یہ لڑنا بھڑنا تو بالکل بھی نہیں آتا، ایک گولی کی آواز پر وہ سہم جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں وہ کہیں میری کمزوری نہ بن جائے، پھر دوسری بات.....'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ''وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں میرے پاس آ گئی ہے، ہر پل میرے کام آتی ہے، اور اگر مجھے کچھ ہو گیا، یہی کچھ دیر پہلے، وہ بم میرے قریب پھٹ جاتا، کوئی گولی میرے آر پار ہو جاتی، تو شانزے کا کیا بنتا؟''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، یہ جذباتی رشتے ہماری کمزوری بن جاتے ہیں، لیکن ایک بات اور بھی ہے،'' میں نے اسی کے انداز میں کہا تو اس نے میری طرف غور سے دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ کیا میرے دوست.....؟''

''یہی رشتے ہماری طاقت ہیں۔'' میں نے کہا اور خاموش ہو گیا، شہباز کچھ نہیں بولا تو میں کہتا چلا گیا۔ ''یہ جو ہم اتنے ہنگاموں سے نبرد آزما ہیں، گولیوں کی بوچھاڑ میں دشمنوں کے درمیان سے نکلنے کی جو لاشعوری کوشش ہوتی ہے، وہ کن کے لیے؟ ہم جو تاریک راہوں کے راہی ہیں، کن کے لیے سانسیں لے رہیں، انہیں بھی پتا ہے ہماری موت ایسی ہی کسی انجان جگہ پر ہوگی، کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔''

''یہ حقیقت ہے لیکن وہ جو ہم سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے دل بہت تڑپتا ہے، ان کا کیا ہوگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا، اب تم چائے پیو بس۔'' میں نے ویٹر کو آتے دیکھ کر بے پروائی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ اس کی بے وجہ ہنسی بھی بہت سارے معاملات حل کر دیا کرتی تھی۔ اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''پہلے میں نے اسے چھپا کر رکھنا چاہا تھا، پھر میں نے جب بھابی ساوری کو دیکھا تو لگا، شانزے کو اس سے ملا دوں، میرا خیال ہے شانزے کافی حد تک حوصلہ پکڑ جائے گی۔''

''اچھا کیا تم نے۔'' میں نے خوشدلی سے کہا تو وہ چائے

پینے لگا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر چل دیے تھے۔ اس بار ڈرائیونگ میں کر رہا تھا اور وہ اپنے طور پر حبیب کھوکھر کی تلاش میں رابطے کر رہا تھا۔ میں نے اپنا رخ کینال روڈ کی طرف کر دیا تھا، لاشعوری طور پر میں آفس کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ جب تک حبیب کھوکھر کی نشاندہی نہ ہو جاتی، تب تک ہم سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں ابھی کینال روڈ تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا، وہ پوجا کا فون تھا۔ شہباز بھی اسکرین پر دیکھ رہا تھا، وہ ایک دم سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس کی سن لے، ہم سے پہلے یہ حبیب کھوکھر کو مارنا چاہتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے شہباز کی طرف دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔

''مبارک ہو تمہیں، وہ خودکش والا معاملہ حل ہو گیا۔''

''مجھے کیوں مبارک باد دے رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہاری کامیابی نہیں ہے کیا؟'' اس نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔

''میں تو ڈیرے تک پہنچا ہی نہیں، وہ تو کسی دوسرے نے کارنامہ کیا ہے، میرے حصے میں وہ نہیں آیا۔'' میں اس سے بات چھپا گیا۔

''چل کوئی نہیں، معاملہ تو ختم ہو گیا ہے نا۔'' اس نے کہا لیکن لہجے میں تشویش بھر گئی تھی جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔

''وہ یار تیرا حبیب کھوکھر نہیں مل رہا، وہ جنازے ہی سے کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے بھی پتا چلا ہے۔ میں لگی ہوئی ہوں، کہیں نہ کہیں سے تو اس کا سراغ مل جائے گا۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''یار پوجا، یہ کیا بات ہے، تیرا بتایا ہوا ہر بندہ گم ہو جاتا ہے۔''

''میں اس بارے کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور تیزی سے بولی، ''ایک بات کہوں، یہ لاہور کافی ٹیڑھا ہے، اسے سمجھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔''

''تھوڑا نہیں، بہت زیادہ، لیکن جو محبت سے لاہور کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں جلد سمجھ میں آ جاتا ہے، خیر، کھوکھر کے بارے میں اگر تمہیں پتا مل جائے تو بتانا، ہم تو پھر تلاش کر رہے ہیں۔'' میں نے پھر خوشگوار سے لہجے میں کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''چل ٹھیک ہے، بتاتی ہوں، جو بھی پتا ملا۔''

اس نے فون بند کر دیا تو شہباز بولا۔ ''کیا خیال ہے تمہارا، اب گھیرا ڈال لیں اس پر؟''

''یہ گھیرے ہی میں ہے اب۔ یہ کھوکھر والا کام کر لیں، پھر اس کے ساتھ کھیلنا ہے، اسے لگ پتا جائے گا کہ لاہور والے کیسے کھیلتے ہیں۔'' میں نے دبے دبے غصے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''او ماما رہنے دے..... وہ تجھے چکر پہ چکر دے رہی ہے۔''

''چل بتا، کیسا چکر؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''وہ بڑے طریقے سے ہمارا نیٹ ورک استعمال کر رہی ہے، جبکہ ہم اسے مارنا چاہتے ہیں، کیسی شاطر ہے وہ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں سوہنے، میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں وہ ہمارے اندر کہاں تک گھس گئی ہے۔ پوجا جو بات کہتی ہے، وہی چاچا بھی کہتے ہیں، کہاں پر ہے یہ سب؟ یہی دیکھنا ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ویری سمپل یار، جس طرح اس نے ہمیں ٹرک کی بتی دکھائی ہوئی ہے، اسی طرح کسی دوسرے کو بھی دکھائی ہو گی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ شاید ہماری بات کچھ مزید لمبی ہو جاتی، اس کے سیل پر کسی میسج آنے کی ٹون بجی تو وہ سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا، اگلے ہی لمحے تیزی سے بولا۔ ''اوئے، کھوکھر اس وقت کرباٹھ کے علاقے میں ہے اور باہر جانے کی کوشش میں ہے۔''

''خبر پکی ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''میں... سو فیصد نہیں کہہ سکتا یار، یہ تائے فاروق شاہ کا بندہ ہے جو اطلاع دے رہا ہے۔''

''کرباٹھ میں اس کا نیٹ ورک ہو گا کہ نہیں؟'' میں نے اسے احساس دلایا تو وہ تیزی سے بولا۔

''میرے بھی کچھ لوگ ہیں وہاں، خیر اگر یہ وہاں ہوا تو بندے چاہیے ہوں گے، میں چاچا سے بات کرتا ہوں۔''

''چل کر۔'' میں نے کہا اور کرباٹھ کے علاقے کی طرف جانے والے راستے کو ذہن میں لانے لگا۔ چند لمحوں میں ایک روٹ میرے ذہن میں آ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں تک پہنچتے ہوئے کوئی گھنٹا ڈیڑھ تو لگ ہی جائے گا۔ میں نے ممکن حد تک رفتار بڑھاتے ہوئے پوری توجہ

ڈرائیونگ پر دے دی۔ کافی دیر تک شہباز بالکل نہیں بولا، وہ اپنے فون میں کھویا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا

''کس طرف سے جاؤ گے؟''

''کرباٹھ کی طرف ہی جا رہا ہوں، اب تم بتاؤ کدھر سے جانا ہے؟'' میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت کہاں ہیں؟'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر خود ہی بولا۔ ''یہ تو کوٹ لکھپت کے قریب آ گئے ہیں۔''

''ہاں تو ابھی تھوڑی دیر بعد.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔

''ہمیں پہلے لدھڑ جانا ہے، بیدیاں روڈ پر، وہاں ایک دوست ہے اس کے پاس ٹھہرنا ہے۔''

تقریباً پون گھنٹے بعد ہم لدھڑ پہنچ گئے۔ وہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ اس کی گلیاں اور بازار چوڑے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس علاقے کو آباد ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ ہم ایک بازار جا پہنچے۔ وہاں اتنا زیادہ رش نہیں تھا لیکن ہم دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے ایک کپڑے کی دکان کے سامنے آ پہنچے۔ شہباز گاڑی سے نکلا تو میں نے بھی گاڑی بند کر کے اپنا پسٹل چیک کیا اور نیچے اتر آیا۔ راستے میں شہباز نے یہاں کے بارے میں جو کچھ بتا دیا تھا، میں اسی کے تناظر میں ذہنی طور پر تیار تھا۔ دکان میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان بیٹھا نظر آیا۔ شہباز نے جاتے ہی اس سے کہا۔

''رانا صاحب سے ملنا ہے۔''

اس نوجوان نے پہلے تو ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر ذرا سے اکھڑ لہجے میں اکتاہٹ سے پوچھا۔

''کیا نام ہی ہے جی آپ کا؟''

شہباز نے کوئی ردِعمل دیے بغیر تحمل سے اپنا نام بتایا تو اس نے انٹر کام پر کسی کو ہمارے بارے میں بتایا، پھر انٹر کام کا ریسیور رکھتے ہوئے دکان کے بالکل ساتھ ہی جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ادھر سیڑھیاں ہیں، اوپر چلے جائیں۔''

چند منٹ بعد ہم اوپر بنی منزل تک پہنچے، ذرا سے صحن کے بعد ان کا آفس تھا۔ ہم آفس میں جا پہنچے۔ چھوٹا سا آفس خاصا خوشگوار تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ دھری کرسی پر ایک ادھیڑ عمر گنجا شخص بیٹھا تھا، جس کا رنگ سفید اور نیلی آنکھیں تھیں۔ اُس کے چہرے ہی سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو شہباز نے ہاتھ ملاتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''حبیب کھوکھر کہاں ہے؟''

''بیٹھو تو سہی۔'' اس نے کہا تو شہباز نے اسی سرد لہجے میں سوال دہرایا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے باری باری غور سے ہماری جانب دیکھا۔ لیکن ہمارے سوال پر کوئی ردِعمل نہیں دیا جیسے اسے پہلے ہی سے ایسے کسی سوال کی توقع ہو۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹ بھینچے ہماری طرف دیکھتا ہوا کچھ سوچنے لگا، وہ حد درجہ بے چینی میں تھا، جیسے وہ بہت زیادہ بے بس ہو۔ تبھی شہباز نے بڑے سکون سے یوں پوچھا جیسے کسی سوٹ کی قیمت دریافت کر رہا ہو۔

''ہاں جی رانا صاحب بتائیں گے یا ابھی آپ کا موڈ نہیں بن رہا؟''

''دیکھو، میں جانتا ہوں، معاملہ بہت زیادہ سیریس ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن آپ بھی جانتے ہیں، میرے منہ سے نکلے ہوئے ایک بھی لفظ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھیں تو اچھا ہے۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں، مجھ پر رحم کریں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بڑے شستہ طریقے سے انکار کر دیا۔

''یعنی اِس انکار کی وجہ صرف اور صرف حبیب کھوکھر کا خوف ہے، نہیں وہ آپ کو اس کی سزا نہ دے دے؟'' شہباز نے پھر پُرسکون انداز میں پوچھا تو وہ تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بالکل، ایسا ہی ہے، آپ ہی بتاؤ، کیا وہ مجھے زندہ چھوڑ دے گا۔''

''میں مانتا ہوں وہ ایسا ہی کرے گا لیکن جو کچھ آپ مجھے بتاؤ گے، اس کی کوئی نہ کوئی قیمت تو ہوگی، میں وہ دینے کو تیار ہوں۔'' اس نے دوسری طرح پیشکش کر دی۔

''نہیں، وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' رانا نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل، اسی طرح ہم بھی آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' شہباز نے کافی حد تک اس کی شکل اتارتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اور پھر ایک دم سے غراتے ہوئے بولا۔

''میرے ہی پاس بیٹھے، مجھے ہی للکار رہے ہو..... تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں۔'' شہباز نے بڑے سکون سے جواب دیا تو وہ غراتے ہوئے بولا

''کیا تم یہ نہیں جانتے، یہ جو سیڑھیاں تم اپنے پاؤں سے چڑھ کر آئے ہو، کاندھوں پر بھی جاسکتے ہو۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے، یہ ہوگا نہیں کیونکہ اس سے پہلے میں تمہیں آسمان تک ضرور پہنچادوں گا۔'' وہ پھر اسی سکون سے بولا۔

''میں تمہیں.....'' اس نے غصے میں کہنا چاہا تو شہباز ایک دم ہی ہتھے سے اکھڑ گیا، اس کی بات پوری ہونے سے پہلے حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

''بندے کے بچے بنو اور کھوکھر کا بتادو، وہ یہاں کس کے پاس ہے۔''

''اور اگر نہ بتاؤں تو.....؟'' اس نے دھمکی آمیز سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر تم کو جو کرنا ہے وہ کرلو، تم زندہ نہیں رہو گے۔'' شہباز نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔

اسی لمحے دروازے میں سے دو پہلوان نما لڑکے اندر آگئے۔ وہ دونوں ہمیں گھورتے ہوئے ہمارے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تک میں نے ایک بھی لفظ نہیں کہا تھا..... رانا نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پُتر، دھمکی لگانے سے پہلے یہ تو دیکھ لو، تمہارے منہ میں پورے دانت بھی ہیں یا نہیں۔ بیٹھو ذرا، ابھی تمہاری ٹیوننگ کرواتا ہوں۔''

''تم جانتے ہو رانا میرے مرنے کے بعد تمہارا کیا... ہونے والا ہے، کیا تمہیں اس کا احساس نہیں۔'' شہباز نے ہتک آمیز لہجے میں کہا ہی تھا کہ وہ دونوں نوجوان شہباز پر پل پڑے۔

ان دونوں نے شہباز کی گردن کو پکڑنا چاہا تھا۔ میں ایک دم سے اسپرنگ کی طرح اٹھا ان دونوں کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے انہیں پیچھے دھکیلا۔ وہ چونکہ پوری قوت سے آگے بڑھے تھے، اس لیے وہ زیادہ پیچھے نہیں ہٹ پائے لڑکھڑا گئے لیکن میں ان کا حملہ روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران شہباز نے چھلانگ لگائی اور رانا پر جا پڑا۔ رانا کرسی سے الٹ کر نیچے جا پڑا۔ نوارد نوجوانوں نے جب رانا کی حالت دیکھی تو اس کی طرف پلٹے مگر انہیں دیر ہوچکی تھی۔ تب تک... شہباز نے اپنا پسٹل نکال کر اس پر تان لیا تھا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ اُدھر۔'' میں نے ان دونوں کو کمرے کے کونے میں فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس کونے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا رانا پر شہباز نے پسٹل تانا ہوا ہے۔ رانا کے کہیں چوٹ لگ گئی تھی یا وہ ڈراما کررہا تھا۔ تکلیف کی شدت کا احساس اس کے چہرے پر تھا۔ شہباز نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔

''تم کیا سمجھتے ہوئے میں ایویں یہاں پر آگیا ہوں۔ باہر بیس سے زیادہ لوگ موجود ہیں، جو اس علاقے میں تیرا ایک ایک بندہ ٹھکانے لگا سکتے ہیں، کیا تو مجھے جانتا نہیں ہے؟'' شہباز نے پورے اعتماد سے جھوٹ کی انتہا کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ تبھی رانا کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''دیکھو فائر مت کرنا، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔''

''مجھے اب کوئی سمجھ نہیں آئے گی، کھوکھر کو تو میں بعد میں پوچھوں گا، پہلے تیرا کام کرلوں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا

''اچھا بتاتا ہوں، یہ پسٹل.....'' رانا نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''پہلے مجھے صرف پوچھنا تھا لیکن اب تجھے ساتھ لے کر جانا ہے، بول چلتا ہے یا.....؟''

''تو کیوں میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟'' رانا نے جھنجلاتے ہوئے کہا ہی تھا کہ شہباز نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ اسی لمحے ایک نوجوان نے بے ساختہ گالی بک دی۔ اس کی آواز ابھی کمرے میں گونج رہی تھی کہ میں اس کے سر پر جا پہنچا اور پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر دے ماری۔ اس کی ناک سے لہو پھوٹ پڑا۔ شہباز نے رانا کو گردن سے پکڑا اور نیچے کی طرف چل پڑا۔ میں الٹے قدموں کمرے سے باہر جانے لگا تو ایک نوجوان نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں داد دیتا ہوں، اس نے پورے وقت اور درست پینترے سے مجھ چھلانگ لگائی تھی۔ میں نے جھکائی بھی دی لیکن اس سے بچ نہیں سکا، میرا سر دروازے میں لگا اور میں گر گیا۔ اس نے میری گردن دبوچ لی، اسی لمحے پیچھے والا بھی اسپرنگ کے مانند اُچھلا، وہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں نے پہلے نوجوان کو ٹانگوں پر رکھ کر دھکیل دیا۔ مجھے بس اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے چنگل سے نکل کر دور جا پہنچا۔ وہ میری جانب لپکے، میں ایک طرف ہوتے ہوئے اٹھ گیا۔ پہلے والے نے مجھے لگ مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ

پوچھا۔

''اس لیے کہ اب رازداری نہیں رہی۔'' میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

''رازداری مطلب؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے اس کا دماغ کہیں اور ہو اور وہ میری بات سننا بھی چاہتا ہو۔

''اس کے اٹھا لینے کی خبر تو پھیل گئی ہے، یہ حبیب کھوکھر تک بھی پہنچ جائے گی اور وہ الرٹ ہو جائے گا۔ کیا فائدہ، اب اسے مارنا پڑے گا۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا تو وہ بولا۔

''یار یہ بتائے یا نہ بتائے، اسے اب مرنا ہے۔ مجھے دکھ یہ نہیں ہے کہ اس نے بتایا نہیں بلکہ اس خبیث پر مجھے غصہ اس لیے آیا کہ اس کے سو کام میں نے کیے، کروڑوں کا فائدہ اسے دیا، جب وقت پڑا، تو یہ مجھے فائدہ نقصان سنا رہا ہے۔ یہ نہیں بتائے گا دوسرے بتا دیں گے۔''

''چلو اگر یہ بات ہے تو اسے کسی ویرانے میں لے جا کر مار دیتے ہیں۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''نہیں، میں نے اسے اذیتیں دے کر ماروں گا۔ دوسرا اس سے ابھی مجھے پیسے پورے کرنے ہیں، پانچ دس کروڑ تو اس کے مل ہی جائیں گے۔ انہی پیسوں سے لوگ کھوکھر کو پاتال سے بھی نکال لیں گے۔''

''یار شہباز جانے دو، غلطی ہو گئی.....'' اچانک رانا منمناتے ہوئے بولا۔

''چپ کر کے پڑا رہ، بکواس نہ کر۔'' شہباز نے اُسے جھڑک دیا۔

''میں بتاتا ہوں، وہ کہاں ہے؟'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے ضرورت نہیں، تو اپنی معلومات اپنے پاس رکھ، تجھے پتا ہے کہ میں تجھے ماروں گا، تو غلط بتائے گا تو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''قسم سے سچ بتاؤں گا، تو جیسی چاہے گارنٹی لے لے۔'' رانا یقین دہانی کراتے ہوئے بولا تو اس نے پھر سے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''خاموش ہو جا۔''

''دیکھ، اگر میری اطلاع غلط ہو، یا تمہیں یہ لگے کہ میں نے تمہیں غلط کہا ہے تو مجھے مار دینا لیکن ایک بار غلطی معاف کر دے۔'' رانا لجاجت سے بولا۔

''چل سن لے یار۔'' میں نے کہا۔

''ہاں چل کہہ.....'' اس نے اجازت دے دی۔

علم

ڈاکٹر نے لڑکے سے کہا۔ ''میں نے تمہارے والد صاحب کو بیماریوں کے بارے میں جو چند کتابیں پڑھنے کو دی تھیں، کیا ان سے انہیں بیماری کو سمجھنے میں مدد ملی؟''

لڑکا۔ ''جی ہاں، بہت زیادہ۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے پہلے ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک بیماری ہے لیکن کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں علم ہوا کہ وہ اٹھارہ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔''

انگور

سیاح دکان دار سے۔ ''یہ کیا ہیں؟''

دکان دار۔ ''سیب ہیں۔''

''اتنے چھوٹے سیب، ہمارے ہاں تو سیب سیر، سیر بھر کا ہے۔'' پھر اس نے کیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہیں؟''

دکان دار نے بتایا۔ ''یہ کیلے ہیں۔''

سیاح نے کہا۔ ''کیلے ایسے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو پانچ، پانچ فٹ کے کیلے ہوتے ہیں۔''

پھر اس نے تربوز کی طرف اشارہ کیا تو دکان دار جھنجلا کر بولا۔ ''یہ انگور ہیں جناب انگور۔''

عبدالغفار زاہد، ایبٹ آباد

چار کی باتیں

چار کا پتا ہے آپ کو نہیں پتا تو دیکھو!

چار کتابیں تو پڑھ لی ہیں اب چار پیسے بھی کما لو۔

آخر ہماری بھی چار لوگوں میں عزت ہے۔ یہ بات چار لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ چار دن کی آئی بہو نے یہ کمال کیا ہے۔ کیا ہوتا جو چار دن گھر میں ٹک کے بیٹھ جاتی۔ تم سے کیا چار قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ وہ آئی اور کھڑی کھڑی چار باتیں سنا گئی۔ اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، چار لوگوں سے جا کے فیصلہ کروا لو۔

عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

لی اور پیچھے کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ پایا اور فرش پر گر گیا۔ اس وقت تک دوسرا میری گردن پر گھونسا مار چکا تھا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا گھونسا میرے مارتا، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پوری قوت سے اسے اپنی طرف کھینچا تو اس نے پیچھے کی طرف زور لگایا، تبھی میں نے اسے دھکا دے دیا۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں پسٹل نکال کر اس پر فائر کر دیتا۔ مگر میں لوگوں کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ میں جیسے ہی باہر جانے لگا وہ دونوں پھر سے میری طرف بڑھے۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک کو پکڑا، اس کے سر پر گھونسا مارا، وہ ایک لمحے کو اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر پرے ہٹایا تو وہ اپنی جھونک میں کھڑکی کے پاس جا لگا، میں نے اسے ٹانگوں سے اٹھایا اور کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔ جو میں نہیں چاہتا تھا، وہ ہو گیا۔ اس نوجوان کے گرنے سے لوگوں کو توجہ ہو جانا تھا۔ اب میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا، میں نے پسٹل نکال کر سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ وہ نوجوان اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس پر فائر نہیں کیا بلکہ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ رانا اور شہباز ابھی سیڑھیوں پر تھے۔ میں نے زور سے کہا۔

''شہباز نکل جلدی.....''

وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے جلدی سے نیچے اترنے لگا۔ میں ان دونوں کو ایک طرف ہٹا کر نکلا اور پہلے ہی سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے جاتے ہی ہوائی فائر کر دیا۔ ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ ہمارے پاس وہی چند لمحے تھے۔ اگر زیادہ وقت لیا جاتا تو شاید ہم گھیرے جا سکتے تھے۔ میں نے جاتے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو شہباز نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر رانا کو پچھلی نشست پر پھینک دیا۔ اس وقت تک میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی۔ جب تک لوگ دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوتے، میں وہاں سے گاڑی نکال چکا تھا۔

مین روڈ پر آتے ہی میں نے پیچھے نگاہ ڈالی۔ رانا یوں ہو رہا تھا جیسے ابھی مر جائے گا۔ جبکہ شہباز اس کے ساتھ یوں بیٹھا تھا جیسے اسے کوئی پروا ہی نہ ہو۔ تبھی میں نے بیزاری سے کہا۔

''شہباز، اسے تم نے بے کار میں اٹھایا۔''

''کیوں، ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' اس نے تیزی سے

''دیکھ، مجھے کوئی ایک گھنٹا پہلے اس نے فون کیا تھا۔ اس نے مجھ سے محفوظ مکان کے لیے کہا۔ ایک بار وہ پہلے بھی یہاں میرے پاس رہ چکا ہے۔ مکان میں نے دے دیا ہے، میرا بندہ بھی وہاں پہنچ چکا ہے لیکن کھوکھر وہاں ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہے، مجھے نہیں پتا۔'' رانا نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہباز نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا پھر ایک موٹی سی گالی نکالتے ہوئے بولا۔

''کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا، وہ بھی مرا ہوا۔''

''دیکھ میں بچ.....'' رانا نے کہنا چاہا تو شہباز جذباتی لہجے میں بولا۔

''اب تو ان نیلی نیلی آنکھوں میں آنسو بھر کے مظلوم بن رہا ہے نا، سن، تجھے ذرا بھی حیا نہیں..... دیکھ ایک کتا ہوتا ہے نا، وہ کسی کے در پر ایک بار روٹی کھا لے، تو وہ بھی اس شخص کا خیال کرتا ہے، پر تو میرے ہی در پر سے کھاتا رہا اور مجھے ہی کاٹا، تجھ سے کتا اچھا ہے، اور تو کتے سے بھی گھٹیا ہے۔''

''مجھے معاف کر دے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو صرف تجھے گالیاں پڑی ہیں۔ صرف گالیاں، ابھی تو میں نے تجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ دیکھتا ہوں تو کیا کرتا ہے۔'' شہباز نے کہا تو اس پر رانا نے کچھ کہنا چاہا تبھی شہباز نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

میرا رخ مغلپورہ والے سیف ہاؤس کی طرف تھا۔ میں اندازے سے جا رہا تھا، اگر غلط جاتا تو مجھے شہباز بتا دیتا اس لیے میں بے فکری سے گاڑی بھگائے جا رہا تھا۔ اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ دو کاریں کافی دیر سے میرے پیچھے ہیں۔ مجھے شک ہوا جیسے وہ میرا تعاقب کر رہی ہیں یا پھر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے یہی شک جب شہباز کو بتایا تو اس نے چوکنا ہو کر ان کاروں کی طرف دیکھا، پھر... بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''چل پھر دیکھ انہیں، میرا خیال ہے اب ہمیں سیف ہاؤس کی طرف نہیں جانا چاہیے، بس تو سیدھا چل، ان کا... انتظام میں کرتا ہوں، لیکن کنفرم ہونے کے بعد۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا فون بجا۔ وہ کال سننے لگا۔ پھر اچانک اُس کی پُرجوش آواز ابھری۔

''تو نے خود دیکھا ہے؟..... بس تو پھر ٹھیک ہے نگاہ رکھ، میں ابھی آیا۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''کھوکھر کا پتا لگ گیا ہے۔ وہ اس وقت کربلا ہی میں

ہے لیکن تھوڑا باہر ایک ڈیرے پر ہے۔ وہاں رہے گا نہیں۔ وہاں سے نکلے گا۔" اس نے دبے دبے جوش میں کہا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"چل اسے یہیں پھینک، اُدھر نکلتے ہیں۔"

"اسے نہیں پھینکنا، اس پر تو مجھے غصہ ہی بہت ہے۔ اب وہیں سیف ہاؤس ہی چل، پیچھے والوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور کسی کو فون پر صورتِ حال کے بارے میں بتانے لگا۔

اگلے دس منٹ بعد تین گاڑیاں ہمارے پیچھے آگئیں۔ اس کا باہر رابطہ تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھیرے میں سیف ہاؤس تک لے گئیں۔ جن گاڑیوں پر مجھے شک ہوا تھا، اس کا مجھے پھر پتا نہیں چلا۔ وہ جو تین گاڑیاں آئی تھیں، انہوں نے کوئی چہکار دکھایا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرے حد درجہ محتاط ہونے کی وجہ سے غلط فہمی تھی یا وہ سچ مچ ہمارے پیچھے تھے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم اندازے سے کچھ پہلے ہی سیف ہاؤس پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی اندر لے جا کر کھڑی ہی کی تھی کہ شہباز اترتے ہوئے بولا۔

"دوسری گاڑی پکڑ کر نکلیں یہاں سے۔"

"چل۔" میں نے ایک اور گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اگلے چند منٹوں میں ہم وہاں سے نکل چکے تھے۔

☆☆☆

میں گاڑی مین روڈ پر لایا تو شہباز اپنے فون میں مست تھا۔ تبھی میں نے یونہی مذاق میں کہا۔

"اوئے ماما..... کچھ مجھے بھی بتا دیا کر..... یونہی لگا رہتا ہے۔"

میری بات سن کر اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ساتھ ایک پرابلم ہے، تمہیں جب کوئی بات بتا دیں نا، تم اس کا جب تک انت نہ کر لو، اسی پر گھومتے رہتے ہو۔ جبکہ یہاں ہر پل صورتِ حال بدل رہی ہوتی ہے۔"

"اب کیا بدل گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حبیب کھوکھر کو جیسے ہی پتا چلا کہ رانا کو اٹھا لیا گیا ہے، وہ جہاں پر تھا، وہاں سے نکل گیا ہے۔" اس نے مایوس کن خبر سنائی۔

"اوہ، یہ تو اچھا نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔

"لیکن وہ بندہ، جس نے مجھے خبر دی تھی، وہ ان کے ساتھ ہے۔ اس وقت وہ سیاہ فور وہیل میں ہے، اس کے

پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر ایک خوشخبری..... دل پزیر، دل نشیں اور دل گداز تحریروں کی خالق

مصنفہ
نسیم دلشاد

جلد ہی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کے باذوق قارئین کے لیے اپنا
ایک اور دل نواز ناول لے کر آرہی ہیں

معاشرے میں پھیلے ان گنت مسائل اور ان کے مؤثر حل کا
بے حد خوب صورت اور دل خوش کن انداز میں قلمی اظہار.....

یقیناً قارئین کے ادبی ذوق کے لیے باعثِ تسکین ہو گا

ساتھ آگے پیچھے چار کاریں ہیں۔ وہ بی آر بی نہر پار کر کے ایک نالے کے ساتھ جا رہا ہے۔ اب دیکھیں کہاں ٹھکانا کرتا ہے۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"مطلب اسے کوئی جگہ چھپنے کو نہیں مل رہی ہے۔" میں نے رائے دی۔

"اب بتاؤ، یہ ساری تفصیل تمہارے کسی کام کی ہے؟" اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر قہقہہ لگا دیا۔

"ہاں لیکن مجھے پتا ہونا چاہیے۔" میں نے سکون سے کہا پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "اب یہ تو بتا دو کہ جانا کہاں ہے؟"

"میرے خیال میں ہمیں نزدیک ترین ہی رہنا چاہیے۔ شام ہو رہی ہے، معاملہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔" اس نے بتاتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا تو میں نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یار تم ایویں اس رانا کے چکر میں پڑ گئے تھے، وقت خراب کر دیا۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کھوکھر ہے کہاں، خیر، یہ یقین رکھو، وقت خراب نہیں ہوا، اگر ہم واپس آ گئے تو دیکھنا، اسی رانا سے کیا کیا نکلتا ہے، یہ ایک تربیت یافتہ بندہ ہے، ایویں پاگل بنا ہوا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مطلب، کیا نکل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے تایا کو دیکھا تھا، وہ فاروق شاہ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، وہی اندرونِ لاہور والا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ سمجھو اُس سے دس ہاتھ آگے ہے، اسے تو یقین ہی نہیں، سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اس کے ساتھ ایسا ہاتھ کر جاؤں گا۔ میں واپس آ کر لیتا ہوں اس کی کلاس، دیکھنا کیا کچھ سامنے آتا ہے، حیران رہ جاؤ گے تم۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اس کے غنڈے بھی تیری تلاش میں ہوں گے۔" میں نے کہا ہی تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر پوجا کا نام تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ بولی۔

"مجھے لگتا ہے وہ جو کھوکھر ہے نا، سرحد پار کر گیا ہے۔"

"کیسے پتا چلا، وہ تو ابھی کچھ دیر پہلے غائب ہوا ہے، اتنی جلدی سرحد تو پار ہی نہیں کی جا سکتی۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"اگر اس نے سرحد پار نہیں کی تو کرنے والا ہے۔" اس نے حواس باختہ ہو جانے والے انداز میں کہا تو میں نے تحمل سے پوچھا۔

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"مجھے سرحد پار سے پتا چلا ہے۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"کیا پتا چلا ہے پوری بات بتاؤ؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کھوکھر نے کچھ دیر پہلے راکیش ورما کے اُن بندوں سے کہا ہے، جن سے اس کا مسلسل رابطہ ہے۔ یہ وہی بندے ہیں جو کھوکھر سے یہاں لاہور میں کام لے رہے ہیں۔ کھوکھر نے ان سے کہا کہ یہاں ہمارے بندے قتل ہو گئے ہیں اور خود کش بھی پکڑا گیا ہے، مجھے پکڑنے کے لیے وہ لوگ میرے پیچھے لگ گئے ہیں، کیا کروں؟"

"تو انہوں نے کھوکھر کو سرحد پار بلا لیا؟" میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہے، اب پار کے لوگ ہی اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔" پوجا نے تیزی سے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"تجھے معلوم ہے وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"راکیش ورما کے کچھ بندے ادھر بڈیارہ نامی گاؤں میں ہیں، سرحد پار سے آئے ہوئے ہیں، ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ انہی کے ذریعے جائے گا۔" اس نے بتایا تو میں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو اُجالا ہے، شام ہو رہی ہے، وہ تو رات میں کسی وقت نکلے گا۔"

"ہاں، ہوگا تو ایسے ہی۔" اس نے کافی حد تک تحمل سے کہا۔

"بس پھر ٹھیک ہے، تمہیں جو بھی پتا چلتا ہے، مجھے فوراً بتانا، میں نکلتا ہوں اس کے لیے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے، اب میری توجہ اسی پر ہے۔"

"ہاں ایک بات..... ادھر سے یہ پوچھو، وہ کھوکھر کس نمبر پر بات کر رہا ہے، وہ نمبر ٹریس کرنا آسان ہو جائے گا، اس کا اپنا نمبر بند جا رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"اوکے، کرتی ہوں پتا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"تو یہ مس پوجا ہمارے ساتھ ساتھ ہے؟" شہباز نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو اگر وہ واقعی... بڈیارہ کی طرف جاتا ہے، تو پھر پوجا کی بات پر سوچا جا سکتا ہے۔ اگر وہ وہاں نہیں گیا تو....." میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''ہمیں اس پوجا کے ٹریپ سے بچنا ہے، ہر حال میں بچنا ہے یار، یہ عورت مجھے سمجھ نہیں آرہی۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''تو پھر ہمارے پاس آپشن کیا ہے؟''

''چند منٹ ٹھہر جاؤ، سب کچھ واضح ہو جائے گا، کھوکھر تک پہنچا میں دوں گا، آگے تمہارا کام ہے، کیونکہ میں مانتا ہوں، جو گردن تم ناپ سکتے ہو، وہ میں نہیں کر سکتا، سچی بات یہی ہے، میرا اتنا حوصلہ نہیں ہے۔'' اس نے سیل فون پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار ایویں میری تعریفیں مت کرو۔ جو اصل کام ہے وہ بتاؤ۔'' تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''یہی کہ بس گاڑی دھیان سے چلاؤ۔''

اس کی بات پر میں نے قہقہہ لگایا اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کچھ دیر بعد غروب ہونے والا تھا۔ مجھے آثار بتا رہے تھے کہ میں بی آر بی تک پہنچنے والا ہوں۔ ہم دونوں کی خاموشی کے باعث یہ سفر تیزی سے ختم ہو گیا۔ اچانک شہباز نے سر اٹھا کر نعرہ لگانے والے انداز میں بے ساختہ کہا۔

''اوئے ماما، وہ ہڈیارہ میں نہیں ہے۔''

''تو پھر کہاں ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''جس بندے کے ساتھ میرا رابطہ ہے، وہ بھی کھوکھر کے ساتھ ابھی تک ایک کار میں ہے۔ وہ یہی بتا رہا ہے کہ کھوکھر ہڈیارہ سے پہلے ہی ایک ڈیرے پر رک گیا ہے۔ اس کے بعد کیا کرنے والا ہے، یہ بالکل بھی نہیں پتا۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''یہ پکی بات ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''میں صرف اسی بندے پر بھروسا نہیں کر رہا، شانزے کی اسسٹنٹ اسی نمبر کو دیکھ رہی ہے۔ جب تم نے پوجا سے نمبر مانگا تو مجھے خیال آیا۔ وہ بھی لوکیشن وہی دے رہی ہے۔''

''پھر تو پکی بات ہوئی نا، یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا

''یہی کوئی دس پندرہ منٹ کا فاصلہ ہوگا۔'' اس نے بتایا۔

''چل پھر یہیں سے فیلڈنگ لگاتے ہیں۔'' میں نے ایک دم سے کہا۔

''پیچھے سے اگر بندے ہمارے پاس پہنچے بھی تو کم از کم آدھا گھنٹا لگ جائے گا، ہمیں کوئی دوسری جگاڑ لگانا پڑے گی۔'' اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، تم مجھے اس ڈیرے کے پاس لے جاؤ، آگے اللہ مالک ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''جی او ماما تیری پھرتیاں..... ذرا صبر کر، کیوں موت کے منہ میں جا رہا ہے، جب تک بندے پہنچتے ہیں، کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے مذاق میں کہا۔

''لیکن اس ڈیرے کے قریب تو چل، رستہ بتا مجھے۔'' میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا تو وہ مجھے راستہ بتانے لگا۔

آسمان نیلگوں ہو گیا تھا جب ہم اس ڈیرے سے کوئی آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر جا پہنچے۔ ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان وہ ایک کچا راستہ تھا۔ ایک کھلی سی جگہ پر ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی چارپائی بھی بچھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں گاڑی سے نکل کر وہاں جا بیٹھے۔

''دیکھ وہ اب بھی وہیں ہے، کنفرم کر لے؟'' میں نے مشورہ دیا۔

''یار ہمیں رسک نہیں لینا، جب ہمارے پاس سب ہیں تو.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں اکتاہٹ سے بولا۔

''یار ہم نے اسے زندہ تھوڑی پکڑنا ہے، زمین کے اس بوجھ کو وہیں دفن کر دینا ہے۔ سارے جھنجھٹ چھوڑ، چل نکلتے ہیں۔'' میں نے حتمی لہجے کہا۔

''بات تیری ٹھیک ہے، اگر وہ بچ گیا تو پھر وہی مقدمے بازی، وہی پھر سارا معاملہ، چل اٹھ۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں اس کے ساتھ بڑھ گیا۔

اس بار ڈرائیونگ شہباز کر رہا تھا، کچے راستے پر چلتے ہوئے ہم ڈیرے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ یہی کوئی سو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ میں نے پسٹل چیک کیا، اسے نیفے میں رکھا اور گاڑی سے اتر گیا۔

ڈیرے کا گیٹ لوہے کا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ہم ذرا تیز قدموں سے گیٹ کے اندر جا پہنچے۔ سامنے ایک فور وہیل جیپ کے ساتھ چند کاریں کھڑی تھیں۔ ایک طرف ٹریکٹر اور جیپ کھڑی تھی۔ ایک لمبی اور تقریباً آٹھ فٹ اونچی دیوار کے ساتھ چھوٹے بڑے زرعی آلات دھرے ہوئے تھے۔ سامنے ایک لمبا برآمدہ تھا جو عموماً ایسے ڈیروں کا ہوتا ہے۔ برآمدے میں سے کمرے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کمرے میں کافی سارے لوگ تھے۔ باقی کمروں میں

سے کوئی بند تھا اور کوئی کھلا ہوا۔ صحن میں ایک طرف چارپائیاں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پورا ماحول ہماری نگاہ میں تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ان میں اگر کوئی سیکیورٹی والے ہوئے بھی تو چند ہی ہوں گے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ وہی تھے جو حبیب کھوکھر کے ساتھ تھے۔ مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ کسی نے ہمیں روکا کیوں نہیں۔ ایسے ڈیروں پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کوئی مہمان آجائے تو کئی لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی خاص ہو، تو گیٹ بند کر دیے جاتے ہیں تاکہ کوئی اندر نہ آسکے، پھر لوگ بھی ادھر نہیں جاتے۔ ہم اس کمرے کے باہر جا پہنچے جس میں کافی لوگ جمع تھے۔ تبھی میں نے سرگوشی کے سے انداز میں شہباز سے پوچھا۔

''میں نے حبیب کھوکھر کو نہیں دیکھا ہے، کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

''میں پہچانتا ہوں۔'' وہ بھی سرگوشی میں کہتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ سامنے جو ہلکے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ اور گہرے نیلے رنگ کی ویسٹ کوٹ میں ہے، وہ پتلا سا، بھارتی مونچھوں والا۔''

میں نے دیکھا، وہی شخص لوگوں کی طرف دیکھ کر کسی کی بات سن رہا تھا۔ دیکھنے میں کتنا نرم مزاج لگ رہا تھا مگر اس کا باطن کتنا خباثت بھرا تھا، یہ وہی جانتے تھے جو اس کے کالے کرتوتوں سے واقف تھے۔ حبیب کھوکھر ہمارے سامنے تھا۔ برآمدے میں جلتے بلب کی روشنی میں ہم نمایاں تھے۔ ہمارے ساتھ بھی دو چار بندے کھڑے تھے۔ میں نے شہباز کی طرف دیکھا، اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اٹیک کرنے کا اشارہ دے دیا۔ میں نے ایک نگاہ پیچھے کی طرف دیکھا، شہباز غیر محسوس انداز میں میرے کور پر آگیا تھا۔ میں نے اپنے حواس قابو میں کرتے ہوئے چشم زدن میں پسٹل نکالا، جب تک پسٹل سیدھا کیا، اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ اس کے چہرے پر گولی لگی تھی۔ خون کی ایک پھوار نکلی تھی، تیسرے فائر کے بعد میں مڑا اور انتہائی سرعت سے واپس پلٹ گیا۔ فائر کی آوازیں گونج کر رہ گئی تھیں۔

میرے سامنے گیٹ تھا۔ میں اس طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے پیچھے شہباز تھا۔ بالکل گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے بھی دو فائر کیے تھے۔ تاکہ لوگ رک جائیں۔ گیٹ سے گاڑی کا سفر کوئی سو میٹر تھا لیکن یہی سفر بہت طویل لگا، ہمارا مقصد صرف حبیب کھوکھر کو ختم کرنا تھا، کسی دوسرے کی جان لینا نہیں۔ وہاں ٹھہر کے مقابلہ بھی کیا جا سکتا تھا لیکن یہ سراسر بے وقوفی تھی۔ اگر مزاحمت نہیں ہوئی تو رکنے کا فائدہ کیا تھا۔ شہباز کے فائر کرنے کا خاطر خواہ اثر ہوا، لوگ سہم کر پیچھے ہٹ چکے تھے۔ شاید ان کے گمان میں اس طرح کا کوئی منظر نہیں تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ ہوا کیا ہے؟

میں ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا تھا، جب تک میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، شہباز پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پسٹل چھوڑا اور گن لے کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اگر وہ کور پر تھا تو پوری طرح کور کرے گا۔ میں نے گاڑی بھگا دی۔ کچھ دور جا کر میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''شہباز، ہمیں آگے کہیں ضرور گھیرا جائے گا۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو، بس جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، اندھیرا بہت گہرا ہو رہا ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے انتہائی محتاط ہو کر کچے راستے پر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

ہم ہڈیارہ نالے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس نالے پر چھوٹے بڑے درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کہیں یہ گھنی تھیں اور کہیں سے جگہ صاف تھی۔ میں نے دیکھا کافی فاصلے پر کچھ گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس روشن تھیں۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ تبھی میں نے شہباز کی توجہ اس کی طرف کی۔

''وہ دیکھ..... اب اُدھر ہی جانا ہے یا.....'' میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ایک منٹ رُک.....'' اس نے کہا اور فون پر نمبر پش کرنے لگا۔ جب تک میں نے گاڑی روکی، اس نے کال ملا کر پوچھا۔ ''کہاں پہنچے ہو؟'' یہ پوچھ کر وہ دوسری طرف سے سنتا رہا، پھر بولا۔ ''چل ٹھیک، آرہے ہیں۔''

''ہاں بول.....'' میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ بولا۔

''وہ اپنے ہی لوگ ہیں، بلاور شاہ وغیرہ..... بس اب نکلو۔''

یہ سنتے ہی میں نے گیئر لگا دیا۔

اس وقت میں برکی روڈ تک جا پہنچا تھا جب پوجا کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ تقریباً چیخنے والے انداز میں بولی۔

''کھوکھر قتل ہو گیا۔''

''ہاں تو پھر.....؟'' میں نے مختصراً کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم.....'' اس نے اپنی بات ادھوری

چھوڑ دی۔

''تیرا کام ہو گیا ہے، ملتے ہیں پھر۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، بہت جلد..... لیکن اب بہت محتاط رہنا، کیونکہ اِن دو دنوں میں تم نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں مسکرا دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرے ذہن میں پہلے ہی کئی آپشن تھے اس لیے سکون سے بولا۔

''پوجا..... ابھی بہت سارے کام ہیں، اتنی جلدی آنکھیں مت بدلو۔''

تبھی اُس کی کھنکتی ہوئی آواز گونجی پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''تم مجھ سے نہیں بلکہ میں تم سے بہت جلد ملنے والی ہوں۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''اوئے، یہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''کچھ نہیں..... لاڈیاں کر رہی ہے۔ اسے چھوڑ یہ بتا، سیف ہاؤس جانا ہے یا گھر؟ تاکہ وہی روٹ لوں۔''

''ابھی تو گھر چل نا، تھوڑا فریش ہو کر ادھر آتے ہیں، آج تو سارا دن بس اسی مار ماری میں لگ گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔

☆☆☆

فون کی تیز آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بیڈ روم میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے سائڈ ٹیبل پر سے فون اٹھایا تو وہ شہباز کی کال تھی۔ میرے ہیلو کہنے پر اس نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔

''سو رہے تھے کیا؟''

''ہاں، بس آنکھ لگ گئی تو کسی نے جگایا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا سن، شانزے ساری رات نہیں سوئی ہے، وہ پوجا کو ٹریس کرتی رہی ہے۔ اور وہ.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں مجھے یہ بتا، وہ کیوں ٹریس کرتی رہی؟ خیریت تو ہے نا؟''

''پوری بات سن نا یار۔'' اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

''اچھا بول۔'' میں نے کہا۔

''وہ دو دن سے پوجا کو تلاش کر رہی ہے۔ اس کا فون ایک ہی جگہ ہے لیکن اس کی کال سے پتا چلتا ہے کہ وہ شہر میں کئی جگہوں پر ٹھہرتی ہے۔ سو اس کے پاس بھی کوئی جدید قسم

قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہو گا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کا فون ہے۔ اور یہ کسی نیٹ ورک کے تحت چل رہا ہے، جیسے تمہارا فون ٹریس نہیں ہوتا۔'' اس نے تفصیل سے سمجھایا۔

''جیسا شانزے نے مجھے دیا، ویسا ہی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بس ایسے ہی سمجھ لے، ہر بندہ اپنے طریقے سے فون کو سیٹ کرتا ہے، اپنی ضرورت کے مطابق۔'' اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

''یہ بات ابھی بتانا ضروری تھی کیا؟''

''ہاں، ابھی شانزے بیڈ روم میں آئی ہے تو اس نے بتایا ہے، پوجا اس وقت تیرے علاقے میں موجود ہے، بالکل تیرے گھر کے پاس۔ اس کا فون دیکھیں تو اب بھی وہیں پڑا ملے گا، جہاں پچھلے دو دن سے ملتا ہے۔'' اس نے بتایا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میرے علاقے میں وہ کیا کر رہی ہے؟''

''اوئے ماما، مجھ سے مشورہ کر کے نہیں گئی۔ اب تم دیکھو، میں نے بتا دیا ہے۔ وہ خود کو چھلاوا سمجھ رہی ہے، اسے قابو میں کرو۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''اوکے، میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ گیا۔

باہر ابھی اندھیرا تھا لیکن پو... پھٹ چکی تھی۔ میں نے ساوری کو آواز دی، اس کا جواب نہیں آیا۔ میں نے کچن میں دیکھنا چاہا تو وہ دوسرے کمرے میں جائے نماز پر تھی۔ یہ اطمینان کر کے میں لاؤنج میں گیا اور پھر باہر پورچ میں چلا گیا۔ باہر سیکیورٹی والے الرٹ تھے۔ میرا احساس کر کے مزید الرٹ ہو گئے۔ میں اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

''چائے پیو گے تم دونوں؟''

''نہیں سر ابھی ضرورت نہیں۔'' ان میں سے ایک نے خوش کن لہجے میں کہا پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سر آپ اس وقت، خیریت؟''

''کوئی خطرہ پوچھ کر نہیں آتا، بس دھیان رکھو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر واپس آ گیا۔ میں لاؤنج میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں سوچنا چاہتا تھا کہ یہ اچانک پوجا کو کیا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میری دشمن تھی۔ میں اس پر بھروسا کر رہا تھا اور نہ وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اسے چھوڑ رکھا تھا، صرف اپنی غرض کے لیے، اگر اس سے کوئی غرض نہ ہوتی تو میں کب کا اسے ختم کر دیتا۔ لیکن یہ اچانک کیا کر رہی ہے؟ میں اسی سوچ میں گم تھا۔

''خیریت ہے؟'' ساوری کی آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں بس اچانک آنکھ جلدی کھل گئی..... تم چائے بناؤ، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

میں تیار ہو کر واپس لاؤنج میں آیا تو میز پر چائے سجی تھی۔ ساوری سامنے کچن میں تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا، چائے کا مگ اٹھایا اور سوچنے لگا۔ پوجا کا کھیل میری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں نے اس کے کھیل کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ وہ جو چاہ رہی تھی، دراصل وہی ہمارے لوگ بھی چاہتے تھے۔ میں اپنوں کے لیے سب کچھ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے اگر پوجا یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے لیے کام کر رہا ہوں، یا وہ مجھے ٹریپ کر چکی ہے تو وہ غلط فہمی میں تھی۔ میں چاچا عبدالمجید سے بات کر کے مطمئن ہو چکا تھا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ مجھے پوجا کو وقت دینا چاہیے یا نہیں؟ میں کسی گھن چکر میں پھنس گیا ہوں یا میرے بڑے میرے ذریعے کوئی دوسرا ہی کھیل کھیل رہے ہیں؟ جو کچھ بھی ہو، لیکن چاچا عبدالمجید کا پوجا کے بارے میں کوئی واضح حکم نہیں تھا۔ اس لیے کم از کم میں پوجا کے معاملے میں اپنی مرضی کر سکتا تھا۔ اس سے بھی اہم سوال اس وقت یہ تھا کہ اب جو یہ حالات بن چکے ہیں یا حالات بنائے گئے ہیں، ان کا مقصد کیا ہے؟ کسی نئے کھیل کی شروعات ہے یا کسی گھن چکر کو ختم کیا جا رہا ہے؟ میں کسی نتیجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف پھر شہباز ہی تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''چائے پی رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کس کے ساتھ؟ میرا مطلب ہے پوجا کے ساتھ؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا، وہ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو اکیلا ہوں۔''

''محتاط رہو، وہ تمہارے گھر سے تھوڑی دور ہے۔ وہاں اُسے کم از کم دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔'' اس نے بتایا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''تو ماما، اس کی اصل لوکیشن مجھے بتا، میں اُس تک پہنچ جاؤں۔''

''وہ میں نے تیرے فون پر بھیج دی ہے، دیکھ لے، مگر اس وقت تک کچھ مت کرنا، جب تک میں نہ پہنچ جاؤں۔''

اس نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر مل کر تلاش کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اُس نے کال ختم کردی۔

میں نے فون دیکھا، اس میں لوکیشن آگئی تھی۔ فون واپس رکھتے ہوئے اچانک میرے دماغ میں بملا آگئی، جے پور کی پاگل اور جنونی لڑکی، جس کا کوئی اعتبار نہیں تھا کب کیا کردے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر واپس لاؤنج میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے کال کردی۔ ایک بار بیل جا کر بند ہوگئی، میں نے دوسری بار کوشش کی تو چند لمحے بعد اس کی خمار آلود آواز سنائی دی۔

''اے راج ویر تو کوئی بڑا..... ہے۔ ہمیشہ غلط وقت پر فون کرتا ہے۔''

''کیا کروں میں اس قدر پھنسا ہوا ہوں کہ باوجود.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''رات پارٹی تھی، تھوڑی جیادہ پی لی تھی، دماغ گھوم رہا ہے اس وقت، پر بول بات کیا ہے؟'' اس نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

''وہی چوہے بلی کا کھیل، کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اور میں اُسے..... وہ ہے کہیں آس پاس۔ بس جو پہلے پہنچ گیا، وہی وار کر جائے گا۔'' میں نے کہا اور ساتھ میں وہ بھی بتادیا کہ نمبر کہیں اور فون کہیں اور گھوم رہا ہے۔

''ظاہر ہے، اب تم نے بے بس ہو کر مجھے کال کی۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کا مان رکھنے کے لیے کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہے، ہار بھی گیا ہوں اور تھک بھی گیا۔''

''چل بول نمبر، ابھی بتاتی ہوں لیکن ایک شرط ہے۔'' اس نے کہا۔

''بول کیا شرط ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مجھے ملو گے۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ وہ خواہش تھی، حسرت تھی یا اس کا اپنا لالچ، میں کچھ نہ کہہ سکا۔

''زندگی رہی تو ضرور ملوں گا۔'' میں نے پورے خلوص سے کہا۔ وہ خاموش رہی تو میں نے اسے نمبر لکھوادیا۔ وہ فون بند کرگئی۔

میری چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ میں نے ساوری کو آواز دی تو وہ ناشتا لے کر آگئی۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھی ناشتا کرتی رہی اور میری نگاہ لیپ ٹاپ پر تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ مجھے شہباز پر اعتماد نہیں تھا بلکہ میں ایک دوسرے سورس سے یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا، کیا واقعی ایسا ہی ہے، کہیں شانزے سے کوئی بھول چوک تو نہیں ہوگئی۔ اگرچہ پوجا کا انداز ہی شانزے کی بات کی تصدیق کررہا تھا لیکن تکمیل کیا ہے، یہ سمجھنا از حد ضروری تھا۔

آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت بیت گیا۔ نہ ابھی تک شہباز پہنچا تھا اور نہ ہی بملا نے کوئی جواب دیا تھا۔ میں خود پر قابو رکھے ناشتا کرچکا تھا۔ ساوری پھر کچن میں جا کر اُلجھ گئی تھی۔ شبانہ اور فرزانہ بھی تیار ہو کر کچن کا ایک چکر لگا گئی تھیں۔ ماحول کافی گھر درا ہوگیا تھا۔ میری نگاہیں لیپ ٹاپ اسکرین پر تھیں۔ اچانک بملا کا پیغام آگیا۔

''اس نمبر سے تمہیں..... بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ یہ جدید ترین تحقیق ہے اور دنیا میں چند لوگوں کے پاس ہے۔ جن میں ایک تمہاری دوست بملا کے پاس بھی ہے۔ یہ نمبر دونوں جگہوں پر نہیں، یہاں پر جو بھی دکھائی دیا جارہا ہے وہ فیک ہے۔ اصل نمبر کی لوکیشن میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی ایک لوکیشن آگئی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ جوہر ٹاؤن کے ایک فیز کی تھی۔ میں نے پھر سے بملا کو فون کردیا۔

''یہ سارا چکر کیا ہے؟''

''ذہین لوگوں کی غلط جگاڑ..... ابھی یہ کم کم لوگوں کی سمجھ میں آرہا ہے ایک دو ماہ تک عام لوگ بھی سمجھ جائیں گے..... اس سے اصل لوکیشن چھپ جاتی ہے، یہ بالکل ایسے سمجھ لو جیسے اصل دستاویز کہیں محفوظ رکھ کر اس کی فوٹو کاپی سے کام چلایا جائے۔'' اس نے سمجھایا تو میں بولا۔

''اچھا اب تم سو جاؤ، میں دوپہر کے بعد تمہیں تنگ کروں گا۔''

''کاش تم مجھے تنگ کرو..... بے تحاشا تنگ کرو، اور بہت زیادہ کرو۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔

میں بہت حد تک پُرسکون ہوگیا تھا۔ میرے اعصاب پر جو ایک دم سے بوجھ سوار ہوا تھا، وہ اتر گیا۔ میں ابھی سیدھا ہو کر بھی نہیں بیٹھا تھا کہ کال بیل بجی اور کچھ دیر بعد شہباز اندر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ہانک لگائی۔

''ساوری..... وہ بھوکا آگیا ہے جس کی بیوی نے ناشتا نہیں دیا۔''

''بیوی نہیں دے گی تو میری بہن مجھے ناشتا دے گی۔'' اس نے میرے دائیں طرف پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میرے خاموش رہنے پر وہ بولا۔ ''تیار ہو تو چلیں

پھر....."

"چائے وغیرہ پی لو، پھر چلتے ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"دیکھ لو کہیں دیر نہ ہو جائے؟" اس نے کہا اور سکون سے ٹیک لگا لی تو میں نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"یار یہ جو اچانک بھاگ دوڑ لگی تھی، وہ ختم ہو گئی، اس میں جتنے اہم مہرے تھے، وہ سب ہمارے پاس ہیں۔ اب بات یہ ہے کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟"

"ہاں، یہ بات ہے، اس وقت ملک حامد، اس کا ملاقاتی بھارتی نوجوان، اور رانا تینوں سیف ہاؤس میں ہیں۔ دوسری طرف پوجا آزاد پھر رہی ہے۔ وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے....."

"اور ہمیں معلوم نہیں، ہم یہ سب کیوں کرتے چلے جا رہے ہیں۔" میں نے بڑے سکون سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید میرے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اسے حیرت ہوئی۔

"پھر کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"پوجا کو پکڑنا کوئی مشکل نہیں ہے، وہ بالکل سامنے ہے، سیف ہاؤس کے لوگوں سے جو پوچھنا تھا، وہ ہمیں پتا ہے، مزید کیا پوچھ تاچھ کرنی ہے یہ ہمیں پتا نہیں..... میرے خیال میں ایک بار ہمیں چاچا سے بات کر لینی چاہیے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا، وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

"ہاں، یہ تو ہے، چل پھر چاچا سے بات کرتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں پُرسکون ہو گیا۔ میں جو چاہ رہا تھا، اس کی شروعات ہو گئی تھی۔

☆☆☆

میں، شہباز اور چاچا عبدالمجید آفس کے ہی ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شہباز نے ساری بات کہہ دی تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر سمجھانے والے انداز میں بولے۔

"دیکھو، تم دونوں میری اولاد کی طرح ہو۔ میں نے تم دونوں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی، یہ تم دونوں کو بھی پتا ہے۔ یہ جو حالات بن گئے ہیں، بالکل اچانک بنے لیکن اس سے بہت ساری باتیں سمجھ میں آ گئی ہیں۔ ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ دشمن ہمارے اندر کس حد تک سرایت کر چکا ہے۔ اس کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ ہے، اور وہ ہے لالچ۔"

"جو بات پوجا کہتی ہے، وہی بات آپ....." شہباز نے پوچھنا چاہا تو وہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولے۔

"یہ شاید میں نے پہلے بھی تم لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی معاملے میں لگی ہوئی ہے۔ اس نے اب تک جو نیٹ ورک بنایا ہے وہ بالکل میرے سامنے ہے۔ وہ مجھ سے اوجھل نہیں۔ لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے کون سے لوگ، کیا کرنا چاہتے ہیں، یہ جان لینا بہت ضروری ہے اور وہ ان اچانک بن جانے والے حالات میں ہمارے سامنے کھل کر آ گیا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا تو دکھی لہجے میں بولے۔

"یہ کوئی نئی نہیں بہت پرانی بات ہے۔ دشمن سیدھے سبھاؤ ہمارے لوگوں پر گولی چلانے کے بجائے، ہماری نسل کو کھوکھلا کرنے کے درپے ہے۔ وہ بندوق نہیں خریدتا، لوگوں پر خرچ کرتا ہے۔ اس کا ٹارگٹ نئی نسل کی سوچ بدلنا نہیں بلکہ پہلے سے موجود سوچ میں شک ڈالنا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی حالات کوئی بہت اچھے نہیں، انہی کا فائدہ اٹھا کر، اسی معاشرتی خلا میں اپنی سوچ ڈال کر وہ نوجوان نسل کو گمراہ کر رہا ہے اور ہم گمراہ ہو رہے ہیں۔ ہماری وہ بنیادیں، جن پر ہم کھڑے ہیں، انہیں دیمک لگانے کی بھرپور کوشش میں ہے۔ اسی ایجنڈے کے ذریعے وہ معاشرے میں بے چینی پیدا کر رہا ہے، جس کی کوکھ سے جرم جنم لیتا ہے۔"

"ایسا تو ہو رہا ہے، اس کا سدِباب کیا ہے؟" شہباز نے کہا۔

"اب اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنے لوگوں کو روکتے رہیں اور اپنی ساری توانائی یہیں خرچ کر دیں، یہ معاشرتی سدھار جن کا کام ہے، وہی کریں، ہمیں ان ہاتھوں کو کاٹنا ہے، جو یہ سوچ لے کر یہاں آتے ہیں، اس سر کو بھی کچل دینا ہے جس میں ایسی سوچ جنم لیتی ہے۔" چاچا یہ کہتے ہوئے جذباتی ہو گئے تھے۔ تبھی میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میرا تو خیال ہے سب سے پہلے ان لوگوں کی ناک کاٹ دینی چاہیے جو ہمارے معاشرے میں بے چینی پیدا کرنے کے ذمے دار ہیں۔"

"لیکن باہر سے آنے والی سوچ تو آتی رہے گی نا۔ یہاں پر جو لوگ بے چینی پیدا کر رہے ہیں، انہیں معاشرے میں موجود اچھی سوچ رکھنے والے خود روک لیں گے۔ ہم بڑی مضبوط سوچ رکھنے والی قوم ہیں۔" چاچا نے سنجیدگی سے کہا تو شہباز بولا۔

''تو پھر ہمیں بتائیں، ہمیں کرنا کیا ہے؟''

''حالات تمہارے سامنے ہیں، ایک خاص سوچ کو یہاں پیدا کرنے اور اسے پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جہاں سے یہ سوچ اُبل کر آرہی ہے، اس دماغ ہی کو ختم کرنا ہے اور بس.....'' چاچا نے حتمی انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

''میں کروں گا یہ کام۔''

''یہ چند افراد کو نہیں پورے معاشرے کو بچانے کا کام ہوگا، اسی وجہ سے جرم پنپ رہا ہے، بہت سارے خاندان تباہ ہو چکے ہیں لیکن.....'' چاچا دھیمے سے لہجے میں کہتے ہوئے رک گئے، یا تو وہ بہت جذباتی ہو گئے تھے یا پھر اس میں بھی کوئی راز تھا۔ میں خاموش رہا، تو وہ بولے، ''پوجا جس کے لیے کام کر رہی ہے، وہ راکیش ورما ہے، ان لوگوں نے ہمارے دو بندوں کو شہید کیا۔''

''وہ کون تھے؟'' شہباز نے بے ساختہ پوچھا۔

''عبدالوحید اور رمضان اصغر..... جانتے ہو نا انہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں جی، یہ تو کافی عرصہ ہمارے ساتھ رہے تھے، یہ لالہ فخر کے پاس ہی تو تھے، وہیں ان سے یاری ہوئی تھی.....'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب باہر سے آئے ہوئے یہ لوگ نئے نئے یہاں پیر جما رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہمارے چند مقامی لوگ ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ عبدالوحید اور رمضان اصغر..... یہ دونوں ان کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔ اور پھر مقامی لوگوں کی وجہ سے..... صرف انہیں ہی راستے سے نہیں ہٹایا،..... بلکہ..... بلکہ ان کے بیوی اور بچے تک.....'' ان کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

''ہمیں ان کا بدلہ لینا ہوگا۔'' شہباز نے شدتِ جذبات سے کہا تو چاچا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بدلہ نہیں..... وہ تو اپنے فرض پر قربان ہو گئے۔ ہاں ان بے گناہوں کا بدلہ بنتا ہے۔ جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے بچوں کا کیا قصور تھا؟ ان دونوں کے خاندانوں کو بچوں سمیت ختم کیا گیا۔ پتا ہے ان کا کیا قصور تھا؟'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش ہو گئے، وہ جذباتی اتنے ہو گئے تھے کہ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا، وہ خود پر قابو پا چکے تو بولے۔

''اطلاع تھی کہ لاہور میں کہیں بم دھماکا ہونے والا ہے، وہ کون ہے؟ کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ دونوں بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد ان لوگوں تک پہنچ گئے۔ ان کا منصوبہ ناکام بنایا، جس کی انہیں سزا دی گئی لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' شہباز نے پوچھا۔

''بم دھماکا انہوں نے پھر بھی کیا۔ کئی بے گناہ لوگ مارے گئے۔ کیا قصور تھا ان کا؟ میں ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوں تو مجھ پر وار کریں۔ دوسرے بے گناہ کیوں؟ اور پھر کسی کی کیا ہمت کہ وہ میرے وطن کے لوگوں کو یوں قتل کرتے پھریں، سب سے زیادہ وہ لوگ ظالم ہیں، جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور دشمن کو راستہ دیتے ہیں، وہ بہت ظالم ہیں۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ پہلی بار میں نے انہیں ایسا جذباتی دیکھا تھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں..... اگر یہاں کے لوگ شامل نہ ہوں تو باہر والوں کی ہمت نہ پڑے۔'' شہباز نے سخت لہجے میں کہا۔

''بس..... اگر بدلہ لینا ہے تو ان لوگوں کو یہاں سے باہر پھینکنا ہوگا، انہیں جڑ سے اکھاڑ کر ختم کرنا ہوگا، تاکہ جب بھی اگر کوئی اس طرف منہ کرے تو پہلے سو بار سوچے، یہاں کے لوگ بھی اور وہاں کے لوگ بھی۔'' انہوں نے کہا تو چند لمحے تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ تبھی میں بولا۔

''میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن کوشش ضرور کروں گا۔''

میرے لہجے میں سختی پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی۔ شہباز نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پُرسکون ہو کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ جس مقصد کے لیے ہماری میٹنگ تھی، وہ پوری ہو گئی تھی۔ ہم کافی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چاچا ہمیں بتا رہے تھے کہ دشمن کی سوچ جب پھیلتی ہے تو اس کے باعث کیا ہوتا ہے۔ ایک طرح سے انہوں نے مجھے پورے حالات سے باخبر کر دیا تھا کہ اصل میں ہوتا کیا ہے۔

چاچا عبدالمجید چلے گئے تھے۔ شہباز میرے ساتھ کمرے سے باہر آکر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تم نے بہت بھاری ذمے داری لے لی ہے۔''

''میں جانتا ہوں، بہت بھاری ذمے داری ہے۔ شاید میں اکیلا پوری نہ کر پاؤں۔ لیکن..... کسی نے تو یہ ذمے داری لینا تھی نا، تم چاہو تو مجھ سے الگ ہو سکتے ہو۔'' میں نے پورے خلوص سے کہا۔

''اوئے ماما یہ تم نے کیسی بات کر دی۔ اگر زندہ رہا تو بڑی لمبی فیلڈنگ کھیلوں گا تیرے ساتھ۔ مر، مرا گیا تو معاف کر دینا۔ چل اب سارا کچھ چھوڑ، یہاں سے نکل، شانزے کے ہاتھ کا کوئی امریکی کھانا کھاتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''ابھی نہیں، شام کے وقت، میں ساوری کے ساتھ ہی آؤں گا۔''

''او کے، لگتا ہے آج تم اکیلے رہنا چاہتے ہو۔'' اس نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی وہاں سے گاڑی لی اور نکل پڑا۔

☆☆☆

سہ پہر ہو چکی تھی۔ میرے سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا اور میں بملا کے پیغام کے انتظار میں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اس سے رابطہ کر کے پوجا کی لوکیشن کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ میں چائے کی چسکی لیتے ہوئے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے وحید اور رمضان کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی یاد آرہے تھے۔ تبھی لیپ ٹاپ سے ہلکی سی آواز گونجی۔ میں نے دیکھا تو وہ بملا کا پیغام تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''وہ صبح سے کئی جگہ گھومی ہے اور اس وقت جہاں تم بیٹھے ہو، تم سے زیادہ سے زیادہ پندرہ اور بیس منٹ کے درمیانی فاصلے پر ہے۔ اگر تمہیں اپنی گاڑی پر رش نہ ملے تو اتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو۔ میں نے تمہیں دنیا سے چھپا لیا ہے۔ چھپا لینے کا مطلب، اب تمہاری لوکیشن دکھائی نہیں دے گی، جو بھی تمہیں ٹریس کرے گا، اسے یہی لگے گا کہ تم اپنے گھر ہی میں ہو۔ اور جو میں لوکیشن بھیج رہی ہوں، یہ اس کی وہ لوکیشن ہے، جہاں پر اب وہ موجود ہے۔''

اس کے ساتھ ہی نیچے اس کی لوکیشن تھی۔ میں نے اس لوکیشن کو سمجھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ لاؤنج میں شبانہ اور فرزانہ میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر پورچ میں آ گیا۔ کچھ دیر میں ہم سڑک پر تھے۔ کار فرزانہ ڈرائیو کر رہی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ میں ہم اسی لوکیشن پر پہنچ گئے۔ ہمارا اور پوجا کا فاصلہ کوئی... دو سو میٹر رہا ہوگا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہ سروس روڈ کے ساتھ پھیلی ہوئی آبادی تھی۔ ایک سڑک گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ جس کے دونوں طرف دو منزلہ گھر بنے ہوئے تھے۔ ہم گلی کے نکڑ پر آ رکے تھے۔ پوجا تک پہنچنے کے لیے ہمارے پاس دو ہی صورتیں تھیں۔ اس کا انتظار کرتے جب بھی وہ باہر نکلتی یا پھر اسے باہر بلاتے۔ پہلی صورت حتمی نہیں تھی جبکہ دوسری صورت میں اس کی منافقت کا بھی پتا چل جاتا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اسے کال ملا دی۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی اور پھر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''کہاں ہو؟'' میں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''یہیں تمہارے شہر میں ہوں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم نے فارم ہاؤس سے اٹھانے کے لیے کہا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''مجھے نہیں پتا، تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ وہ وہاں پر نہیں ہے۔''

''ہاں، اس وقت تو وہاں پر نہیں ملی تھی لیکن اب اس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ یہیں شہر میں کسی کے پاس ہے، ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اسے کسی نے وہاں سے ہٹا دیا تھا، مجھے یہ بتاؤ وہ کسی خطرے کی وجہ بن سکتی ہے؟'' میں نے اسی نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا وہ راکیش ورما کی انفارمر ہے ساری معلومات وہ یہاں سے دے رہی ہے۔ وہ خطرہ بن سکتی ہے، ممکن ہے وہ خطرہ بن چکی ہو۔'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر پتا کرو، وہ کہاں ہے؟'' میں نے بے پروائی والے انداز میں کہا۔

''اگر وہ تمہارے کسی بندے کے پاس ہوئی تو؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''پاگل ہو تم، میرے بندوں کے پاس ہوتی تو مجھے پتا ہوتا، وہ مجھے اسی وقت مل گئی ہوتی، وہ تمہارے ہی کسی بندے کے پاس ہے۔ یہ میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ بہت ساری ایسی خبریں سامنے آ رہی ہیں جو ہمارے لیے خطرناک ہو سکتی ہیں، اب تم جانو تمہارا کام۔''

''اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہو، میں نے تو بس اندازہ لگایا تھا، خبریں کیا آ رہی ہیں؟'' اس نے اپنے مطلب کی بات پوچھ لی، یہی میں چاہتا تھا۔

''خبریں اچھی نہیں ہیں، وہ بھی تمہارے بارے میں۔ اب ساری تفصیل میں تمہیں فون پر تو بتانے سے رہا اور ہاں میں روہی واپس جا رہا ہوں۔ مجھے کچھ کام ہیں وہاں پر۔ میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب میں یہاں تمہاری.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''کب جانا ہے؟''

''آج رات کسی وقت۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''کہیں مل سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا تو میں نے بے پروائی سے کہا۔

''ایک آدھے گھنٹے کے دوران، وہ بھی پانچ دس منٹ

بس۔"

"کہاں پر ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے گھر میں ہوں۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"چلو نکلو پھر، میں تمہیں گلبرگ میں کہیں ملتی ہوں۔"

"تم نجانے کب پہنچو، جہاں پہنچنا ہے وہاں جا کر مجھے کال کرنا، میں نکل آتا ہوں، زیادہ سے زیادہ دس پندرہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

"میں ابھی دو منٹ میں نکل رہی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم فیلڈنگ لگائے بغیر باہر نہیں نکلو گی، اس میں تمہیں بہت وقت لگ جائے گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"ہم مل رہے ہیں اور میں نکل رہی ہوں۔"

"اوکے، جب پہنچ جاؤ تو مجھے بتانا۔" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔

اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ میں نے اسے فون کیا ہے۔ اب اگر بادیہی واقعی ہی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی تو اس نے بلاشبہ دو منٹ ہی میں نکلنا تھا۔ اگر وہ دو منٹ میں نکل پڑتی تو اسے میرے ٹریپ میں آجانا تھا۔ دوسرا بادیہی کی اہمیت کے بارے میں تصدیق ہو جاتی۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ پوجا مجھے روہی جانے سے روکنے اور بادیہی کو تلاش کرنے کے لیے رام کرے گی۔ یہی میرا ٹریپ تھا۔

تیسرا منٹ شروع ہو چکا تھا کہ گلی کے درمیان سے ایک گھر کا گیٹ کھلا، اس میں سے سیاہ رنگ کی کار باہر نکلی اور میرے مخالف رخ پر چل دی۔ لوکیشن پر دکھائی دینے لگا کہ یہ وہی کار ہے۔ میں نے فرزانہ سے چلنے کا کہا۔ اس نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی اور سیاہ کار کے پیچھے لگا دی۔ وہ جب تک گھوم کر سڑک پر آئی، ہم اس کے برابر جا پہنچے تھے۔ میں پچھلی نشست پر تھا اور کافی حد تک چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ میں نے سیاہ کار میں دیکھا، وہ بھی پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ڈرائیور تھا جو کار چلا رہا تھا۔

"فرزانہ اب اس کے پیچھے رکھو۔" میں نے کہا تو اس نے کار پیچھے لگا دی۔ سیاہ کار گلبرگ کے ایک اوپن ائر ریستوران کے سامنے جا رکی۔ پوجا نکلی اور اندر چلی گئی۔ فرزانہ نے کار روکی تو میں ہر طرف کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے کوئی ہلچل دکھائی نہیں دی۔ میں کار سے نکلا اور اندر چلا گیا۔ وہ لان کے سرے پر کھڑی کہیں بیٹھنے کی جگہ دیکھ رہی تھی۔ لان میں ایک طرف مدھم سا اندھیرا تھا۔ میں تیز قدموں سے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قربت کا احساس پا کر اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے حیرت بھرا جھٹکا لگا۔ وہ یقین نہیں کر سکتی تھی کہ میں اتنی سرعت سے وہیں آجاؤں گا جہاں بیٹھ کر اس نے مجھے فون کال کرنا تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تبھی اس نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تم اتنی جلدی؟"

مجھے لگا یہ اس کا سوال نہیں، ٹریپ میں آجانے والے شکار کی چیخ تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"پوجا، میں نہیں سمجھتا کہ تم پاگل ہو، یا تمہیں سمجھ نہیں ہے۔ اس لیے اسی سکون کے ساتھ میرے ساتھ چلو، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم..... کسی بھی غلط فہمی....." اس نے کہنا چاہا۔

"ایک بھی لفظ نہیں کہنا، بس اب چلو یا یہیں....." میں نے سخت لہجے میں کہا تو سکون سے میرے ساتھ چل دی۔

میں ریستوران سے باہر نکلا تو فرزانہ نے کار کو یوں لگا دیا تھا کہ اگر فوراً نکلنا پڑے تو آسانی ہو۔ میں نے اُسے سمجھا دیا تھا۔ یا تو پوجا میرے ساتھ ہوگی یا پھر میں اسے گولی مار کر لوٹوں گا، دونوں صورتوں میں مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے ہمیں دیکھا، شبانہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں پوجا کو لے کر جیسے ہی بیٹھا، وہ دوسری جانب آ کھڑی ہوئی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ اگلی نشست پر بیٹھی تو فرزانہ نے کار آگے بڑھا لی۔

جب تک سفر رش میں ہوتا رہا کوئی بھی ایک لفظ نہیں بولا۔ میں نے اس دوران شہباز کو ایک ایس ایم ایس کیا۔

"میں شاید تم سے بات نہ کر پاؤں لیکن مجھے بادیہی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہی لڑکی جسے فارم ہاؤس سے اٹھایا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد اس کا میسج آ گیا۔

"اوکے، مجھے اندازہ ہے تم کام پر لگ گئے ہو گے، اپنا خیال رکھنا۔"

جیسے ہی کار فیروز پور روڈ پر آئی تو پوجا نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔ "کہاں لے جا رہے ہو؟"

''دیکھو پوجا تمہیں مار دینے سے مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہونے والا اس لیے مت ڈرو، پُرسکون رہو۔ مجھے تھوڑی کنفیوژن ہوگئی ہے، اسے دور کرنا ہے بس، کردو گی تو ٹھیک، ورنہ پھر تم جانتی ہو مجھے۔'' میں نے سرد لہجے میں یوں کہا جیسے میں اس کے لیے اجنبی بن چکا ہوں۔

''بولو، کیا پوچھنا ہے تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ بھی کون ہے؟ اصل معاملہ کیا ہے؟'' میں نے جان بوجھ کر ایک فضول سا سوال کیا تو چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا، وہ صرف ایک انفارمر ہے، اس کا جتنا بھولا بھالا چہرہ ہے، جتنی وہ معصوم دکھائی دیتی ہے، اتنی ہی چالاک اور شاطر بھی ہے۔ اس کی کمزوری یہی ہے کہ اسے لڑنا جھگڑنا نہیں آتا۔ باقی سارے کام کر لیتی ہے۔ میں پھر تمہیں بتادوں کہ میں جو پلان کر رہی ہوں، وہ اس سے واقف ہوگئی ہے۔ سو وہ میرے لیے انتہائی خطرناک ہو چکی ہے، اسی لیے وہ گم ہے، اگر وہ میرے پلان کے بارے میں.....''

''کہاں گم ہے کوئی خبر ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں، اس کی ہوا نہیں لگ رہی۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''تو پھر سمجھو تم بہت زیادہ خطرے میں ہو..... تم، تمہارا پلان اور یہاں کا نیٹ ورک، سب سامنے آگیا ہے۔ اب تم اس کا سامنا کیسے کر پاؤ گی، میں نہیں جانتا۔'' میں نے پورے اعتماد سے جھوٹ بول دیا۔

''میں نہیں جانتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو، لیکن مجھے اتنا اندازہ ہے کہ اب سے دس منٹ پہلے تک راکیش ورما کا مجھ پر اعتماد تھا۔'' اس نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''دس منٹ نہیں، تقریباً گیارہ بجے سے..... راکیش ورما کا پلان یہ ہے کہ تم یہیں ہمارے ہاتھوں ماری جاؤ، اس نے صرف اتنا کیا ہے کہ یہاں ہمارے لوگوں کو کچھ کچے پکے ثبوت دے دیے ہیں کہ کل جو کچھ ہوا، اس کی انفارمر تم ہو۔'' میں نے پھر جھوٹ بول دیا۔

''تو اسی لیے تم.....'' وہ حیرت زدہ انداز میں کہتے ہوئے رک گئی۔

''دیکھو بات سنو..... تمہیں پکڑنے اور اٹھا لینے کی ڈیوٹی ان دونوں لڑکیوں کی ہے، یہ میرا اپنا ایک نیٹ ورک ہے، جس کی وجہ سے مجھے علم ہوگیا۔ انہوں نے تم کو وہاں لے کر جانا ہے جہاں..... خیر چھوڑو، اگر تم میرے ساتھ سیدھی باتیں کرلوگی، کچھ مجھے سمجھا دوگی، خود سمجھ لوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا، اب فیصلہ تمہارا ہے۔'' میں نے یونہی گول مول سی بات کر کے فیصلہ اسی پر چھوڑ دیا۔

''مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ یہ سب.....'' اس نے کہنا چاہا مگر میں بات کاٹتے ہوئے اجنبیت سے بولا۔

''سوچ لو، ابھی کچھ دیر سوچ لو۔''

سورج ڈوب گیا تھا جب ہم اس نئے آباد ہونے والے پوش علاقے میں جا پہنچے۔ وہاں ایک بنگلا تعمیر ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی تیاری میں ابھی تھوڑا کام باقی تھا۔ وہاں پر ہمارے کچھ لوگ رہائش پذیر تھے۔ وہ میرے انتظار میں تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک کمرا دے دیا۔ میں اور پوجا اس کمرے میں چلے گئے۔ بیڈ پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں جا کر بیڈ پر پھیل گیا۔ پوجا بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بولو..... کیا چاہتی ہو تم اور کیا کر رہی ہو؟''

''اس وقت میں تمہیں کچھ بھی کہوں، تم نہیں مانو گے۔ جبکہ میں تمہیں ہر بات سچ بتا چکی ہوں۔'' اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''اور میں تمہیں بار بار سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے مسلسل غلط بیانی کرتی چلی آرہی ہو۔ سچ کیا ہے اب بھی بتادو۔'' میں نے سکون سے پوچھا تو وہ اداکاری کرنے لگی جیسے اسے بہت غصہ آرہا ہو، شٹپٹا رہی ہو۔ میں اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پوجا، جب تم مجھے ملی تھیں نا، تو اس وقت ریتا اور شوبتا تھیں، اس وقت فرزانہ اور شبانہ ہیں، یہ اتفاق تو ہے لیکن یہ ان کے جیسی بزدل نہیں، اور وہ دونوں ان جیسی خونخوار نہیں تھیں۔ صرف پانچ منٹ، تمہیں یہ اُدھیڑ کر رکھ دیں گی اور تم چیخ چیخ کر بولوگی۔''

''تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پوجا نے کہنا چاہا تو میں نے کھسا کر تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا، وہ الٹ کر بیڈ سے نیچے جا گری۔ تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی شبانہ اور فرزانہ اندر آکر دروازے میں رک گئیں۔ پوجا دھیرے دھیرے فرش سے اٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک دھار بہہ گئی تھی۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے جان سے نہیں مارنا لیکن اسے پوری طرح اُدھیڑ دو۔''

''نہیں، ایسے نہیں کرنا۔'' پوجا چیختی رہ گئی لیکن وہ دونوں آگے بڑھ چکی تھیں۔ انہوں نے پوجا کو بازوؤں سے پکڑا

اور دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ شبانہ اس کے سینے پر بیٹھ گئی اور پوری قوت سے گھونسا اس کی گردن پر مارا۔ پوجا کے منہ سے دردناک خراخراہٹ نکلی جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ فرزانہ نے اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ وہ بالکل ہی یوں ہوگئی جیسے اس کے حواس گم ہو چکے ہوں۔ انہوں نے پوجا کا ایک ایک بازو پکڑا اور کھڑا کرلیا، ایک نے اس کی پسلی پر گھونسا مارا تو دوسری نے پیٹ میں۔ شبانہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پھر سے گردن پر گھونسا مارا، اسی لمحے فرزانہ نے اس کے سینے پر کہنی ماردی۔ وہ ڈکارتی ہوئی بیڈ پر گری۔ تبھی دونوں پل پڑیں۔ اس نے آدھا منٹ بھی نہیں نکالا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بے ہوش ہوگئی۔

تھوڑی دیر جب اُسے ہوش دلایا گیا تو اس کی حالت بُری ہو چکی تھی۔

''تم نے بہت ظلم کیا۔'' اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کراہتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے حیرت یہ ہے کہ تم نے مزاحمت نہیں، جس طرح میرے ساتھ لڑی تھیں۔'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔'' اس نے ہانپتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

''تو چھپانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہر پانچ منٹ بعد یہی چلتا رہے گا، خود مرجاؤ تو مرجاؤ لیکن میں تمہیں نہیں ماروں گا۔'' میں نے سرد مہری سے کہا تو وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ شبانہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔ وہ گلاس بھر پی چکی تو بیڈ پر پھیلتے ہوئے بولی۔

''میرا فون دے دو، اس پر بڑی اہم کال آئی ہوگی۔''

''کیسی کال؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تیرے گھر کے بارے میں کال، ساوری کے بارے میں۔'' اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مطلب، تم نے اس پر حملہ.....'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''ہاں، میں نے اپنے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔'' اس نے کہا تو میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''پوجا، اسی فون نے تمہیں دھوکا دیا ہے، اسی فون نے تمہارے جھوٹ پکڑنے میں میری مدد کی ہے، اور یہی فون تمہیں دنیا میں زندہ رکھے گا لیکن تم باہر لان میں کئی فٹ گہرے گڈھے میں گل سڑ رہی ہوگی۔''

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور شہباز کا نمبر ملا دیا۔ ساتھ ہی اسپیکر آن کردیا۔

چند لمحوں بعد اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

''اوئے ماما کدھر ہو تم؟ ساوری بھابی آگئی اور تم.....''

''میں پوجا کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چل منا لے پھر، تمہارے گھر پر کچھ غنڈے آئے تھے۔ وہ اس وقت تھانے میں بند ہیں۔ واپس آکر ان کا کچھ کرلینا۔'' اس نے کہا۔

''میرے سامان کا کیا بنا؟''

''پیکٹ تیار ہے، جب کہو گے، بھیج دوں گا۔''

''اچھا شبانہ کو فون کرکے پوچھ لو کہاں ڈلیور کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کرتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے فون بند کرتے ہوئے پوجا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سن لیا میری جان؟''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی چلی گئی، جیسے حیرت ہی سے مرجائے گی۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا جا رہا تھا۔ کافی دیر بعد مری ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ..... سب..... کک..... کیا ہے؟''

''سب کچھ ملا جلا کر اگر فقط ایک شبد کہا جائے تو وہ ہے منافقت۔ وہ بھی تمہاری منافقت..... تم کیا سمجھتی ہو، مجھے بے وقوف بنا کر مجھ سے کام لیتی رہو گی، مجھے ٹریپ کرلیا تم نے؟ ایسا نہیں ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا، تم کھیل کون سا میرے ساتھ کھیل رہی ہو اور کہاں تک کھیل سکتی ہو..... یہی کھیل تھا نا تمہارا؟''

''مجھے معاف کردو..... تم جو کہو گے میں وہی کروں گی۔'' وہ ایک دم سے روتے ہوئے میرے پاؤں پڑ گئی۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اتنے میں شبانہ کا فون بج اٹھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''باہر جاؤ تو کسی سے دو چار سگریٹ بھی لیتی آنا۔''

میری بات سن کر وہ فوراً ہی پلٹ گئی۔ ''تم تو سگریٹ نہیں پیتے ہو؟'' اس نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''آج پیوں گا۔'' میں نے کہتے ہوئے پاؤں کی ٹھوکر اس کی پسلی میں ماری وہ دہری ہوتی چلی گئی۔ فرزانہ نے اسے ہٹا کر پیچھے کردیا۔ وہ قالین پر اوندھے منہ گر گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بہت مشکل سے اٹھی اور ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''تم جانتے ہو میں ایک کٹھ پتلی ہوں، کوئی نچا رہا ہے اور میں ناچ رہی ہوں۔ مجھے مار دو۔'' اس نے بلکتے ہوئے کہا تو میں سرد لہجے میں بولا۔

''میں نے کہا نا میں تمہیں ماروں گا نہیں، زندہ رکھوں گا لیکن تمہارا جسم اسی گھر کے لان میں بنائے گئے گڑھے میں گل سڑ جائے گا۔''

میرے یوں کہنے پر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ظاہر ہے بات اس کی سمجھ میں نہیں آنے والی تھی۔ یہ سب میرے دماغ میں چل رہا تھا۔ اتنے میں شبانہ کمرے میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ وہ دیتے ہوئے اس نے اشارے سے بتا دیا کہ یاد بھی آرہی ہے۔ میں نے سگریٹ ہاتھ میں لیا اور پوجا کو قریب کرنے کا اشارہ کیا۔ فرزانہ نے اسے آگے دھکیل دیا۔ میں نے اس کی گردن اپنے ہاتھ میں پکڑی اور سگریٹ کی راکھ اس کی کھلی آنکھوں میں ڈال دی۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے سگریٹ اس کے گال پر لگا دیا۔ وہ دل خراش انداز میں تڑپتے ہوئے چیخی۔ اس کے ساتھ ہی ہذیانی انداز میں کہنے لگی۔

''پوچھو، جو پوچھنا ہے، میں بتاتی ہوں۔''

میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ شبانہ اور فرزانہ نے آگے بڑھ کے اسے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پوجا جلن کی شدت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''گیم کیا ہے؟''

''جو برسوں سے چل رہا ہے۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ذمے کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پر چند لوگوں کو بے تحاشا نوازنا، انہیں ہر طرح سے مضبوط کرنا اور پھر یہاں کے اداروں میں اپنے لوگ بٹھا دینا۔'' اس نے یوں بتایا جیسے رٹا ہوا سبق دہرا رہی ہو۔

''کتنے افراد ہیں یہاں؟'' میں نے پوچھا تو وہ بہ مشکل بولی۔

''تین لوگ ہیں،...... لیکن سورس بہت...... ، پیسہ دو...... ہر کوئی...... ہر کام کرنے کو...... تیار ہے۔''

''لوگوں کا قتل، یہ بم دھماکے، یہ دہشت گردی......؟'' میں نے پوچھا۔

''خوف...... ہر طرف خوف...... رکھنا ہے...... اسی میں افواہیں...... جنم لیتی ہیں...... اور ہمارا کام...... چلتا ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''باقی دو کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''انوار شاہ اور سدرہ جمال......'' اس نے کہا۔

''دونوں مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں،...... میں بھی تو...... اُن کے لیے...... نورین ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

''کہاں رہتے ہیں؟''

''پتا نہیں،...... صرف...... فون پر...... بات ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوکے...... اب بتاؤ یہ راکیش ورما والا ڈراما کیا ہے؟''

''اس کے بارے میں اب تک میں نے تمہیں جو بتایا ہے، وہ سب سچ ہے۔...... کلیان جی...... ایک حقیقت ہے۔ راکیش ورما جیسے...... نجانے کتنے لوگ...... ان کے ساتھ ہیں لیکن ہم انہیں...... استعمال کر رہے ہیں۔'' اس نے بہت مشکل سے کہا۔

''تم لوگ کون ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''ہم...... نہ پوچھو...... مار دو مجھے...... تم نہ پوچھو......''

میرے پوچھنے پر ایک دم سے خوف زدہ ہوگئی۔ اس کا خوف اس کی آنکھوں سے چھلک پڑا تھا۔ وہ بے جان سی ہو کر قالین پر گر گئی۔ میرے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ میں نے اس کی پنڈلی پر سگریٹ لگایا تو وہ ایک لمحے کو تڑپی اور پھر یونہی بے جان سی ہوگئی۔

''یہ ایسے نہیں مانے گی، اسے ہمارے حوالے کر دیں۔'' شبانہ نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا شبانہ...... اب بس مجھے مرنا ہے۔'' پوجا نے اوندھے لیٹے ہوئے کہا تو مجھے لگا وہ اب مزید تشدد سہنے کی سکت نہیں رکھتی ہے۔ لیکن اس کا اس قدر خوف زدہ ہو کر اپنے سارے حوصلے ہار جانا، اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔ میں نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

''چلو، نہیں پوچھتا، اتنا بتا دو یہ کہ تم نیا گینگ، نیا نیٹ ورک کیوں بنا رہی ہو؟ کیا مقصد ہے تمہارا......؟''

''علی زین...... ان باتوں کو...... یہیں ختم کر دو......، تمہارا اس سے...... کوئی لینا دینا نہیں ہے،...... تمہیں راکیش ورما کا...... نیٹ ورک ختم کرنا ہے،...... چند دن میں ایک ایک بندہ...... ختم کروا دوں گی۔...... اس کے بدلے میں...... تم مجھے جانے دو گے...... اسی میں...... تمہاری بھلائی ہے۔'' اس نے بہت مشکل سے کہا تو میں نے حقارت سے کہا۔

''میرا دشمن میری بھلائی چاہے، ایسا ممکن تو نہیں ہے، خیر، تم ابھی سکون کرو، پوری رات پڑی ہے، بہت کچھ بتاؤ

pklibrary.com

گی۔"

اس سے پہلے کہ فرزانہ اسے اٹھاتی، باہر ذرا سی ہلچل کی آواز آئی، پھر دروازہ کھلا اور بادیہی اندر آ گئی، جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اگلے ہی لمحے جب اس نے پوجا کو بری اور خستہ حالت میں قالین پر پڑے ہوئے دیکھا تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"آؤ بادیہی جی آؤ..... میں نے آفر کی تھی کہ تمہیں باہر بھیج دوں مگر تم تو بہت چالاک نکلی ہو، آؤ ذرا پوجا کی بغل میں اور سناؤ قصہ....."

"قصہ، کیسا قصہ؟" اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا تو میں سختی سے بولا۔

"تمہارے یہ بھولپن کا ڈراما بہت ہو گیا، پوجا نے تمہارے بارے میں بتایا ہے تو میں نے تمہیں اٹھوالیا ہے۔ بولو..... کیا جانتی ہو پوجا کے بارے میں؟"

"سب کچھ سچ سچ بتاؤں گی، لیکن مجھ پر کوئی تشدد مت کرنا۔" اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کھانا، شراب اور سگریٹ سب دوں گا۔ بس تم کو سچ بولنا ہے، ورنہ تم پار نہیں بلکہ زمین کے اندر چلی جاؤ گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ پوجا، یہاں پر بھارت کے ایک شخص راکیش ورما کے لیے کام کرتی ہے، میں بھی اسی کے لیے کام کرتی ہوں۔ کچھ ہفتے پہلے اس نے مجھے پوجا کے بارے جانکاری کے لیے کہا، یہ فارم ہاؤس پر میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔ یہ راکیش ورما کو ڈبل کراس کر رہی ہے، اسی کے لیے کام کرتی ہے اور اسی کے بندے ختم کر رہی ہے، یہ ڈبل کراس کیوں کر رہی ہے، یہ میں نہیں جانتی۔"

"اس کے لیے تیرے پاس کیا ثبوت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میں راکیش ورما کو دے چکی ہوں۔ اگر یہ پوجا نہیں مانتی تو....." اس نے کہنا چاہا تو پوجا نے ایک دم سے قہقہہ لگایا..... اگرچہ یہ قہقہہ بڑا دردناک قسم کا تھا لیکن اس میں حقارت اور طنز صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"بھولی بادیہی..... تم کیا سمجھتی ہو، میں نہیں جانتی..... میں اسی دن جان گئی تھی، ..... جس دن راکیش ورما نے تمہیں میرے لیے..... یہاں بھیجا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور حتمی لہجے میں بولی۔ "علی زین،.....

اب تم جو چاہو سو کرو..... مجھے زمین میں گاڑ دو..... جلا کر ہوا میں اچھال دو..... میں اب..... کچھ نہیں بتانے والی..... جو مرضی ہے سلوک کرو میرے ساتھ۔"

اس کے یوں کہنے پر میں ... چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر فرزانہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اس بادیہی کو لے جاؤ، اسے کھانا، شراب اور سگریٹ دو۔ میں آتا ہوں اس کے پاس۔ مجھے اور پوجا کو اکیلے چھوڑ دو۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے شبانہ کی طرف مخصوص انداز میں دیکھا تو وہ دونوں بادیہی کو لے کر چل دیں۔ کمرے میں ہم دونوں رہ گئے۔ وہ قالین پر پڑی تھی اور میں بیڈ پر بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا مگر اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور کھسکتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا، جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بڑا عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھیانک انداز میں ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے اندر کس قدر غصہ تھا۔ یہ اسے بھی معلوم تھا کہ اب صرف موت ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہتی چلی گئی۔

"علی..... ایک بات کہوں..... جو تم مجھ سے پوچھنا چاہ رہے ہو، اسے مت پوچھو..... بلکہ اس کے بارے میں تمہیں معلوم ہی نہیں ہونا چاہیے..... ایک بھیانک دنیا ہے..... یہ مت سوچنا کہ میں تم میں تجسس پیدا کر رہی ہوں..... میں جانتی ہوں تم ایک محب وطن اور اچھے انسان ہو،..... اپنی اس محدود دنیا میں رہو..... یہی تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔"

"مجھے بھی تمہاری اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ ہی میں تم سے پوچھوں گا۔ بس اتنا بتا دو..... راکیش ورما کے لیے کام کرنے کے باوجود، تم اسے ختم کیوں کر رہی ہو؟"

"تم سمجھ لو..... میں کسی دوسرے کے لیے..... کام کر رہی ہوں..... اور میری دنیا کے لوگ..... نہیں چاہتے کہ..... راکیش ورما..... یا اس جیسے لوگ یہاں پر..... ہماری راہ میں حائل ہوں..... ہمیں ایک نئی دنیا بسانی ہے..... وہ کیا ہے..... کیسی ہے..... اسے چھوڑو..... تمہارا مقصد ان لوگوں کو ختم کرنا ہے..... تو کرو..... میں تمہاری مدد

کرتی ہوں۔'' اس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں سرد لہجے میں بولا۔

''مجھے اب تمہاری مدد نہیں چاہیے۔''

''جانتی ہوں..... لیکن اگر تم بادیبی جیسے..... لوگوں پر انحصار کر رہے ہو..... تو یہ محض ایک سورس ہے،..... یہ کچھ نہیں..... اس کی حیثیت..... ایک چیونٹی کے جیسی.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اس چیونٹی نے تمہیں کاٹ لیا۔ تم اسی چیونٹی سے بدک رہی تھیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ دھیمے سے ہنس دی پھر بولی۔

''کہتے ہیں نا..... مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا..... مجھے مار کر تمہیں کچھ حاصل نہیں ہونے والا..... ہاں یہ زندہ ہاتھی..... سوا لاکھ کا ہو سکتا ہے۔''

''اوکے۔ زندہ رکھوں گا مگر آزاد نہیں، بولو زندہ رہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''رہوں گی۔'' اس نے سر مارتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا تو میں کوئی بات کیے بنا اٹھ گیا۔ میں نے باہر لان میں آکر چاچا عبدالمجید کو فون کر دیا۔ انہیں ساری صورتِ حال بتا کر پوچھا۔

''اب بتائیں کیا کروں؟''

''تم کچھ نہیں کرو۔ کچھ لوگ ابھی آکر اسے لے جائیں گے۔ سمجھو تم نے اسے گولی مار دی۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں واپس کمرے میں آیا تو پوجا اسی طرح دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ وہ مجھے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ میں خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گیا۔ میرا اب اس سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد تین بندے آگئے۔ مجھ تک پہنچنے میں انہیں مزید دس منٹ لگ گئے۔ جیسے ہی وہ کمرے میں آئے، میں بیڈ سے اٹھا، اپنا پسٹل نکالا اور پوجا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم بادیبی کے لیے مر گئی ہو۔ بس ایک آخری چیخ.....'' یہ کہتے ہوئے میں نے دو فائر کر دیے۔ پوجا کی چیخ ابھری۔ ایک دم سناٹا چھا گیا۔ میں نے پوجا کو لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ آنے والوں نے اسے بیڈ کی چادر میں لپیٹا اور نکل گئے۔

میں اس کمرے میں جا پہنچا جہاں بادیبی کو رکھا ہوا تھا۔ وہ تینوں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر بادیبی کا رنگ اُڑ گیا۔ تبھی فرزانہ نے پوچھا۔

''یہ فائر.....؟''

''میں نے پوجا کو مار دیا ہے۔ اس کی لاش ٹھکانے لگائی جا رہی ہے اور تم بادیبی، جانا چاہو تو جا سکتی ہو، کل تک یہ ملک چھوڑ دینا۔ تم نے میرا کچھ نقصان نہیں کیا اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فرزانہ اور شبانہ کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دیں۔

☆☆☆

میں فیروز پور روڈ کے ایک فلنگ اسٹیشن کی ٹک شاپ پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے شہباز کا انتظار تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی پانچ سے سات منٹ تک پہنچنے والا تھا۔ میرا ذہن پوجا میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں باوجود چاہنے کے اسے قتل نہیں کر پایا تھا۔ میرے خیال میں یہی اس کا شاطرپن تھا جس کے باعث وہ مجھ سے بچ گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جب میں بہت کچھ سوچ چکا تو ایک خیال یہ بھی آیا کہیں میں اس کے لیے اپنے من میں کوئی نرم گوشہ تو نہیں رکھتا تھا؟ میں نے پوری ایمانداری سے اپنے من کو ٹٹولا، کہیں دور دور تک ایسا نہیں تھا بلکہ یہ حیرت ہوئی کہ مجھے اس سے شدید نفرت تھی۔ میرا چائے کا کپ ابھی خالی نہیں ہوا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب سے کسی اجنبی مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔

''علی زین بات کر رہے ہو؟''

''تم کون ہو؟'' میں نے محتاط انداز میں پوچھا تو وہ بولا۔

''ہم آپ کے چاہنے والے، سنا ہے آج کل تم بہت سرگرم ہو۔''

''اپنا تعارف کراؤ۔'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا تعارف نہ چاہو تو بہتر ہے۔ ہاں مگر اتنا جان لو، پوجا کے بارے میں جانکاری رکھتے ہیں۔ کہو، وہ زندہ ہے یا مار دیا تم نے؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ شاید رانگ نمبر ہے؟'' میں نے اجنبی لہجے میں اکتاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''نہیں، انجان نہیں بنو..... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کہاں کھڑے ہو۔''

''تو آکر مجھ سے بات کر لو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میرا آنا تمہیں مہنگا پڑے گا جو سوال کیا ہے، بس اسی کا جواب دو۔'' اس بار وہ حکم دینے والے انداز میں بولا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں خود پر قابو رکھتے ہوئے بولا۔

''او بھائی، لگتا ہے تم فلمیں زیادہ دیکھتے ہو اس لیے مجھے تمہارا دماغ خراب لگتا ہے۔ میرا وقت برباد مت کرو۔''

''پوجا میری دوست ہی نہیں، میری ساتھی بھی ہے۔ اسے اٹھا تو لیا ہے لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے غراتے ہوئے بے ڈھنگے سے انداز میں کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

''تمہارا نمبر غلط لگ گیا ہے یا پھر تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ جاؤ اپنے دماغ کا علاج کراؤ اور فلمیں دیکھنا بند کرو۔'' میں نے کہا اور فون کال بند کر دی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ دوبارہ کال ضرور کرے گا۔ میں نے چائے کا کپ ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ میں لاشعوری طور پر انتہائی محتاط ہو گیا تھا۔ ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ میرا فون ٹریس نہیں کر سکتا، پھر اس نے ایسا کیوں کہا۔ میں چند لمحے اس صورتِ حال میں رہا کہ جو سامنے آئے گا، دیکھا جائے گا، یہ سوچ کر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ اسی لمحے میرا فون بجا، میں نے فون کان سے لگایا، اپنے پسٹل کو محسوس کیا اور ٹک شاپ سے باہر آ گیا۔

شہباز میرے انتظار میں تھا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تو اس نے کار بڑھا دی۔ اگلے چوراہے تک میں نے اسے ساری بات انتہائی اختصار سے سنا دی۔ یہاں تک کہ فون کے بارے میں بھی بتا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد بولا۔

''اس فون کو نظر انداز مت کرو، ابھی وہ صرف اعصاب سے کھیلے گا، دیکھ لیتے ہیں اُسے بھی۔'' اس نے کہا پھر ٹرن لے کر بولا۔ ''یہ جو جیون رام اور بکا راجھستانی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب وہ کام کے نہیں رہے، کیا خیال ہے؟''

''بالکل کام کے ہیں۔ بس مجھے اتنا بتا کہ اگر یہ بھارت چلے جائیں تو ہم یہاں سے انہیں وہاں بھی تلاش کر سکتے ہیں یا نہیں؟''

''وہاں بھی کر سکتے ہیں، یہ سارا سیٹلائٹ سے ہے نا۔'' اس نے کہا تو ایک دم سے میرے دماغ میں خیال ابھرا، بھی میں نے تیزی سے پوچھا۔

''مجھے یہ بتا، کہیں ہمارے اندر کی چپ کو تو نہیں ٹریس کر رہا، یا پھر پوجا کے اندر بھی ممکن ہے ایسی کوئی چپ لگی ہو؟''

''ہمیں کوئی ٹریس نہیں کر سکتا سوائے ان کے جنہیں ہمارے کوڈ کا پتا ہوگا، میرے علم میں ابھی ایسا نہیں ہے، لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔'' اس نے اُلجھتے ہوئے کہا تو میں نے چاچا کا نمبر ملا لیا۔ دوسری بیل پر چاچا نے فون ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا۔

''تم نے بالکل درست سوچا، پریشان نہ ہو، میں دیکھتا ہوں، تم صرف اپنے کام پر دھیان دو۔ یہ پوجا والا سارا معاملہ میں دیکھ لوں گا۔''

''اوکے۔'' میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی شہباز نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''اب بتاؤ تم بکا۔ اور جیون رام کے پاس کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''میں انہیں بھارت واپس بھیج دینا چاہتا ہوں۔ وہ جائیں اور جہاں تک بھی جائیں، ہماری نگاہ میں رہیں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''اور تم.....؟'' اس نے وحشیانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''میں اُن کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔''

''نہ کر..... ایسے نہ کر یار..... ہم سے بھی زیادہ آگے سوچنے والے موجود ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے تمہارا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں دشمن کو اب مزید وقت نہیں دینا چاہتا۔ یہاں سوائے بھل بھلیوں کے کچھ نہیں ہے۔'' میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

''وہاں کہاں جاؤ گے، راکیش ورما تمہاری راہ میں تو نہیں بیٹھا ہوگا کہ بس آؤ اور اُسے قتل کر دو، یہ سب تو.....'' اس نے جذباتی انداز میں کہا تو میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں، تم یہ سب میری محبت میں کہہ رہے ہو، لیکن یار شہباز کسی کو تو جانا ہے، میں ہی کیوں نہیں..... میں ساری دنیا تج سکتا ہوں لیکن اپنے محسن کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

''اوئے ماما، میں تمہیں نہیں کہوں گا بس.....'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنا سر جھٹک دیا پھر اچانک بولا۔ ''وہ دونوں اس وقت تصور کے پاس ایک گاؤں کے ڈیرے پر ہیں۔ یہ سات آٹھ لوگ ہیں، جس کے پاس ہیں وہ ہمارا ہی بندہ ہے۔ اب اگر تم چاہو تو ہم انہیں یہاں بلوا لیتے ہیں یا پھر اُدھر ہی جائیں، بولو؟''

''جیسے تمہاری مرضی.....'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ ابھی ہم نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر نصب فون پر پش کر کے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے کسی نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

''ہیلو جناب؟''

''اوئے خیر ہے، اتنا گھبرا کیوں گئے ہو؟'' شہباز نے پوچھا۔

''ادھر ڈیرے پر پولیس آئی ہوئی ہے، اس نے چھاپا مارا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی کیا غلطی ہو گئی ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''غلطی نہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی، کیا کہتی ہے پولیس؟ کس لیے آئی ہے، کچھ تو بتایا ہو گا؟''

''کچھ بتا ہی تو نہیں رہے، بندے ایک طرف بٹھا کر تلاشی لے رہے ہیں۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''ٹھہرو، میں ابھی پتا کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کار ایک طرف روک دی۔ اس نے کار مجھے چلانے کا کہا اور خود اتر کر پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سیدھے چلتے رہو، ہم قصور جا رہے ہیں۔''

میں نے سر ہلا کر رفتار بڑھا دی۔ اس نے کسی کے نمبر پش کیے اور پھر بات کرنے لگا۔ جب تک ہم قصور شہر کے نواح تک پہنچے، اس کی چند لوگوں سے فون پر ہونے والی باتوں سے میں سمجھ گیا تھا کہ سارا معاملہ کیا ہے۔ پہلے اس نے وہاں کی پولیس سے چھاپا مارنے کو کہا، اب پولیس کو ہی ہدایت دے رہا تھا۔

''یہ سب کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا تو پُرسکون لہجے میں بولا۔

''بادیہی اور پوجا کے پکڑے جانے کے بعد یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اب جو بھی سامنے آتا ہے، اسے ختم کرو۔ کم از کم لاہور سے یہ گند صاف کرنا ہے۔''

''تو انہی سے ابتدا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت ساری جگہیں ہیں، آپریشن کلین اَپ شروع ہے۔ یہ سات آٹھ لوگ ہماری ذمے داری پر تھے اس لیے۔'' اس نے صاف انداز میں بتا دیا تو میں خاموش رہا۔

قصور سے کافی پہلے بائیں جانب ایک سڑک جاتی ہے، اس نے مجھے مڑنے کو کہا۔ میں اُدھر مڑ گیا، تقریباً بیس منٹ چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں بالکل آبادی نہیں تھی۔ ہر طرف فصلیں تھیں۔ درمیان سے ایک چھوٹی سی پکی سڑک تھی۔ دور دور تک کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا پھر جیسے ہی ایک طرف سڑک مڑی تو شہباز بول اٹھا۔

''یہ بائیں جانب کچی سڑک پر اتار لو۔''

میں نے کار کچی سڑک پر ڈال لی۔ راستہ بتا رہا تھا کہ کافی ٹریفک گزرا ہے۔ میں چلتا رہا، تین چار منٹ سفر کرتے رہنے کے بعد دیکھا، سامنے ایک ڈیرا تھا جہاں چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے کار ان کے پاس روک دی۔ باہر ہی چند لوگ کھڑے تھے۔ شاید وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ ہمارے اترتے ہی وہ لوگ فوراً ہماری جانب بڑھ آئے۔ ایک موٹے سے ناٹے قد والے نوجوان نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر جی یہ سب اچانک ہوا، مجھے.....''

''انسپکٹر کہاں ہے؟'' شہباز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ انسپکٹر اُدھر بیٹھا ہے جی۔'' اسی موٹے اور ناٹے قد والے نے بتایا تو ہم اس طرف چل دیے۔

سامنے برآمدہ تھا۔ جس میں کچھ پولیس والے کھڑے تھے۔ کافی سارے کمرے تھے، جن میں سے ایک کمرے میں کوئی سات آٹھ افراد فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں بکارا جھستانی اور جیون رام بھی موجود تھے۔ ہم نے انہیں.... سرے سے ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ دو پولیس والے ان کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ انسپکٹر ایک چارپائی پر بیٹھا تھا، ہمیں دیکھتے ہی اٹھا۔

''آ گئے جناب.....'' انسپکٹر نے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ہاں پہنچ گئے..... اب وقت ضائع کیا کرنا، بولیں کیا کہتے ہیں؟'' شہباز نے بالکل اجنبی بن کر پوچھا، مجھے لگا وہ ایک اچھا اداکار ہے۔ لیکن سامنے انسپکٹر بھی کوئی ماٹھا اداکار نہیں تھا، اس نے بھی بہترین پرفارمنس دیتے ہوئے کہا۔

''او سر جی، ہمیں مخبری ہوئی ہے کہ یہاں کوئی مشکوک لوگ ہیں، بارڈر ایریا ہے سر جی، اس لیے.....''

''تو پھر کیا ملا؟'' شہباز نے پوچھا تو اس نے ذرا زور سے کہا تاکہ کمرے کے علاوہ باہر کھڑے لوگ بھی سن لیں۔

''ان سے ملا تو کچھ نہیں، لیکن یہ کچھ مشکوک بندے ہیں تو سہی۔''

''ان کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ آپ جائیں، صبح یہ

سارے بندے پیش کر دیں گے۔'' شہباز نے اعتماد سے کہا تو انسپکٹر بے رخی سے بولا۔

''سوری جناب، بندے تو میں ابھی لے کر جاؤں گا، جو بات کرنی ہے اُدھر تھانے میں آ کے کر لیں۔''

''چلیں لے جائیں بندے...... مگر انہیں تھانے لے جانے کا فائدہ کیا ہوگا؟'' شہباز نے کہا۔

''اب ساری باتیں میں یہاں تو نہیں کر سکتا نا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو شہباز نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ، میں ابھی بات کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ ناٹے قد والے موٹے کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ ناٹے قد والے موٹے نے پوچھا۔''اب کیا ہوگا؟''

''مجھے یہ بتاؤ، پولیس کی یہاں آمد کے بارے میں کسی دوسرے کو علم ہے ہمارے سوا؟ کہیں کسی دوسرے کو بتایا؟''

''نہیں، جس وقت میں نے فون کیا، یہ پہنچے ہی تھے، میں نے صرف آپ ہی کو فون کیا تھا۔''

''او کے، میں سنبھال لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور مجھے لیتا ہوا پھر کمرے میں چلا گیا۔

''میں انہیں صبح پیش کر دوں گا۔ ابھی آپ جائیں۔'' شہباز نے انسپکٹر سے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں جناب، جن لوگوں نے مخبری کی ہے، وہ ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں، میں انہیں کیا جواب دوں گا۔''

''کن لوگوں نے کی ہے مخبری......؟'' شہباز نے پوچھا۔

''یہ آپ جب تھانے جائیں گے تو وہیں پتا لگ جائے گا۔'' اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا پھر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اپنے ماتحتوں سے بولا۔ ''سارے بندے لاؤ باہر۔''

ہم برآمدے میں آ گئے۔ وہ ناٹے قد والا موٹا ہمارے پاس آ گیا تو شہباز نے اس سے پوچھا۔

''کوئی اندازہ ہے ایسا کیوں ہوا؟''

''میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا جناب، ابھی کچھ دیر پہلے میں یہاں آیا تو میرے پیچھے ہی پولیس والے آ گئے۔ یہ کھوج تو اب لگانا پڑے گا۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

اس اثنا میں پولیس والے ان سب لوگوں کو نکال کر باہر لے آئے تھے۔ ایسے میں شہباز نے پھر انسپکٹر سے کہا۔

''دیکھیں سر جی، اب بھی دیکھ لیں، اگر تھوڑی سی گنجائش ہے تو......''

''نہیں سر، ایسا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

سبھی کو باری باری پولیس گاڑی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ سب بیٹھ گئے تو پولیس کی گاڑیاں چل دیں۔ انسپکٹر کی گاڑی آگے تھی۔ شہباز نے مجھے اشارہ کیا، ہم اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔

واپسی پر وہی وحشت ناک سناٹا، اندھیرا اور سڑک کے دونوں جانب فصلیں تھیں۔ چھوٹی سی سڑک پر تین گاڑیاں آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ سب سے آگے انسپکٹر، پھر پولیس گاڑی، اور پھر ہماری کار تھی۔ ہمارا ان کے ساتھ تھوڑا فاصلہ تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لگ رہا تھا جیسے تھوڑے سے فاصلے پر نہر ہے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے بیزاری سے پوچھا۔

''یار، تم دیکھتے رہو۔'' اس نے کہا اور اپنا فون نکال کر کال کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ ''نہر کے پل سے اتر کر جو چوراہا آنے والا ہے نا یہ جگہ ٹھیک ہے۔ یہاں روک دو۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ آگے والی گاڑیاں رک گئیں۔ ہم تھوڑا پیچھے رک گئے۔ انہوں نے سب کو باہر نکال لیا۔ شہباز تیزی سے نکلا تو میں بھی ہیڈ لائٹس جلتی چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ سب ڈراما ہو رہا ہے۔ مگر میں بھی محتاط تھا، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو انسپکٹر......'' شہباز نے چلاتے ہوئے کہا۔

''سنا نہیں مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا، یہ سارے سوا سوا لاکھ کے ہیں جناب، زندہ لے گیا تو کہیں غائب کر دیں گے، مرے ہوئے ترقی دیں گے۔'' انسپکٹر نے کہا تو شہباز نے آگے بڑھ کر انسپکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اگلے ہی لمحے انسپکٹر نے شہباز کا ہاتھ پکڑا اور اسے نیچے لے لیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا تھے کہ اسی لمحے میں کودا اور دوسرے پولیس والوں کے پاس جا پہنچا۔ انہیں پسٹل دکھاتے ہوئے بولا۔

''رک جاؤ انسپکٹر......''

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے رک گیا۔

''خبردار کوئی ہلا تو گولی مار دوں گا۔'' میں نے پولیس

pklibrary.com

والوں کی طرف پسٹل لہراتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے میں جان بوجھ کر بکار ابھستانی کے پاس پہنچا تھا، اس کے ساتھ جیون رام تھا۔ ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھاگو......''

وہ ایک دم سے بھاگے۔ اسی لمحے فائرنگ ہونے لگی۔ ہم وہاں سے بھاگے اور کار میں آ گئے۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ چکے تھے۔ میں نے کار ایک جانب جانے والی سڑک پر موڑی اور تیز رفتاری سے نکل گیا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ تھوڑا سا آگے جا کر شہباز نے تبصرہ کرنے والے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''اب یہ علاقہ محفوظ نہیں، ہو سکتا ہے ہمیں گھیرا جائے۔''

''اب کرنا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جتنی جلدی ہو سکے واپس لاہور چلو۔'' اس نے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے کہا اور رفتار مزید بڑھا دی۔

تقریباً بیس منٹ بعد جب ہم بڑی سڑک تک پہنچے تو شہباز نے پوچھا۔

''جیون رام، تمہارا پار جانے کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے؟''

''ہے تو سہی لیکن تلاش کرنا پڑے گا۔'' جیون نے منمناتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، سیدھی سی بات ہے، جس مقصد کے لیے تمہیں جیل سے چھڑوایا گیا تھا، وہ تم لوگوں نے پورا نہیں کیا، ہم سے کوئی رابطہ کیا اب تک؟ پوجا کے بارے میں ایک بھی بات بتائی؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کوئی کام کرنے کا موقع تک نہیں ملا تو میں کیا کر سکتا تھا۔'' وہ دھیمے سے بولا تو شہباز نے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر وہ بادیبی پکڑی نہ جاتی تو شاید تم دوبارہ ہمیں بھی نہ ملتے۔ یہ تو ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم دونوں یہاں ہو۔''

''ٹھیک ہے ہم نے وعدہ خلافی کی ہے، اب تم جو چاہو ...کر سکتے ہو، لیکن اگر تم ہمیں جانے دو تو......'' اس نے کہا تو بکار ابھستانی بولا۔

''علی زین...... میں تمہارا مجرم ہوں۔ لیکن تم نے مجھ پر ہمیشہ احسان کیا ہے، اس بار ہمیں جانے دو۔ اگر اپنے باپ کا تخم ہوا تو ضرور اس کا بدلہ دوں گا، یہ ایک رانگڑ کا وعدہ ہے۔'' اس نے کہا تو میں کار روکتے ہوئے بولا۔

''ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا، تمہیں وہاں سے بچا لائے، ورنہ اب تک تم سڑک پر مرے پڑے ہوتے۔ اپنی بات پر قائم رہنا۔ اب اترو اور دوڑ جاؤ۔''

''تم آزاد ہو یہاں رہو، پار جاؤ، جو مرضی کرو۔'' شہباز نے کہا تو وہ دونوں اتر گئے۔ ہم نے پلٹ کر بھی انہیں نہ دیکھا اور چل دیے۔

''اب سمجھ آ گئی، اتنا ڈراما صرف ان دونوں کو بچانے کے لیے کیا گیا۔''

''ہو سکتا ہے کہیں کام آ جائیں۔'' میں نے کہا تو اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر کی تو موج لگ گئی، چل کوئی نہیں۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ تھوڑا سا سفر کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''اب یہ دونوں پار چلے جائیں گے؟''

''نہ گئے تو بھیج دیں گے، تم اب فکر نہ کرو۔'' اس نے اطمینان سے کہا تو میں نے نگاہیں سڑک پر مرکوز کر دیں۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ میں فریش ہو کر لاؤنج میں آیا تو ساوری وہاں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میرا احساس پا کر اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کل جس وقت تم شانزے کی طرف گئیں تو......''

''میں پہلے ہی چلی گئی تھی۔ وہ غنڈے بعد میں آئے تھے۔'' اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوری بات کہہ دی۔ وہ لحہ بھر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی، ''ناشتا لاؤں؟''

''ہاں لاؤ۔'' میں نے دھیمے سے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈ سے پوچھا تو وہ بولا۔

''سر جی، کچھ لوگ یہاں آئے تھے۔ انہوں نے آپ کا پوچھا، پھر اندر جانے اور آپ سے ملنے کی ضد کرنے لگے۔ پھر اچانک انہوں فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اصل میں وہ اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔''

''پھر کیسے پکڑے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ان کی فائرنگ کرنے کی دیر تھی، سامنے سے ایک دم فائرنگ ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے، کوشش یہی تھی کہ مرے کوئی نہیں۔ بس پھر پکڑ کر انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔'' یہ کہہ کر وہ تھانے اطلاع کرنے، پولیس کے آنے اور انہیں پکڑنے کی رُوداد سنانے لگا۔ میں واپس لاؤنج میں آ گیا۔

اس وقت میں ناشتا کر چکا تھا، جب شہباز کا فون آ گیا۔

''کب تک پہنچ رہے ہو آفس؟''

pklibrary.com

''جب تم کہو؟'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''آجاؤ یار یہاں، کچھ باتیں ڈسکس کرتے ہیں۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں بولا۔

''میں بس نکلتا ہوں ذرا تھانے سے ہو کر آتا ہوں۔''

''چھوڑ تھانہ، ان میں سے ایک ہی بندہ تھا، وہ سیف ہاؤس میں ہے، باقی سارے مقامی غنڈے تھے، انہیں پتا ہی تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں بولا۔

''تو پھر میں آفس آ کر کیا کروں گا۔ اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو۔''

''تمہارے گھر پر حملہ کرنے والے پوجا ہی کے لوگ تھے۔ وہ جو اپنے فون کی وجہ سے یہیں کہیں قریب دکھائی دیتی تھی، اسی کے لوگ تھے، ان کا کوئی پلان تھا، وہ کیا تھا؟ معلوم ہو جائے گا، یہ حملہ انہوں نے اچانک کیا تھا۔''

''یہی پلان ہوگا نا کہ اگر پوجا پکڑی جائے تو ساوری کو اٹھا لیا جائے، یہی بیک اَپ رکھا ہوگا خیر..... یہ تو ہو جائے گا، وہ جو رات فون آیا تھا مجھے، جسے تم نے کہا تھا کہ نظر انداز نہ کروں، اس کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو بات ہے، وہ بھی بالکل اسی طرح ہے جیسے پوجا کا فون تھا۔ اس کے بارے میں بھی ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ یہی تشویش کی بات ہے، پوجا سے جان چھڑائی تو یہ کوئی دوسرا آ گیا۔'' اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''چلو، کچھ کرتے ہیں اس کا بھی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''چل ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ تبھی میں نے سامنے دیکھا، ساوری مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''ایسے ہی بس، کیا میں تجھے دیکھ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بڑے مان سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، مجھے ہی دیکھنا ہے، ویسے کل اگر تم یہاں ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

''علی زین..... جب تک میں روہی میں تھی، وہاں زندگی کے معنی ہی کچھ دوسرے تھے۔ جب سے تمہارے ساتھ ملی ہوں، زندگی میرے لیے کیا ہو گئی ہے، یہ شاید تم نہیں جانتے۔ میں نے تنہا رہنا سیکھ لیا ہے۔ انسان موت ہی سے ڈرتا ہے نا، جو آنی ہے۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں رہا۔ میں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جانتی ہوں تمہیں میری فکر رہتی ہے، لیکن..... میری فکر مت کیا کرو۔ میں نے جس وقت تم سے شادی کی تھی، مجھے سب معلوم تھا کہ مجھے کیسے رہنا ہے۔''

''ساوری..... جب تم میری زندگی میں نہیں تھیں تمہارے لیے میرے جذبات تب بھی وہی تھے اب بھی وہی ہیں۔ تم میرے بچپن کی محبت ہو۔'' میں نے کہا تو میرے لہجے میں نجانے کہاں سے پیار سمٹ آیا تھا۔

''محبت کا مطلب کسی کو قید کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ کو اپنی محبت پر اعتماد ہے نا تو محبت آزادی دیتی ہے۔ اگر کوئی بھٹکے تو اس کا مطلب ہے میری محبت میں کوئی کمی ہوگی۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''ساوری..... تم میرا حوصلہ ہو۔'' میں نے محبت سے لبریز انداز میں کہا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں جیسے ان لفظوں کو وہ اپنے اندر اتار رہی ہے۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھی رہی، پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے کہا۔ ''چلو تیار ہو جاؤ، کہیں باہر چل کر.....''

''نہیں، اگر تمہارے پاس وقت ہے تو اپنے گھر سے زیادہ پُرسکون جگہ کیا ہو سکتی ہے۔ محبت ماحول کی محتاج نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی۔ اس وقت ساوری مجھے کسی دوسری دنیا سے آئی لگ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ میں اور شہباز قصور کے ایک گاؤں نتھووالا کے قریب ایک ڈیرے سے نکل رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک شخص تھا، جس نے مجھے سرحد پار کروانی تھی۔ ہم بی آر بی نہر پار کر کے ایک کچے راستے پر ہو لیے۔ سامنے باڑ کی تیز روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں شہباز نے درختوں اور پودوں کے چھوٹے سے جھنڈ میں گاڑی روک دی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور جذباتی سے لہجے میں کہا۔

''اوئے ماما..... اب دیکھ کیا رہا ہے، چل جا اب۔''

''ساوری کا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ سامنے دور تک کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ ہم اس کچے راستے سے ہٹ کر کھیتوں کے درمیان چلنے لگے۔

''ہمیں تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر چلنا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔

''تو چلو، لیکن احتیاط سے۔'' میں نے دھیمے سے جواب دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہم ایسی جگہ آ پہنچے جہاں پر کھیت ختم ہو گئے۔ سامنے سپاٹ زمین تھی۔ ایک بڑی سی ٹیکری کے ساتھ بیٹھ کر اس شخص نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔

''پہنچ گئے ہو؟'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

''بالکل، قریب ہیں۔'' اس نے کہا۔

''بڑے وقت پر پہنچے ہو۔ اچھا فون چالو رہے، رکھنا مت، میں بتاتی ہوں، میرا سامان لائے ہو نا، پھر نہیں کہنا۔'' نسوانی آواز نے کہا۔

''پہلے کبھی وعدہ خلافی ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، پر میرا پوچھنا تو فرض ہے نا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر کسی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ہمارے بارے میں کسی کو ہدایات دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ ''اب مجھے نہیں معلوم تم کہاں پر ہو۔ اپنی سمت سیدھی کرو تو بتاؤں۔''

''میں لوکیشن بھیجتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جلدی سے لوکیشن بھیج دی۔ اس دوران فون بند ہو گیا۔ اس نے دوبارہ کال کی تو وہ بولی۔

''چلو اب بڑھو تو مجھے پتا چلے۔''

ہم اٹھ کر چل دیے۔ فون پر آواز ابھرتی رہی۔ ہم بڑھتے رہے۔ میں انتہائی محتاط تھا۔ تیز روشنی کے باعث سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک طرح سے ہم 'اندھا دھند' آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے سامنے ایک سیاہ گیٹ آ گیا تو آواز ابھری۔

''گیٹ نظر آ رہا ہے نا؟''

''ہاں بالکل.....'' اس نے کہا۔

''تو بس یہیں آ جاؤ لیکن تیزی سے۔'' اس نے کہا تو میرے ساتھ کھڑے شخص نے میرے کاندھے پر تھپکی ماری، میں انتہائی سرعت سے گیٹ کی جانب بھاگا۔ اس گیٹ کے پاس میری موت بھی کھڑی ہو سکتی تھی، مجھے گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا اور میں وہاں سے سرحد پار بھی کر سکتا تھا۔

میں بالکل گیٹ تک پہنچا تو گیٹ ذرا سا کھلا، وہی تیز آواز سنائی دے۔

''ابے چل جلدی۔''

میں گیٹ تک پہنچا اور پھر اگلے چند لمحوں بعد میں گیٹ کے پار تھا۔ میرے سامنے ایک گہرے سانولے رنگ کی لڑکی وردی میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک

دیکھا اور بولی۔

''لا میرا سامان؟''

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سونے کے پانچ بسکٹ نکال کر اسے دے دیے۔ اس نے ایک نگاہ انہیں دیکھا اور جیب میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''چل نکل......''

سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس میں ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بیٹھا تھا۔ وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی اس جیپ تک آئی، ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک لڑکی ہی تھی۔ میں جیسے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اس نے جیپ چلا دی۔ بغیر ہیڈ لائٹس کے چلتی ہوئی جیپ، جسے ایک اجنبی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی، گہرا اندھیرا، ہر طرف سناٹا اور اجنبی دیس۔ بس ایک سرحد کی لکیر عبور کی اور اجنبی دیس ہو گیا۔ کھیتوں کے درمیان پندرہ سے بیس منٹ کے درمیان سفر ہوا ہوگا۔ پھر ایک ڈیرے سے کچھ فاصلے پر اس نے جیپ روک کر کہا۔

''وہ سامنے وہاں چلا جا۔''

میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے جیپ موڑی اور اسی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ ان کاموں کی بہت ماہر ہے۔ میں کچی سڑک پر تنہا کھڑا تھا۔ میرے اردگرد گہرا اندھیرا اور دبیز سناٹا تھا۔ میں راستے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یہیں انتظار کرنا تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد میرا اسیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب شہباز تھا۔

''پہنچ گئے ہو؟''

''ہاں لیکن ایک ڈیرے کے باہر۔'' میں نے بتایا۔

''ابھی کال آجاتی ہے تمہیں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سے پُراعتماد آواز ابھری۔

''کہاں کھڑے ہیں صاحب۔''

''ڈیرے کے باہر، کچی سڑک پر۔'' میں نے بتایا۔

''میں آرہا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ آگیا۔ وہ ایک لمبا سا نوجوان تھا۔ اس نے شال اوڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ڈیرے میں چلا گیا۔ وہاں ایک پیلا بلب روشن تھا۔ تبھی مجھے پتا چلا کہ وہ ایک سکھ نوجوان ہے۔

''روبندر سنگھ میرا نام ہے جی۔ اب آرام کرنا ہے یا نکلیں؟''

''نکلو یہاں سے جتنی دور جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چلیں جی پھر۔'' اس نے کہا اور کوٹھی نما گیراج میں کھڑی ایک کار نکالی، ہم اس میں سوار ہوئے اور ایک اجنبی سفر پر چل نکلے۔

اس وقت سورج نکل رہا تھا جب ہم فرید کوٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں راجو والا تھا۔ ہم فیروز روڈ سے بائیں جانب مڑے، ذرا سا آگے پانی والی ٹینکی تھی اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم ایک دو منزلہ گھر کے پاس جا پہنچے۔ وہاں موجود ایک جوڑا ہمارے ہی انتظار میں تھا۔ ہمیں اوپری منزل کا ایک کمرا دے دیا گیا۔

''لو جی آپ فریش ہو جاؤ، پھر کھانا کھا کر سو جانا۔'' مرد نے کہا تو میں سیدھا باتھ روم کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

میں نیند سے بیدار ہوا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ روبندر سنگھ کمرے میں موجود تھا۔ میں تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہ مرد کمرے میں آیا، اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ اس میں چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے وہ ٹرے میز پر رکھی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''چائے پئیں۔''

میں نے پیالی اٹھائی تو روبندر نے بھی اٹھائی۔ مجھے اس کا رویہ تھوڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ شاید کچھ اسرار تھا یا وہ مجھ سے کچھ چاہتا تھا۔ میں بھی خاموش رہا کہ دیکھیں وہ کیا چاہتا ہے۔

''مجھے نہیں معلوم آپ یہاں کیوں آئے ہیں لیکن آپ جو چاہیں گے آپ کو مدد ملے گی۔ میرے ساتھ طے یہ ہوا ہے کہ ہر ممکن مدد دوں گا، لیکن میرا ایک کام کرنا ہوگا۔'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ میری مدد کو چھوڑیں، اپنا بتائیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہ جس گھر میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں نا، یہ میرا ذاتی گھر ہے۔ یہاں جو عورت آپ نے دیکھی ہے، سمجھ لیں یہ میری دوسری بیوی ہے۔ میں نے آپ کے تھوڑی دیر یہاں پر ٹھہرنے کا بندوبست اس لیے کیا کہ میں آپ سے یہیں بات کرلوں، پھر شاید ہمارا آمنا سامنا نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''فرید کوٹ میں میرا اچھا بھلا کاروبار ہے، زمینداری ہے۔ پہلے پہل کچھ غنڈوں نے مجھ سے بھتا لینا شروع کر دیا، پھر دو چار برسوں میں ہی لاکھوں سے کروڑوں تک جا پہنچا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ بھلے مجھے کچھ بھی نہ ملے، لیکن ان کا صفایا ہونا چاہیے۔ بس یہی......'' اس نے انتہائی نفرت

سے کہا۔

''آپ کی ایسی کون سی مجبوری تھی، جس کی وجہ سے......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''صرف یہ کہ میں راکیش ورما کے خلاف تھا۔ سمجھ لیں ہماری دشمنی کالج دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ جیسے ہی وہ منتری بنا اس نے مجھے قلاش کر دینے کی سزا دی، اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔'' اس نے صاف بتا دیا۔

''آپ میری کہاں تک مدد کر پائیں گے اور کیسے؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا تو وہ بولا۔

''جیسی مدد بھی چاہیں گے۔ میں ہر اس بندے کو جانتا ہوں جو راکیش ورما کے خلاف ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن جب ہر بندہ مجھے جانے گا تو میرا پتا فوراً نہیں لگ جائے گا کیا؟''

''ارے نہیں صاحب، میں نے سب کو بتانا تھوڑی ہے، مجھے تو خود آپ سے نہیں ملنا، بھی سامنے نہیں آنا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو میں رابطہ کس سے رکھوں گا، کیا فون پر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ تھوڑا اعتماد سے بولا۔

''یہ روبندر کس لیے ہے، اسی لیے تو ہے۔ دوسرا میرا نمبر رکھیں اپنے پاس، اگر ضرورت ہو تو کال کر لیں، ایسی بھی گئی گزری بات نہیں۔''

''اوکے......'' میں نے حتمی لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی یہی بزدلی تھی جس نے اسے کنگال کر دیا۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت سے کام لیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ مگر میرے دماغ میں یہ بات اتر نہیں رہی تھی۔ ایک آدمی جس کے پار ملک میں رابطے ہوں، وہ میرے جیسے غیر قانونی طور پر آنے والے بندے کو بھی سنبھال لینے کا حوصلہ رکھتا ہو، تو...... یہی وہ سوال تھا جس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ہم چائے پی چکے تھے۔ تبھی میں نے روبندر سنگھ سے پوچھا۔

''ہاں جی، آپ میرے ساتھ چلو گے؟''

''مجھے آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اب بھائی سمجھ لو یا ملازم۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''بھائی ہو تم میرے، چل اب نکلیں۔''

راجووالا سے نکل کر ہم فرید کوٹ کی طرف چل پڑے۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم پارو کالونی پہنچ گئے۔ فرید کوٹ میں یہی ہمارا ٹھکانا تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا۔ جب میرا اسیل فون بجا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔ وہ ریتو کا فون تھا جسے میں نے اپنی آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح تقریباً پندرہ گھنٹے کا سفر کر کے فرید کوٹ پہنچ گئی تھی۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔

''کدھر ہے؟''

''تمہاری لوکیشن پر پہنچ گئی ہوں۔ باہر چھاکو سڑک پر ہوں۔''

''اوکے، میں آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور جلدی سے نیچے جانے کے لیے کمرے سے نکلا، میں ابھی سیڑھیوں پر ہی تھا کہ روبندر تیزی سے نکلتے ہوئے بولا۔

''کیا ہوا؟''

''ایک دوست آئی ہے یار۔'' میں نے کہا اور باہر جانے کے لیے داخلی دروازے کی جانب بڑھا۔ میں پورچ میں آ گیا تھا کہ روبندر نے بڑھ کے بیرونی گیٹ کھولا، تب تک میں پہنچ گیا، باہر تھوڑے سے فاصلے پر ایک فور وہیل کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ روبندر کو دیکھتے ہی فور وہیل آگے بڑھی۔ گیٹ کے سامنے آئی تو اس میں بیٹھی ہوئی ریتو دکھائی دے گئی۔ ''اندر لے آؤ۔''

میں لاؤنج میں آیا تو ریتو اندر داخل ہوئی۔ میں نے اسے دیکھ کر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ گرم جوشی سے میرے سینے سے آ لگی۔ اس کی گرفت سے اس کے جوش، خلوص اور خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہی بوائے کٹ بال، گول چہرے پر موٹے نین نقش، ناک تھوڑا بیٹھا ہوا، موٹے سرخ ہونٹ، آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن پر چتون بنی ہوئی، سفید رنگ لیکن اب اس کا جسم پتلا نہیں کافی صحت مند ہو گیا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے دبے دبے جوش سے پوچھا۔

''تھوڑا بہت بدلی ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے۔

''او یے دل نہ بدلیں، باقی سب ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو روبندر کے ساتھ ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی بولی، ''یہ مینا ہے، ہر فن مولا کہہ لو۔ ہمارے

pklibrary.com

ساتھ رہے گی۔"

"چلو اب، تم بہت لمبی ڈرائیونگ کر کے آئی ہے، آرام کرلو۔"

"مجھے بس سونا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آئیں۔" رویندر نے کہا تو وہ جانے لگی پھر ایک دم رک کر بولی۔ "رانی جی کا نہیں پوچھو گے؟"

"ہاں، کیسی ہے وہ؟" میں نے دھیمے سے پوچھا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی۔

"جو میٹھا روگ دے آئے تھے نا اُسے، اسی میں جل رہی ہے۔"

"چل دیکھ لیں گے وہ بھی، تم آرام کرو۔" میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

میں ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو حیران رہ گیا، وہ بملا کا فون تھا، میں نے کال ریسیو کی تو وہ ترنت بولی۔

"ابے سالے راج ویر، تم بھارت میں آ گئے ہو اور مجھے بتایا ہی نہیں تم نے، کیا چھپ جاؤ گے مجھ سے تم؟"

"کس نے کہا تمہیں، میں بھارت میں ہوں۔" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا تو وہ ایک دم سے غصے میں بولی۔

"تو ساری دنیا کو دھوکا دے سکتا، مجھے نہیں، وعدہ بھول گیا ہے کیا۔"

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں بھارت آ گیا ہوں، تو یہ بھی پتا ہوگا کہاں ہوں؟" میں نے پُرسکون انداز میں پوچھا تو بولی۔

"دس گیارہ گھنٹے کے سفر پر، فرید کوٹ میں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ویسے ہی تمہیں چیک کیا، دو دن ہوئے رابطہ نہیں کیا تم نے تو مجھے پتا چلا، بتا کب مل رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بس بہت جلد۔" میں حسرت بھرے انداز میں بولا۔

"چل اب تیرے ساتھ رہوں گی، خود پہنچوں گی تجھ تک۔" اس نے کہا۔ میں تھوڑی دیر اس سے باتیں کرتا رہا، پھر سو گیا۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں، ریتو اور رویندر سنگھ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نینا ہمارے سامنے چائے رکھ کر جا چکی تھی۔ میں نے ایک سپ لیا تو ریتو نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"اب تک جو ہماری ریسرچ ہے، اس میں راکیش ورما، اسی طرح ایک مہرہ ہے جیسے پرتاپ سنگھ تھا۔ اس وقت راکیش ورما سیاست میں تو ہے لیکن کسی سرکاری گدی پر نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس بارے دو باتیں سامنے آئی ہیں، ایک تو اس کی مخالفت بہت زیادہ ہونا شروع ہو گئی ہے پارٹی کے اندر سے، اس نے کچھ زیادہ ہی لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ دوسری وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی زیرِ زمین کام پر لگ گیا ہے۔ وہاں اس کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ اب سچ کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔"

"ریتو..... وہ ہوتا کہاں ہے؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"اس کے زیادہ تر تین ٹھکانے ہیں، ایک چندی گڑھ، جہاں اس کی سیاست ہے، دوسرا فرید کوٹ یہاں بہت کم آتا ہے اور تیسرا ان کے درمیان ہے لدھیانہ..... جہاں سے وہ اپنے کالے دھندے دیکھتا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کہاں پر ہاتھ ڈالنا چاہیے؟" میں نے یونہی ایک خیال کے تحت پوچھا تو وہ ذرا سوچ کر بولی۔

"کہیں پر بھی ہاتھ ڈالو گے تو وہیں سے اس کی پشت پناہی کرنے والی تنظیم "کلیان جی" تمہارے پیچھے لگے گی۔ ایک طوفان اٹھ جانا ہے، جس کا بہر حال مقابلہ کرنا پڑے گا۔" اس نے صاف لفظوں میں صورتِ حال بتا دی۔

"میں نے سنا تھا اس کلیان جی نامی تنظیم کا بڑا اودھے پور کا ہے، کلیان آنند، وہ پتایا میں ہے اور اس....." میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"ایسا ہی ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ جو پتایا والا بندہ تھا نا وہ مر گیا ہے، بلکہ پتایا سے بات ہی ختم ہو گئی ہے اس ساری تنظیم کی۔ اب وہاں اس کا کوئی بڑا نہیں ہے۔ جو ہے وہ یہیں بھارت میں، وہی سب دیکھتا ہے، زیادہ گمان یہ ہے کہ یہاں کی بھارتی ایجنسی ہی اسے بغل بچہ تنظیم کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔"

"میں ایک چھوٹی سی بات کہوں؟" اچانک رویندر سنگھ نے کہا۔

"ہاں ہاں بولو۔" میں نے کہا۔

"یہاں پر اُسے لانا ہے تو اس کے کسی اپنے کو ختم کرنا ہوگا، کریا کرم کے لیے تو آئے گا نا، یہیں بس کام کر دیں گے

اُس کا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''صرف راکیش ورما کو نہیں مارنا رویندر.....'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو پھر.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم دیکھتے جاؤ۔'' میں نے کہا پھر لمحہ بھر رک کر ریتو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب ایک ہی طریقہ ہے، مارو اور بھاگ جاؤ۔ اس وقت تک، جب تک ہم سامنے نہیں آجاتے، ایسے ہی وار کرتے رہیں۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''بالکل مناسب یہی ہے، بہت سوچ کر اور بڑے سکون سے کسی بڑے کو ختم کیا جائے۔'' ریتو نے میری بات کی تائید کردی۔

''اب رویندر، تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ تم یہاں سے وہ بندہ دیکھو جو راکیش ورما کا سب سے بڑا مخالف ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو کئی سارے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور اس کے سب سے قریبی شخص کی معلومات؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی مل جائے گی۔ تھوڑی دیر میں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تو پتا کرو، اور بتاؤ، پھر پلان کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ وہ اٹھ کر چل دیا۔ میں اور ریتو یونہی اس بارے میں باتیں کرنے لگے۔

اس وقت ہم ڈنر سے فارغ ہو چکے تھے۔ رات لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہمارے پاس ابھی تک کوئی ایسی معلومات نہیں پہنچی تھی جس سے میں کوئی اپنا راستہ اپنا سکتا۔ میرے اردگرد کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انتارش تو کسی کو بھی متوجہ کر سکتا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ بس ریتو ہو گی اور میں، بظاہر میاں بیوی کے دکھاوے سے رہیں گے۔ یہاں تک کہ کوئی خاص ٹاسک نہیں مل جاتا۔ میں یہاں فرید کوٹ میں کوئی رہائش کرنے تھوڑی آیا تھا۔ رویندر سنگھ سرِشام ہی باہر نکل گیا تھا جو اَب تک نہیں لوٹا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا مگر بے چین تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کمرے سے باہر نکلوں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، اس کے ساتھ ہی ریتو اندر آ گئی۔ وہ ہمیشہ مجھے ایک کمزوری عورت لگی تھی، جیسے عورت ہوتے ہوئے بھی اس کے اندر نسوانی احساسات نہ ہوں۔ اس نے گہرے رنگوں کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، اسی مناسبت سے بڑا آنچل تھا۔ اسی رنگ کی مناسبت سے گہری لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ یہ سب معمول سے ہٹ کر تھا۔ بلاشبہ یہ تھوڑا سا ہٹ کر تھا اور حیران کن تھا۔ وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے آئی اور بیڈ کے ساتھ دھرے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ریتو، خیریت؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھے جواب دیتی، میرا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے اسکرین کو دیکھا پھر کال ریسیو کر لی۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری جانب وہی شخص تھا جس نے دو دن پہلے فلنگ اسٹیشن پر مجھ سے بات کی تھی۔

''علی زین ہی بات کر رہے ہو نا؟''

ایک دم سے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ چلو وہاں تو ٹھیک تھا اس نے بات کر لی، مگر یہاں وہ کیسے بات کر رہا تھا؟

''ہاں بولو، کیا بات ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تم نے میرے فون کو سیریس نہیں لیا۔'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں تحکمانہ انداز میں کہا۔

''یار میں تمہیں جانتا ہی نہیں، خود اپنے بارے میں بتاتے ہو، نہ ہی کوئی اچھی بات کرتے ہو، میں کیا جواب دوں تمہیں؟'' میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''کیا پوجا کا حوالہ کافی نہیں تھا؟ کہاں ہے وہ؟''

''میرا خیال ہے تم فلمیں کچھ زیادہ ہی دیکھتے ہو، اس لیے.....''

''شٹ اَپ.....'' اس نے سرد لہجے میں کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولا۔ ''یہیں رہنا، میں پہنچ رہا ہوں تم تک۔''

''کیا مطلب، تم.....؟'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''مطلب میں ابھی آ کر سمجھاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس کی آواز معدوم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کال ڈراپ ہو گئی۔

'یہ کیا ہوا..... اُسے میرے بارے میں کیسے پتا.....، وہ کیسے مجھ تک پہنچ رہا ہے؟' یہ سوچتے ہی میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

گردشِ دوراں

طاہر جاوید مغل

زندگی میں رونما ہونے والا کوئی ایک واقعہ بعض اوقات وہ پہلا پتھر ہوتا ہے... جس کے بعد زندگی کے شب و روز زخمی زخمی ہو جاتے ہیں... ایک ایسی ہی لڑکی کا دردناک ماجرا جو طوفانی گردشوں میں گھر چکی تھی... حالات کا تند و تیز ریلا ہر دن اسے بے دردی سے اٹھا کر پٹخ رہا تھا...

عمران جونیئر اور تابش کے لازوال کرداروں سے سجی تحریر کے سنسنی خیز موڑ.....

صوفیہ ایک نرم و نازک لڑکی تھی اور جتنی نرم و نازک تھی اتنی ہی حساس بھی..... یہ بات اب میرے لیے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ وہ کراچی کے باکسر کمانڈو سے خاموش محبت کرتی تھی۔ وہ بھی صوفیہ کی خاموش محبت میں گرفتار تھا۔ باکسر کمانڈو کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی مگر اُس میں کچھ خوبیاں بھی موجود تھیں۔ ایک کیس میں ملوث ہو کر کمانڈو قبائلی علاقے میں فرار ہو چکا تھا اور صوفیہ یہاں لاہور میں مصائب کا شکار تھی۔ وہ امیر زادے شاہد احمد کے چنگل میں

pklibrary.com

پھنسی ہوئی تھی۔ وہ شاہد احمد کی ضد بن چکی تھی، وہ ہر صورت اسے اپنی دُلہن بنانا چاہتا تھا۔ کچھ دن پہلے اس منہ زور نے اپنے گلے میں باقاعدہ دولھا والا ہار ڈال لیا تھا اور بھری محفل میں صوفیہ سے زبردستی نکاح پڑھانا چاہا تھا۔ خطرناک قاتل ولا اور عرف تیزاب اس زبردستی کے نکاح میں شاہد کا مددگار بنا تھا۔ اس واقعے میں دونوں کو منہ کی کھانا پڑی تھی مگر وہ بدستور گھات لگائے ہوئے تھے۔

میں صوفیہ اور اس کے گھر والوں کو ڈرانا نہیں چاہتا تھا مگر انہیں پوری طرح محتاط کرنا بھی ضروری تھا۔ میں عمران جونیئر کو لے کر صوفیہ کے گھر پہنچا تو صوفیہ کے ڈرے سہمے والد حیات صاحب نے دروازہ کھولا اور ہمیں گھر کی چھوٹی سی بیٹھک میں بٹھایا۔ کچھ دیر بعد چادر میں لپٹی لپٹائی صوفیہ بھی آ گئی۔ اُس کا چہرہ زرد پھول کی طرح تھا جس پر آنسو، اوس کے قطروں کی طرح لرز رہے تھے۔ حیات صاحب نے اسے اپنے پہلو سے لگا کر اس کا ماتھا چوما اور گلوگیر آواز میں بولے۔ ''میری بچی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا اور میں اسے اپنے بازوؤں میں چھپا کر کہیں بہت دور لے جاتا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح کھانسنے لگے اور ان کا جسم خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ صوفیہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ''ابو جی! پانی لاؤں؟''

''نہیں، نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے اپنا کمزور سینہ سہلاتے ہوئے کہا اور صوفیہ کو دوبارہ اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اسی دوران میں صوفیہ کی والدہ بھی اندر آ گئیں۔ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو چند لمحے پہلے حیات صاحب نے کہی تھی کہ جی چاہتا ہے یہ محلہ ہی نہیں، یہ شہر بھی چھوڑ کر کہیں دور نکل جائیں۔

عمران جونیئر نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''انکل حیات! ہم یہی گزارش کرنے کے لیے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ فی الوقت آپ لوگوں کے لیے سب سے محفوظ جگہ یہی چار دیواری ہے۔ انشاء اللہ یہاں کوئی آپ کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکے گا۔ میں ہر وقت آپ کی طرف سے باخبر ہوں۔ چاچو بھی ہر پل کی اطلاع رکھ رہے ہیں۔''

حیات صاحب نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ''ہیرو بیٹا! ہمیں پتا ہے کہ تیرے ہوتے ہوئے، وہ مشاہد احمد اس محلے کے پاس سے بھی نہیں گزر سکتا لیکن وہ اُس کا بدمعاش یار تیزابا..... سب ہی کہتے ہیں کہ وہ بڑا وحشی بندہ ہے۔ اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی اور اس نے قسم کھائی ہے کہ صوفیہ.....'' حیات صاحب کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکے۔

بہرحال ان کی بات میری اور عمران کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ پچھلے ہفتے سے یہ افواہ یا خبر گردش کر رہی تھی کہ مفرور تیزابے نے حلفاً کہا ہے کہ وہ صوفیہ کو اپنے یار مشاہد کی سیج پر بٹھا کر چھوڑے گا۔

میں نے اور عمران نے ایک بار پھر صوفیہ اور اس کے اہلِ خانہ کو ہر طرح کی تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ اس محلے میں رہتے ہوئے کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ تیزابا بھی زیادہ دیر قانون کی گرفت سے بچ نہیں پائے گا۔

☆☆☆

دس پندرہ روز مزید گزر گئے تو مشاہد اور اس کے پشت پناہ تیزابے کے حوالے سے افواہوں اور خبروں کا زور ٹوٹ گیا۔ ویسے بھی عمران کی عقابی نگاہیں ہمہ وقت صوفیہ اور اس کے گھر والوں کی نگران تھیں۔ اس نے اپنے دو قابلِ اعتماد دوستوں کو مسلسل صوفیہ کے گھر کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔ میں نے بھی سادہ لباس میں اپنے ایک ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل کو وہاں مقرر کر دیا تھا۔ وہ رات کے وقت اس محلے میں بڑی چوکسی کے ساتھ موجود رہتا تھا۔

ایک روز کی بات ہے میں اپنی پرائیویٹ گاڑی پر پولیس ہیڈ کوارٹر سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ رات کوئی نو بجے کا وقت تھا۔ ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے سردی میں اضافہ محسوس ہوتا تھا۔ میں فیروز پور روڈ پر پہنچا تو اچانک گاڑی بند ہو گئی۔ اچھی بھلی کار تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی مسئلہ کیا ہو۔ میں نے کافی کوشش کی مگر اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ پھر بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں مجھے اپنے بالکل قریب گاڑی کا مسلسل ہارن سنائی دیا۔ مڑ کر دیکھا تو حیرانی ہوئی۔ ماہین اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اپنی سفید کار میں موجود تھی۔ مزید حیرانی یہ ہوئی کہ عمران جونیئر بھی ان کے ساتھ تھا۔ ماہین ڈرائیو کر رہی تھی۔ کھڑکی سے ہاتھ نکال کر چیخی۔ ''انکل تابش! یہ اچھی بھلی گاڑی کیسے ناراض ہو گئی آپ سے؟''

عمران کے ساتھ ماہین کا بوائے فرینڈ حشام بھی گاڑی سے باہر آ گیا تھا۔ عمران نے گاڑی کے انجن سے چھیڑ چھاڑ کی لیکن اس نے اسٹارٹ ہو کر نہیں دیا۔ فیصلہ ہوا کہ گاڑی کو یہیں سڑک کنارے چھوڑ کر مکینک کو یہاں بھیج دیا جائے۔ میں ان تینوں کے ساتھ ماہین کی سفید کار میں آ بیٹھا۔ مجھے از حد حیرانی ہو رہی تھی کہ دو شیر اور ایک بکری ایک گھاٹ پانی

پی رہے ہیں۔ میرا مطلب، عمران، ماہین اور اس کے بوائے فرینڈ حشام سے تھا۔ عقدہ یہ کھلا کہ ماہین نے ان دونوں کو ''ہائی ٹی'' کی دعوت دی تھی۔ اب وہ تینوں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ''چائے وائے'' پی کر آرہے تھے۔

درحقیقت عمران کی دلیری اور ہمت نے ان دونوں کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ خاص طور سے میں نے ماہین کی نگاہوں میں اکثر عمران کے لیے ستائش دیکھی تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہ صورتِ حال ماہین کے بوائے فرینڈ کو پسند نہیں تھی مگر فی الحال تو وہ ماہین کی ہاں میں ہاں ملاتا نظر آتا تھا۔

اب کار میں عمران اور میں پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ حشام کو میں نے ماہین کے ساتھ اگلی نشست پر بٹھا دیا تھا۔ عمران نے ان دونوں کی آنکھ بچا کر مجھے مُکّا دکھایا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ ''چاچو، اگر تم ماہین کے ساتھ آگے بیٹھ جاتے تو میری جلن کڑھن میں تھوڑی سی کمی واقع ہو جاتی۔ بڑے بے حس ہو تم۔''

''اب کہاں جا رہے تھے تم لوگ؟'' میں نے ماہین سے پوچھا۔

''عمران صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔'' ماہین بولی۔

''ارے، یہ عمران بےچارہ تمہارے لیے صاحب کیسے ہو گیا؟'' میں نے کہا۔

''جب سے میں نے بلکہ ہم دونوں نے عمران صاحب کو سمجھنا شروع کیا ہے۔ سچی بات ہے کہ عمران صاحب چھپے رستم ہی نکلے ہیں..... کیوں حشام؟'' اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے تائید چاہی۔

حشام کے چہرے پر سرخی سی لہرائی پھر سنبھل کر بولا۔ ''لیکن عمران کے ساتھ ''صاحب'' ذرا جچا نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ماہین نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ صاحب سے ذرا تکلف کی بُو آتی ہے نا۔'' اس نے بات بنائی۔

''حشام! بالکل ٹھیک کہتے ہو۔'' عمران اسٹارٹ ہو گیا۔ ''عمران صاحب کے بجائے عمران مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے بلکہ اسکول، کالج میں مجھے ساتھی عمانو... بلکہ اکثر صرف مانو کہا کرتے تھے۔ اوئے مانو..... یار مانو... ایہ اتنا سا کام کر دو..... اور میں اکثر ''مان'' جاتا تھا..... ہاں لڑکیوں کی بات اور ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟'' ماہین نے پوچھا۔

''جب لڑکیاں کہتی تھیں مانو..... تو میں بالکل نہیں مانتا تھا۔ یعنی سنتا ہی نہیں تھا۔ کئی لڑکیوں نے کہا مانو..... بلکہ ایک دفعہ تو ایک لڑکی کی ماں نے بھی اکیلا دیکھ کر کہا مانو..... لیکن میں نہیں مانا۔ بھاگ آیا۔ اس نے جھپٹا مارا، میری قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ بعد میں اس نے مجھ پر الزام لگانے کی کوشش کی۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں، مرد کی قمیص یا واسکٹ وغیرہ پیچھے سے پھٹی ہو تو قصور عورت کا ہی ہوتا ہے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟''

ماہین بے ساختہ ہنسنے لگی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''بڑے دلچسپ ہو عمران۔''

''شکر ہے اب آپ نے ساتھ ''صاحب'' نہیں لگایا۔ آپ مجھے بے دھڑک ہو کر عمران بلکہ عمانو... یا مانو بھی کہہ سکتی ہیں۔''

وہ مسلسل ہنس ہنس کر سرخ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، نہیں۔ کوئی بھی لڑکی یہ مانو والا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''کوئی خطرہ نہیں مس ماہین، میں زندگی میں کبھی مانا ہی نہیں۔ چاچو اس بات کے گواہ ہیں۔''

حشام نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں بات صرف لڑکیوں کی ہی نہیں آپ ویسے ہی کسی کی نہیں مانتے۔ آپ کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کوئی فقرہ اُچھالتا۔ اس کی جیب میں فون کا میوزک سنائی دینے لگا۔ رُل تے گئے آں پرچس بڑی آئی اے۔ ''اوہ، کہیں مہوش حیات کا فون ہی نہ ہو۔'' وہ بڑبڑایا اور فون نکالا۔ اسکرین دیکھ کر وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ ''ہیلو، عمران بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سن کر عمران کی سنجیدگی بڑھ گئی۔ ''تم نے اچھی طرح چیک کر لیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ دوسری طرف کا جواب سن کر وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں دس منٹ میں۔'' فون بند کر کے وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟''

''صوفیہ اور اس کے گھر والے گھر سے غائب ہیں۔ گھر کا باہر والا دروازہ لاک ہے۔''

''کہاں گئے؟''

''پتا نہیں۔ بارش شروع ہونے سے پہلے بجلی غائب تھی۔ اب تک غائب ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑی خاموشی سے کہیں نکل گئے ہیں، یا پھر.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو

گیا۔

اس کے ادھورے فقرے کا تشویشناک مطلب میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کہیں اندھیرے اور موسم کا فائدہ اٹھا کر مشاہد اور تیزابے نے کوئی کارروائی نہ کر ڈالی ہو۔

ہم ابھی عمران کے محلے ندیم ٹاؤن سے دو تین کلومیٹر دور تھے۔ ''ماہین! رفتار تیز کرو۔'' میں نے کہا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

محلے میں سراسیمگی نظر آ رہی تھی۔ بوندا باندی میں لوگ مختلف چھجوں کے نیچے کھڑے حیات صاحب کے گھر ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باہر کا دروازہ لاک تھا اس لیے یہ خدشہ کم ہی محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کہیں زبردستی لے جایا گیا ہے، تاہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عمران نے کئی بار صوفیہ اور حیات صاحب کے نمبروں پر ٹرائی کی تھی لیکن ان کے موبائل خاموش تھے۔ بالآخر عمران دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا اور کسی طرح بیرونی دروازہ بھی کھول دیا۔ محلے کے ایک دو معزز افراد کے ساتھ میں بھی اندر داخل ہوا۔ گھر کے اندر افراتفری سی دکھائی دی۔ کئی الماریاں کھلی ہوئی تھیں۔ کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگ بہت جلدی میں گئے ہیں..... یا لے جائے گئے ہیں۔ فریج آف تھا۔ ایک کے سوا باقی لائٹس بھی آف تھیں۔

''کچھ سمجھ میں آیا چاچو جی؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں۔''

اسی دوران میں عمران کا ایک ساتھی ضیا تیز قدموں سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہیرو بھائی! ایک سی سی ٹی وی میں وہ لوگ نظر آئے ہیں۔''

ہم بھاگم بھاگ ایک چھوٹی گلی سے گزر کر ساتھ والی گلی میں پہنچے۔ اسے خواجہ اسٹریٹ کہا جاتا تھا۔ یہاں کی لائٹ بحال ہی رہی تھی۔ اسی اسٹریٹ کے کارنر پر ایک تین منزلہ مکان پر سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔ یہاں ''عمران ہیرو'' کو سب جانتے تھے۔ ہر کوئی مدد پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ہم نے گھر کے اندر جا کر سی سی ٹی وی کی فوٹیج دیکھی اور چونک گئے۔ صوفیہ کے والد صاحب صاف پہچانے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ چادروں میں لپٹی ہوئی دو خواتین تھیں۔ ان میں سے ایک یقیناً صوفیہ اور دوسری اس کی والدہ تھیں (صوفیہ کا بھائی شہر سے باہر تھا) حیات صاحب نے ایک چھوٹا اٹیچی اٹھا رکھا تھا۔ غالباً صوفیہ کے پاس بھی اٹیچی یا بیگ قسم کی کوئی شے تھی مگر وہ چادر کے نیچے تھی۔ وہ بڑی جلدی میں نظر آتے تھے۔ کیمرے نے انہیں گلی کے اس موڑ تک دکھایا جہاں سے آگے بڑی سڑک شروع ہوتی تھی۔

عمران کا ساتھی ضیا بولا۔ ''ہیرو بھائی! آج صبح ہی چچا حیات، کریانے والے مجید سے پوچھ رہے تھے کہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کو کون سی سواری جاتی ہے۔''

عمران نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ فوٹیج پر جو وقت آ رہا تھا اس سے پتا چلا کہ صوفیہ اور اس کے والدین کو یہاں سے نکلے قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف گئے ہیں تو عین ممکن ہے کہ ابھی اسٹیشن پر ہی ہوں۔

یہاں سے نکل کر بڑی غلطی کی تھی انہوں نے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مشاہد احمد کی حالت زخمی سانپ جیسی ہے۔ صوفیہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بے طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت اس کے خطرناک ساتھی تیزابے کی بھی تھی۔ ان دونوں کے گماشتے یقیناً تاک میں تھے۔ لاہور میں یا لاہور سے باہر کسی دوسرے شہر میں صوفیہ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں اور عمران بھاگتے ہوئے واپس کار تک آئے۔ ماہین ابھی تک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ حشام کار کے قریب ٹہل رہا تھا۔ ''کیا بنا انکل؟'' ماہین نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہمیں فوراً ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔ لگتا ہے کہ وہ لوگ اُدھر ہی گئے ہیں۔''

جوں ہی ہم بیٹھے ماہین نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ بڑی سڑک پر پہنچ کر ہم کوئی ٹیکسی وغیرہ پکڑ لیں گے مگر ماہین نے کہا کہ نہیں، وہی لے کر جائے گی۔

میری توقع کے برخلاف اس نے کافی تیزی اور مشاقی سے ڈرائیونگ کی۔ وہ کئی طرح سے ایک پُرجوش لڑکی تھی۔ مارشل آرٹ تو اس کا شوق تھا ہی وہ ایک یوٹیوب چینل سے بھی وابستہ تھی اور اس چینل کے لیے نیوز رپورٹنگ بھی کرتی رہتی تھی۔ اکثر ایک چھوٹا مگر جدید کیمرا اس کی گاڑی میں رہتا تھا۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی خدشہ پیدا ہوتا ہے اور وہ آناً فاناً حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ کر مختلف پلیٹ فارمز پر دیکھ رہے تھے کہ اچانک میرے سیل

فون پر ایک میسج آیا۔ پولیس کے وائرلیس نیٹ ورک پر ایک پیغام چل رہا تھا۔ بس اڈا بادامی باغ کی طرف ایک سنگین واردات ہوئی تھی۔ ایک ٹیکسی کار پر فائرنگ ہوئی تھی۔ دو افراد کے ہلاک اور ایک کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے ایس ایچ او زبیر کو فون کیا۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''ڈی ایس پی صاحب! میں آپ ہی کو کال ملانے والا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ منٹو پارک کے قریب جن لوگوں پر حملہ ہوا ہے یہ وہی ہیں جن کو آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔''

ریلوے اسٹیشن سے بس اڈے کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ بارش کی وجہ سے ٹریفک بھی بہت کم تھا۔ ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ ایک ذیلی سڑک پر درختوں کے درمیان ایک ٹیکسی کار ایک باؤنڈری وال سے ٹکرائی ہوئی تھی۔ اندر دو نہیں، تین لاشیں پڑی تھی۔ ایک صوفیہ کے والد حیات صاحب کی تھی، دوسری صوفیہ کی والدہ کی..... اور تیسری بے چارے ٹیکسی ڈرائیور کی۔

حیات محمد صاحب اور ان کی شریکِ حیات کو سر میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ حیات صاحب کو ایک گولی سینے میں بھی لگی تھی۔ اسی طرح ڈرائیور کو بھی ایک گولی سینے میں لگی تھی۔ ٹیکسی کی کھڑکیوں پر بھی گولیوں کے نشان تھے۔ نشستوں پر خون پھیلا ہوا تھا۔ میں حیات صاحب کی لاش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کل کی بات ہے وہ اپنے گھر میں اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے پہلو سے چمٹائے بیٹھے تھے اور ہماری باتیں سن رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر ماہین کا چہرہ دھواں ہونے لگا۔ حشام، لاشوں پر ایک خوف زدہ نگاہ ڈال کر دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

انسپکٹر زبیر وقوعہ کا جائزہ لے رہا تھا اور تصاویر وغیرہ بنوا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''سر! گاڑی کے اندر سے کچھ چیزیں ملی ہیں۔ یہ ایک لیڈیز سینڈل ہے اور یہ شولڈر بیگ۔ لگتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق حیات صاحب کی بیٹی سے ہے۔''

''کیا اسے اغوا کر لیا گیا ہے؟''

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی خوش قسمتی نے ساتھ دیا ہو اور وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔''

''کیوں..... کوئی ایسی شہادت ملی ہے؟''

''کچھ فٹ پرنٹ نظر آ رہے ہیں..... جو آٹھ دس میٹر دور تک گئے ہیں لیکن پھر پختہ جگہ پر اوجھل ہو گئے ہیں۔''

''کوئی عینی شاہد وغیرہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''عینی شاہد تو یقیناً ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ ہوں مگر ایسے موقعوں پر کون سامنے آتا ہے۔'' زبیر نے مایوسی سے سر ہلایا۔

یہ ایک اندوہناک واقعہ تھا جس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پتا یہی چل رہا تھا کہ بدقسمت حیات صاحب نے اپنی فیملی سمیت بذریعہ ریل جانے کے بجائے بس کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر ان کا ''اپنا سفر'' لاہور ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں کی دہشت ان کے عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ انہوں نے بیمار حیات محمد اور ان کی اہلیہ پر سیدھی فائرنگ کی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ اگر صوفیہ ان کے ہتھے چڑھ گئی ہے تو پھر اس کے بارے میں کوئی خوش فہمی رکھنا حماقت ہے۔ کاش حیات صاحب نے ہماری گزارشات پر عمل کیا ہوتا۔ ہم نے بہت زور دے کر ان سے کہا تھا کہ وہ اس محلے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ کچھ دنوں کے لیے صرف گھر تک ہی محدود رہیں۔ ان کے بڑھے ہوئے خوف نے انہیں گھر سے نکالا تھا اور اس مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں موقع واردات کی سی سی ٹی وی فوٹیج مل گئی۔ نیم تاریکی میں یہ ایک ادھوری فوٹیج تھی۔ بہرحال اس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ منٹو پارک کے قریب تہرے قتل کی لرزہ خیز واردات کرنے والے وہی تھے جو ہاتھ دھو کر صوفیہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، یعنی مشاہد احمد اور تیز ابا۔ انہوں نے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے، تاہم ٹوپی اور مفلر کے ڈھاٹے میں چھپا ہوا مشاہد اپنے قد کاٹھ اور چال ڈھال سے صاف پہچانا جا رہا تھا۔ تیز ابے کا قد کاٹھ اور لباس بھی اس کی صاف نشاندہی کر رہا تھا۔ ٹیکسی پر آٹومیٹک رائفل سے ایک چھوٹا برسٹ بھی چلایا گیا تھا۔ مشاہد کی گرفت سے بچنے کے لیے صوفیہ ٹیکسی سے نکل کر بھاگی تھی، گری تھی، پھر اٹھی تھی۔ مشاہد اور ایک مسلح شخص اس کے پیچھے درختوں کی طرف لپکے تھے پھر وہ کیمرے کی رینج سے نکل گئے تھے۔ ہم نے کئی بار وہ فوٹیج چلا کر دیکھی اور اس سے جو کچھ اخذ کرنا تھا کر لیا۔

اب عمران بھی میرے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے ان اشیا کا جائزہ لیا جو ٹیکسی سے برآمد ہوئی تھیں۔ حیات صاحب کی ٹوٹی ہوئی عینک، ان کی دوائیں، صوفیہ کی والدہ کی تسبیح اور چھوٹا سا

بٹوا۔ صوفیہ کا سینڈل اور شولڈر بیگ جس پر خون کے چھینٹے تھے۔ شولڈر بیگ میں کئی دیگر اشیا کے علاوہ ایک چھوٹی سی ڈائری بھی تھی۔ اس ڈائری میں وہ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتی رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی حد تک ادبی ذوق بھی رکھتی ہے۔ تاہم یہ بڑا سلجھا ہوا ذوق تھا۔ کئی صفحات پر فیض، احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی وغیرہ کے اشعار درج تھے۔ ڈائری کا ایک صفحہ کافی قابلِ غور تھا۔ اس صفحے کی تحریر ایک ایسی لڑکی کی تحریر تھی جس کے لیے اپنے والدین کی عزت و حرمت بے حد اہم ہے۔ وہ ایک مشرقی لڑکی کی مجبوریوں کو بھی پوری طرح سمجھتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے کسی انہونے جذبے کو ہرگز سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتی۔ وہ یہ بھی سوچتی ہے کہ جس گاؤں کی طرف جانا ہی نہیں اس کا راستہ پوچھنے کا کیا فائدہ..... وغیرہ وغیرہ۔

نجانے کیوں، صوفیہ کی یہ مختصر سی تحریر پڑھ کر میرا دھیان خود بخود کراچی کے بدنام باکسر شاہنواز عرف کمانڈو کی طرف چلا گیا۔ یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ایک نہایت شریف گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ شاہنواز کمانڈو کے لیے کچھ خاص اور خاموش جذبات رکھتی تھی۔ اب وہ اپنے ان جذبات اور اپنی تمام تر معصومیت سمیت مشاہد احمد جیسے منتقم المزاج امیرزادے کے قبضے میں تھی۔ یہ امیرزادہ اب پوری طرح تہرے قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور اپنے ہم نوالہ و پیالہ تیزابے کی طرح راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ یہ انتہائی مخدوش صورتِ حال تھی۔ اس تہرے قتل پر میڈیا نے بریکنگ نیوز لگائی تھی اور شہر میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ حیات محمد اور ان کی اہلیہ کی اس دردناک موت نے ندیم ٹاؤن اور اردگرد کی گلیوں میں سوگ اور ہراس کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

رات کے پچھلے پہر پتا چلا کہ ہمارے ایس ایس پی ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہوں نے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کئی چھاپا مار پارٹیاں ترتیب دے دی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بھی فون پر رابطہ کیا۔ اس واقعے کی ساری تفصیلات مجھ سے دریافت کیں اور حکم دیا کہ میں تفتیش اور گرفتاری میں اپنا پورا کردار ادا کروں۔ (وہ نہ بھی کہتے تو مجھے یہ کردار ادا کرنا ہی تھا) ایک طرح سے مشاہد اور تیزابے والا معاملہ میرا اور عمران کا ذاتی معاملہ بن چکا تھا۔ ہم نے ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا اور اب انہوں نے ہمارے پتھر کا جواب پگھلے ہوئے سیسے سے دے دیا تھا۔ وہ سیسہ جس نے ایک ڈرے سہمے معمر جوڑے کی جان لی تھی اور ایک بے گناہ لڑکی کو کانٹوں کی سیج پر پہنچا دیا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت مختلف ٹی وی چینلز پر یہ نیوز چلی کہ حملہ آور واردات کے بعد مغویہ کے ساتھ شیخوپورہ کی طرف فرار ہوئے ہیں۔

یہ تیسرے روز دوپہر کی بات ہے۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ عمران بھی میرے ساتھ تھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ ہمیں لاشوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دیگر شواہد کا انتظار تھا۔ اسی دوران میں انسپکٹر زبیر کا فون آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ لاہور سے تقریباً پچاس کلومیٹر آگے حافظ آباد جانے والی سڑک پر ایک اور واقعہ ہوا ہے۔ ہائی وے پر ایک تیز رفتار ٹویوٹا کار سڑک سے اتر کر درخت سے جا ٹکرائی ہے۔ اس کا گیس سلنڈر پھٹا ہے اور وہ ایک شخص سمیت جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ شواہد سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ مشاہد احمد کی ملکیتی گاڑیوں میں سے ایک ہے۔

یہ بے حد اہم اطلاع تھی۔ اسے ایک سراغ بھی کہا جا سکتا تھا۔ کم از کم اس سے اتنا اندازہ تو ہوتا ہی تھا کہ مجرموں کا رخ کس جانب ہے۔ میں اور عمران جونیئر صرف ڈیڑھ گھنٹے میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ شیخوپورہ سے فقط دو تین میل آگے ہائی وے کے ساتھ ایک ذیلی سڑک تھی۔ مسلسل بوندا باندی کی وجہ سے سڑک پر پھسلن بھی موجود تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گاڑی تیز رفتاری کے سبب بُری طرح لہرانے کے بعد سڑک سے اتری ہے اور تناور درخت سے ٹکرانے کے بعد اس میں آگ لگ گئی ہے۔

اس جگہ پر ہمیں ایک موقع کا گواہ بھی میسر آ گیا۔ یہ ایک کھیت مزدور تھا جو کچھ فاصلے پر مویشیوں کو بارش سے بچانے کے لیے ایک چھپر تلے باندھ رہا تھا۔ اس نے دھماکے کی آواز سنی۔ دھماکے کی آواز سے اس کی ایک بھینس بھاگ نکلی۔ جب وہ اسے دوبارہ پکڑ کر اور کھونٹے سے باندھ کر موقع پر پہنچا تو گاڑی کو آگ لگ چکی تھی اور ایک لمبا شخص جس نے چادر کی بُکل مار رکھی تھی، ایک لڑکی کو بازو سے پکڑ کر درختوں کی طرف لے جا رہا تھا۔ لڑکی ایک دو دفعہ گری بھی مگر پھر وہ اسے لے کر گھنے ..... درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

''تم اس بندے اور لڑکی کو پہچان سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں زناب! میرے پہنچنے تک وہ کافی دور نکل گئے تھے۔ میں نے اُن کو پیچھے سے ہی دیکھا۔''

''کیا کسی اور نے بھی یہ حادثہ دیکھا؟'' عمران نے

پوچھا۔

''بعد میں تو کئی ساروں نے دیکھا ہے جی۔ پر شروع میں تین چار بندے ہی تھے۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی والا تھا جو جرا دیر کے لیے رکا تھا۔ دو تین موٹر سائیکلوں والے تھے۔''

ہم نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ کار کا ڈھانچا ابھی تک سلگ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص وہیں پر جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ اب ایمبولینس والوں نے اسے ایمبولینس میں رکھ کر اس پر چادر ڈال دی تھی۔ انسپکٹر زبیر بھی پہنچ گیا اور مقامی ایس ایچ او سے معلومات حاصل کیں۔

انسپکٹر زبیر نے کہا۔ ''سر! بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ لوگ جلد سے جلد کسی ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے۔ پولیس کا ڈر بھی تھا۔ گاڑی کنٹرول سے باہر ہوئی۔ ڈرائیونگ کرنے والا چوٹ سے مر گیا یا بے ہوش ہو گیا۔ مشاہد احمد اور مغویہ صوفیہ پچھلی نشست پر تھے اس لیے انہیں زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ مشاہد، صوفیہ کو کھینچ کر باہر لے آیا اور لوگوں کے پہنچنے سے پہلے اسے لے کر بھاگ نکلا۔''

عمران بھی بہت سنجیدہ تھا۔ اس کا کھلنڈرا پن دور، دور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مقامی ایس ایچ او سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مشاہد احمد مغویہ کے ساتھ یہاں سے فرار ہوا ہے۔ اگر اسے کوئی سواری نہیں ملی تو وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا اور اگر سواری ملی ہے تو پھر کسی مقامی شخص نے ہی اسے لفٹ دی ہوگی۔ آپ ان دونوں پہلوؤں پر غور کریں۔''

ایس ایچ او کی بڑھی ہوئی توند دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ پہلوؤں پر غور کرنے والا بندہ نہیں، مرغن خوراکوں پر غور کرنے والا ہے۔ بہرحال اس نے شدومد سے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور ہمیں پوری تسلی دی۔

اس کی تسلی کا انداز دیکھنے کے بعد ہم نے رات اسی علاقے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ بہ امر مجبوری ایس ایچ او رمضان نے تھانے کے ایک کمرے میں ہی ہماری شب بسری کا انتظام کر دیا۔

☆☆☆

اگلے چھ سات گھنٹے میں مقامی پولیس کے ساتھ مل کر ہم نے خود بھی کافی بھاگ دوڑ کی۔ اردگرد کے دو تین دیہات کو چھانا گیا۔ ایک قصبے سے دو مشتبہ افراد کو بھی پکڑا گیا۔ ان پر شک تھا کہ شاید انہوں نے مشاہد کو لفٹ دی ہو یا کم از کم اسے صوفیہ کے ہمراہ راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا ہو۔ بہرحال یہ کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔

رات تک مطلع صاف ہو گیا تھا مگر سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ دیہاتی آسمان پر تاروں کے جھرمٹ تھے۔ میں اور عمران پولیس اسٹیشن کے آرام دہ بلکہ پُرتعیش کمرے میں موجود تھے۔ ہم صوفیہ کے حوالے سے بہت غمزدہ تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ والدین کی ناگہانی موت دیکھنے کے بعد اب وہ بدترین حالات سے گزر رہی ہوگی۔

عمران نے کہا۔ ''چاچو! ہوسکتا ہے کہ گاڑی کے اندر جل جانے والا شخص وہ حرامی تیزاب عرف تیزابا ہی ہو؟''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر حقیقت کا پتا تو میڈیکل رپورٹ کے بعد ہی چل سکتا ہے۔''

''وہ تو کوئلہ ہو گیا ہے۔ میڈیکل رپورٹ کیا ہوگی۔ اگر کوئی ریکارڈ موجود ہوا تو شاید ڈی این اے سے پتا چل جائے۔''

پھر وہ ذرا سوچتے ہوئے بولا۔ ''ویسے چاچو! حادثے سے پہلے کار جس طرح سڑک پر لہرائی ہے..... وہ نشان کافی دور تک گئے ہیں۔''

''ہاں، یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ گاڑی کے اندر کوئی جدوجہد بھی ہوئی ہو۔ میرا مطلب ہے صوفیہ نے چلتی گاڑی میں مزاحمت کی ہو..... خود کو بُرے انجام سے بچانا چاہا ہو۔ اسی ہلچل میں گاڑی درخت سے جا ٹکرائی ہو؟''

میں نے دھیان سے اُس کی طرف دیکھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی کسی وقت بہت دور کی کوڑی لاتا تھا۔ ایسے میں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک انوکھی چمک نمودار ہوتی تھی۔

اتنے میں میرے فون پر ماہین کی کال آ گئی۔ وہ بھی بہت پریشان تھی۔ کیس کی موجودہ صورتِ حال جاننا چاہ رہی تھی۔ اس کے اندر جستجو کا مادّہ تھا اور ایک خاص قسم کی ہمدردی بھی اس کے اندر موجزن رہتی تھی۔ میں نے اسے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے عمران کا حال احوال بھی پوچھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اب عمران کو نوٹس کرنا شروع ہو گئی ہے۔ (چند ہفتے پہلے تک وہ اسے ایک مسخرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی)

میں نے ماہین سے کہا کہ وہ اس سارے معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ اپنے طور پر اس کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی مہم جوئی بھی اس کے لیے سخت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ماہین سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے عمران کی طرف دیکھا تو وہ بڑے دھیان سے اپنے اسمارٹ فون پر کچھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ یہ ندیم ٹاؤن کے دو تین سی سی ٹی

وی کیمروں کے کلپس تھے جو عمران نے اپنے موبائل میں محفوظ کیے تھے۔ کل بھی ہم ان طویل کلپس کو دھیان سے دیکھتے رہے تھے کہ شاید واردات کا کوئی سراغ ملے۔ عمران نے موبائل کی اسکرین میرے سامنے کرتے ہوئے ایک منظر پر انگلی رکھی اور بولا۔ ''چاچو! یہ دیکھو ذرا دھیان سے۔''

میں نے دیکھا، یہ ندیم ٹاؤن کے چھوٹے سے پارک کا منظر تھا۔ غالباً سہ پہر کا وقت تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔

''کچھ نظر آیا؟'' عمران نے پوچھا۔ پھر منظر کو ذرا ''زوم'' کر کے بولا۔ ''یہ دیکھیں۔ یہ بینچ پر ایک شخص بیٹھا ہے۔ صرف سائڈ نظر آرہی ہے۔''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ ایک لمبے بالوں اور داڑھی والا شخص تھا۔ دیہاتیوں کی طرح اس نے گرم چادر اپنے سر پر ڈال رکھی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔

عمران بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کو کچھ محسوس ہو رہا ہے یا نہیں۔ مجھے تو ہو رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ اس بندے کا ڈیل ڈول اور اس کے چہرے کی نظر آنے والی سائڈ باکسر کمانڈو کی طرح ہے۔''

اب میں بھی ذرا سا چونکا۔ عمران نے فوٹیج کو اسٹل کر دیا تھا لیکن منظر واضح نہیں تھا۔ درختوں کے سائے اسے مزید دھندلا رہے تھے۔ تاہم عمران کی بات سے کلی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مشابہت کی جھلک سی تو ضرور دکھائی دیتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اب باکسر کمانڈو کے بال لمبے ہو چکے ہوں اور اس نے داڑھی بھی رکھ لی ہو۔ مجھے اپنے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ مشاہد کے بھائی کے قتل کے بعد کمانڈو قبائلی علاقے میں مفرور تھا لیکن..... اگر وہ..... واپس آکر صوفیہ کے گھر کے قریب اس پارک میں بیٹھا ہوا تھا تو یہ بہت حیران کن بات تھی۔ یہ فوٹیج صوفیہ کے اغوا اور اس کے والدین کے قتل سے دو دن پہلے کی تھی۔ اگر اسے واقعی کمانڈو شاہنواز کی فوٹیج مان لیا جاتا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ کمانڈو بھی یہاں موجود ہے اور ہماری طرح وہ بھی صوفیہ پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ ہو چکا ہے پھر یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ ہماری طرح وہ بھی قاتلوں کے پیچھے ہو۔ فوٹیج پر کافی دیر تک غور کرنے کے باوجود ہم کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ صوفیہ سے عشق کرتا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ وہ اپنے بدلے ہوئے رنگ روپ کے ساتھ..... سارے خطرات کو بالائے طاق رکھ کر یہاں پہنچ گیا ہو..... صوفیہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے یہاں اس پارک میں آن بیٹھا ہو..... لیکن..... کم از کم اس فوٹیج سے تو اس کی لاہور میں موجودگی کنفرم نہیں ہوتی تھی۔

عمران نے اسی وقت لاہور میں اپنے دو قابلِ بھروسا دوستوں ضیا اور وحید کو فون کیا اور انہیں اپنے شبہے سے آگاہ کرنے کے بعد چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے بھی انسپکٹر زبیر کو اس حوالے سے الرٹ کیا۔

نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''اگر کمانڈو نے واقعی یہاں آنے کی حماقت کی ہے تو یہ اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اشتہاری مجرم ہے۔ گرفتاری اسے پھانسی کے پھندے تک بھی پہنچا سکتی ہے۔''

عمران بولا۔ ''بات تو یہ ٹھیک ہے..... لیکن عشق محبت میں حماقتوں کے بجائے عقل مندیاں اور دور اندیشیاں آجائیں تو پھر وہ ''عشق محبت'' ہی نہیں رہتا۔''

ہم صرف ایک رات کے لیے اس مضافاتی تھانے میں قیام کرنے کے لیے آئے تھے مگر ہم نے اگلے چار روز بھی وہیں پر گزارے۔ مقامی پولیس کے ساتھ مل کر اس علاقے کا چپا چپا چھانا، ہر چھوٹے سے چھوٹے اور غیر اہم سراغ کا پیچھا کیا لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ حملہ آور صوفیہ کو لے کر زمین کی ساتوں تہ میں اتر گئے ہیں۔ تیزاب کا بھی کہیں کھوج کھرا نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاش کا بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کس کی ہے۔ وہ لاش تھی بھی کہاں؟ بس سوختہ ہڈیوں کے کچھ حصے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ مشاہد احمد کا کوئی ساتھی تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی ہے، صوفیہ اور مشاہد ہیں کہیں اسی علاقے میں۔ پانچویں روز ہم شیخوپورہ کے اس نواحی تھانے سے واپس لاہور آگئے۔

☆☆☆

عمران کے محلے ندیم ٹاؤن میں فضا ابھی تک سوگوار تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد حیات محمد اور اہلیہ کی میتیں کراچی روانہ کر دی گئی تھیں۔ تاہم ان کی غائبانہ نماز جنازہ ندیم ٹاؤن میں بھی ادا کی گئی تھی۔ ابھی تک ہمارے ذہن میں کمانڈو شاہنواز والا شک بھی موجود تھا۔ میں نے عمران سے کہا تھا کہ وہ اس بارے میں چھان بین کرے کہ کہیں واقعی تو کمانڈو یہاں نہیں آیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس نے خاموش نہیں بیٹھنا تھا۔ وہ جس پر دل و جان سے فدا تھا وہ مصیبتوں کے گھیرے میں تھی۔ ایک ہوس کار اُسے ایک بھری پُری شاہراہ سے اچک کر لے گیا تھا اور اب وہ ہر طرح

اس کے قبضے میں تھی۔ اس واقعے کا صدمہ عمران نے مجھ سے بھی بڑھ کر لیا تھا۔ وہ اس کے علاقے کی رہائشی تھی اور اس کے بیمار والد سے عمران کا خاص قلبی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اسے بجا طور پر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ ڈکیت تیزابے نے براہِ راست اس سے ٹکر لی ہے۔ (اس تصادم کا احوال پچھلے واقعے میں بیان کیا جا چکا ہے)

ہمارے ایس ایس پی رانا صاحب بڑی کھردری طبیعت کے مالک تھے۔ ویسے بھی مجھ سے لیے دیے رہتے تھے۔ اب وہ اس بات پر مجھ پر برہم تھے کہ میں نے اس سارے معاملے میں فالتو طور پر ٹانگ اڑائی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے کمانڈو شاہنواز کی در پردہ پشت پناہی کر کے تیزابے جیسے خطرناک شخص کو بھڑکا دیا ہے۔ اب وہ کسی بھی قیمت پر اور جلد سے جلد صوفیہ کی بازیابی چاہتے تھے۔ اعلیٰ افسران کے علاوہ میڈیا کی طرف سے مغویہ کی برآمدگی کے لیے دباؤ تھا۔

ہمارے لاہور آنے کے دوسرے روز کی بات ہے یا شاید تیسرا روز تھا، میں اپنے گھر میں موجود تھا اور اسی معاملے پر غور و فکر کر رہا تھا کہ چلبلی طبیعت والی ماہین آدھمکی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پتلون میں تھی اوپر سلیولیس جیکٹ تھی۔ ریشمی بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے اصرار کر کے خود ہی چائے بنائی اور پھر میرے پاس بیٹھ کر خاموشی سے چسکیاں لینے لگی۔ کچھ دیر بعد اچانک بولی۔

''ویسے انکل تابش! یہ آپ کے عمران صاحب کیا چیز ہیں؟ میرا مطلب ہے ان کے موڈ ووڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کسی وقت بہت زیادہ کھلنڈرے نظر آتے ہیں، کسی وقت اتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں کہ دیکھ کر ڈر لگنے لگتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سنجیدہ تو بس کبھی کبھار ہی ہوتا ہوگا۔ آج کل اس لیے سنجیدہ ہے کہ صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے انکل! کل میں آپ کو فون کرتی رہی مگر وہ آف جا رہا تھا پھر میں نے عمران کو فون کیا کہ صوفیہ کے بارے میں تازہ صورتِ حال کا پتا چل سکے۔ ان کا فون ہی شاید خراب تھا۔ کھڑکھڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آدھے لفظ سمجھ میں آتے تھے آدھے نہیں۔ بندہ کم از کم فون ہی ڈھنگ کا رکھتا ہے۔'' ماہین کی آواز میں تاسف تھا۔

''بس وہ ایسا ہی اول جلول ہے۔''

''موٹر بائیک کی حالت بھی دیکھی ہوگی آپ نے۔ وہ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے، جس سے مالی حالت بہتر ہو جائے۔ کچھ آپ ہی مشورہ دیں نا ان کو۔ ویسے میں نے حشام سے بھی بات کی تھی۔ وہ انہیں کوئی اچھی جاب دلا سکتا ہے۔''

''جاب شاب کرنے والی بلا نہیں ہے وہ..... بس اپنے ہی ڈھنگ سے جینا چاہتا ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ حشام جیسوں کو تو وہ خود جاب دے سکتا ہے۔

چائے پیتے ہوئے ماہین بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ اصل میں وہ کوئی اور بات کرنے کے لیے چل کر یہاں میرے پاس آئی ہے۔ مجھے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ اصل موضوع پر آ ہی گئی۔

اپنے ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''پلیز انکل! آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں، بُرا نہ مانیے گا۔''

''بھئی، اگر بُرا ماننے والی بات ہوئی تو ماننا ہی پڑے گا۔''

''پلیز نہیں۔ اگر ہوئی بھی تو نہ مانیے گا۔ آپ بڑے اچھے ہیں پلیز۔'' اس نے باقاعدہ میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ

اوسط کا قاعدہ

ایک ریاضی داں چھٹیاں منانے کے لیے شہر سے دیہی علاقے میں گئے۔ ایک روز گھومتے پھرتے وہ ایک نہر کے کنارے پہنچے جس کے پار بہت خوب صورت باغات نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے نہر میں اترنے کا ارادہ کیا تو وہاں موجود لوگوں نے انہیں روکا اور ڈوب جانے کے خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے پھر لوگوں سے نہر کی گہرائی کے بارے میں سوال کیے۔ ان معلومات کی روشنی میں انہیں علم ہوا کہ کنارے پر نہر کی گہرائی صفر تھی۔ وسط میں وہ دس فٹ گہری تھی۔ ان کے علم اور حساب کی روشنی میں نہر کی اوسط گہرائی پانچ فٹ نکلی۔ وہ خود سوا چھ فٹ لمبے تھے۔ لوگوں کے روکنے کے باوجود نہر میں اتر گئے۔ بیچ میں پہنچے تو ان کا سارا حساب دھرا رہ گیا۔ نہر کی گہرائی اور تیز بہاؤ میں بے چارے اپنی ساری ریاضی سمیت بہہ گئے۔

بنگلا دیش سے خرم علیم کا گوشوارہ

دیے۔

''اچھا بتاؤ۔'' میں نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر ''جان کی امان'' چاہی اور بتایا کہ اپنے تجسس سے مجبور ہو کر وہ اپنے ایک کولیگ کے ساتھ شیخوپورہ گئی تھی۔ اس نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں مشاہد احمد کی گاڑی درخت سے ٹکرا کر خاکستر ہوئی پھر وہ اپنی گاڑی پر اردگرد کے علاقے میں بھی گھومی۔ کچھ لوگوں سے اس حادثے کے بارے میں بات کی۔ وڈیو کلپس وغیرہ بھی بنائے۔ تاہم ابھی تک اس نے کوئی چیز اپنے یوٹیوب چینل پر نہیں ڈالی تھی۔

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہے اور اس نے بالکل برعکس کام کیا تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سے چند تلخ ترش باتیں کیں لیکن میری تلخی ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ماہین نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ نہ صرف چونکا دیا بلکہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد مجھے اور عمران کو ایک بار پھر لاہور سے شیخوپورہ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ گاڑی میری تھی تاہم ماہین بھی اس میں سوار تھی۔ ہم ایک عمر رسیدہ عورت سے ملنے کے لیے جا رہے تھے۔ اس عمر رسیدہ عورت کے بارے میں ماہین نے ہی بتایا تھا۔

☆☆☆

جنتر کے درختوں اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان سے ریل کی دو پٹریاں گزرتی تھیں۔ ایک پٹری پر کسی خستہ حال مال گاڑی کی تین بوگیاں شاید کئی مہینوں سے بیکار کھڑی تھیں جس جگہ مشاہد احمد والی ٹویوٹا کار بھسم ہوئی تھی، وہ یہاں سے پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ مال گاڑی کی ایک بوگی میں خشک پرالی پر ایک خستہ حال عورت بیٹھی تھی۔ عمر ستّر سال کے لگ بھگ ہوگی۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کی بینائی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ اس کے اردگرد روزمرہ استعمال کی کئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ راکھو نام کی یہ عورت اسی بوگی میں رہتی ہے۔

ہماری آمد سے وہ پریشان ہوئی۔ تاہم ماہین نے اسے مطمئن کیا اور پھر کہا کہ جو کچھ وہ پہلے اسے بتا چکی ہے، ہمیں بھی بتائیے۔ عورت نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''وہ بدھ کے روز یہاں آئے تھے۔ وہ دو تھے۔ ایک لمبے قد کا منڈا تھا۔ دوسری کڑی تھی جو بس سارا وقت روتی ہی رہی تھی۔ منڈے کے ہتھ میں ایک بندوق بھی تھی۔ اس نے شروع میں مجھے ڈرایا دھمکایا بھی تھا مگر بعد میں ذرا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مجھے پتا چل گیا کہ وہ اس وچاری کڑی کو کہیں سے نکال کر لایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تم اس بندے کا حلیہ بتا سکتی ہو؟''

''نہیں پُتر، میری نظر بڑی کمزور ہے۔ ہاں اگر میں ان دونوں کی آوازیں سنوں تو شاید پہچان جاؤں۔''

''اماں، وہ کتنی دیر رہے یہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''پُتر! جب وہ آئے تو رات ہی تھی۔ اس ویلے تھوڑی بارش بھی ہو رہی تھی۔ وہ اگلے روز ڈیگر ویلے تک یہاں رہے پھر چلے گئے۔ وہ لمبے قد والا منڈا کوئی گڈی لے کر آیا تھا۔''

اس اماں راکھو کی اطلاعات بڑی کارآمد تھیں۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ لڑکا اسے اپنی بیوی کہتا تھا مگر جب ایک موقع پر وہ تھوڑی دیر کے لیے بوگی سے باہر نکلا اور اماں راکھو نے لڑکی سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کا میاں نہیں ہے۔ اسی دوران میں وہ واپس آ گیا اور لڑکی مزید تفصیل نہ بتا سکی۔ شاید اس نے اسے سختی کے ساتھ بولنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بالکل چپ ہو گئی تھی۔ لڑکی کے پاؤں میں صرف ایک جوتی تھی۔ اس کا دوسرا پاؤں تھوڑا سا زخمی بھی تھا۔ اگلے روز وہ لڑکا چند منٹ کے لیے باہر گیا اور کوئی گاڑی لے کر آ گیا۔ اس نے لڑکی کو لیا اور چلا گیا۔

اس اماں راکھو کی گفتگو اور شواہد سے نہایت واضح اشارے مل رہے تھے کہ چند دن پہلے جس لڑکی نے اس تاریک بوگی میں رات گزاری، وہ صوفیہ تھی اور اس کے ساتھ رائفل بردار مشاہد احمد تھا۔

یکا یک عمران کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ بوگی سے باہر تھا اور اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں اور ماہین باہر نکلے۔ عمران نے کچی زمین کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں ایک جگہ کچھ موبل آئل گرا ہوا تھا۔ موبل آئل کے کچھ دیگر نشانات آگے تک گئے تھے۔ ساتھ میں کسی چھوٹی گاڑی کے ٹائروں کے تدھم نشان بھی دیکھے جا سکتے تھے۔

یہ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ عمران نے کسی کھوجی کی طرح کمر اٹھانے کی کوشش کی۔ ٹائروں کے نشان چند دن پرانے تھے اس لیے آگے تک نہیں جا سکے۔ ہاں ایک کرشمہ ہوا۔ موبل آئل کے سیاہی مائل تدھم دھبے اور قطروں کے نشانات جگہ جگہ دکھائی دیتے

چلے گئے۔ یوں لگتا تھا کہ اس گاڑی کا موبل آئل لیک ہو رہا تھا یا پھر یہ کوئی لوڈر نما گاڑی تھی جس پر موبل آئل رکھا تھا جو کسی وجہ سے نیچے گر رہا تھا۔

ہم اپنی کار پر..... نشانات کو دیکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے رہے..... کہیں کہیں نشانات غائب بھی ہو جاتے تھے۔ بہرحال جلد ہی ہمیں ایک جگہ موبل آئل کا کافی بڑا دھبا نظر آیا۔ یہ درختوں کے درمیان ایک خانقاہ نما جگہ تھی۔ ساتھ میں سفید رنگ کی صاف ستھری مسجد بھی نظر آ رہی تھی۔

دس منٹ بعد ہم مسجد کے ادھیڑ عمر پیش امام کے سامنے موجود تھے۔ ماہین مسجد سے باہر گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہی تھی۔

اس الگ تھلگ مسجد کے امام صاحب نے کچھ پس و پیش کے بعد جو انکشاف کیا، وہ حیرت انگیز تھا اور ہمارے اندازوں کی تصدیق بھی کرتا تھا۔

انہوں نے بتایا۔ ''پچھلی جمعرات کو مغرب کے بعد وہ بندہ مسجد میں آیا اور مجھ سے میرے حجرے میں ملا تھا، اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی۔ لالٹین جل رہی تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ چادر کے نیچے اس نے کوئی ہتھیار بھی چھپا رکھا ہے۔ اس کا کیری ڈبا باہر کھڑا تھا اور اس میں کوئی لڑکی موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اس لڑکی سے نکاح پڑھوانا چاہتا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔ میں ڈر گیا۔ میں نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے پہلے مجھے پیسوں کا لالچ دیا پھر ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ اسی وقت نہ صرف لائٹ آ گئی بلکہ گاؤں کے تین چار بندے مجھ سے ملنے بھی آ گئے۔ وہ گاڑی سمیت یہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ میں اتنا ڈر گیا تھا کہ کسی کو اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔''

امام مسجد کا بیان ظاہر کرتا تھا کہ مشاہد احمد اس حجرے میں ان سے ملا تھا۔ بے شک اس وقت روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن جو قد کاٹھ اور حلیہ وہ بتا رہے تھے وہ مشاہد کی طرف ہی اشارہ کرتا تھا۔ وہ صوفیہ سے نکاح کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے صوفیہ کو منکوحہ بنانے کی قسم کھائی ہوئی تھی اور وہ اپنی ضد کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ نکاح نامہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس علاقے سے نکلنے اور کسی محفوظ مقام تک پہنچنے میں اسے آسانی رہے۔

مسجد سے آگے قریباً دو کلومیٹر تک ہمیں موبل آئل کے مدھم نشانات مزید نظر آئے پھر ختم ہو گئے۔ ماہین مختلف مناظر کو اپنے جدید کیمرے میں ریکارڈ کرتی جا رہی تھی۔ موبل آئل کے نشان نظر آنا بند ہو گئے تو وہ بولی۔ ''اگر ''موبل آئل'' انجن سے گر رہا ہوتا تو گاڑی یہاں رک جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ موبل آئل کا ڈرم وغیرہ لوڈر کے پیچھے رکھا ہوا تھا اور وہی لیک کر رہا تھا۔''

میں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

موبل آئل کے ان دھبوں سے ہمیں اس رخ کا اندازہ ضرور ہو گیا تھا جس طرف صوفیہ گئی تھی پھر جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع طور پر ہوا۔ ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اتنی آسانی سے صوفیہ تک پہنچ جائیں گے۔

سورج اب تیزی سے مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں سے گھرے ہوئے اس علاقے کی شکل ایک بیلے جیسی تھی۔ ہم ایک ڈیڑھ کلومیٹر مزید آگے گئے اور رک جانے کا سوچ رہے تھے جب سامنے گھنی جھاڑیوں میں تیز حرکت ہوئی، جیسے کوئی جانور یا انسان ہمیں دیکھ رہا تھا اور بھاگ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا ہے۔ ہم نے گاڑی روک دی۔ عمران باہر نکلا۔ ''کون؟'' اس نے پکار کر پوچھا۔

''جواب'' نہایت سنگین تھا اور شاید یہ عمران جونیئر کی حیرت انگیز ''لک'' ہی تھی جو وہ اس ''جواب'' کی سنگینی سے محفوظ رہا۔ آٹومیٹک رائفل کی ایک گولی اس کے سر کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ دوسری میری گاڑی کی باڈی میں لگی۔ میں ماہین کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا گاڑی سے باہر جھاڑیوں میں گرا۔ سرکاری پسٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ عمران نے بھی ہمارے ساتھ ہی ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے لی تھی۔ عمران کے پاس میرا دیا ہوا کولٹ ریوالور موجود تھا۔ تاہم ریوالور میں صرف پانچ گولیاں تھیں، اضافی راؤنڈ نہیں تھے۔ یہ سنسان جگہ دھماکوں سے گونج اٹھی۔ ہمارے سامنے کم از کم دو افراد تھے اور بے دریغ فائر کر رہے تھے۔ میری ایک گولی عین نشانے پر لگی اور میں نے ایک شخص کو چلا کر ایک بارشی گڑھے میں گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھی نے تڑپ کر پوزیشن تبدیل کی اور ہمیں اس کی ایک جھلک نظر آئی۔ یقیناً میرے ساتھ ساتھ عمران بھی ششدر رہ گیا ہوگا۔ یہ کوئی اور نہیں خود دلاور عرف تیزابا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ''اے کے 57'' تھی اور وہ سراپا قہر نظر آ رہا تھا۔ ہم محفوظ آڑ میں نہ ہوتے تو وہ اب تک ہمیں بھون چکا ہوتا۔ میں بڑی احتیاط سے جوابی فائر کر رہا تھا۔ کیونکہ راؤنڈ زیادہ نہیں تھے۔

یکا یک میں نے محسوس کیا کہ عمران ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ مزید گزرے اور پھر اچانک ہم نے اسے دیکھا..... اور ایسے دیکھا کہ دل و دماغ سن ہو کر رہ گئے۔ وہ ایک شاندار نظارہ تھا۔ وہ تیزابے کی بائیں جانب سے نمودار ہوا تھا۔ بالکل ایک جوان چیتے کی طرح جو جھاڑیوں میں سے جست لگا کر اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں ہم نے پنجاب کے خطرناک ڈکیت اور عمران کو گتھم گتھا دیکھا۔ یہ خوفناک کشمکش دس بارہ سیکنڈ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ پھر مجھے بپھرے ہوئے عمران کے ہاتھوں میں وہی کلاشنکوف نظر آئی جو چند سیکنڈ پہلے دلاور عرف تیزابے کے ہاتھوں میں تھی۔ عمران نے اسے بیرل کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے آہنی دستے کی ایک ''کھوپڑی توڑ'' ضرب اس نے تیزابے کے سر پر لگائی۔ وہ لہرا کر گرا۔ عمران اندھا دھند اس کے سر پر ضربیں لگانے لگا پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے کلاشنکوف کی تین مہلک گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ ماہین خوف سے لرز رہی تھی۔ ہم دونوں اوٹ سے نکلے اور بھاگتے ہوئے عمران کے پاس پہنچے۔ وہ دو لاشوں کے درمیان ہانپتا ہوا کھڑا تھا..... تیزابا یقیناً زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔

اب یہ بات یقینی تھی کہ مشاہد احمد اور صوفیہ بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہیں۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ماہین ہمارے ساتھ نہ ہوتی لیکن اب اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے واپس بھیجا جا سکتا۔ تیزابے والی کلاشنکوف اب عمران کے ہاتھ میں تھی اور یہ وزنی ہتھیار ہمیں اضافی حوصلہ بھی دے رہا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے کوئی آدھا کلومیٹر آگے گئے جب ہمیں ایک ٹوٹے پھوٹے اجاڑ خشت بھٹے کے آثار نظر آئے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ہم پر پمپ ایکشن گن کے دو فائر ہوئے۔ یوں لگا کہ یہ فائر وارننگ کے طور پر کیے گئے ہیں۔ ہمیں پاس ہی ایک گھنے جھنڈ میں وہ سوزوکی کیری ڈبا بھی چھپا نظر آ گیا جس کا ذکر پیش امام صاحب نے کیا تھا۔ یہ کیری ڈبا ایک ورکشاپ سے چرایا گیا تھا اور اس کی پکی رپورٹ بھی کہیں درج ہوئی تھی (یہ باتیں ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں) اب اس امر میں شبے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی کہ صوفیہ، مشاہد کے ساتھ اینٹوں کے اسی کھنڈر بھٹے میں ہے۔

''اندر داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے جواب دیا اور پھر سیل فون پر ایس ایس پی رانا صاحب سے رابطہ کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے انہیں یہ بتا کر ششدر کر دیا کہ تیزابا مارا جا چکا ہے اور ہم نے مشاہد کو مغویہ سمیت ایک کھنڈر میں ڈھونڈ لیا ہے۔ رانا صاحب نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''تابش! مغویہ کو ہر صورت صحیح سلامت بازیاب ہونا چاہیے۔ میں اس سلسلے میں کوئی کوتاہی یا کمی برداشت نہیں کروں گا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ تمہیں اس ''بیلے'' میں گھسنے سے پہلے مجھے اطلاع دینا چاہیے تھی۔'' آخر میں اُن کا لہجہ درشت ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ شیخوپورہ سے بھاری نفری موقع کی طرف روانہ کر رہے ہیں اور خود بھی پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے قریبی تھانے سے بھی فوراً رابطہ کرنے کو کہا اور آرڈر دیا کہ اس جگہ کو پوری طرح گھیر لیا جائے۔

مقامی تھانے سے میرا ٹیلی فونک رابطہ ہو گیا اور وہاں سے بھی پولیس کی نفری روانہ ہو گئی لیکن یہ نفری پہنچنے سے پہلے ایک اور واقعہ ہو گیا اور اس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ میرے اور عمران کے ساتھ ساتھ ماہین بھی چکرا کر رہ گئی۔

عمران بھٹے کے سامنے موجود تھا۔ میں بھٹے کے عقب میں پوزیشن لینے کے لیے آگے بڑھا تو اندر سے للکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، آگے نہ آؤ..... ورنہ چھلنی کر ڈالوں گا۔''

اس آواز کو سن کر میرے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ یہ آواز..... ہاں یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی..... اور یہ آواز..... مشاہد کی نہیں تھی، نہ ہی اس کے کسی ساتھی کی تھی..... یہ آواز تو کمانڈو شاہنواز کی تھی۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی تھی کہ یہ اسی کی آواز ہے۔ میں کئی سیکنڈ تک بالکل ساکت جامد کھڑا رہا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''کیا تم شاہنواز ہو؟'' دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پھر پکار کر کہا۔ ''میں تابش ہوں۔ میرے ساتھ عمران ہے۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر تاریکی میں ایک ہیولا کھنڈر کی دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کی گرم چادر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ وہ کمانڈو شاہنواز تھا، کمانڈو باکسر۔

☆☆☆

پانچ منٹ بعد ہم بھٹے کی ایک کوٹھری نما جگہ پر کمانڈو شاہنواز اور صوفیہ کے سامنے کھڑے تھے۔ چادر میں لپٹی ہوئی صوفیہ، کمانڈو شاہنواز کے بازو سے لگی ہوئی تھی اور

اشک بار نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاہنواز کی آنکھوں میں بھی آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر ششدر کر دیا تھا کہ دو روز پہلے وہ صوفیہ کی رضامندی کے ساتھ اس سے نکاح کر چکا ہے۔ اور آج رات ہی اسے دوبارہ، صوفیہ سمیت خیبر ایجنسی کی طرف رخ کر جانا تھا۔ صورتِ حال بہت حد تک میری اور عمران کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ ہم اپنے تئیں مشاہد اور صوفیہ کا پیچھا کر رہے تھے۔ درحقیقت یہ شاہنواز اور صوفیہ کا پیچھا تھا۔

اچانک میرے جسم میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاہنواز تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس کی بھاری نفری یہاں پہنچ جائے گی۔ تم ہمیں مختصر الفاظ میں بس اتنا بتا دو کہ صوفیہ تمہیں کب اور کہاں ملی؟“

جواب میں شاہنواز نے اشک بار جذباتی لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ ہے۔ ”صوفیہ کے لیے اس کی تڑپ اسے قبائلی علاقے سے واپس لاہور میں کھینچ لائی تھی۔ صوفیہ کے والدین کے قتل اور صوفیہ کے اغوا کے وقت بھی وہ لاہور میں ہی تھا۔ اس نے بھی ٹی وی پر یہ خبر سنی تھی کہ قاتل مغویہ کے ساتھ شاید شیخوپورہ کی طرف فرار ہوئے ہیں۔ وہ بے چین ہو کر ”شیخوپورہ“ جا پہنچا تھا اور وہاں دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ شاید قدرت کو اس کی تڑپ پر ترس آیا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت اس نے قصبے کے ایک ٹریفک سگنل پر ایک ٹویوٹا کار کو رکتے دیکھا۔ اسے شک گزرا کہ یہ وہی ٹویوٹا کار ہے جو مشاہد اور واجد کی ملکیت تھی۔ وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا اور اس نے کار میں مشاہد کو ایک چادر پوش لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے پہچان لیا۔ اتنی دیر میں کار چل پڑی۔ شاہنواز نے چلتی کار کا دروازہ کھولا اور اندھا دھند کار کے اندر گھس گیا۔ اسی کشمکش کے دوران میں کار بائی وے پر آ گئی تھی۔ شاہنواز نے کار میں صوفیہ کو بھی پہچان لیا تھا۔ مشاہد نے اسے سیٹ بیلٹس کے ساتھ سختی سے باندھ رکھا تھا اور خود ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اگلے ایک دو منٹ میں کار کے اندر زبردست ہاتھا پائی ہوئی، پھر کار ایک ذیلی سڑک پر مڑی اور کھیتوں کے درمیان درخت سے جا ٹکرائی۔ سر پر چوٹ لگنے سے مشاہد نیم بے ہوش ہو گیا۔ شاہنواز پر وحشت سوار تھی۔ اس نے ڈری سہمی صوفیہ کی بندشیں کھول کر اسے کار سے نکالا..... پھر کار کے گیس سلنڈر کا پائپ کھول کر اسے شعلہ دکھا دیا۔“

میں اور عمران حیرت زدہ ہو کر شاہنواز کی یہ روداد سن رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ گاڑی میں جل کر مرنے والا.....؟“

”جی ہاں، وہ مشاہد احمد ہی تھا۔“ شاہنواز نے کہا اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر خون کی سرخی جھلک دکھانے لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے صوفیہ کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ صوفیہ جو اس کی رگوں میں عشق بن کر گردش کرتی تھی اور جو حالات کی چکی میں پس کر اپنے والدین، اپنا گھر بار سب کچھ کھو چکی تھی۔ دور کہیں ویرانے میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی مرضی بھی وہی تھی..... جو میری تھی۔

☆☆☆

بعد میں جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ قارئین کو ہو ہی گیا ہو گا۔ پولیس کی بھاری نفری نے خشت بھٹا کو حصار میں لے لیا مگر بھٹے کے کھنڈر میں سے انہیں کچھ نہیں ملا۔ میرا بیان یہی تھا کہ تاریکی اور نامکمل حصار کا فائدہ اٹھا کر ملزم لڑکی سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں نے کہا۔ میرے خیال میں تو وہ مشاہد احمد ہی تھا تاہم ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا کوئی ساتھی ہو۔

ظاہر ہے کہ اس بیان کی وجہ سے ایس ایس پی رانا صاحب کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا ہو گا۔ مجھے ان سے بہت تلخ ترش سننا پڑیں۔ ممکن ہے کہ ان کا طیش مجھ پر مزید غضب بھی ڈھاتا مگر تیزاب جیسے خطرناک ڈکیت کی لاش نے بڑی حد تک میرا دفاع کیا۔ اعلیٰ افسران اسے ایک بڑی کامیابی قرار دے رہے تھے۔ دراصل تیزابا بھی کمانڈو شاہنواز اور صوفیہ کو ڈھونڈتا ہوا اس بیلے میں پہنچا تھا۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا اور فائر کھول دیا۔ اس کی یہی جارحانہ جلد بازی اس کی اور اس کے ساتھی کی موت کا سبب بنی۔ اب اس کی موت کا کریڈٹ مجھے مل رہا تھا۔ ماہین اس کی چشم دید گواہ تھی لیکن اگر ہم یہ کامیابی عمران کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرتے تو کئی قانونی سوال پیدا ہو سکتے تھے۔ لہٰذا باہمی مشاورت سے اس بات کو راز ہی رہنے دیا گیا کہ تیزابے کا سینہ میں نے نہیں عمران نے چھلنی کیا تھا اور جہاں تک عمران کی بات ہے، اسے ان باتوں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ خوشی ہر انعام سے بڑھ کر تھی کہ صوفیہ حالات کی طوفانی گردشوں سے نکل کر بلند پہاڑوں کے درمیان کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہے اور زندگی اس کے لیے کچھ نئی اور سلامت والی راہیں کھولنے والی ہے۔

❖❖❖

خود کو ایک جگہ پر ٹھہرانا مشکل ہو رہا تھا۔ تلاطم خیز موجوں پر لانچ خطرناک انداز میں اچھل کود کر رہی تھی۔ بند کیبن کے اندر بھی طوفانی بارش اور تیز ہواؤں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ منہ زور سمندری طوفان کے سامنے ہماری ساری تدابیر ناکام ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کسی بھی لمحے لانچ کے غرقِ آب ہونے کا قوی امکان نظر آ رہا تھا۔ جب سے لانچ کو بیچ سمندر میں طوفان نے آگھیرا تھا۔ ناخدا نے لانچ کا رخ بلند لہروں کی طرف رکھا تھا۔ اس طرح لانچ کے جلد ڈوبنے کا

طوفان

محمد سلیم کرد

سمندر کی اپنی ایک دنیا ہے... ٹھاٹھیں مارتی موجوں کی حکمرانی ہوتی ہے... انہی موجوں پر پوری مشاقی سے جہاز رواں دواں ہوتے ہیں... ایسی ہی ایک سمندری کہانی جب طوفانی موجوں نے اس جہاز کو اپنی گرفت میں لے لیا... اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ غرقِ آب ہو گیا...

موجِ حوادث میں گھرے دو مصیبت زدہ مسافروں کا دل خراش ماجرا.....

امکان کم ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ہماری لانچ طوفانی لہروں کے سامنے بدستور اسی پوزیشن میں آگے بڑھنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اب موہوم سی امید بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ صحیح سلامت طوفان سے نکل جائے گی۔ یہ ایک دیوہیکل ماہی گیر لانچ تھی جس میں مجھ سمیت عملے کے پندرہ افراد موجود تھے۔ سب کے جسم پر لائف جیکٹ موجود تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ ابتر ہوتی ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر تھوڑی دیر قبل لانچ کے ناخدا نے ہنگامی اعلان جاری کیا تھا۔

"صورتِ حال ہمارے قابو سے باہر ہے۔ ہم صرف خدا کے بھروسے پر ہیں۔ کارک اور ضرورت کی دوسری چیزیں جلدی سے اپنے ساتھ اٹھاؤ اور تیار ہوجاؤ۔" میں زیادہ پرانا خلاصی نہیں تھا۔ میرے تمام ساتھی میرے مقابلے میں زیادہ سینئر اور تجربہ کار تھے۔ اس وقت آدھی رات کا وقت تھا۔ لانچ میں پانی بھر آنے سے الیکٹرک سسٹم میں بھی نقص پیدا ہو گیا تھا۔ لانچ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا تاہم ٹارچ کی روشنیوں کے سہارے ہم اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے۔

میں نے لرزتے ہوئے اپنے شل ہاتھوں سے ایک کارک اٹھایا۔ لانچ سے نکاسیٔ آب کے لیے مسلسل ہینڈ پمپ چلانے سے میرے ہاتھ شل ہو گئے تھے لیکن ہاتھوں کے لرزنے کی وجہ صرف ہاتھوں کی تھکاوٹ نہیں بلکہ خوف کا اثر تھا۔ ہر طرف افراتفری اور خوف کی فضا طاری تھی۔ لانچ کا اگلا، پچھلا حصہ اب بڑی تیزی کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ یوں گمان ہو رہا تھا کہ لانچ کسی بھی لمحے درمیان سے دولخت ہو جائے گی۔ طوفانی ہوا اور شدید ہچکولوں کی شدت سے لانچ پر موجود اشیا تنکوں کے مانند اُڑ، اُڑ کر کیبن پر برس رہی تھیں اور کیبن سے باہر نکلنے کی صورت میں ان کی زد میں آکر وقت سے پہلے لقمۂ اجل بننے کا خدشہ تھا۔ یعنی اس وقت ہمیں سمندر میں ڈوب کر مرنے سے بھی زیادہ ان چیزوں کا خوف لاحق تھا۔ اس وقت لانچ کا جملہ عملہ کیبن میں موجود تھا۔

"کیبن سے ہمیں احتیاط کے ساتھ نکلنا ہوگا اور سمندر میں اترتے وقت حتی المقدور یہ کوشش کرنا ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اس طرح ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے۔" ناخدا کی آواز سنائی دی۔

"اگر حالات موقع فراہم کرے شاید تب ایسا ممکن ہو۔" انجن آپریٹر نے کہا۔

"کوشش کرنا لازمی ہے۔" ناخدا سپاٹ لہجے میں بولا۔

اس وقت ہماری لانچ بحرِ ہند کے پانیوں میں کینیا کی سمندری حدود میں بُری طرح طوفان میں پھنسی ہوئی تھی۔ نیوی گیٹر سے معلوم ہو رہا تھا کہ خشکی کا قریب تر علاقہ بھی کینیا کا پڑتا ہے جو جنوب مغرب کی طرف واقع ہے، اس کے علاوہ تنزانیہ کے بھی کچھ شمالی علاقے نزدیک پڑتے تھے۔

"اب تاخیر نہ کرو..... سب میرے پیچھے ایک، ایک کر کے کیبن سے نکلو۔" ناخدا چیخا۔ اس وقت چیزوں کے گرنے پڑنے کا اودھم بھی رک گیا تھا۔ ناخدا نے جیسے ہی کیبن کا دروازہ کھولا، ہوا کا ایک طوفانی جھکڑ بوچھاڑ سمیت سرعت کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گیا۔ بوچھاڑ آمیز جھکڑ کی شدت سے کیبن کے در و دیوار ایک دم ہل کر رہ گئے۔ میں بڑی مشکل کے ساتھ کارک یا واٹر سپورٹر اور ٹارچ سنبھالتا ہوا آگے بڑھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک، ایک کر کے کیبن سے باہر نکل آئے۔ باہر کی حالت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ابتر تھی۔ طوفان کی شدت اور غضب کے ہچکولوں میں ایک جگہ پر پیر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ تیز ہوا، تلاطم خیز موجوں کی چنگھاڑ اور گرج چمک کے ساتھ برستی ہوئی طوفانی بارش میں کان پڑی آواز بھی بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کارک پر ہاتھوں کی مضبوط گرفت رکھی تھی۔ معمولی سی سستی سے بھی تند و تیز ہوا کی وجہ سے ہلکا پھلکا کارک ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

طوفان کے شور میں اچانک ایک دھماکے دار آواز گونج اٹھی۔ پیروں تلے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ لڑکھڑاتے ہوئے گرتے گرتے بچا لیکن ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فوراً میری سماعت سے ایک آواز آٹکرائی۔ "لانچ کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔" جو میرے خیال میں طاہر کی آواز تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے لانچ زیرِ آب جانے لگی۔ موت کا ڈر..... اور ایک ایسی موت کا ڈر جس کے ساتھ جسدِ خاکی کی سلامتی کی فکر بھی لاحق ہو، زبان و بیان سے بالاتر ہے..... نہ معلوم یہ وقت نزع کی ایک بھیانک صورت تھی یا نئی زندگی کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم، میں نے بھی خدا کو یاد کرتے ہوئے خود کو بحرِ ہند کے پانیوں کے سپرد کر دیا۔ مجھے اپنے ساتھ کسی کی موجودگی کا احساس ہوا جو مجھ سے جیسے جڑا ہوا تھا۔ تاریکی میں لپٹے ہوئے تند و تیز طوفان میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ کون تھا۔ لانچ ٹوٹنے کی گونج دار آواز کے فوراً بعد میں نے اپنے قریب طاہر کی آواز سنی تھی، شاید وہ طاہر ہی تھا جو میرے ساتھ تھا۔ بلند و بالا لہروں نے کسی دیو کی طرح ہمیں اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پٹخنا شروع کر دیا تھا ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور ہم دونوں پانی کی اس ہیبت ناک دنیا میں بے بسی کے عالم میں اچھلتے، گرتے، تیرتے چلے جا رہے تھے۔ زندہ رہنے کی فطری تحریک نے شاید ہمارے بازوؤں میں طاقت بھر دی

تھی کہ کارک پر ہماری گرفت مضبوط تھی اور ہم دونوں منہ زور لہروں کے غضب ناک تھپیڑوں میں اکٹھے بہہ رہے تھے۔ چند سیکنڈ کے لیے میں اس بات پر حیران ہوئے بنا بھی نہیں رہ سکا تھا کہ آخر وہ اس ابتر حالت میں میرے ساتھ کیسے جڑا ہوا تھا۔ حالات کہاں کسی سوال و جواب کے لیے سازگار تھے مگر مجھے اپنے ساتھ اس کی موجودگی سے ایک طمانیت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ شاید وہ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ منہ زور لہروں کے زبردست ٹکراؤ سے کارک کے ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔ میری طرح اس کے جسم پر بھی یقیناً لائف جیکٹ ہوگی لیکن اس وقت کارک کی اہمیت لائف جیکٹ سے بڑھ کر تھی۔ گرج چمک کے وقفے میں پہلے کی نسبت خاصی حد تک تاخیر آ گئی تھی لیکن موجوں کا جوش بدستور انتہا پر تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ پہلے کی نسبت لہروں کے جارحانہ تیور میں خاصی کمی کا احساس ہو رہا تھا اور ہوا کے دباؤ میں بھی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ تاہم بارش بدستور تیزی کے ساتھ برس رہی تھی۔

''میرے خیال میں طوفان کی شدت میں بتدریج کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔'' میں اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

''ہاں..... میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' تاریکی میں مجھے اپنے پاس طاہر کی آواز سنائی دی۔

''کیا تم طاہر ہو؟'' پھر بھی میں نے جاننا چاہا۔

''ہاں..... میں طاہر ہوں۔'' ایک دفعہ پھر اس کی آواز سنائی دی۔

''میں جمیل ہوں۔'' میں نے کہا۔ پانی میں اترنے کے بعد پہلی بار ہمارے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

''مجھے پتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''لانچ کے تباہ ہو کر زیرِ آب جاتے ہی تیز جھکڑوں کے باعث کارک میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ میرے قریب تم موجود تھے..... میں تمہارے ساتھ پانی میں اتر گیا اور تمہارے کارک کے سہارے اب تک تیر رہا ہوں۔'' یہ سن کر میں اپنے ساتھ اس کے جڑے رہنے کی وجہ سمجھ گیا۔

''بُرے حالات میں بھی تم میرا پیچھا چھوڑنے سے باز نہیں آتے۔'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ دراصل ہماری آپس میں کبھی بنتی نہیں تھی۔ لانچ کے پورے عملے میں، میں صرف اس شخص سے بیزار تھا۔ یہ ہمیشہ مجھے تنگ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالا کرتا تھا۔ بعض مواقع پر ہمارے درمیان نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی۔ طاہر کا مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ مجھے ایک آنکھ ..... نہیں بھاتا تھا مگر اس وقت اس کا ساتھ مجھے طمانیت اور تحفظ کا احساس دلا رہا تھا۔

''پیچھا چھوڑتا تو تم اس وقت کھلے سمندر میں اکیلے پڑے ہوتے۔'' طاہر نے کہا۔

''اور یقیناً تم بھی اکیلے ہوتے اور صرف لائف جیکٹ کے سہارے پر ہوتے۔'' میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں یقیناً..... میرے خیال میں طوفان کا زور اب ٹوٹ رہا ہے۔ شاید آئندہ ہمیں کوئی مدد بھی مل جائے۔'' اس نے میری بات پر مثبت انداز میں کہا اور اپنا خیال بھی ظاہر کیا۔

''موسم کے حوالے سے میں بھی کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں لیکن کسی مدد کے حوالے سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اب سارا دارومدار ہماری قسمت پر ہے۔ جلد کسی ذریعے کی صورت نکل آئی تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ بصورت دیگر بھوک پیاس سے ہم مرکھپ جائیں گے یا کسی خونخوار سمندری مخلوق کا تر نوالہ بن جائیں گے۔'' آخر میں خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے میں نے کہا۔

''اتنا بھی چھوٹا دل مت رکھو، شاید ہم کسی ساحلی آبادی میں پہنچ سکیں۔'' طاہر نے امید افزا لہجے میں کہا اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول رات کی تاریکی میں سمندر کے رحم و کرم پر نامعلوم منزلوں کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بنا ہاتھ پیر چلائے کارک پانی کی سطح پر پھسلتا جا رہا تھا۔ ایسی سچویشن میں غیر محسوس انداز میں سیکڑوں ناٹیکل میل کا فاصلہ چند منٹوں میں طے ہوتا ہے۔

لانچ کے مالک کا تعلق ایران سے تھا جبکہ عملے کے افراد کا تعلق پاکستان سے تھا۔ لانچ جب پوری طرح طوفان میں پھنس چکی تھی، اس وقت لانچ کے ناخدا نے سیٹلائٹ فون کے ذریعے بندر عباس ایران میں موجود لانچ کے مالک سے رابطہ کیا تھا۔ ناخدا نے صورت حال کی نزاکت اور لانچ کی لوکیشن کے متعلق اطلاع دی تھی لیکن خشکی سے کئی ناٹیکل میل دور طوفان میں پھنسی ہوئی لانچ کو بروقت ڈھونڈ کر ریسکیو کرنا ناممکن تھا اور اس طرح لانچ کے غرق آب ہونے کے بعد وسیع و عریض سمندر میں عملے کے افراد کو تلاش کر کے بچانا آسان نہیں تھا۔ بہرحال ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ خشکی پر ہنگامی کال کے نتیجے میں ضرور کوئی ٹیم ریسکیو کرنے کے لیے نکلی ہو گی۔ رفتہ رفتہ ہوا کی رفتار میں اعتدال آنا شروع ہو گیا اور بارش کا زور بھی ٹوٹنے لگا۔ سمندر نے گویا سکوت کی چادر اوڑھنا شروع کر دی تھی۔

رات بالآخر بیت گئی اور صبح کی پہلی کرن نمودار ہوگئی۔ ہر سُو تا حدِ نگاہ سمندر پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ ساحل کس طرف نزدیک ہو گا؟'' طاہر نے ہر سُو ایک نگاہ ڈالنے کے بعد استفسار کیا۔

''تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو..... سنا ہے کہ جس طرف لہروں کا رخ ہو، ساحل اسی طرف ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''سنا بھی ہے اور غور بھی کیا ہے۔'' طاہر نے کہا۔

''پھر؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''سوچا شاید تمہیں اس حوالے سے مجھ سے زیادہ بہتر معلومات ہوں۔'' طاہر نے کہا۔ وہ مجھ سے چار سال سینئر تھا اور پچھلے تین سال کے عرصے میں ہم ''النثار'' نامی لانچ پر ایک ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ طوفان چھٹنے کے بعد پانی کی روانی میں سستی آگئی تھی۔ اس وقت ہم پُرسکون سطحِ آب پر دھیرے دھیرے تیرتے ہوئے لمبے چوڑے اور مضبوط ساخت والے کارک پر آسانی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پُرسکون سطحِ آب پر چھوٹی چھوٹی لہریں ابھر کر بکھر رہی تھیں۔ ہم نے رفتار بڑھانے کی خاطر کارک کو ہاتھوں سے اس طرف کھینا شروع کیا جس طرف لہروں کا رخ تھا۔ سورج مشرقی افق پر قدرے بلندی پر آگیا تھا۔ ہماری اپنے تئیں یہ کوشش تھی کہ ہم کسی طرح جلد خشکی پر قدم رکھ پائیں۔ ساتھ ساتھ ہماری متلاشی نگاہیں ہر طرف ٹھہرتی ہوئی جارہی تھیں مگر دور دور تک پھیلے ہوئے نیلگوں سمندر میں ہمیں کسی بحری جہاز یا کشتی کے آثار تک... نظر نہیں آرہے تھے۔ جدوجہد میں مصروف ہمیں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا کہ صبح سے دوپہر ہوگئی لیکن دور دور تک کسی کنارے کے آثار تک نظر نہیں آرہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صبح کے وقت ہم نے جہاں سے سفر شروع کیا تھا ابھی تک وہیں موجود ہیں۔ چند منٹ ستا لینے کے بعد ہم نے دوبارہ اپنی جدوجہد شروع کی۔ گرمیوں کے طویل دن تھے۔ دن ڈھلنے میں ابھی کافی وقت پڑا ہوا تھا۔ ایک آدھ گھنٹا سفر کے بعد طاہر بیزاری کے عالم میں بولا۔

''اتنی ہی کوشش کافی ہے مزید خواہ مخواہ کی کوشش سے ہماری رہی سہی توانائی بھی زائل ہوجائے گی۔ اب ہمیں ستانا ہوگا۔'' پھر طاہر کارک کی سطح پر تقریباً لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں بھی موند لیں۔ میں بھی بُری طرح تھک چکا تھا۔ طاہر کی تقلید میں اس کے برابر لیٹ گیا۔ پانی کی سطح پر کارک ہوا کے دباؤ سے دھیرے دھیرے تیرتا ہوا نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ تھکاوٹ کے باعث میری آنکھ لگنے میں دیر نہ لگی۔

☆☆☆

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ نیند کا خمار ابھی تک میری آنکھوں میں تھا۔ ذہن صورتِ حال کو سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا۔

''اٹھو جمیل..... دیکھو تو سامنے۔'' جیسے کوئی مجھے دور سے مسلسل پکار رہا ہو اور ساتھ میں مجھے جھنجوڑ بھی رہا ہو۔ میں غنودگی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اردگرد دیکھنے لگا۔ طاہر میرے سامنے تھا اور ہر طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آرہا تھا۔ ذہن پر چھائی ہوئی تھکاوٹ اور غنودگی تیزی سے چھٹنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی پُرسکون اور بے خبر دنیا سے بیداری کی پریشان کن دنیا میں واپس قدم رکھ چکا تھا۔

''کیا ہے؟'' میں نے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے بیزار کن لہجے میں پوچھا جو اس وقت کارک کو تیزی کے ساتھ کھینے میں مصروف تھا اور اُس کے چہرے پر مجھے بے پناہ خوشی اور جوش دوڑتا ہوا نظر آرہا تھا۔

''ہم کسی ساحل کے قریب پہنچ گئے ہیں جمیل۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''دیکھو، دیکھو..... وہ دیکھو سامنے۔'' وہ سامنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر پُرجوش انداز میں بولا۔

اس وقت مغرب کی طرف سورج کا سرخ گولا نصف تک سمندر میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ میں نے طاہر کے ہاتھ کے اشارے کا تعاقب کیا۔ جس طرف ہمارا رخ تھا کافی دور ڈوبتے ہوئے سورج کی ناتواں روشنی میں لپٹے ہوئے سرسبز جنگلات پر میری نگاہیں ٹھہر گئیں۔

''اوہ..... واقعی میں ہم لوگ خشکی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔'' میں بھی خوشی سے چہکا پھر ہم دونوں نے مل کر کارک کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

''ایک بھرپور نیند لینے کے باوجود بھی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے۔ بہرحال میری آنکھ ایک گھنٹے کے لیے لگی تھی۔ کنارہ نظر آنے تک میں یوں ہی پڑا رہا تھا۔'' طاہر نے کہا۔

''جگا دیتے مجھے۔'' میں نے کہا۔

''یہ خیال بھی آیا مجھے..... لیکن سوچا سونے دو اسے..... جب کنارہ مجھے نظر آیا تو خوشی کے مارے مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' طاہر بولا۔

''مجھے بھی یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ کم از کم ہمیں زمین تو نظر آگئی۔'' میں نے کہا۔ تازہ ہوا کے خوش گوار جھونکے وقفے وقفے سے چل رہے تھے۔ تاریکی پل پل بڑھتی چلی

جا رہی تھی۔ ہم دونوں صرف ٹراؤزر میں تھے... ہمارے جسم پر سرخ رنگ کی صرف لائف جیکٹ تھی۔ میری ٹارچ لانچ پر جھٹکے کی وجہ سے گر گئی تھی اور طاہر کے پاس سرے سے ٹارچ ہی نہیں تھی۔ کارک رفتہ رفتہ اتھلے پانیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے لہروں کی پُرشور آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سمندر پر اب کُلی طور پر تاریکی پھیل چکی تھی۔ اِکا دُکا تارے آسمان پر ٹمٹمانے لگے تھے۔ جوں جوں کارک آگے بڑھتا جا رہا تھا، پانی کے تیز بہاؤ اور طغیانی کی وجہ سے ہچکولوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تاریکی میں دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن اندازہ ضرور کر سکتے تھے کہ کنارہ اب بھی خاصی دوری پر ہے۔ آخر ہم سر اٹھاتی اور بکھرتی ہوئی لہروں کے مقام پر پہنچ گئے۔ کارک پر غضب کے دھچکے پڑنے لگے اور ایک بار کارک الٹتے الٹتے رہ گیا اور پھر شور مچاتی ہوئی بکھرتی موجوں کے تیز بہاؤ کے ساتھ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے کی طرف پھسلتا چلا گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کارک پر اکیلا ہوں اور طاہر میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ یقیناً طوفانی لہروں کے کارک کے ساتھ ٹکرانے سے پانی میں گر گیا تھا۔ شور اور تاریکی کی وجہ سے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔

میں نے طاہر کو آوازیں دینا شروع کیں لیکن سوائے ہر طرف شدت کے ساتھ بکھرتی ہوئی دیوپیکر لہروں کی چنگھاڑ کے، اور کوئی آواز میرے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی۔ خطرہ اب بھی موجود تھا۔ پانی کا تیز بہاؤ اسے اپنے ساتھ اٹھا کر منٹوں میں دوبارہ گہرے پانیوں میں بھی لے جا سکتا تھا اور دور کہیں کنارے پر بھی نکال پھینک سکتا تھا۔ اچانک کا یہ اکیلاپن مجھے کاٹنے لگا۔ موجوں کے رحم و کرم پر میرا کارک بے تحاشا اچھلتا مچلتا چلا جا رہا تھا اور میں نے پوری قوت سے اسے اپنے سینے سے چمٹا کر رکھا ہوا تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے پیروں نے آخر پانی کے اندر زمین کی سطح کو چھو لیا۔ میں نے سکون کی ایک لمبی سانس خارج کی۔ یہ احساس ہی میرے لیے بے پناہ خوشی کا باعث تھا کہ میں زندہ سلامت سمندر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور ساتھ ساتھ طاہر کی سلامتی اور یہاں سے بحفاظت نکلنے کے لیے بھی دعائیں مانگتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی میں بوجھل اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ساحل کی خشک اور نرم ریت پر پہنچ گیا۔ کارک میرے پاس تھا۔ تھکاوٹ سے میرا سارا بدن چُور چُور تھا اور غشی کے دورے بھی پڑ رہے تھے۔ دوسرے لمحے میں گھٹا ٹوپ تاریکی میں ساحل کی خشک اور نرم ریت پر تقریباً ڈھیر ہو گیا اور دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ نگاہوں کے سامنے تاریکی چھائی ہوئی تھی اور سماعتوں میں سمندر کا شور برپا تھا۔ جلد مجھے اپنے پیروں پر کھرچنے کا احساس ہوا جو لامحالہ میرے جاگنے کا سبب تھا۔ گہری تاریکی میں، میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن آسانی سے اندازہ کر سکتا تھا کہ میرے پیروں کو نوچنے اور کھرچنے والی چیزیں دراصل کیا بلا ہیں...... میں نے اپنی جگہ پڑے پڑے اپنے پیروں کو ایک زوردار جنبش دی۔ میرے جسم میں اچانک حرکت پا کر وہ بڑی تیزی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ دراصل وہ کنارے پر رہنے والے خاکی رنگ کے کیکڑے تھے جو مجھے مردہ سمجھ کر نوچ رہے تھے۔ مجھے اُن کی اس حرکت سے وحشت سی محسوس ہونے لگی۔ رات کی تاریکی میں ایک دور اُفتادہ ویران ساحل پر تنہائی کا احساس مجھے ڈسنے لگا۔

میں طاہر کے بارے میں سوچنے لگا کہ آخر اسے کیسے تلاش کیا جائے۔ رات کی تاریکی میں یہ کام مشکل تھا۔ مجھے دن کا انتظار کرنا تھا۔ ایک ویران ساحل پر خوراک اور خاص طور پر پانی کے بغیر زیادہ دن تک زندہ رہنا مشکل تھا اور پیاس مجھے اس وقت بھی ستا رہی تھی۔ سوچوں میں غلطاں ساحل کی ریت پر پڑے پڑے صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ سارے مناظر واضح ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی میں اٹھا اور اردگرد کا باقاعدہ جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا نیلگوں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آ رہا تھا تو دوسری طرف گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا سرسبز اور گھنا جنگل دور دور تک پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور میں قدرت کے ان دو شاہکاروں کے درمیان لبِ ساحل بے سروسامانی کے عالم میں اکیلا کھڑا تھا۔

میں نے کارک اٹھایا اور چلنا شروع کر دیا۔ میرا رخ اس طرف تھا جہاں میرے اندازے کے مطابق طاہر کے ملنے کا امکان زیادہ تھا۔ کنارے پر خوراک کی تلاش میں سرگرداں خاکی رنگ کے کیکڑوں کی فوج مجھے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بڑی تیزی کے ساتھ دوبارہ اپنے بلوں میں چھپنے لگی۔ بڑی سست روی کے ساتھ میرے قدم اٹھ رہے تھے اور میری نگاہیں سامنے دور دور تک بھیگی ہوئی ساحلی پٹی پر مرکوز تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹا سفر کے بعد مجھے کافی دور کنارے پر ایک سیاہ دھبا جیسی چیز نظر آنے لگی جو حرکت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کنارے پر کوئی چیز پڑی ہوئی تھی جس پر مجھے حرکت کا گمان ہو رہا تھا یا وہ واقعی متحرک تھی۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے سرِدست کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا لیکن یہ

دیکھ کر میرے دل میں امید و بیم کی ایک ہلکی سی کرن ضرور روشن ہوگئی تھی اور میرے بوجھل قدموں میں قدرے تیزی آگئی تھی۔

"طاہر بھی ہوسکتا ہے؟" میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

"نہیں یہ طاہر نہیں ہوسکتا۔ کوئی بے جان شے ہوگی یا کوئی جانور۔" اچانک میرے ذہن میں ایک منطق آمیز خیال کوندا جو میرے لیے مایوس کن تھا۔

طاہر کے جسم پر لائف جیکٹ تھی جو سرخ رنگ کی تھی اور دھوپ کی تمازت سے ان کی سرخی کافی فاصلے سے بھی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سیاہ رنگت والی کوئی چیز نظر آرہی ہے۔

مجھے وہ مسلسل حرکت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا رخ میری طرف ہو۔ آئندہ چند منٹوں کے اندر اندر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ایک جاندار تھا جو مسلسل حرکت کرتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ وہ ایک انسان تھا یا حیوان اس وقت اس بات میں تمیز مشکل تھی پھر اس بات کو بھی ظاہر ہونے میں دیر نہ لگی کہ وہ دراصل ایک انسان تھا۔ یہ دیکھ کر میری ڈھارس ایک دفعہ پھر بندھ گئی اگر وہ طاہر نہ بھی ہوا تو بھی یہ بات طے تھی کہ اس ویران ساحل پر کم از کم میری ملاقات ایک آدم زاد سے ہونے والی ہے۔

"طاہر کے سوا یہاں اور کون ہوسکتا ہے؟" میں نے خود سے کہا۔

شاید وہ بھی ساحل پر میری موجودگی کو پا چکا تھا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ ہمارے درمیان فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے اس کی چال میں طاہر کی چال کی جھلک نظر آنے لگی اور پھر اس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا جب اس نے اپنا ہاتھ اپنائیت کے ساتھ میری طرف لہرانا شروع کیا۔ میں اس کا اشارہ فوراً سمجھ گیا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ طاہر ہی ہے۔ جواباً میں نے بھی اپنا ہاتھ اٹھا کر لہرایا۔ آخرکار ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ تم نے کہاں سے اٹھا کر پہن لیا ہے..... میں سمجھا تھا کوئی اجنبی شخص میری طرف آرہا ہے۔" میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے طاہر کی طرف ایک دو قدم مزید بڑھانے کے بعد بغلگیر ہوتے ہوئے مسرت سے کہا۔

ہماری ایک دوسرے سے کبھی گاڑھی چھنتی نہیں تھی اور آج ہم دوبارہ ملنے پر خوشی کے مارے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

طاہر کے جسم پر ایک لمبا چوڑا سیاہ رنگ کا رین کوٹ تھا جو اس کے ٹخنوں پر آرہا تھا جس کی وجہ سے میں کافی فاصلے سے اس کی شناخت نہیں کرسکا تھا۔

"یہ مجھے کنارے پر پڑا ہوا ملا تھا۔" تھوڑی دیر بعد رین کوٹ کے بٹن کھول کر طاہر اس کے متعلق بتانے لگا۔ "بڑی اچھی حالت میں ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا۔" سارے بٹن کھلنے کے بعد رین کوٹ کے نیچے لائف جیکٹ کی جھلک نظر آنے لگی۔

"مجھے بڑی تشویش لاحق ہوگئی تھی کہ کہیں تمہیں پانی کا تیز بہاؤ دوبارہ گہرے پانیوں کی طرف نہ لے گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"کارک سے گرنے کے بعد تیز بہاؤ نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور لپیٹے میں لے کر کہیں دور پھینک دیا۔ میں بڑی مشکل سے کنارے کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا وقت لگا ہے۔" طاہر نے بتایا۔

"خوش قسمتی سے میں اس مقام پر نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جہاں ہمارا رخ تھا۔" میں نے اپنے بارے میں بتایا۔

"اچھا..... پھر تم نے کمال کر دیا ہے بھئی..... میں سمجھا تھا تم بھی کارک کے ساتھ تیز بہاؤ کے لپیٹے میں آگئے ہو۔" وہ حیرت سے بولا اور پھر رین کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چاقو نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی کام کی چیز ہے۔ میں اپنے ساتھ اٹھا لایا۔"

پھر میں اسے اپنے بارے میں بتانے لگا کہ اکیلا میرا وقت کیسے گزرا تھا۔

"زندہ رہنے کے لیے لازمی شے پانی ہے۔ ہمیں پہلے پانی تلاش کرنا ہوگا۔" طاہر نے کہا۔

"ہاں، پانی کی تلاش بے حد ضروری ہے۔ اس سے پہلے مدد کی کوئی صورت نکل آئے تو زیادہ بہتر ہوگا۔" میں نے نیلے سمندر پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا لیکن دور دور تک خالی سطحِ سمندر کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"کچھ دیر کے لیے یہاں سستا لیتے ہیں پھر پانی کی تلاش میں جنگل کی طرف نکلیں گے۔ مجھے غضب کی پیاس کا احساس ہو رہا ہے۔" طاہر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ہم دونوں نیچے بیٹھ گئے۔

☆☆☆

سرسبز و شاداب جنگل ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ ہم ساحل کو اپنے پیچھے چھوڑ کر گھنے جنگل میں داخل ہوگئے۔ چند قدم چلنے کے بعد اونچے اور تناور درختوں کا ایک گھنا سلسلہ

شروع ہو گیا جو آپس میں سر جوڑے اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ سورج کی کرنیں بمشکل آر پار ہو کر زمین تک پہنچ پا رہی تھیں اور سر پر ہر طرف سبز چھتا سایہ فگن تھا۔ لہٰذا ہر سُو نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور ہم بڑے محتاط انداز میں ننگے پیر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اور ہمارے قدموں تلے خشک پتے چرمرا رہے تھے۔ ہم درست طور پر اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس وقت ہم کس ملک کی سرحدوں میں موجود ہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہم اس وقت بحرِ ہند کے کنارے واقع کسی ملک کے ایک سنسان جنگل میں موجود تھے۔ پل پل ملگجی تاریکی سے ہماری آنکھیں مانوس ہو رہی تھیں۔ بلند و بالا اور تناور درختوں کے نیچے مختلف اقسام کے خاردار بیل بوٹے ہمیں نظر آ رہے تھے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر ہم ان خاردار بیل بوٹوں سے بچ بچا کر آگے بڑھ رہے تھے کہ کہیں ان میں سے کسی زہریلے بوٹے کا کانٹا ہمارے ننگے پیروں میں چبھ نہ جائے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہمیں ایک طرف مڑنا پڑا، کیونکہ آگے گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے راستہ مسدود تھا۔ اس طرح ہم سنسان اور تاریک جنگل میں میٹھے پانی کی تلاش میں سرگرداں کافی دور نکل گئے۔

"میرے خیال میں ہمیں واپس کنارے کی طرف چلنا چاہیے..... کم از کم وہاں کھلی فضا میں مرنا بہتر رہے گا۔ یہاں تو ایک پرندہ بھی پر نہیں مار رہا ہے۔" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔ حبس اور گرمی کی شدت سے ہمارے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"ہاں جمیل تم درست کہہ رہے ہو، یہاں پیڑ اور پودوں کے سوا زندگی کے اور آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ہمیں یہاں پانی کہاں ملے گا۔ کنارے پر کم از کم تازہ ہوا خوری کا موقع ملتا ہے۔" طاہر نے اثبات میں کہا اور ہم واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ پانی کے علاوہ ہمیں ناریل کے درختوں کی بھی تلاش تھی لیکن پورے کنارے سے لے کر یہاں تک ہمیں ناریل کا ایک پیڑ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ہمارا ارادہ کنارے پر سستا کر کچھ تازہ دم ہونے کے بعد دوبارہ پانی کی تلاش بسیار کے لیے نکلنا تھا۔ پانی ملنے کی امید ہمیں کم نظر آ رہی تھی۔ تاہم ایک ساحل کنارے ناریل کے پیڑ نظر آنے کی امید زیادہ کی جا سکتی تھی۔ ہم دوبارہ ساحل کی طرف گامزن تھے لیکن واپسی کے لیے ہم نے اس امید پر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا کہ شاید نئے راستے پر ہمیں اپنے مطلب کی چیزیں نظر آ جائیں۔ خالی پیٹ اور پیاس سے خشک حلق کے ساتھ جنگل کے حبس زدہ ماحول میں تقریباً آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارے اٹھتے قدم جواب دینے لگے اور ایسی حالت میں دم لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بہتر جگہ کا انتخاب کر کے ہم فروکش ہو گئے۔ یہاں ہوا قدرے کھل کر چل رہی تھی اور روشنی بھی خاصی پڑ رہی تھی جبکہ ہمارے دائیں طرف تقریباً ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر درخت اور جھاڑیوں کا ایک باہمی جھنڈ نظر آ رہا تھا جو ایک بڑے دہانے والے کھوہ کی شکل کا لگ رہا تھا۔ آپس میں ہم آئندہ کے حوالے سے باتیں کرتے جا رہے تھے پھر ہمارے درمیان خاموشی طاری ہو گئی۔ اسی اثنا میں طاہر اٹھا اور چہل قدمی کے انداز میں کھوہ نما جھنڈ کی طرف دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا اور میں مستقبل کے حوالے سے خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔

"ارے جمیل..... یہاں آؤ تو سہی....." اچانک طاہر کی حیرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں چونک کر خیالات کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ لیکن سامنے مجھے طاہر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہوا بھئی؟ کیا تم ٹھیک ہو؟" میں تشویش بھرے انداز میں تقریباً چیخا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔

"تم آؤ تو سہی....." اس کی آواز جھنڈ سے برآمد ہوئی۔

میں کھوہ نما جھنڈ کی سمت قدم اٹھانے لگا جس کا دہانہ تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ابتدائی لمحوں میں صاف طور پر کچھ نظر آنا مشکل ہو رہا تھا۔ اندر طاہر ایک ہیولے کی صورت کھڑا نظر آ رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں دہانے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ دیکھو۔" طاہر مختصراً بولا۔

اب مجھے جھنڈ کے اندر کا منظر واضح ہوتا ہوا نظر آیا جو اندر سے کسی کشادہ گپھا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

"دراصل یہ زیادہ تر کٹی ہوئی ٹہنیوں کا جھنڈ ہے۔" طاہر نے کہا۔

"میں نہیں سمجھا۔" میں نے نافہم انداز میں کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

"ابھی پتے پڑے گی ساری بات....." طاہر بولا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو جو اس نے کنارے پر سے اٹھایا تھا۔ جھنڈ پر رسید کر دیا۔ غیر متوقع طور پر ایسی آواز گپھا نما جھنڈ میں گونج اٹھی جیسے ضرب کسی ٹھوس ساخت والی چیز پر پڑی ہو۔

"ان شاخوں کو جلدی ہٹانا شروع کرو۔" طاہر نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں مل کر بڑی تیزی کے ساتھ پتے دار شاخیں اکھاڑنے لگے۔ ٹھوس آواز کا عقدہ

منٹوں میں کھل کر میرے سامنے آ گیا۔ جھنڈ سے ایک گاڑی نمودار ہونے لگی۔ پتے دار شاخوں کی مدد سے درختوں اور جھاڑیوں کے سرسبز جھنڈ میں بڑے ماہرانہ انداز میں گاڑی کیموفلاج کی گئی تھی۔ دراصل کھوہ نما جھنڈ کا ایک پورا حصہ پتے دار شاخوں سے چھپائی گئی گاڑی پر مشتمل تھا۔

''بڑی حیرت کی بات ہے۔'' حیرت کے مارے میرا منہ کھل گیا۔

''شاید اس میں ہمیں کھانے پینے کی چیزیں ملیں۔'' طاہر امید بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے نتیجے میں ویران اور سنسان جنگل میں اب ہمارے سامنے ایک سرمئی رنگ کی لینڈ روور جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ہم اس کے اردگرد گھوم کر اس کا جائزہ لے رہے تھے جو مکمل طور پر لاک تھی لیکن کھڑکیوں کے عام شیشوں سے اندرونی منظر جنگل کی نیم تاریکی میں قدرے واضح نظر آ رہا تھا۔ ہمیں اس وقت گاڑی کی پُراسراریت جاننے سے زیادہ اس میں اپنے مطلب کی چیزوں کی فکر تھی۔

''کھڑکی کا شیشہ توڑنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہی میں نے ایک پتھر ڈھونڈ کر درمیانی کھڑکی کا شیشہ ایک بھرپور ضرب سے چکنا چور کر دیا اور پھر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا جبکہ طاہر نگرانی کے لیے باہر ٹھہر ا رہا۔ اس کا فاصلہ گاڑی سے کچھ دور تھا۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں کافی چیزیں پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

''کوئی کام کی چیز ملی کیا؟ تاخیر مت کرو۔'' باہر سے طاہر کی آواز سنائی دی۔ میں وسطی نشستوں پر موجود تھا۔ طاہر کی آواز پر میں بڑی عجلت سے وسطی نشستوں کے نیچے متوجہ ہو گیا۔ اتفاق سے مجھے اپنے مطلب کی چیزیں نیچے نظر آ گئیں۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا جیسے مجھے ایک بیش بہا خزانہ اچانک مل گیا ہو۔ دو منرل واٹر کی بوتلیں اور ایک پلاسٹک بیگ جس میں میرے اندازے کے مطابق کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں اور اس وقت ان سے بڑا اور کوئی خزانہ ہمارے لیے نہیں تھا۔

''ہاں یار! بڑی کام کی چیزیں ہاتھ لگی ہیں۔'' میری آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔

''تو اب نکلنے میں دیر نہ لگاؤ۔'' طاہر بے قراری سے بولا۔

میں چیزوں سمیت گاڑی سے فوراً باہر آ گیا۔

''چلو..... یہاں سے جلدی نکل چلو..... میری چھٹی حس خطرے کی بُو سونگھ رہی ہے۔'' طاہر بے چینی سے بولا۔

''کیا تمہیں کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ ہوا ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''ایک بار مجھے جنگل کے سناٹے میں کچھ یوں گمان ہوا جیسے دور کہیں سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دے رہی ہو۔'' طاہر نے بتایا۔

''شاید تمہارا گمان ہو؟'' میں نے کہا۔

''وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے..... ہو سکتا ہے محض میرا گمان ہو..... اور نہ بھی ہو لیکن جھنڈ کے اندر سے جو گاڑی دریافت ہوئی ہے اس بات کو مدِنظر رکھا جائے تو میرا شبہ درست بھی ہو سکتا ہے۔'' طاہر نے پُراسرار گاڑی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ درست ہو..... ایک گاڑی یہاں تک آ سکتی ہے تو اور کیوں نہیں۔ بھاڑ میں جائیں گاڑیاں۔ ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں مل گئی ہیں۔'' آخر میں، میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

''واقعی یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے..... ہمیں ان سے فوراً مستفید ہونا چاہیے۔'' طاہر متفق انداز میں بولا اور پھر ہم دونوں نے ایک جگہ پر ڈیرا ڈال دیا۔ شاپنگ بیگ میں چپس اور غذائیت سے بھرپور بسکٹ کے پیکٹ تھے۔ پانی کی بوتلیں اور یہ سب اپنے سامنے پا کر پیاس سے خشک ہونٹ اور خالی پیٹ کے ساتھ مزید صبر کرنا مشکل تھا۔ نصف بوتل پانی اور چند بسکٹ لینے کے بعد ہماری توانائی خاصی حد تک بحال ہو گئی۔ باقی توشہ ہم نے آنے والے وقت کے لیے اپنے پاس سنبھال کر رکھا۔

اچانک جنگل کی پُرسکوت فضا میں دور سے آتی ہوئی ایک دھیمی آواز سماعت سے ٹکرانے لگی۔ آواز کی نوعیت سے طاہر کا گمان درست ثابت ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

''شاید یہ اور گاڑی ہو..... میرا مطلب ہے کہ اس گاڑی کا پُراسرار لینڈ روور سے تعلق نہ ہو اور ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ان سے کوئی مدد مل جائے۔'' میں نے خیال آرائی کی۔

''وقت کا تقاضا ہے کہ اس بات کی تصدیق کے لیے پہلے انتظار کر کے دیکھا جائے..... بروقت ہمیں اپنی موجودگی ہرگز ظاہر نہیں کرنی ہوگی۔'' طاہر نے اندیشے کا اظہار کیا اور میں اثبات میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

آواز مسلسل قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آنے والی گاڑی کا تعلق پُراسرار لینڈ روور سے ضرور ہوگا۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھے۔ ہمارا رخ کنارے کی طرف تھا۔ ارادہ تھا کہ کنارے کے آس پاس درختوں کے کسی جھنڈ میں چھپ کر اصل صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کریں گے۔ ابھی ہم اپنے طے کردہ مقام سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھے کہ فضا میں ایک اور نئی گونجتی ہوئی آواز کا اضافہ ہو گیا جو ایک موٹر بوٹ کی تھی۔ ایک ویران اور سنسان کنارے پر آخر یہ سب ماجرا کیا تھا؟ جھنڈ میں چھپائی گاڑی، دور جنگل کی طرف سے آتی ہوئی ایک اور گاڑی اور اب کھلے سمندر میں سے آتی ہوئی موٹر بوٹ، ان سب کا آپس میں کوئی تعلق تھا یا یہ سب کچھ ایک اتفاق تھا؟ فی الحال ہم کوئی اندازہ بھی قائم کرنے سے قاصر تھے۔ چند قدم اٹھانے کے بعد ہمیں سامنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان کھلے سمندر میں موٹر بوٹ کی جھلک نظر آ گئی جو پانی کی سطح کو بڑی تیزی کے ساتھ چیرتی ہوئی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہمارے پیچھے سرسبز گھنے جنگل کی طرف سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز قریب ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم دونوں درختوں کے اس جھنڈ میں ایک ایسی جگہ پر دبک کے بیٹھ گئے جہاں سے دونوں طرف نظر رکھنا ممکن تھا۔ گاڑی کے انجن کی آواز سے ہم فاصلے کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ تاہم موٹر بوٹ ہمیں صاف نظر آ رہی تھی۔

"میرے خیال میں لینڈ روور جہاں موجود ہے وہاں سے کنارے تک کسی گاڑی کا آنا ناممکن ہے۔" میں نے اندازہ قائم کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں بھی ایسا ہی ہوگا۔" طاہر متفق انداز میں بولا۔

کچھ دیر بعد جنگل کی طرف سے گاڑی کا شور آنا بند ہو گیا۔ شاید وہ لینڈ روور کے پاس پہنچ کر رک گئی تھی۔

"ارے..... وہ دیکھو طاہر۔" اچانک میری نگاہیں دور کھلے سمندر میں موجود ایک لانچ پر پڑیں، تو میں چونکے بنا نہیں رہ سکا۔ سفید رنگ کی لانچ دھوپ کی تمازت سے سمندر کی نیلی سطح پر چمک رہی تھی۔ میرے متوجہ کرنے پر طاہر کی نظریں لانچ پر فوراً ٹھہر گئیں۔

"شاید یہ سب ہنگامی کال کا نتیجہ ہو۔ کوئی ریسکیو ٹیم ہو..... جو ہمیں ریسکیو کرنے نکلی ہو اور ہم یہاں دبکے بیٹھے ہیں۔" طاہر نے کہا۔ اس کا اشارہ لانچ اور موٹر بوٹ کی طرف تھا۔ لانچ کا رخ بھی کنارے کی طرف تھا لیکن اس کی رفتار انتہائی دھیمی تھی۔

"لیکن احتیاط برتنا لازم ہے۔" پھر وہ خود ہی بولا۔

دیکھتے ہی دیکھتے موٹر بوٹ تیز رفتاری کے ساتھ کنارے پر آ لگی اور اس پر سوار افراد بڑی چستی کے ساتھ کود کر نیچے اترنے لگے۔ ان کی تعداد کل چھ تھی۔ دو سیاہ فام تھے جو خطرناک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ باقی چار سفید فام تھے جو بظاہر نہتے تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیٹلائٹ فون تھا جس پر وہ کسی سے رابطے میں نظر آ رہا تھا۔ ہم کنارے سے خاصے فاصلے پر موجود تھے۔ موٹر بوٹ ہمارے بائیں جانب کنارے پر تھی اور اس میں سے اترنے والے افراد کا رخ قدرے جھنڈ کی طرف تھا جس میں ہم اس وقت چھپے ہوئے تھے۔ بدقسمت لانچ کے عملے میں صرف ہم دونوں پڑھے لکھے افراد تھے جبکہ ہمیں موٹر بوٹ پر ایسا کوئی مونوگرام یا ایسے الفاظ درج نظر نہیں آ رہے تھے جس سے اس کا تعلق کسی ملک کے سرکاری و نجی ادارے یا کسی بین الاقوامی امدادی ادارے سے ظاہر ہوتا۔ ان افراد کی چال ڈھال اور انداز میں بھی ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر کسی ریسکیو ٹیم کی آمد کا گمان ہوتا، یہ کسی اور قبیل سے تعلق رکھنے والے لوگ نظر آ رہے تھے جو بڑی عجلت اور تیزی کے ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ہمارے دل دھڑکنے لگے اور پھر یہ دیکھ کر قدرے سکون کا احساس ہوا کہ وہ جھنڈ سے ایک فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے۔

"لگتا ہے کہ کوئی ریسکیو ٹیم ہمیں یہاں ڈھونڈنے پہنچ گئی ہے۔" میں نے سرگوشیوں میں کہا۔

"نجانے کیا چکر چل رہا ہے۔" طاہر آہستگی سے بولا۔

ہم دونوں لانچ کی طرف متوجہ ہو گئے جو اب لنگر انداز نظر آ رہی تھی۔

"پُراسرار لینڈ روور..... جنگل میں کسی گاڑی کے انجن کی بازگشت..... موٹر بوٹ اور پھر لانچ سب ایک پُراسرار زنجیر کی کڑیاں محسوس ہو رہی ہیں۔" میں نے دھیمے انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک اور نئی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" طاہر بڑے متفکر انداز میں گویا ہوا۔ آہستہ آہستہ ہمیں حالات کا ادراک ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ہم آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا جیسی کیفیت سے دوچار تھے۔ ہماری موجودگی کا اندازہ انہیں لینڈ روور کی حالت سے ہو گیا یا عنقریب ہونے والا ہے۔ ہم درختوں کے جھنڈ سے

نکلنے کا خطرہ مول لے نہیں سکتے تھے۔ وہ جھنڈ کے قریب ایک درخت کے سائے تلے آ کے کھڑے ہو گئے۔ اب ان کے چہروں کے خدوخال ہمیں واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اب ہمیں صاف سنائی دے رہی تھی جو وہ انگریزی زبان میں کر رہے تھے۔ اب ہمیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ ہماری نگاہوں کی تپش سے جھنڈ میں ہماری موجودگی کو بھانپ نہ لیں۔ اس لیے اب ہم اس وقت براہِ راست ان کی طرف دیکھنے سے کترا رہے تھے لیکن ہمارے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔

سیٹلائٹ فون والا گورا سیٹلائٹ فون پر بدستور دوسری طرف کسی سے رابطے میں تھا جو اپنے انداز سے بظاہر ان لوگوں کا سربراہ لگ رہا تھا۔ وہ دوسری طرف کسی کو جلدی سے آنے کا کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رابطہ منقطع کر کے اپنے پاس کھڑے ایک سفید فام ساتھی کی طرف متوجہ ہوا جس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا چرمی بیگ نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں سرگوشیوں کے انداز میں محوِ گفتگو ہو گئے۔ ان کی آواز صاف طور پر ہم تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ وقت جیسے ہمارے حق میں جمود کا شکار ہو گیا تھا پھر اچانک ہمیں ایک طرف درختوں کے درمیان سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ ہم دونوں اس طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ سیاہ فام مسلح افراد درختوں کے درمیان سے نمودار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ جھنڈ میں ہماری موجودگی پاتے ہم دونوں فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ چند ثانیے بعد وہ لوگ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہم سے اس قدر قریب سے گزرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ہمیں اپنی سانسیں تک بھی روکنا پڑیں۔ ان کا سارا دھیان بکسوں کو سنبھالنے پر مرکوز تھا جو درختوں کی شاخوں سے الجھتے جا رہے تھے۔ وہ جنگل کے دائیں طرف سے نکل کر آ رہے تھے اور ان کا رخ ہمارے بائیں طرف موجود موٹر بوٹ سے اترنے والے افراد کی طرف تھا۔

"یہ لو اپنا مال و اسباب......" جب وہ موٹر بوٹ والوں کے سامنے پہنچ گئے تو سب سے آگے والے نیگرو نے اپنے کندھے سے بکس اتارتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ اس کے لہجے سے بیزاری نمایاں تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی بکس نیچے رکھنا شروع کر دیے۔ سیٹلائٹ فون والے سفید فام نے ایک نگاہ سامنے زمین پر پڑے بکسوں پر ڈالی پھر اپنے ساتھیوں کو انہیں اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ سات درمیانی سائز کے چوبی بکس تھے۔ ہر ایک سیاہ فام ایک بکس اپنے کندھے پر اٹھا لایا تھا۔ جنگل کی طرف سے آنے والی پارٹی بھی بکسوں کے عدد کے برابر تھی۔ یعنی سات افراد پر مشتمل تھی۔ اس وقت موٹر بوٹ والی پارٹی بکس اٹھا رہی تھی۔ دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ بکسوں میں خاصی وزنی چیز موجود ہوگی۔

"یہ لو۔ اپنا کیش......" پارٹی سربراہ کے پاس کھڑے ہوئے سفید فام نے اپنے ہاتھ میں موجود سیاہ رنگ کا چرمی بیگ سامنے کھڑے ہوئے سیاہ فام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہمارے سامنے کنارے پر دراصل دو اسمگلر گروہوں کے درمیان ایک ڈیل ہو رہی تھی۔

"تم نے اس دفعہ بڑی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کیا جیک......" نیگرو ایک دفعہ پھر شکوہ کناں نظر آ رہا تھا۔ اس کا مخاطب موٹر بوٹ والی پارٹی کا سربراہ تھا۔

"ہم پرسوں یہاں طے شدہ وقت پر پہنچ گئے تھے تو تمہاری طرف سے اچانک یہ اطلاع آئی کہ ہم یہاں پہنچ نہیں سکتے...... کیا تمہیں خراب موسم کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا جو ہمیں یہاں سامان سمیت بلا کر خود آنے سے معذرت کر لی۔ نہیں آنا تھا تو ہمیں پہلے بتا دیتے۔"

"میں پہلے بھی تم کو بتا چکا ہوں کہ ہم مخمصے کا شکار ہو گئے تھے۔ سمندری طوفان کی پیشگوئی کا ہمیں علم تھا ڈیوڈ......" سفید فام سربراہ بتانے لگا جسے نیگرو نے جیک کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

"جب موسم کے تیور بدلتے ہوئے نظر آنے لگے پھر بھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے یوں ہی تم سے رابطہ ہونے میں تاخیر ہو گئی اور جب تک تم لوگ طے شدہ وقت پر یہاں پہنچ چکے تھے...... ویسے طوفان کے گزرنے کے بعد بھی گہرے پانیوں میں تلاطم کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ کل کی نسبت آج سمندر زیادہ پُرسکون ہے پھر بھی میں نے براہِ راست موٹر بوٹ سے آنے کے بجائے لانچ سے آنا بہتر سمجھا۔ زحمت اٹھانے پر ایک دفعہ پھر معذرت۔"

"اصل بات کچھ اور ہے۔" جنگل سے آنے والی پارٹی کا سربراہ بتانے لگا جسے ڈیوڈ کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ "اچھا ہوا کہ ہمارے پاس دوسری گاڑی تھی۔ بصورت دیگر ہمیں جنگل سے نکلنے کے لیے شہر سے گاڑی بلانا پڑتی اور گاڑی کے انتظار کی ہزیمت بھی اٹھانا پڑتی یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم پرسوں سے جنگل میں خوار ہو رہے ہوتے۔ ہماری لینڈ روور اپنے مقام پر پہنچ کر خراب ہو گئی جس کے خفیہ خانوں میں دو ٹن کی پیٹیاں چھپائی گئی تھیں۔" یہ سن کر ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔

pklibrary.com

"جب تمہاری طرف سے ہمیں نہ آنے کی غیر متوقع اطلاع ملی تو ہماری پریشانی مزید بڑھ گئی۔" ڈیوڈ نام کا سیاہ فام بول رہا تھا۔

"ہم ویپن کے ساتھ دوبارہ واپسی کے لیے سفر کا رسک نہیں لے سکتے تھے ہمیں ڈیل کے مطابق ایک دفعہ پھر انہیں اٹھا کر واپس یہاں جو لانا تھا...... ویپن کی پیٹیاں لینڈ رووَر کے خفیہ خانوں میں چھپائی ہوئی تھیں۔ باقی کام خراب لینڈ رووَر کو چھپانا تھا۔ ہم نے پیڑوں کی شاخیں کاٹ کاٹ کر لینڈ رووَر کو درختوں کے جھنڈ میں شاخوں تلے پوری طرح چھپا لیا لیکن آج اسے غیر متوقع طور پر ظاہری حالت میں پایا اور ایک طرف کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا پایا۔ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر کوئی گاڑی کے اندر داخل ہوا تھا اور کچھ معمولی قسم کی چیزیں بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کھانے پینے کی چند چیزیں...... جیسے انہیں صرف ان کی اشد ضرورت تھی۔"

ہم واضح طور پر سن اور دیکھ رہے تھے۔ اس دوران جیک کے کارندے موٹر بوٹ میں پیٹیاں رکھ رہے تھے جنہیں ڈیوڈ نامی سیاہ فام ویپن کی پیٹیاں کہہ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ بات ہے مسٹر ڈیوڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی تیسری پارٹی بھی اس دور افتادہ ویران ساحل پر اتفاق سے موجود ہے جو بے ضرر اور مصیبت زدہ بھی ہے...... لیکن اس میں ٹینشن لینے والی آخر بات کیا ہے وہ صرف اپنی ضرورت کی چیزیں لے گئے ہیں۔" جیک بے پروائی سے بولا۔

"بات چیزوں کی نہیں ہے۔ اصل بات اس دور افتادہ ویران علاقے میں انہیں ایک مشکوک گاڑی کا پایا جانا ہے۔ کوئی بے ضرر بھی آئندہ ہمارے لیے ضرر رساں بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" ڈیوڈ دلائل سے بولا۔

"ہاں یہ بات تو ہے...... کچھ اندازہ ہے کہ وہ کس طرف نکل گیا یا نکل گئے ہوں گے؟" جیک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں فی الحال ہم لوگ اندازہ نہیں لگا سکے ہیں۔ گاڑی کے قرب و جوار میں پڑے ہوئے خشک پتے اور ٹہنیوں پر پیروں کے نشانات ملنا ناممکن ہے۔" ڈیوڈ نے بتایا۔

"لانچ، موٹر بوٹ، لینڈ رووَر یہ سب انتظامات اور ان کی باتوں سے ہمیں اچھی طرح علم ہو رہا تھا کہ اس ویران اور دور افتادہ ساحل پر بڑے پیمانے پر اسلحے کی اسمگلنگ ہو رہی تھی اور یہ ویران ساحل ان کی غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتا آرہا ہے۔ اس وقت موٹر بوٹ کے ذریعے اُتھلے پانیوں سے گہرے پانیوں میں لنگر انداز لانچ پر غیر قانونی اسلحہ منتقل کرنے کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔ اس وقت ہمارے سامنے پیڑ کے سائے تلے جیک اور ڈیوڈ سمیت کل نو افراد موجود تھے۔

"یہ تم لوگوں کی ذمے داری بنتی ہے کہ انہیں تلاش کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اوکے۔ فی الحال اب ہم چلتے ہیں۔" جیک نے الوداعی انداز میں کہا۔ عین اسی موقع پر ساحل کی پُرسکوت فضا کسی ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ سے مرتعش سی ہونے لگی۔ سب کی نظریں ایک دم سے اوپر اٹھ گئیں اور ہم بھی درختوں کے جھنڈ میں کھلے آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ سامنے کافی دور کنارے کنارے سے ایک ہیلی کاپٹر خاصی نچلی پرواز کرتا ہوا ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ سب چوکنا ہو گئے۔

"یہ اس وقت کہاں سے آن ٹپکا۔ لگتا ہے ہماری سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔" سیاہ فام ڈیوڈ گرجا۔

صورتِ حال گمبھیر ہونے کا کافی امکان نظر آرہا تھا۔ برّ، بحر کے بعد اب فضا سے ایک نئی عفریت نازل ہو رہی تھی۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جانے کا خاصا امکان نظر آرہا تھا۔ فضا سے اسمگلر ہونے کے دھوکے میں ہمارا بے گناہ مارے جانے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اور زمین پر کسی سرکاری مخبر ہونے کے شبہے میں مارے جانے کا خدشہ نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ زمین سخت اور آسمان بے رحم ہو گیا تھا ہمارے لیے۔ ہم ہر طرف خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ہمیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ ہیلی کاپٹر سے چھپنے کے لیے جھنڈ کی طرف نہ لپکیں جس میں ہم چھپے بیٹھے تھے لیکن خوش قسمتی سے وہ پلک جھپکتے میں پیڑ کے تلے سے نکل کر گھنے جنگل میں داخل ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے لیکن جو کنارے پر ان کے ساتھی موٹر بوٹ کے پاس موجود تھے، ان کے پاس ہیلی کاپٹر سے بروقت چھپنے کی جگہ کہاں تھی۔ وہ ہکا بکا نظر آرہے تھے۔ آناً فاناً ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر پہنچ کر چکرانے لگا جواب ہمیں قدرے واضح نظر آرہا تھا۔ وہ اپنے طرز و انداز سے کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے کا ہیلی کاپٹر نظر آرہا تھا۔ انتہائی غیر یقینی صورتِ حال کا سماں بندھ گیا تھا۔

اچانک فضا فائرنگ کی آواز سے لرز اٹھی اور موٹر بوٹ کے پاس موجود افراد اب بھاگم بھاگ درختوں کے جھنڈ کی

pklibrary.com

طرف آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ وہ ساتھ ساتھ فضا میں چکراتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف بھی فائرنگ کرتے جارہے تھے لیکن ہیلی کاپٹر کی طرف سے بھی جوابی فائرنگ میں دیر نہ لگی اور اس کے نتیجے میں جنگل کی طرف بے تحاشا دوڑ لگانے والے افراد میں سے چند ایک چیخ کر منہ کے بل کنارے پر ڈھیر ہوگئے چند سیکنڈ بعد باقیوں کا انجام بھی اپنے ساتھیوں جیسا ہوا..... دوڑتے اور ہیلی کاپٹر کی طرف اوپر فائر داغتے ہوئے جنگل میں گھسنے کی کوشش میں وہ ہیلی کاپٹر سے برستی ہوئی گولیوں کا یکے بعد دیگرے شکار ہوتے چلے گئے۔

ہیلی کاپٹر بڑی تیزی کے ساتھ فضا میں گھوم کر گھنے جنگل کی طرف بڑھا جس طرف تھوڑی دیر قبل جیک اور ڈیوڈ نامی اسمگلر اپنے ساتھیوں سمیت نکل بھاگے تھے۔ شاید وہ بھی ہیلی کاپٹر میں موجود افراد کی نظروں میں آچکے تھے اور اب ہیلی کاپٹر سے ان کا پیچھا کیا جارہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے کھلے ہوئے دروازے سے مخصوص یونیفارم میں ملبوس مسلح جوانوں کی ایک جھلک ہمیں نظر آگئی۔ فائرنگ میں وقفہ آگیا تھا۔ لیکن یہ وقفہ محض چند لمحوں کا ثابت ہوا۔ ایک دفعہ پھر گولیوں کی تھرتھراہٹ فضا میں گونج اٹھی۔ فائرنگ کی شدت سے اندازہ ہورہا تھا کہ بھاری ہتھیاروں کا استعمال بھی اب ہورہا ہے۔ سر کے اوپر سے زن کے ساتھ گزرتی ہوئی گولیوں کی بازگشت خوفناک انداز میں سنائی دے رہی تھی۔ خوف کے مارے ہم کانپ رہے تھے اور آپس میں ہم باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔ کھلے سمندر میں لنگرانداز لانچ کی طرف سے بھی اب فائرنگ ہورہی تھی۔ دونوں طرف سے برستی ہوئی گولیاں ہمارے اوپر سے گزرتی ہوئی ٹارگٹوں کی طرف بڑھتی جارہی تھیں اور جنگل میں چھپے ہوئے اسمگلر بھی ہیلی کاپٹر کے ساتھ لڑنے میں مصروفِ عمل تھے۔ پرائے پھڈے میں پھنسے ہوئے ہمیں اپنی بقا کا سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ فضا میں ہر سُو ہیلی کاپٹر کی گھن گرج اور دل دہلانے والی فائرنگ کے شور کا راج تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کو اسمگلروں پر غلبہ حاصل تھا۔ وہ فائرنگ کی زد سے محفوظ نظر آرہا تھا یا اس کی ٹھوس ساخت کے سامنے گولیاں اپنا اثر کھو رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر فضا میں مختلف زاویوں سے چکر کاٹ کر سمندر اور خشکی پر موجود اسمگلروں سے لڑ رہا تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ تمام اسمگلروں کا صفایا کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرے گا۔ جنگل کی طرف سے زوردار دھماکوں کی گونج سنائی دینے لگی۔ گمان ہورہا تھا کہ جیسے ہیلی کاپٹر سے جنگل میں موجود اسمگلروں کے ٹولے پر ہینڈ گرینیڈ پھینکا جارہا ہو۔ کیونکہ اس وقت ہیلی کاپٹر ہماری نظروں سے اوجھل تھا صرف ہم اس کی آواز سے اس کی سمت کا اندازہ لگا رہے تھے جو جنگل کی طرف سے ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ مزید چند اور زوردار دھماکوں کے بعد جنگل کی طرف سے فضا میں دھوئیں کا ایک ہلکا سا بادل اٹھتا ہوا نظر آنے لگا اور ہیلی کاپٹر اچانک دھوئیں کے بادل کے پاس نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس کا رخ کھلے سمندر کی طرف تھا۔ اس وقت جنگل کی طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں معدوم ہوچکی تھیں۔ مگر کھلے سمندر میں لنگرانداز لانچ کی طرف سے فائرنگ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر سے لمحہ بھر کے وقفے کے بعد اب دوبارہ لانچ پر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لانچ سے بھی دھواں اٹھتا ہوا نظر آنے لگا۔ ایک آدھ منٹ بعد وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر فضا میں صرف ہیلی کاپٹر کی گھن گرج باقی رہ گئی۔

☆☆☆

ہم دور سے دیکھ رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر سے لٹکتے ہوئے رسی کے زینے سے مسلح جوان لانچ میں اتر رہے تھے۔

''کچھ یوں محسوس ہورہا ہے کہ سارے کے سارے اسمگلر مارے گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟ یہاں جھنڈ میں چھپے بیٹھے رہیں یا باہر نکل کر اپنی موجودگی ان پر ظاہر کریں؟'' طاہر فکرمندی سے بولا۔

''باہر نکل آئے تو یہ ہمیں اسمگلروں کا بچا کھچا ساتھی سمجھ کر مار ڈالیں گے اور یوں ہی چھپے بیٹھے رہے تو ہوسکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔'' میں اُلجھن آمیز انداز میں بولا اور پھر ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

لانچ سے فارغ ہونے کے بعد ہیلی کاپٹر کنارے کی طرف پرواز کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس وقت ہم بھی کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ ایک آدھ منٹ ہیلی کاپٹر فضا میں چکر کاٹتا رہا پھر کنارے پر ایک مناسب جگہ پر لینڈ کرنے لگا جہاں ایک فاصلے پر موٹر بوٹ کنارے پر لگی نظر آرہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کے لینڈ کرنے کے فوراً بعد مسلح جوان اتر آئے اور ہیلی کاپٹر کے گھومتے ہوئے پروں کے نیچے سے جھکے ہوئے انداز میں بڑی مستعدی کے ساتھ موٹر بوٹ کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ چند منٹوں کے اندر اندر وہ ونچن کی ساری پیٹیاں اور کچھ دیگر چیزیں اٹھائے واپس ہیلی کاپٹر کی طرف آتے ہوئے نظر آنے لگے۔ جھنڈ سے ہیلی کاپٹر کا فاصلہ خاصا تھا اس سے قبل کہ وہ

ہیلی کاپٹر تک آپہنچے اور ہیلی کاپٹر انہیں لے کر ٹیک آف کر جاتا ہم دھڑکتے دل کے ساتھ جھنڈ سے باہر آ گئے۔

طاہر نے رین کوٹ جسم سے اتار کر جھنڈ میں پھینکا... جو اس نے کنارے سے اٹھایا تھا اب میری طرح اس کا بالائی جسم برہنہ تھا جبکہ لائف جیکٹ اور کارک وغیرہ ہمارے ہاتھوں میں موجود تھے۔ ایسا اس خیال سے کیا گیا تھا کہ رین کوٹ کی وجہ سے وہ کہیں ہمیں اسمگلر سمجھنے کی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ ہم نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر لہرانے شروع کیے اور ساتھ ساتھ گلا پھاڑ کر انگریزی میں ایک ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''پلیز ہماری مدد کیجیے..... ہم مصیبت زدہ ہیں۔ ہماری لانچ حادثے کا شکار ہوگئی۔'' ایک لمحے کے لیے دل زور سے دھڑکا کہ کہیں سینہ گولیوں سے چھلنی نہ ہو جائے۔ ہمارے ہاتھ بدستور مدد طلب انداز میں ہوا میں لہرا رہے تھے اور ہم مسلسل اپنی بپتا سنانے کی کوشش کرتے جا رہے تھے۔ چند ثانیوں بعد چار مسلح سپاہی ہماری طرف محتاط انداز میں قدم اٹھانے لگے جن کی رائفلوں کا رخ سیدھا ہماری طرف تھا اور ہم بھی ان کی طرف چھوٹے چھوٹے قدم بھرتے جا رہے تھے۔ آخر ہم ایک دوسرے کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا واقعی تم لوگ غرق شدہ لانچ کے عملے سے ہو، جنہیں ہم تلاش کرنے یہاں پہنچے تو اتفاق سے ہماری مڈبھیڑ اسمگلروں سے ہوگئی؟'' ان میں سے ایک نے کہا اور اس کے منہ سے ایسا غیر متوقع جملہ سن کر ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے فوراً مختصر لفظوں میں سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنے لگے جہاں اُن کے ساتھی بھی ہماری طرف متوجہ تھے۔ ایک طرف مارے جانے والے اسمگلروں کی لاشیں کنارے پر بکھری پڑی تھیں۔

☆☆☆

یہ کینیا کوسٹ گارڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں دہری کامیابی پر جشن کا سماں تھا۔ لانچ سے ایمرجنسی کال کے فوری بعد لانچ کے مالک نے طوفان میں بُری طرح پھنسی ہوئی اپنی لانچ کے بارے میں متعلقہ ملک کے حکام کو مطلع کیا تھا۔ اسی وقت کینیا کوسٹ گارڈ کی طرف سے ایک ٹیم تیار ہو کر ہیلی کاپٹر پر سمندری طوفان میں پھنسی ہوئی لانچ کو ریسکیو کرنے کے لیے گہرے پانیوں کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ لیکن خراب موسم اور رات کی گہری تاریکی میں وسیع و عریض سمندر میں ایک لانچ کو بروقت ڈھونڈنا انتہائی مشکل کام تھا۔ کیونکہ لانچ سے رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ کسی طرح اس تک پہنچ جانا ممکن ہوتا۔ اس طرح وہ لانچ کو اپنے تئیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے لیکن لانچ کب کی دولخت ہو کر ڈوب چکی تھی۔ آخر کار ٹیم کو واپس ناکام لوٹ آنا پڑا۔ انہیں بھی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ لانچ اب تک غرق آب ہو چکی ہے۔ جب موسم میں بہتری آنا شروع ہوگئی تو ہمیں ڈھونڈنے کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ یوں... آج وہ ہمیں زندہ اور مردہ ہر دو صورتوں میں کنارے کنارے پر ڈھونڈنے میں مصروف تھے کہ ان کا سامنا غیر متوقع طور پر مخلے میں اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث ایک بین الاقوامی گروہ کے ٹولے سے ہوا۔ جس کے نتیجے میں کوسٹ گارڈ کو ایک اتفاقیہ کارروائی کے بعد ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ لانچ، موٹر بوٹ اور گاڑیوں سمیت سارا اسلحہ پکڑا گیا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ جیک اور ڈیوڈ نامی انتہائی مطلوب اسمگلر مارے گئے تھے۔ صرف ایک کارندہ زندہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ دوسری بڑی کامیابی یہ تھی کہ ویران ساحل پر وہ غرق شدہ لانچ کے عملے کے دو افراد کو زندہ سلامت ڈھونڈ کر نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یعنی صرف ہم دونوں۔ ہمارے باقی ساتھیوں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

میں اور طاہر مسرت اور اندوہ کی ملی جلی کیفیت میں ایک طرف خاموش بیٹھے ڈھول کی تھاپ پر رقصاں کوسٹ گارڈ کے افسران و اہلکار کو دیکھ رہے تھے۔

کوسٹ گارڈ کے ایک سیاہ فام اہلکار نے اپنے سفید دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''نئی زندگی ملنے کی خوشی میں تم لوگ بھی جشن مناؤ۔''

ہم لوگوں نے یہ کہہ کر معذرت کی ہم بے حد تھکے ہوئے ہیں۔ ہم نئی زندگی ملنے پر بے پناہ خوش تھے اور اپنے پروردگار کے بے حد شکر گزار تھے کہ ہمیں ہر آفت سے زندہ سلامت نکلنے میں مدد دی۔ لیکن ہمارے دل و دماغ کسی جشن منانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ہمیں اپنے ایک ایک ساتھی کی فکر لاحق تھی۔

دراصل کوسٹ گارڈ والے ہم سے بے حد خوش تھے کہ انہیں غرق آب لانچ کے عملے کو تلاش کرنے کے نتیجے میں ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اسمگلروں کی ناکامی، کوسٹ گارڈ کی کامیابی یہ سب کچھ سمندری طوفان کا نتیجہ تھا جس نے سب کو ایک دور افتادہ ویران ساحل پر عین موقع پر اکٹھا کر دیا تھا۔

❖❖❖

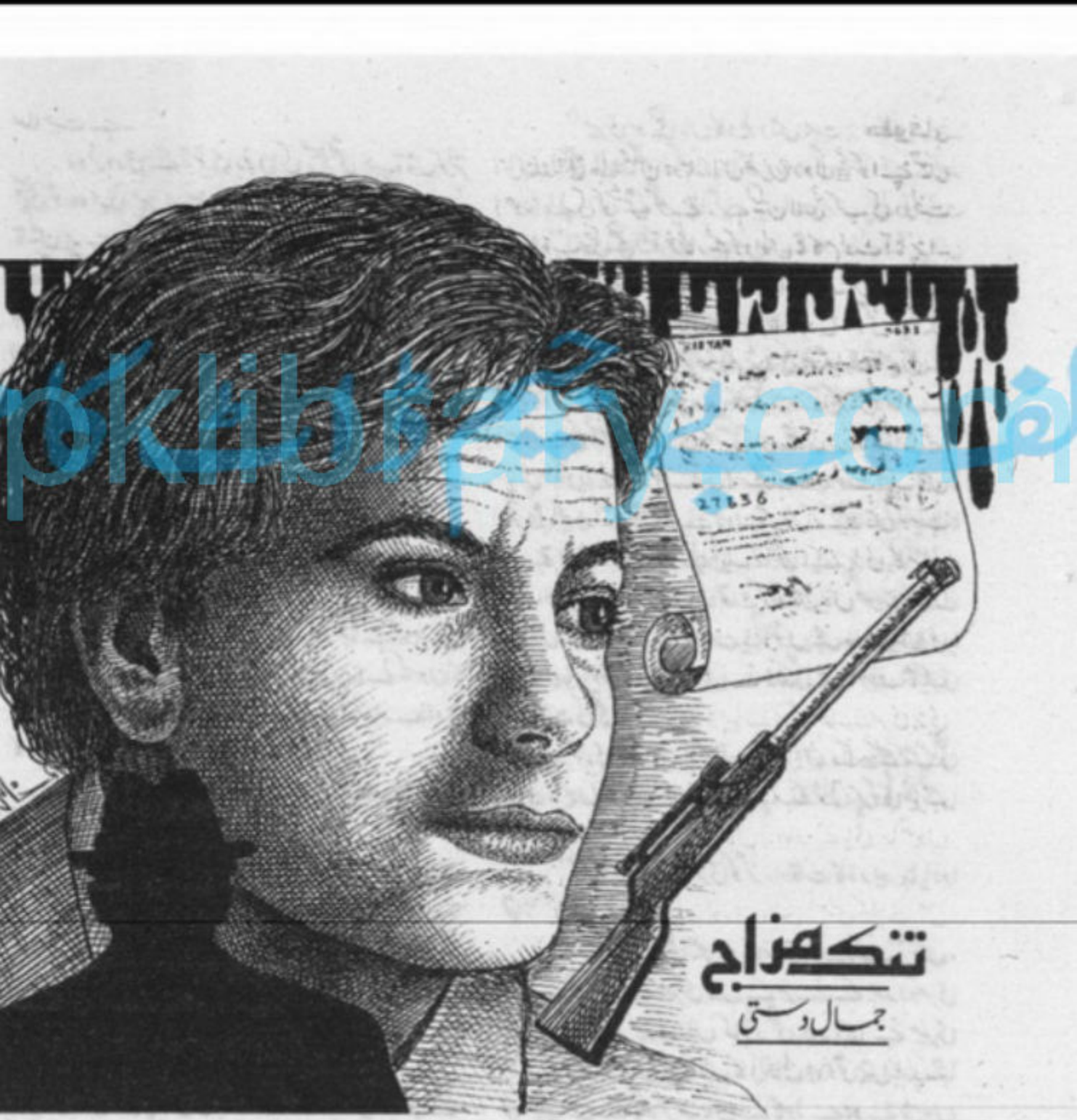

تنک مزاج

جمال دستی

اپنا جرم چھپانے کے لیے مجرم کی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس کے پیچھے سچ پوشیدہ رہے... سالوں سے فائلوں میں بند ایک ایسے ہی کیس کی رُوداد... ذہانت اور غوروفکر کی عادت نے سراغ رساں کو وہ راستہ سجھا دیا جس پر چل کے حقیقت کی تہ تک پہنچا جا سکتا تھا...

تنک مزاج حامل شخص کی کارستانی..... بے سکونی نے اسے گھائل کر رکھا تھا.....

رابی کورین کچھ پریشان اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے تھے اور اس کے گالوں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی فرم میں کام کرتے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران رابی نے مجھ سے ایک درجن کے قریب غیر حل شدہ کیسز پر تبادلۂ خیال کیا لیکن ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی حل نہیں کر سکے اور شاید اسی وجہ سے وہ پریشان تھا جبکہ اس فرم کا دعویٰ تھا کہ مردہ کیس حل کرنا ہی اس کی خاص

صلاحیت ہے۔

وہ فروری کے آخری دنوں کی صبح تھی جب میں دفتر پہنچی تو وہ اپنی میز پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ میں نے قالین پر سے ایک کاغذ اٹھایا، وہ ایک ایسے شخص کی جانب سے بھیجی گئی ای میل تھی جو اپنے باپ کی موت کے بارے میں ہماری فرم سے رجوع کرنا چاہ رہا تھا۔ پولیس کے مطابق اس کے باپ نے خودکشی کی تھی لیکن اسے اس پر یقین نہیں تھا، اس کا باپ کبھی خودکشی نہیں کرسکتا اور اسی سلسلے میں وہ ہم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

''کیا تم نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا؟'' میں نے وہ کاغذ ہاتھ میں لہراتے ہوئے کہا۔

''میری پلیٹ پہلے ہی پوری طرح بھری ہوئی ہے۔'' رابی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ جب تم اس نئے کیس پر کام کرو تو اس کے ساتھ ہی پرانے کیسوں کا بھی نئے سرے سے جائزہ لے سکو گے۔ اگر تمہارے اوپر کام کا زیادہ بوجھ ہے تو میں یہ کیس دیکھ لوں گی۔''

رابی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم لو دینا؟'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تمہاری ٹریننگ شروع ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے اور ابھی تمہیں پرائیویٹ سراغ رساں لائسنس بھی نہیں ملا لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ اپنے طور پر کوئی کیس ہینڈل کرلو گی تو میں اسے ملاقات کا وقت دے دیتا ہوں اور تم اس کی فائل پڑھ سکتی ہو لیکن بہت زیادہ توقع مت کرنا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں نے پولیس کی ملازمت کے دوران خودکشی کے کئی کیسز کی تحقیقات کی اور اس کے نتیجے میں یہ ثابت ہوگیا کہ مرنے والے نے خودکشی کی تھی لیکن ان کے وارثوں نے کبھی اسے تسلیم نہیں کیا۔ خودکشی ان کے لیے ایک بڑا صدمہ ہوتی ہے۔ خاندان کے افراد اور دوست سمجھ نہیں پاتے کہ مرنے والے نے خودکشی کیوں کی؟ یہ بھی شاید اسی طرح کا کیس ہے۔ اس شخص کو چاہیے کہ وہ کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرے۔

اسی روز سہ پہر میں ہماری ملاقات کارنیلس میجر سے ہوئی۔ وہ تقریباً تیس سالہ موٹا اور پستہ قد شخص تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی ہے اور ایمسٹرڈم میں رہتا ہے۔ اس کا باپ بھی دوسری شادی سے پہلے اسی شہر میں رہائش پذیر تھا۔

''میری سوتیلی ماں کا ویلیو میں بہت بڑا مکان ہے۔ اس ولا کی مالیت کم از کم دس لاکھ یورو ہوگی۔ شادی کے بعد میرا باپ اس کے گھر چلا گیا۔ یہ سات برس پہلے کی بات ہے۔'' اس نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔''

''وہ کیوں؟'' رابی نے پوچھا۔

''اسے دوبارہ شادی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کم از کم اس عورت سے نہیں۔'' کارنیلس نے کہا۔ ''وہ اس کے مطلب کی نہیں تھی۔ اس کا تعلق اپر کلاس سے ہے، اس کے پاس اچھی زندگی گزارنے کے لیے بہت دولت ہے۔ اس کا فرنچ ریویرا میں بھی سمر ہاؤس ہے۔ اس کے علاوہ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟ وہ اس کے لیے ایک ساتھی سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک ایسا شخص جو اس کا بازو تھام کر گاؤں میں گھومتا پھرے اور اس کے ساتھ تفریح گاہوں یا ہوٹلوں میں جائے لیکن میرا باپ ایسا آدمی نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں صرف شاعری سے محبت کی تھی۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔ یوں لگا جیسے اسے اپنے باپ کے شوق پر کوئی فخر نہیں تھا۔

''کیا اس نے شاعری کو گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہوا تھا؟'' رابی نے پوچھا۔

کارنیلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، اسی لیے تو اس نے میری ماں کے مرنے کے بعد دوسری شادی کی تھی۔ میری ماں کماتی تھی اور اسی نے میری پرورش کی۔ نو برس پہلے اس کا انتقال ہوا تو میرا باپ تنہا رہ گیا۔ اس نے کچھ عرصہ ماں کے چھوڑے ہوئے پیسوں پر گزارہ کیا اور جب وہ رقم ختم ہوگئی تو اس نے روزا سے شادی کرلی۔''

کارنیلس نے ہمیں بتایا کہ ان دونوں کی ملاقات ایمسٹرڈم کی ایک تقریب میں ہوئی جہاں میرے باپ نے اپنی ایک نظم پڑھی تھی۔ روزا اس کی شاعری اور خاص کر اس کے طرزِ بیان سے بہت متاثر ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو جانے یا سمجھے بغیر ہی شادی کرلی جس کے نتیجے میں بہت جلد ان کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ میرا باپ ایک تنک مزاج شخص تھا۔ اسی لیے اس نے کسی ممکنہ تنازع سے بچنے کے لیے تنہا رہنے کو ترجیح دی جبکہ روزا اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسے اپنی ہم مزاج دوستوں میں بیٹھنا پسند ہے جو سب اپر کلاس سے تعلق

رکھتی ہیں۔ اسے بے اولاد ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اس نے ایک شاعر سے شادی کر کے اس کمی کو پورا کرلیا ہے۔ وہ روزانہ ملتے تھے اور ہفتے میں سو سے زیادہ فون کرتے تھے۔ پانچ سال پہلے تک صورت حال قدرے بہتر تھی پھر میرے باپ نے پسپائی اختیار کرلی اور جنگل میں اپنے رہنے کے لیے شیڈ بنالیا۔ وہیں اس کی موت واقع ہوئی لیکن تقریباً چار ماہ قبل اس کی لاش دریافت ہوئی۔"

"چار ماہ قبل؟"

کارنیلس نے تائید میں سر ہلایا۔ "اکتوبر کے وسط میں میری سوتیلی ماں موسم سرما گزارنے کے لیے جنوبی فرانس میں واقع اپنے گھر چلی گئی جبکہ میرا باپ ہالینڈ میں ہی رہا۔ پولیس یقین سے نہیں بتا سکتی کہ اس کی موت کب واقع ہوئی لیکن یہ اکتوبر کے آخر یا نومبر کے شروع میں ہوئی تھی جب انہیں لاش ملی تو وہ بُری طرح گل سڑ چکی تھی۔"

"کتنی خوفناک بات ہے۔" میں نے کہا۔

کارنیلس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے یہ ایک بدترین خبر تھی۔" اس نے پُرتاسف لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے میں اپنے آپ کو الزام دیتا ہوں۔ اس کی دوسری شادی کے بعد ہمارے درمیان بہت کم رابطہ رہ گیا تھا کیونکہ اپنے کام اور بیوی بچوں کی وجہ سے میری مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا تعلق ہر سال کرسمس کے موقع پر کارڈ بھیجنے تک محدود رہ گیا تھا۔"

"اور تمہیں یقین ہے کہ تمہارے باپ کو قتل کیا گیا ہے؟" رابی نے پوچھا۔

"بالکل جب مجھے دسمبر میں اس کا کرسمس کارڈ نہیں ملا تو مجھے اس کی خبر لینی چاہیے تھی۔ اس طرح ہمیں اس کی لاش بہت پہلے مل جاتی۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"میرا خیال تھا کہ وہ روزا کے ساتھ دیلو دگیا ہو گا۔ وہ ہر سال خزاں اور سردیوں میں پانچ چھ مہینے وہاں گزارتی ہے۔ گزشتہ ستمبر میں وہ معمول کے مطابق فرانس گئی اور اس کا کہنا ہے کہ ان مہینوں میں اس کا میرے باپ سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے کئی بار فون کیا لیکن میرے باپ نے فون نہیں اٹھایا۔ میرا خیال ہے کہ روزا کا اس قتل سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ہے۔"

"تمہارے خیال میں قتل کا محرک کیا ہوسکتا ہے؟"

"ضرورت۔" کارنیلس نے کہا۔ "وہ اسے طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ ایسی صورت میں ہالینڈ کے قانون کے مطابق اسے اپنی نصف جائداد اور اثاثے میرے باپ کو دینا پڑتے اور یہ صرف اس کی دولت ہی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں اتنے سالوں تک ایک ساتھ رہے۔ میرا باپ مالی طور پر اس کا محتاج تھا۔ وہ ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں ایک معقول رقم جمع کروا دیتی تھی جس سے اس کا گزارہ ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سوشل سیکیورٹی کا حق دار ہوتے ہی اسے طلاق دے دیتا کیونکہ ان کے تعلقات بہت پہلے خراب ہو چکے تھے۔"

"تمہارے باپ کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"اسے گولی ماری گئی تھی۔"

"اس کے شیڈ میں؟"

ہمارے مہمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ کوئی اس کے شیڈ میں داخل ہوا۔ اسے قابو کر کے اسی کی شکاری رائفل اس کی ٹھوڑی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا لیکن بہت زیادہ وقت گزر جانے کی وجہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی موت کی وجہ جاننے میں اتنی تاخیر نہ ہوتی۔"

"وہ شکاری رائفل تمہارے باپ کی تھی؟"

"وہ اسے جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔" کارنیلس نے وضاحت کی۔ "تاکہ وہ کام کے دوران اسے پریشان نہ کریں۔ اس کی رائفل ہمیشہ بھری ..... ہوتی تھی۔"

"کیا تم کبھی اپنے باپ سے ملنے دیلو دگئے؟"

"تین سال پہلے ایک دفعہ گیا تھا۔ اس وقت روزا فرانس میں تھی ورنہ میں تب بھی نہ جاتا۔ مجھے اب بھی الوداعی منظر یاد ہے جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تو وہ شیڈ کو جانے والے تنگ راستے پر چل رہا تھا۔ اس نے اندر جا کر دروازہ بند کرلیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ تین سال بعد وہ اسی دروازے کے پیچھے مردہ پایا گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اس کا یہ انجام نہ ہوتا اگر اس عورت سے اس کی شادی نہ ہوتی۔"

اس نے ہمیں ایک پتلی سی فائل تھمائی اور رابی نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم اگلے روز دیلو دگا دورہ کریں گے۔ اس فائل میں جائے وقوعہ کی کوئی تصویر تھی اور نہ ہی کوئی فارنسک رپورٹ۔ لگتا تھا کہ ان ثبوتوں کی ضرورت محسوس

نہیں کی گئی کیونکہ بظاہر اس کی موت کو خودکشی سمجھا جارہا تھا لیکن ہمارا کلائنٹ اس سے مطمئن نہیں تھا۔ کیا یہ بھی ایک ایسا ہی کیس ثابت ہوگا جس میں وارثوں کو یقین نہیں آتا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے۔

پولیس رپورٹ کے مطابق البرٹ میجر کی عمر رسیدہ پڑوسن نے ان سے ہفتہ 13 فروری کو رابطہ کیا۔ اسے روزا نے فون کر کے کہا تھا کہ وہ کئی بار اپنے شوہر کو فون کرنے کی کوشش کر چکی ہے لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہا گو کہ بوڑھی پڑوسن کے بھی تنگ مزاج البرٹ سے اچھے تعلقات نہیں تھے تاہم وہ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

جب وہ ولا پہنچی تو سامنے کا دروازہ مقفل تھا لیکن عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چل دی تو اسے شیڈ نظر آیا جس کا دروازہ بند اور مقفل تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے کیونکہ اس نے فضا میں ایک ناگوار بُو محسوس کی تھی۔ اس نے البرٹ کا نام لے کر دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ شیڈ میں ایک ہی کھڑکی تھی۔ اس نے وہاں سے جھانک کر دیکھا تو ایک لرزہ خیز انکشاف ہوا۔ البرٹ کی گلی سڑی لاش شیڈ کے پختہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

جس پولیس آفیسر نے بوڑھی پڑوسن کی فون کال سنی تھی، اس نے بھی اسی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور سمجھ گیا کہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا۔ اسے اندر سے بند کیا گیا تھا۔ اسی طرح وہ کھڑکی بھی مقفل تھی۔ اس لیے انہیں دروازہ توڑنا پڑا۔ میڈیکل آفیسر نے موت کی وجہ گولی سے لگنے والا زخم بتائی۔ لاش کے برابر ہی ایک دونالی شاٹ گن بھی پڑی ہوئی تھی اور مرنے والے کی شہادت کی انگلی ابھی تک ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔ کورونر کو البرٹ کے ہاتھ پر گن پاؤڈر کی تچھٹ بھی نظر آئی۔ ان تمام شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رابرٹ نے خود کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شیڈ سے ملنے والی دو چیزوں سے اس شبے کو تقویت ملی۔ ان میں ایک پوسٹ کارڈ اور دوسرا بینک اسٹیٹ منٹ تھا۔ ان دونوں کو دیوار پر کیل سے لگایا گیا تھا۔ پوسٹ کارڈ روزا نے فرانس سے بھیجا تھا جس میں اس نے اپنے شوہر کو بتایا تھا کہ وہ اب اس سے محبت نہیں کرتی لہٰذا وہ اس سے ملنے فرانس نہ آئے جبکہ بینک اسٹیٹ منٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ میجر کے اکاؤنٹ میں کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خودکشی کا محرک ہو سکتی تھیں لہٰذا ان شواہد کی بنا پر کیس بند کر دیا گیا۔

اس کے باوجود میرے ذہن میں دو قابلِ ذکر نکات وضاحت طلب تھے۔ پہلا نکتہ خودکشی کی تاریخ تھی۔ تفتیشی افسر کو ولا کے باہر لگے ہوئے میل باکس سے کچھ اشتہاری خطوط ملے۔ ان میں سب سے پرانا خط 29 اکتوبر کو ڈالا گیا تھا۔ اس سے پولیس والوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میجر نے اس روز یا اس سے کچھ دیر قبل خودکشی کی ہوگی لیکن بوڑھی پڑوسن کے بیان سے اس کی تردید ہو رہی تھی۔ اس نے پُرزور طریقے پر اصرار کیا کہ میجر کم از کم نومبر کے پہلے ہفتے کے اختتام تک زندہ تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ اپنے گھر سے اسے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے آری سے لکڑی کاٹنے کی آواز سنی جو وہ ہر مرتبہ موسمِ خزاں میں کیا کرتا تھا۔ اسے اس بارے میں اس لیے بھی یقین تھا کہ 3 نومبر کو اس کی سالگرہ تھی اور آرا چلنے کے شور سے اسے غصہ آرہا تھا اور یہ سلسلہ آئندہ کئی روز تک جاری رہا۔ اکتوبر کے آخر میں آنے والے طوفان سے بھی جنگل کو کافی نقصان پہنچا اور لگتا تھا کہ میجر جلانے کی لکڑی کے لیے کئی گرے ہوئے درخت کاٹ رہا تھا لیکن پھر اس نے 29 اکتوبر کے بعد اپنا میل باکس کیوں خالی نہیں کیا۔ اس کے جواب میں پڑوسن نے کہا کہ البرٹ تھوڑا سا تنہائی پسند تھا اور اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔

دوسرا قابلِ غور نکتہ وہ بیان تھا جو روزا نے پولیس کو دیا جب پولیس نے اسے بتایا کہ اس کے شوہر نے شیڈ کا دروازہ اندر سے سلاخ لگا کر بند کر رکھا تھا۔ روزا یہ سن کر حیران رہ گئی اور بولی کہ اس کے علم کے مطابق دروازے میں کوئی سلاخ نہیں تھی۔

جب میں نے فائل کی ورق گردانی ختم کی تو رابی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا نتیجہ اخذ کیا ''خودکشی'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اب ہمارے پاس ویلو وجانے کی کوئی وجہ ہے۔'' میں نے سلاخوں سے مقفل دروازہ اور البرٹ کے ہاتھ پر لگے ہوئے گن پاؤڈر کے ذرات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''البرٹ میجر نے خود کو گولی ماردی۔ اس کا بیٹا اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا۔ اسی لیے وہ ہمارے پاس آیا۔ شاید کسی حد تک وہ اپنے آپ کو بھی قصوروار سمجھ رہا ہے کہ اس نے اپنے باپ کی زندگی میں دلچسپی نہیں لی۔''

''پھر؟'' رابی مسکرایا۔ ''میں حیران ہوں.....''

''پھر تم کیا سمجھتے ہو؟''

''میرے خیال میں وہ اپنے آپ کو قصوروار نہیں بلکہ ناراض اور دکھی محسوس کر رہا ہے، اس کے اپنی سوتیلی ماں سے اچھے تعلقات نہیں ہیں اور روزا نے بھی اپنے شوہر سے رابطہ نہ ہونے کے باوجود اسے فون نہیں کیا۔ اس سے ان کے تعلقات میں سرد مہری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ روزا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے کارنیلس توقع کر رہا تھا کہ بالآخر ایک دن وہی روزا کی جائداد کا واحد وارث بن جائے گا لیکن اس کے باپ کی خودکشی کے بعد روزا دوسری شادی کرسکتی ہے۔ اس طرح اسے ورثے میں سے ملنے کا کچھ امکان تھا تو وہ بھی ختم ہوگیا۔ اس طرح البرٹ کی خودکشی سے سب سے زیادہ فائدہ روزا کو ہوا لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے پڑوسن سے یہ کہنے میں اتنی دیر کیوں لگائی کہ وہ جاکر البرٹ کی خیریت معلوم کرے۔ کیا اس کے شوہر سے تعلقات اس حد تک خراب ہوگئے تھے؟ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض کرلیا جائے کہ البرٹ کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ ہے تو ایسی صورت میں وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی لاش شیڈ میں پڑی ہوئی ہے اور فرانس سے واپس آنے سے پہلے اس کا ملنا روزا کے مفاد میں ہوتا اس طرح اس کی بے گناہی ثابت ہوجاتی۔ اگر کل ہم ویلو وگئے تو میں خاص طور پر اس سلاخوں والے دروازے کو ضرور دیکھوں گا جسے تم فیصلہ کن سمجھ رہی ہو۔''

اگلے روز صبح ہم ویلو کے لیے روانہ ہوگئے۔ اپنے مرنے تک البرٹ اس وسیع جنگل کے مشرقی کنارے پر رہائش پذیر تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہماری کار ایک الگ تھلگ سڑک پر مڑ گئی۔ وہاں کئی ولاز تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اور سبزے میں تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ اس علاقے میں شیڈ کافی مقبول تھے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ سڑک کے کنارے کئی جگہ پر گھاس غائب تھی اور تارکول پر ریت پڑی ہوئی تھی جب میں نے اس جانب اشارہ کیا تو رابی مسکرا دیا۔

''جنگلی سؤر۔'' اس نے کہا۔ ''ان کی وجہ سے اس علاقے میں بڑی پریشانی ہے۔ لوگوں کے لان تباہ ہوگئے ہیں لیکن ناراض شہری ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ اگر کوئی انہیں نشانہ بنانا چاہے تو انہیں جانوروں کے تحفظ کی تنظیموں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

کچھ دیر چلنے کے بعد ہماری نظر اس مکان پر گئی جس کی ہمیں تلاش تھی۔ ڈرائیوے کا فرش پختہ تھا اور اس کے دونوں جانب سدابہار جھاڑیاں تھیں۔ سامنے والے دروازے پر ایک باوردی پولیس والا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ان دو افسران میں سے ایک تھا جنہوں نے بوڑھی پڑوسن کا فون سنا۔

''اس کے بیٹے نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟'' اس نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''ہم اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔'' رابی نے تسلیم کیا۔ ''لیکن اس مرحلے پر ہمارے پاس پولیس کی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم نے فائل پڑھ لی ہے۔ یہ بالکل کھلا ہوا کیس ہے۔''

آفیسر نے گہری سانس لی۔ اب وہ خاصا پُرسکون نظر آرہا تھا۔ ''گویا تمہیں معلوم ہے کہ میجر نے اپنے آپ کو اندر سے بند کرلیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''تم دیکھو گے کہ اس کی کوئی اور وضاحت نہیں ہوسکتی۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ کسی فارنسک ٹیم کو نہیں بلایا گیا؟''

''یہ بالکل غیر ضروری لگ رہا تھا۔''

پولیس آفیسر نے ہمیں شیڈ تک لے جانے کی پیشکش کی لیکن رابی نے تامل کیا۔ وہ پہلے ولا کو اندر سے دیکھنا چاہ رہا تھا۔ ہم لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ولا کے عقب میں گئے۔ آفیسر نے پچھلا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ رابی سیدھا کچن کی طرف گیا۔ اس نے فریج کھول کر اس میں سے ایک پیکا ہوا دودھ کا ڈبا نکالا۔ اس میں جمے ہوئے دودھ کی تھوڑی سی مقدار تھی جبکہ ڈبے کے نیلے ڈھکنے پر استعمال کی آخری تاریخ 3 نومبر کی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے فریج میں رکھی ہوئی دوسری چیزوں کا بھی معائنہ کیا اور مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''اب شیڈ کی طرف چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

گھر کے پیچھے سے ایک کچا راستہ جنگل کی طرف جارہا تھا۔ ہم کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان گھرے ہوئے شیڈ کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ ایک کھلی جگہ پر واقع تھا جس کا قطر ساٹھ فٹ ہوگا۔ زمین پر درخت سے گرے ہوئے پتوں کی موٹی تہ بچھی ہوئی تھی۔ موسمی اثرات کی وجہ سے اس شیڈ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ وہ ایک شش پہلو کمرا تھا جس پر ٹکونی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اس میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی جس کے فریم میں چار گرد آلود دروازے لگے ہوئے تھے اور اس

کھڑکی کا رخ ولا کی جانب تھا۔ شیڈ کا دروازہ دائیں دیوار میں لگا ہوا تھا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گا۔'' پولیس آفیسر نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

رابی نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ایک ناگوار بو ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی لیکن رابی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ایک میز اور سادہ سی لکڑی کی کرسی رکھی ہوئی تھی، اس پر بیٹھ کر وہ شاعری کرتا تھا اور ولا کا بھی نظارہ کرتا رہتا۔ رابی کو وہاں ایک پیڈ، قلم اور میز کی دراز میں شاٹ گن کا ایک ڈبا بھی ملا۔ ان سب چیزوں کا ذکر پولیس کی رپورٹ میں بھی موجود تھا۔ کنکریٹ کے فرش پر ایک سیاہ دھبا بھی نظر آ رہا تھا جہاں لاش کئی مہینوں تک پڑی رہی۔

رابی نے دروازے کے دونوں جانب لگے ہوئے اسٹین لیس اسٹیل کے بار بریکٹ کو غور سے دیکھا جو شیڈ کی دوسری چیزوں کے مقابلے میں نئے لگ رہے تھے۔ انہیں لکڑی کی اندرونی دیوار کے ساتھ تانبے کے پیچ لگا کر جوڑا گیا تھا جب پولیس والوں نے دروازہ توڑا تو یہ پیچ بھی نکل گئے۔

''دروازے کو باہر سے سلاخ لگانا ممکن نہیں تھا۔'' چوکھٹ کی دوسری جانب کھڑے ہوئے پولیس مین نے کہا۔ ''اور ایک قاتل کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ دروازے کو اندر سے سلاخ لگا کر بند کرنے سے یہ خودکشی ثابت ہوتی ہے۔''

''یہ بالکل واضح ہے۔'' رابی نے کہا۔

''درست۔''

''پوسٹ کارڈ اور بینک اسٹیٹ منٹ کہاں لگے ہوئے تھے؟''

''کھڑکی کے دائیں جانب۔''

رابی نے سر ہلایا اور باہر جا کر درخت کی ننگی شاخوں کو دیکھنے لگا جو اس جگہ کے گرد لگے ہوئے تھے۔ ''ان درختوں کے کچھ پتے اس روز بھی گرے ہوں گے جب البرٹ نے خودکشی کی۔''

''درست۔'' پولیس مین نے کہا۔ ''یہاں تک کہ اکتوبر کے آخر میں طوفان کے بعد بھی زیادہ تر پتے نومبر کے وسط تک گرتے رہے۔''

''گویا جائے وقوعہ ویسی نہیں رہی جو اس کی خودکشی والے دن تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان پتوں کے نیچے کیا ہے۔ مجھے ایک اندیشہ ہے جو اہم ہو سکتا ہے۔''

پولیس مین پڑوس کے مکان سے پتے ہٹانے کی مشین Leaf Blower لے آیا۔ رابی نے اس کی مدد سے پتے ہٹانے شروع کر دیے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے نیچے کی زمین نظر آنے لگی۔ درحقیقت یہ ایک انکشاف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگلی سوروں کے ایک ریوڑ نے وہاں اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ شیڈ کے اردگرد کی زمین پر جہاں بھی گھاس ہوتی تھی وہ مکمل طور پر وہاں سے لے جائی جا چکی تھی۔ گھاس کے موٹے تنکے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں کے درمیان درجنوں شاٹ گن کے خالی کارتوس پڑے ہوئے تھے۔

البتہ رابی کو وہاں قدموں کے نشانات نہیں ملے۔ شدید طوفان نے ایسے تمام نشانات مٹا دیے تھے۔ اب وہاں صرف ان پولیس والوں کے قدموں کے نشانات باقی رہ گئے تھے جو بوڑھی پڑوسن کا فون سن کر آئے تھے۔ رابی ایک درخت کے چوڑے تنے پر بیٹھ گیا اور اس جگہ کے علاوہ شیڈ کا بھی پوری طرح جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے اسمارٹ فون سے وہاں کی کچھ تصویریں بھی لیں اور کھڑا ہو گیا۔

''میں نے بہت کچھ دیکھ لیا۔''

ہم نے پولیس آفیسر کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چل دیے۔ رابی لنچ کے لیے ہمیں گاؤں کے ایک کیفے میں لے گیا۔ لگتا تھا کہ اس کیس میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے جو واقعی ایک اوپن اینڈ شٹ کیس معلوم ہو رہا تھا جسے دوسرے لفظوں میں حل شدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کھانے کے انتظار میں اس نے وہاں رکھے ہوئے اخباروں کی ورق گردانی شروع کر دی۔ دس منٹ بعد وہ اس سے بھی اکتا گیا اور اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیے پھر اس نے جیب سے اپنا فون نکالا۔

''گویا یہ خودکشی تھی۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

رابی کی انگلیاں چھوٹے سے اسکرین پر گھومنے لگیں اور وہ مسکرا دیا۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ پولیس کو نئے سرے سے اس کیس کی تفتیش کرنا پڑے گی۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟ واقعی یہ ایک قتل ہی تھا؟''

اسی اثنا میں ویٹریس کافی اور سینڈوچ لے کر آ گئی۔ اس کے جانے کے بعد رابی نے فون رکھ دیا اور بولا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ خودکشی نہیں تھی۔ اب مجھے ثبوت جمع کرنے

ہیں۔'' اس نے دوبارہ فون اٹھالیا۔ ''تم جب تک سینڈوچ کھاؤ، میں اپنا کام کرتا ہوں۔''

''تم بلف کررہے ہو۔''

رابی مسکرادیا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ قتل کس نے کیا؟ اس کی بیوی نے؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ کون ہے؟''

''مجھے کوئی آئیڈیا نہیں۔'' وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جسے البرٹ نہیں جانتا تھا یا کم از کم پوری طرح واقف نہیں تھا۔ قسمت نے ساتھ دیا تو میں آئندہ چند منٹوں میں اس پُراسرار شخص کا پتا چلالوں گا۔ تمہیں یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکیں۔ اس کی وجہ تجربے کی کمی ہے۔''

''لیکن یہ خودکشی کے علاوہ کچھ اور کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بھی تمہارے ساتھ وہاں سب کچھ دیکھا۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا اور کھڑکی بھی نہیں کھل سکی تھی۔ میرے خیال میں تو یہ ایک بڑا سادہ سا کیس ہے۔''

''تم اس دروازے کو اہمیت دے رہی ہو۔ وہی اس کیس کی کنجی ہے۔ مجرم غیر معمولی طور پر ہوشیار تھا۔ اگر دروازہ اندر سے مقفل نہ ہوتا تو کوئی بھی شیڈ میں داخل یا باہر آسکتا تھا لیکن دروازے میں اندر سے سلاخ لگی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ اس سلاخ کو پکڑنے والے بریکٹ حال ہی میں لگائے گئے تھے۔ میرے نزدیک یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ البرٹ کو وہ نئے بریکٹ لگانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اس کی بیوی کے علاوہ وہاں کوئی نہیں آتا تھا اور وہ کئی مہینوں سے فرانس میں تھی۔''

''کیونکہ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو۔''

رابی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ قاتل نے ہی وہ بریکٹ نصب کیے تھے کیونکہ دروازے میں اندر سے سلاخ لگی ہونے کی وجہ سے ہی یہ خودکشی کا کیس سمجھا جارہا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں کوئی اور بھی وہاں موجود تھا جیسا کہ پڑوسن کی گواہی سے ظاہر ہے۔ اس نے پانچ نومبر اور اس کے بعد کئی روز تک آرا چلنے کی آواز سنی اور یہ بھی نوٹ کرنے والی بات ہے کہ البرٹ نے اس دوران اپنا میل باکس خالی نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کوئی خریداری کی۔ اس کے پاس دودھ ختم ہوگیا تھا اور 5 نومبر کو اس کے فریج میں دودھ کا جو خالی ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس کے استعمال کی تاریخ دو روز قبل ختم ہوگئی تھی۔''

''تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟''

''اتنا اندازہ تو تمہیں بھی ہونا چاہیے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی اور شخص جلانے کی لکڑی کاٹ رہا تھا؟''

رابی نے پُرجوش انداز میں تائید کی۔ ''کیا تم واقعی سمجھتے ہو۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہ کسی اور شخص نے البرٹ کو قتل کیا اور کئی روز تک اس کے یارڈ میں کام کرتا رہا۔''

''ہاں بالکل میرا یہی خیال ہے۔''

''یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ کوئی قاتل ایسا کیوں کرے گا؟''

''ہاں لیکن اس قاتل نے ایسا کیا۔ میں جلد ہی اس کا مظاہرہ کروں گا۔ اس نے اپنے قدموں کے نشانات ضائع کرنے کے لیے ایسا کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ چاروں طرف لگے ہوئے درختوں میں سے چند ایک کو کاٹتا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے سامنے حالات کی تصویر کشی کرسکوں۔ ایک بار تمہاری سمجھ میں آگیا کہ وہاں کیا ہوا ہوگا تو تم اس سے اتفاق کروگی کہ یہ سب بہت آسان تھا۔ لہٰذا تم اپنی توجہ اس پر مرکوز رکھو اور جائے وقوعہ کو دیکھنے کی کوشش کرو۔ شیڈ کے اردگرد خالی زمین کے بارے میں سوچو جس سے وہاں جنگلی سؤروں کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے جو وہاں خوراک کی تلاش میں آئے تھے اور وہاں گرے ہوئے پتوں کے نیچے شاہ بلوط کے پھل بھی تھے جو سؤروں کی پسندیدہ غذا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ سؤروں نے خاص طور پر اس جگہ کو نظر انداز کیا کہ کہیں انہیں گولی نہ لگ جائے۔ یاد کرو وہاں شاٹ گن کے خالی کارتوس بھی پڑے ہوئے تھے۔''

''پھر اس جگہ کو نقصان پہنچنے کی کیا وجہ تھی؟''

''تمہیں کوئی اندازہ نہیں؟''

''نہیں۔''

''اکتوبر کے آخر میں جو طوفان آیا تھا، اس کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''میں کیوں سمجھتی کہ کیسے.....''

رابی نے میری بات کاٹ دی۔ ''یاد کرو کہ کارنیلس میجر نے ہمیں کیا بتایا تھا۔ وہ تین سال پہلے صرف ایک مرتبہ

اپنے باپ سے ملنے اس شیڈ پر آیا تھا۔ اس نے کیا بتایا تھا جب اس نے آخری بار اپنے باپ کو دیکھا؟"

"اس کا باپ شیڈ کو جانے والے راستے پر چل رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور....."

"اب تمہاری سمجھ میں آیا؟" اس نے پوچھا۔

"اوہ میرے خدا، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں بولی۔

میں نے تصور کی آنکھ سے اس کچے راستے کو دیکھا جو درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا شیڈ تک جا رہا تھا۔ مجھے وہ واحد کھڑکی بھی نظر آئی جس میں سے جھانک کر پولیس والے نے لاش دیکھی تھی۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔ "دروازہ سامنے نہیں بلکہ شیڈ کے ایک جانب ہے اور اس کا رخ ولا کی طرف ہے۔ میجر کا کہنا تھا کہ وہ ولا کے عقب میں کھڑا ہوا تھا جب اس نے اپنے باپ کو دروازے میں جاتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ وہاں سے صرف شیڈ کا سامنے والا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے باپ کو شیڈ کے اندر جاتے اور دروازہ بند کرتے دیکھا لیکن وہ یہ منظر ولا کے عقب سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لگتا ہے کہ اسے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا۔"

"اگر وہاں کوئی اور علامات نہ ہوتیں تو میں اس وضاحت سے مطمئن ہو جاتا۔" رابی نے تسلیم کیا۔ "لیکن وہاں شیڈ کے گرد وہ جگہ بھی ہے جہاں گھاس غائب تھی۔ کیا تمہیں اس میدان کے گرد لگے ہوئے درخت یاد ہیں؟"

"ہاں۔"

"وہ کون سے درخت ہیں؟"

"سفیدے کی قسم کا ایک درخت۔" میں نے کہا۔

"اور شیشم۔"

"اور شاہ بلوط؟"

"نہیں۔"

"اس کے باوجود زمین پر شاہ بلوط کے پھل پڑے ہوئے تھے۔ وہ وہاں کیسے آ گئے؟"

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں شاہ بلوط کا درخت بھی ہوگا۔"

"میں ایک درخت کے تنے کے ٹوٹے ہوئے حصے پر بیٹھا اسی بارے میں سوچ رہا تھا اور تبھی مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہ ایک پرانے شاہ بلوط کے درخت کا تنا تھا تب میں سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔ اکتوبر کے طوفان میں وہ درخت زمین پر گر کر ماچس کی تیلی کی طرح ٹوٹ گیا۔ اس کے گرنے سے شیڈ کو نقصان پہنچا اور اس کی چند موٹی شاخوں نے زمین میں سوراخ کر دیے ہوں گے جب البرٹ نے صفائی شروع کی تو اس نے وہ شاخیں بھی نکال لیں۔ اس کے بعد وہ جگہ ایسی لگنے لگی جیسے سوئروں نے وہاں کی گھاس کو روند دیا ہو۔ البرٹ صفائی میں مصروف تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔"

"اسے کس نے قتل کیا؟"

"جس شخص نے اپنا جرم چھپانے کے لیے ایک ملتا جلتا شیڈ تعمیر کیا تھا گو کہ کار نیلس خود بھی بڑھئی ہے لیکن یہ اس کا کام نہیں۔ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جو البرٹ میجر کو نہیں جانتا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ شیڈ کا دروازہ اور کھڑکی کہاں پر ہے۔ وہ شیڈ پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا اور کنکریٹ کے فرش کے سوا وہاں کچھ باقی نہ رہا۔ دوسرا شیڈ بھی نیا نہیں تھا ورنہ پولیس فوراً پہچان جاتی۔ لہٰذا قاتل نے ایک دوسرے شیڈ کا انتظام کیا جو میجر کے شیڈ کے سائز کا تھا۔"

"لیکن اس نے یہ ساری تکلیف کیوں اٹھائی ہو گی؟"

رابی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کسی نے اسے غصے کی حالت میں گاڑی چلاتے یا میجر کے گھر کی طرف پیدل جاتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ یاد رہے کہ اس کے علاوہ البرٹ سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ اگر بعد میں میجر کی لاش دریافت ہوتی تو ہر کوئی یہی شک کرتا کہ اسی نے البرٹ کو قتل کیا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ میجر کی موت کو خودکشی کا رنگ دیا جائے۔ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ وضع کرنا ضروری تھا جس کے پیچھے بچ چھپ جائے۔ سب سے پہلے قاتل کو گرے ہوئے درخت کی باقیات کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اس کے لیے اس نے آرے کا استعمال کیا جس کی آواز پڑوسن نے بھی سنی پھر اس نے وہاں سے لکڑی اور برادہ صاف کیا اور غالباً رات کی تاریکی میں انہیں گاڑی میں ڈال کر کہیں دور پھینک آیا تاکہ ان چیزوں کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ اسی دوران اسے ولا سے روزا کا کارڈ اور بینک اسٹیٹ منٹ بھی مل گیا۔"

رابی نے گلا صاف کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے ایک مقامی اخبار میں گارڈن سینٹر کا اشتہار دیکھا جو شیڈ کی کٹ فروخت کر رہے تھے۔ اس طرح کے شیڈ اس علاقے میں عام ہیں اور ان سب کا ایک ہی سائز ہوتا ہے لیکن وہ نئے شیڈ ہیں جنہیں وہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پرانا شیڈ چاہیے تھا۔ لہٰذا میں نے اسی اخبار کے

پرانے آن لائن ایڈیشن میں کلاسیفائڈ اشتہار دیکھا جس میں اس طرح کے شیڈ فروخت کے لیے پیش کیے جارہے تھے۔"

اس نے اپنا اسمارٹ فون اٹھایا۔ "یہ وہ اشتہار ہے جس میں کوئی شخص پرانا شیڈ فروخت کرنا چاہ رہا ہے۔ اسے کہیں بھی دوبارہ جوڑ کر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ یہ اشتہار اکتوبر کے آخر میں آیا تھا۔ کیا یہ وہی شیڈ نہیں ہوسکتا؟"

اس نے دوبارہ اسکرین پر انگلی پھیری اور بولا۔ "ایک ہفتے بعد یہ اشتہار آنا بند ہوگیا۔ کیا اس وقت تک وہ شیڈ فروخت ہو چکا تھا؟ اس کے لیے ہمیں مزید گہرائی میں جانا ہوگا۔ اگلے ہفتے اسی اخبار میں جلانے کی لکڑی برائے فروخت کا اشتہار آیا جس میں بیچنے والے کا نام اور پتا بھی درج تھا۔ یہ وہی سڑک ہے جس پر بے چارہ البرٹ رہتا تھا۔ لہٰذا یہی شخص قاتل ہوسکتا ہے۔"

"اس کی وضاحت کرو۔"

"تم نے گرے ہوئے درخت کا تنا دیکھا تھا۔ اس میں سے کافی لکڑی نکالی جاسکتی تھی۔ کیا تم نے ولا میں لکڑی کا ڈھیر دیکھا۔ مجھے تو نظر نہیں آیا۔ وہاں صرف پچھلے سیزن کی بچی ہوئی کچھ لکڑی پڑی ہوئی تھی۔ مجرم اس درخت کے تنے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔" رابی مسکرایا۔ "حالانکہ وہ اسے ولا کے عقبی حصے میں بھی رکھ سکتا تھا لیکن اس کے دل میں لالچ آگیا اور اس نے اسے پیسے کمانے کا ایک طریقہ سمجھا اور یہی چیز اس کے گلے کا پھندا بن گئی۔"

رابی نے وہیں بیٹھے بیٹھے انٹرنیٹ پر کچھ تلاش کیا۔ چند لوگوں کو فون کیے اور اسے کچھ مزید معلومات مل گئیں۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ جب وہ Blower سے زمین پر پڑے ہوئے پتے ہٹا رہا تھا تو ان کے ساتھ ہی کچھ سفید رنگ کے پر بھی اڑتے ہوئے جنگل کی طرف گئے۔ اس سے اس نے ایک اور نظریہ تخلیق کیا جو قاتل اور مقتول کے درمیان وجہ نزاع بنا۔ مجرم البرٹ کی ظالمانہ کارروائی پر ناراض تھا۔ اس نے اسی کی رائفل سے اسے ہلاک کر دیا۔

گو کہ یہ قتل نہیں بلکہ ایک حادثہ تھا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا البرٹ کے پاس آیا اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ اسی کشمکش میں رائفل چل گئی اور گولی البرٹ کی کنپٹی پر جا لگی۔ قاتل یہ منظر دیکھ کر ڈر گیا اور شدت سے ایسا راستہ تلاش کرنے لگا جس سے اس کا جرم چھپ جائے۔ اس کے لیے اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس نے ایک پرانا شیڈ خریدا۔ البرٹ کی لاش کنکریٹ کے فرش پر اور اس کی انگلی ٹریگر پر رکھی پھر اس کے گرد وہ شیڈ کھڑا کر دیا پھر اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس میں سلاخ لگانے کے لیے دیوار میں دروازے کے دونوں جانب بریکٹ نصب کر دیے پھر وہ دیوار پر چڑھ کر باہر آگیا اور بعد میں اس نے شیڈ پر چھت ڈال دی۔ اب کوئی بھی دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ البرٹ نے خودکشی کی ہے۔

"اگر ہم نے شیڈ کا بغور معائنہ کیا ہوتا۔" رابی نے کہا۔ "تو ہمیں معلوم ہوجاتا کہ چھت اندر سے نہیں بلکہ باہر سے ڈالی گئی تھی لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ شیڈ تبدیل کیا گیا ہے کیونکہ اس جگہ ایسا ہی شیڈ پچھلے پانچ سال سے موجود تھا۔"

وہاں سے واپس آتے ہوئے راستے میں رابی نے ہر نکتے کی وضاحت کر دی۔ البرٹ کی موت کا ذمے دار کبوتر پالنے کا شوقین تھا اور ہر روز ایک گھنٹے کے لیے اپنے کبوتروں کو فضا میں پرواز کرنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ ایک دن اس کا سب سے بہترین کبوتر واپس نہیں آیا جس نے پرواز کے مقابلوں میں کئی مرتبہ انعام حاصل کیا جس کی وجہ سے اس کے مالک کی کافی تعریف ہوئی۔ کئی دنوں بعد اس کا ایک اور کبوتر غائب ہوگیا اور اس بار اس نے کچھ فاصلے سے گولی چلنے کی آواز بھی سنی۔ وہ اس آواز کی سمت میں گیا اور دیکھا کہ اس کے دونوں کبوتر میجر کے شیڈ کے برابر مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ میجر نے تسلیم کیا کہ اس نے ہی ان دونوں کو گولی ماری تھی کیونکہ ان کی غٹرغوں سے اس کے کام میں ہرج ہورہا تھا جس پر اسے غصہ آگیا۔

رابی کے کہنے پر پولیس نے اس شخص سے پوچھ گچھ کی اور اس نے فوراً ہی اعتراف کرلیا کہ وہ میجر کی موت کا کس حد تک ذمے دار ہے۔

"یہ ایک آسان کیس تھا۔" رابی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "یہ ہمارے معمول میں ایک نیا موڑ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بار مجھے جلد ہی ثبوت مل گئے جس کا میں عادی نہیں ہوں۔"

میں نے رابی کے چہرے پر غیر معمولی چمک دیکھی۔ وہ گزشتہ روز کے مقابلے میں خاصا پُراعتماد نظر آرہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی میز پر پڑے ہوئے زیرالتوا کیسوں کا حل بھی ممکن ہے۔

❖ ❖ ❖

الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاؤ کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاؤ ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان جو جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

انیسویں قسط

pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

پاکستانی ڈاکٹر سیف الدین، امارات کے ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہے، یوں دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹاپ پروفیشنل افراد میں بھارت سے تعلق رکھنے والے دو ڈاکٹرز رمیش اگروال اور رنبیر سنگھ بھی ہیں۔ کھلے دل کا مالک اور دوست نواز رنبیر سنگھ، ڈاکٹر سیف کا ایک اچھا دوست ہے لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال ایک کینہ پرور آدمی ہے۔ پاکستان کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت بھری ہوئی ہے اور وہ ڈاکٹر سیف سے بھی اسی لیے عداوت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں رمیش جان بوجھ کر سیف کے سامنے اس کے ملک پاکستان کی برائیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کے دوران جب بھارت کے ہاتھوں پاکستان کو شکست ہوئی تو بغض ڈاکٹر رمیش اگروال کو پاکستان کے خلاف زہر اگلنے کا خوب موقع ملا اور جب ہی ڈاکٹر سیف یہ برداشت نہ کر سکا اور زبانی کلامی اسے منہ توڑ جواب دے دیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آتی اگر دیگر کولیگز ان کے درمیان نہ آتے، انہوں نے بھی رمیش کو ہی اس کی بداخلاقی اور بدزبانی پر کوسا تھا جن میں رنبیر سنگھ سرفہرست تھا۔ بہ ظاہر بات آئی گئی ہوگئی لیکن رمیش نے دل میں رکھ لی۔ انہی دنوں سیف پر ایک بھیانک انکشاف ہوا کہ اسپتال میں چند جرائم پیشہ خفیہ طور پر انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری میں ملوث تھے۔ اسپتال کے تیرہویں چودہویں فلور میں غلطی سے جانے پر سیف کو رمیش دانستہ کچھ باکسز کی جھلک دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑی کینہ توز اور منتقمانہ نظروں سے گھورتا ہے، سیف نہیں جانتا کہ اس باکسز میں اس کے چھوٹے معصوم بھائی عادل کو رمیش نے اپنی دشمنی کے غبار تلے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا ہے۔ اس دوران سیف پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، مگر قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کی جگہ اس کا ہم وطن احسان مارا جاتا ہے، دوسرے حملے میں اس کا بھارتی دوست رنبیر سنگھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سیف پاکستان لوٹتا ہے اور اسے بھائی کی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سیف پنجاب (پاکستان) کے ایک سرحدی گاؤں کا باشندہ ہے۔ باپ زمین کے کچھ ٹکڑوں کا مالک ہے۔ بعد میں وہ پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے کوچ کر جاتا ہے۔ سیف کا چھوٹا بھائی عادل، ماجد کا دوست ہے اور ماجد، سیف کی کلاس فیلو ڈاکٹر حمیرا کا بھائی ہے۔ حمیرا کے باپ امجد کا لاہور میں کاروبار ہے۔ حمیرا اور سیف آپس میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان پسندیدگی، پھر انسیت اور اس کے بعد تعلقِ خاطر محبت میں بدل جاتا ہے۔ وطن لوٹنے پر عادل کی گمشدگی پر سیف اس کی تلاش میں لگ جاتا ہے اس دوران اسے عادل کی لاش دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسی لاش جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اندر سے خالی تھی۔ بدنصیب عادل کو لاش میں بدلنے سے پہلے مکروہ کھیل کے دوران اسے اہم اندرونی جسمانی اعضا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سیف بھائی کی قبر کی مٹی اٹھا کر قسم کھاتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے، وہ انہیں تصویرِ عبرت بنا کے چھوڑے گا۔ اس کے بعد سیف کی زندگی کا ڈھب بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں طارق مجید نامی ایک کرائم رپورٹر جو بیک وقت لڑائی بھڑائی میں بھی طاق ہے اور اس کی پارٹنر رومانہ عرف رومی، جس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کیا اور انٹرپول سے متعلق تھی، آج کل یہ دونوں آرگن پائریسی اور انسانی اعضا کی اسمگلنگ کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ سیف جیسے عام مسیحا کو ان دونوں "ٹاپ پروفیشنل" کی ہم راہی مل جاتی ہے تو وہ کندن بننے لگتا ہے۔ تاہم حالات کی تلخیاں اور رزم آرائیاں اس کی نفسیات پر عجیب اثر... ڈالتی ہیں جہاں وہ ایک طارق اور رومی جیسے ٹاپ پروفیشنلو ساتھیوں کی سنگت داری میں جنگجو بننے لگتا ہے وہیں اس میں بدلہ بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب ان تینوں اور انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری کرنے والے بین الاقوامی خونی سوداگروں کے بیچ ایک دھواں دھار رن پڑ چکا ہے۔ ان تینوں ساتھیوں کی مضبوط مگدّم...... ان خونی بیوپاروں کو گھنگی کا ناچ نچاتی ہے، جن کا نیٹ ورک پاکستان میں بھی اس گھناؤنے کالازار میں مصروفِ کار ہے۔ پاکستان میں ان کا سرغنہ فیروز شاہ المعروف گوہر شاہ اور اس کے خاص کارپرداز تاج کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ سیف کو پتا لگتا ہے کہ ڈاکٹر رمیش نے اپنی بھیانک دشمنی نکالنے کے لیے انہی دونوں مذکورہ افراد کو عادل کا پتا دیا تھا۔ ڈاکٹر رمیش اگروال خونی سوداگروں کی "ہائیر اتھارٹیز" سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا باس سرجن امرناگ بھی شامل ہے۔ یہی لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو چلا رہے ہیں اور ان خونی بیوپاریوں میں...... ٹھگر چانگیہ، سہراب مجوشہ، بینکاک اور دیگر چند ممالک کے ذیلی چیف احکامات دیتے اور انسانی اعضا کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر خصوصی چارٹرڈ طیارے ہائر کرنے اور مذکورہ بیمار افراد کو کروڑوں روپوں کے عوض اعضا لگانے کے پابند ہیں۔ پاکستان میں گوہر شاہ کے ساتھ جنگ کے دوران یہ لوگ حمیرا کے گھر والوں کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ سیف کا دوست ایس پی شاداب اس کی مدد میں شامل ہے۔ حمیرا اور اس کا باپ ان کے ڈر سے یوکے شفٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیف اور حمیرا کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں ساتھیوں کی کوششوں کے سبب...... پاکستان میں ان خونی بیوپاریوں کے نیٹ ورک کا قلع قمع ہونے لگتا ہے لیکن سیف کو ابھی اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ رومی اور سیف امارات کا رخ کرتے ہیں، یہاں اپنے بھائی کے ایک دشمن سرجن امرناگ کو سیف عبرت ناک موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن اصل دشمن ڈاکٹر رمیش اگروال فرار ہو کے بھارت جا کر اپنے گرو گھنٹال ٹھگر چانگیہ کے چرنوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے تعاقب میں رومی اور سیف بھارت کا رخ کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے رومی تو بھارت چلی جاتی ہے لیکن سیف نہیں جا سکتا۔ طارق اور رومی کے مشورے اور ہدایات کے مطابق ناچار سیف امارت سے

پاکستان کا رخ کرتا ہے کہ طیارے کو کچھ نامعلوم دہشت گرد ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ اندر کچھ ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے طیارے کو کریش لینڈنگ کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ راجستھان کے صحرا میں تباہ ہو جاتا ہے۔ سیف اور اس کی دو بدنصیب مسافر ساتھی مالا اور شکنتلا زندہ بچتے ہیں مگر وائے نصیب کہ یہ تینوں صحرائی لٹیروں کے چنگل میں جا پھنستے ہیں۔ قبیلے میں آتے ہی ان تینوں کے ساتھ زیادہ برا سلوک نہیں ہوتا۔ سیف کیونکہ ڈاکٹر تھا اس لیے سہارا کی خصوصی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ مالا سے یہاں کا ماحول اور حالات برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ موقع دیکھ کر وہ فرار ہو جاتی ہے اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہو کے ہلاک ہو جاتی ہے۔ سیف اور شکنتلا بھی یہاں سے جلد نکل جانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی مہاراجا کا دیہانت ہو جاتا ہے۔ سیف محل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قدرت اسے ان خونی سوداگروں کے پاس پہنچا دیتی ہے جو جسونت رائے کے بھتیجے کے اعضا کو آکس باکس میں رتلام اسپتال پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سیف کو کملیش کا آدمی سمجھتے ہیں۔ راستے میں پولیس ریڈ کے نتیجے میں سیف دھر لیا جاتا ہے۔ سیف کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جسونت اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ سیف کی مدد سے کملیش اور اس کے ساتھی پکڑے جاتے ہیں پھر کمشنر جسونت کو اطلاع دیتا ہے کہ سیف پڑوسی ملک کا خطرناک جاسوس ہے اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔ یہ سن کر سیف چونک پڑتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں جیسے بے دم سا ہو کر دوبارہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ریٹا اور ڈوجا بدستور میری جانب اپنی پستولوں کا رخ کیے چوکس انداز میں کھڑے رہے۔

ان کے ساکت و جامد انداز سے صاف ظاہر تھا کہ میری ایک ذرا سی غلط حرکت انہیں بے دریغ گولی چلانے پر متحرک کر سکتی تھی۔

مردود جسونت رائے بڑی مکارانہ نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا پھر وہ مجھ سے بولا۔

"کیا تم واقعی پڑوسی ملک کے جاسوس ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ میں تو ایک عام سا ڈاکٹر ہوں، آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے لہجے میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی، تاکہ اس مردود و ملعون دھوکے باز کو میری بات پر یقین آ جائے اور کسی طور بے ضرر سمجھے اور مجھے تھوڑی اور مہلت مل جائے، لیکن بدبخت میری بات پر قہقہہ مار کے ہنسا اور بولا۔

"میں کسی پبلک سروس کمیشن کے ادارے کا چیئرمین نہیں ہوں جو ڈاکٹروں کے امتحانات لے کر انہیں سرکاری نوکریوں میں بھرتی کرتا ہو۔"

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ مجھ سے جاسوسی کا امتحان لیں گے تو میں فیل ہو جاؤں گا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"ابے چپ، سالے! دماغ خراب کر رہا ہے میرا۔ اپنی حرکتوں کی وجہ سے..... مجھے تو تو ڈاکٹر بھی نہیں لگ رہا ہے۔" مجھے اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر اس حرام شے کو جائز طریقے سے پینے پر مجبور ہو گیا اور بولا۔

"دیکھو رائے صاحب! اب ایسی بات بھی نہیں، میں ڈاکٹر تو اپنی جگہ پر ہوں لیکن تقدیر نجانے مجھے کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ آپ مجھے انڈین آرمی کے حوالے کر کے ایک ڈاکٹر کا مستقبل تباہ کر دیں گے۔ ایک ڈاکٹر تو انسانیت کا خادم ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ انڈین آرمی کو تو خوامخواہ ہی پڑوسی ملک کے خلاف اپنا بغض نکالنے کا موقع ملنا چاہیے۔"

"بھاشن دینا بند کر۔" اس نے جھلا کر پھر مجھے جھڑکا۔ "ہم ملک کے حساس اداروں کو نہیں چھیڑا کرتے۔ اب تم جانو اور وہ..... میرا دماغ مت چاٹو....."

یہ کہہ کر اس نے ریٹا اور ڈوجا کو نجانے کیا ہدایت کی اور پھر چلا گیا۔

پاس کے کمرے سے اب کملیش کی چیخیں آنا بند ہو چکی تھیں۔ جسونت رائے کے کمرے سے نکلتے ہی ریٹا اور ڈوجا سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ پستولیں ہنوز انہوں نے اپنے ہاتھوں میں یوں تھام رکھی تھیں جیسے وہ کھلونے ہوں۔

"انہیں نیچے کر لو چل نہ جائیں۔ میں تو پہلے ہی نہتا ہوں۔" میں نے مسمسی سی صورت بنا کر ان سے کہا، مگر ان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اسی طرح مجھے سرد نظروں سے گھورتے رہے، یوں جیسے روبوٹ ہوں۔

وقت بیتا چلا جا رہا تھا۔ کسی بھی وقت کمشنر یہاں پہنچنے والا تھا اور اس کے بعد مجھے اس کے حوالے کر دیا جاتا اور بعد میں وہ مجھے اس ناہنجار انڈین آرمی آفیسر کے سپرد کر دیتے۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ یہ سوال میں نے خود سے مگر

دل میں کیا۔ ایک بار اگر میں انڈین آرمی کی قید میں چلا جاتا تو میرا بچنا مشکل ہو جاتا۔ وہ مجھے پاکستان دشمنی کی آڑ میں اُدھیڑ کر رکھ دیتے۔ اس کے بعد تصور میں رومی کو میں طارق سے کہتے ہوئے سنتا۔

"دیکھا، میں نے کہا بھی تھا سیف کو، یہاں انڈیا میں نہیں آنا چاہیے تھا، یہاں اس کی دال نہیں گلنے والی، اُلٹا پھنس جائے گا اور وہی ہوا۔ پاکستان اپنا ملک تھا وہاں کی اور بات تھی یا پھر امارات....."

رومی کو تو جیسے مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

"کمشنر کتنی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا؟" بھاری سل کی طرح پیتے لمحات سے گھبرا کر میں نے ان دونوں سے دوسرا سوال کیا۔ وہ تب بھی روبوٹ جیسی خاموشی سے مجھے تکتے رہے۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں بھی لگا کہ جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ میں نے تصدیق کی خاطر خود کو اِدھر اُدھر ہلا کر صوفے سے اُٹھنے کی کوشش چاہی تھی تو ڈوجا غرایا۔

"بیٹھے رہو۔"

میں ساکت ہو گیا۔ تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ دونوں کم از کم سکتے میں بالکل نہیں تھے، بلکہ چوکس تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی تو ایک اور جیسا شخص اندر وارد ہوا اور جھک کر اس نے ریٹا کے کان میں کچھ کہا۔ ریٹا نے ڈوجا کی طرف دیکھ کر مخصوص انداز میں اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔ ڈوجا نے میری جانب دیکھا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ریٹا بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں اب بھی مستعد اور چوکس تھے۔

"چلو اُٹھو....." ریٹا نے اپنے پستول کی نال سے مجھے اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ کہا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ان کے اشارے پر ایک طرف کو یوں چلا جیسے کسی بچے کو زبردستی اسکول لے جایا جا رہا ہو اور وہ منہ لٹکائے چلا جا رہا ہو۔

دوسرے کمرے میں مجھے وہی کمشنر راجیشور گڈوانی کھڑا نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو پولیس اہلکار اور وہ کم بخت انسپکٹر ارن پال بھی کھڑا تھا۔ انہیں نجانے کیوں بیٹھنے کے لیے بھی شاید نہیں کہا گیا تھا، یا پھر وہ جلدی میں تھے۔

"یہ لو کمشنر! سنبھالو اسے..... ہمارا کام ختم ہوا۔" ریٹا اس سے سپاٹ لہجے میں بولی۔

کمشنر راجیشور نے مجھے سخت اور کڑے تیوروں سے گھورا اور پھر ارن پال کو اشارہ کیا، ارن پال نے دونوں اہلکاروں کو اشارہ دیا اور وہ ہینڈ کف لیے میری جانب بڑھے۔

آن واحد میں مجھے آہنی ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ اس کے بعد ہم باہر ایک گاڑی میں سوار ہو گئے۔

ان دو میں سے ایک اہلکار نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، کمشنر اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا، جبکہ ارن پال، میں اور دوسرا اہلکار..... ہم عقبی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

میرا چہرہ بالکل ہی اُتر گیا تھا۔ دل و دماغ میں اب کسی اُمید کی ایک ذرا سی رمق نہ رہی تھی۔ ایک جھٹکے میں جیسے کایا کلپ ہو گئی تھی میری اور میں جن لوگوں کے نرغے میں جانے سے سخت خوف زدہ تھا، اب پورے اہتمام کے ساتھ مجھے انہی لوگوں کے حوالے کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں طارق یا رومی کی طرح کوئی پروفیشنل فائٹر نہ تھا کہ دھواں دھار قسم کی ہیرو والی انٹری ماروں اور ان کے چنگل سے نکل بھاگوں.....

مجھے اب یوں لگ رہا تھا جیسے بس اب میں بند گلی میں آن کھڑا ہوا ہوں۔ آگے کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ یہی نہیں اسی بند گلی میں مجھے اپنی قبر بھی بنی نظر آنے لگی تھی۔ ایسی قبر جس کے اندر میری اُجڑی بجڑی لاش پڑی ہو۔

اب انڈین آرمی والے میرے ساتھ کیا حشر کرتے، اس کا اندازہ مجھے ہو چلا تھا۔ یہ لوگ پاکستان فوبیا میں پڑ کر ذہنی مریض ہو چکے تھے۔ پاکستان سے ایک مچھر بھی سرحد پار کر کے ان کے ہتھے چڑھ جاتا اور اس پر پاکستانی جاسوس کا ٹھپا لگا کر زندان میں پھینک دیا جاتا تھا۔

میں بھی اپنا حشر تصور کی آنکھ سے کچھ ایسا ہی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے جسونت رائے پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بڑا دھوکا کیا تھا۔

ساری معلومات مجھ سے حاصل کر لینے کے بعد اس نے مجھے لشوپیر کی طرح پھینک دیا تھا۔ بقول اس کے وہ کم از کم..... اپنے دیش کی آرمی کے معاملات سے دور ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پہلے تو وہ بھرے پُرے شہر کی ٹریفک زدہ شاہراہوں سے گزرتی رہی اس کے بعد مضافات میں آتے ہی رفتار مزید بڑھا دی گئی۔

وقت دن کا تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گرمی پڑ رہی تھی۔ گاڑی میں اے سی آن تھا۔ پانی کی بوتلیں پی جا رہی تھیں مگر مجھے خالی بوتلیں دکھا کر پیاس

بجھانے کی خاموش تلقین کی جاتی رہی۔

مضافات میں سفر کرتے ہوئے ہمیں پندرہ بیس منٹ بیت چلے۔ یہاں اکا دکا کوئی گاڑی یا ٹرک وغیرہ گزر جاتا۔ آس پاس جنگلاتی علاقہ پھیلا نظر آیا۔ کہیں چھوٹی بڑی پہاڑیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی رہی۔

سامنے ایک تنگ موڑ پر...... گاڑی کی رفتار بتدریج آہستہ ہوئی اور جیسے ہی اس نے ایک موڑ کاٹا، ارد گرد سے ہماری گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی اور ساتھ ہی کار کے اندر بھی ایک عجیب قسم کا دھماکا ہوا، یوں جیسے کسی تیز اور سریع الاثر گیس کا گولا پھٹا ہو۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کشادہ اور آرام دہ کمرے میں ایک نرم و گداز بیڈ پر پایا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں سے بھی آزاد تھے۔

تھوڑی دیر تک تو میں اسی طرح خالی الذہنی کی حالت میں بیڈ پر پڑا چھت کو تکتا رہا۔

مجھے اپنے جسم میں درد کا احساس بھی ہوا۔ چہرے اور پیشانی پر کچھ خراشیں بھی محسوس کیں۔ جن سے ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ میں ان معمولی چوٹوں کو سہہ گیا اور پھر کسی دیکھی ہوئی فلم کی طرح وہ مختصر واقعات میرے چشم تصور سے گزرتے چلے گئے۔

جسونت رائے کی دھوکا دہی، کمشنر کے ہاتھوں میری حوالگی اور پھر پولیس کی معیت، گاڑی، فائرنگ اور گیس کے گولے کا پھٹنا پھر میرا بے ہوش ہونا، سب اس ''شارٹ فلم'' میں شامل تھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیسے بچ گیا تھا اور نہ صرف بچا ہوا تھا بلکہ آرام سے لیٹا ہوا اور آزاد بھی تھا۔

آزادی کا لفظ ذہن میں آتے ہی میں ایک دم بیڈ پر اُٹھ بیٹھا۔ سر تھوڑا چکرایا مگر ذہن زیادہ چکرایا ہوا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا۔ میں اکیلا ہی تھا۔ دروازہ بند تھا۔

میں نے خود کو ٹٹولا ذرا سنبھالا لیا اور پھر بیڈ سے نیچے اُتر آیا۔ آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھا۔ ناب پر ہاتھ رکھا اور اسے گھمایا۔ ناب گھوما مگر دروازہ کھل کے نہیں دیا۔ یعنی باہر سے بند تھا۔

میں ابھی پلٹ کر بیڈ تک پہنچا ہی تھا کہ دروازہ یک دم کھل گیا۔ سامنے جن دو افراد پر میری نظر پڑی، انہیں دیکھتے ہی مجھے ایسا ہی لگا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ سب محض ایک خواب تھا۔ یعنی، جسونت رائے کی گل نمار ہائش گاہ سے لے کر پولیس کے ہاتھوں میری حوالگی اور پھر انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر رائے کی رہائش گاہ سے روانگی، سب خواب......

میرے سامنے ریٹا اور ڈوجا کھڑے تھے۔ خلافِ معمول ان دونوں کے چہروں پر اسرار بھری مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

''مم...... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں......؟'' میں نے ان دونوں کو حیران پریشان سی نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' ریٹا مسکرا کر بولی۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ آؤ، سب معلوم ہوجائے گا۔'' ڈوجا بولا اور ساتھ ہی مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔

ہم اسی کمرے میں آگئے جہاں کچھ دیر پہلے میں جسونت رائے کے ساتھ موجود تھا۔

وہاں میں نے اسے بھی صوفے پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان، سگار پیتے ہوئے پایا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے بھی سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' جسونت رائے گمبھیر لہجے میں بولا۔ میں اسے حیران اور اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا تم نے ہمارے لاڈلے بھتیجے وجے کا خون اتنا ہی رائگاں سمجھا تھا؟'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں......'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اس چھوٹے سے ڈرامے کی ہم تم سے معافی ہرگز نہیں مانگیں گے۔'' وہ پھر بولا۔ ساتھ ہی سگار کا ایک کش لے کر لچھے دار دھواں فضا میں اُگلا۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں......رائے صاحب!'' میں نے بہ یک گرنت کہا۔ ''لیکن اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

''یہ سالے آرمی والے...... اپنی نااہلیت کو چھپانے اور اپنی قابلیت ان ڈھکوسلے بازیوں سے اُجاگر کرنے کی ناکام کوشش کر کے بھارتی عوام کے سامنے خود کو ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے ان کا پسندیدہ حربہ پاکستان کے کسی آدمی کو پکڑ کے اس پر خطرناک جاسوس کا لیبل لگا لیتے ہیں۔ مگر اب بھارتی جنتا بھی انہیں سمجھ چکی ہے۔

''تازہ ترین بھارتی ہوا باز کی پاکستان کی سرحد پر بھگوڑے جیسی حالت اور وہاں چائے نوشی کی مہمان نوازی

okliberary.com

کے بعد اس کا پاکستان سے خیر سگالی کے طور پر زندہ چھوڑ دیا جانا ثابت کر گیا ہے کہ دونوں طرف کی عوام صرف امن چاہتی ہے۔

"بے شک، مجھے آپ کے یہ خیالات جان کر خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"تم اب بھارتی آرمی سے آزاد ہو چکے ہو۔" رائے نے جیسے مجھے خوش خبری دی۔

"لیکن میں ان کی گرفت میں گیا ہی کب تھا؟" میں نے ہونق سے انداز میں سوال کیا۔

"گرفت میں چلے جاتے تو ہم یہ ڈراما کرنے کے قابل ہی کہاں رہتے؟" جسونت رائے بولا۔ میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔

"تم اب ان کے لیے مر چکے ہو۔ ایک لاش وہاں تمہارے نام کی جلی سڑی رکھ دی گئی ہے۔ ایک پولیس اہلکار کو بھی قتل کرنا پڑا۔ ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے کمشنر اور ہمیں اپنے نالائق داماد کو بھی زخمی کرنا پڑا۔"

وہ اس انکشاف پر ذرا رکا تو تب بھی میرے اندر کچھ سوالات تھے، اگرچہ میں اب جان چکا تھا پولیس کی گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے والے اسی کے آدمی تھے۔

"لل..... لیکن فائرنگ کے فوراً ہی بعد گاڑی کے اندر میں نے گیس کا ایک گولا پھٹتے بھی دیکھا تھا۔ اس کا اس بنے بنائے ڈرامے سے کیا تعلق تھا؟"

میرے اس سوال پر جسونت رائے کی باچھیں مسکرانے کے انداز میں تھوڑا پھیلی تھیں مگر تب بھی وہ مسکراتا محسوس نہیں ہوا مجھے؛ وہ اسی انداز میں بولا۔

"وہ تمہارے ساتھ بیٹھے پولیس اہلکار کا شاخسانہ تھا، جو در پردہ ہمارا ہی آدمی تھا۔ تمہیں اور ان سب کو بے ہوش کرنا ضروری تھا۔ ہمارے آدمیوں نے دانستہ پولیس گاڑی کی باڈی پر فائرنگ کی تھی۔ ڈرامے کا اصل حصہ جسے تم 'کلائمیکس' بھی کہہ سکتے ہو، بعد میں شروع ہوا..... ہم بلاوجہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے قائل نہیں ہیں لیکن معاملہ ذاتیات پر آجائے تو ایک آدھ قتل پر کوئی مضائقہ نہیں کرتے، آخر کو اس قسم کے ڈرامے میں کہیں اصل رنگ کا "ٹچ" بھی دینا ہی پڑتا ہے، خیر..... ٹائر برسٹ ہونے پر گاڑی کچے میں جا کر کھڑائی۔ گھات لگائے ہوئے ہمارے آدمیوں نے پولیس ڈرائیور کو گولی مار کے اس کا دیہانت کیا۔ ایک ایک گولی کمشنر اور ارن پال کے شریر میں بھی اُتارنا پڑی۔ ارن پال کو تو ویسے میں نے اپنا غبار نکالنے کے لیے ٹھوکنا ہی تھا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "مگر اس طرح کے ان کا دیہانت نہ ہو، یہ ڈرامے میں اصل رنگ بھی بھرنا مقصد تھا اور ایک طرح سے انہیں سزا دینا بھی کہ جب میں کہہ آیا تھا کہ تمہارے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے تو پھر بھارتی آرمی کو کیسے یہ سب معلوم ہوا؟ تمہاری جگہ ایک لاش کو ہتھکڑیاں ڈال کر اس کا چہرہ مسخ کر دیا گیا۔ اب باقی کا کام ارن پال سنبھال لے گا..... سمجھ تو وہ ناہنجار بھی گیا ہوگا، مگر ہمیں پورا وشواش ہے کہ وہ اب بھی وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔"

یہ ساری صورتِ حال جان کر میرے دماغ کا بوجھ کم ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جس مایوسی اور نا اُمیدی کا شکار تھا اب ایک دم مسرت انگیزی سمیت پر اُمیدی محسوس کرنے لگا۔

اگرچہ اب بھی کچھ بعید نہ تھا کہ جسونت رائے کے اگلے ڈرامے کے اندر میرا کیا رول ہوگا؟

"مان گئے آپ کو رائے صاحب! مان گئے۔ میں تو سمجھا تھا کہ بس مفت میں مارا گیا میں....." میں نے توصیفی لہجے میں کہا۔

"میں چاہتا تو تمہیں ایک طرف کر دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے اور میرے دشمن ایک ہی ہیں اور جو جذبہ تمہارے دل میں ہے وہی میرے دل میں بھی ہے۔ اب تم میرے لیے کھل کر اور بلاخوف کام کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ پھر سگار کا ٹوٹا ڈوجا کی جانب بڑھا دیا، جسے اس نے فوراً فدویانہ انداز میں اس کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"میں اب بھی حاضر ہوں....." میں نے بھی عاجزی سے کہا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"ریٹا اور ڈوجا تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تمہیں اب کیا کرنا ہے، یہ دونوں تمہیں بتا دیں گے۔"

یہ کہتے ہی جسونت رائے اُٹھا اور چلتا بنا۔ میں اب ریٹا اور ڈوجا کی جانب دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کملیش کی پشت اور بوتھی دونوں ہی سوجی ہوئی تھیں۔

جسونت رائے کے کمرے سے نکلتے ہی ریٹا اور ڈوجا مجھے اس کمرے میں لے آئے تھے جہاں کملیش کو رکھا گیا تھا۔ رائے کے جلاد صفت آدمیوں نے اس کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہیں برتی تھی۔

لائحہ عمل مجھے ان دونوں نے سمجھا دیا تھا۔ جسے سن کر

مجھے خود پر فخر ہوا کہ جسونت رائے نے اپنے ان دونوں فعال ترین اور چست و چالاک آدمیوں کو مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا تھا۔

بہر کیف..... ان کا لائحہ عمل سننے کے بعد میں نے ہی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے کملیش کے پاس لے جایا جائے اور یوں اب میں ریٹا اور ڈوجا کو لیے یہاں موجود تھا۔

یہ کمرا ایک عقوبت خانہ تھا..... اینٹوں والے فرش پر کملیش ننگے بدن کے ساتھ آڑا ترچھا اور لہولہان پڑا تھا۔ پکی چھت والے اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔

جلادوں میں سے ایک وہاں موجود تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط ڈیل ڈول کا شخص تھا۔ رنگت سیاہ تھی، سر گنجا اور چہرے پر کرختگی اور..... خونخواری نمایاں تھی۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا، نیچے اس نے شکاریوں والی خاکی نیکر پہن رکھی تھی۔

وہ ایک طرف اپنے موٹے موٹے ستونوں جیسے پاؤں پھیلائے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔

"اسے سیدھا کرو اور ہوش میں لاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

اُس نے میری جانب گھورا تو مجھے اپنے پورے بدن میں پھریری کا احساس ہوا۔

قریب دھرے آلات تشدد جو زنگ آلودہ ہو کے مزید ہیبت دکھا رہے تھے، وہاں پانی کی ایک بالٹی رکھی تھی۔

وہ اُٹھا۔ اس نے کملیش کے اُوپر پھینکی اور ساتھ ہی اسے پیروں کی ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ کملیش کی حالت واقعی اس سفاکانہ تشدد کے بعد ناگفتہ بہ تھی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ کسی طور بھی معافی یا رحم کے مستحق نہیں ہو سکتے تھے۔

میں چند قدم اُس کی جانب بڑھا۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل سیدھا ہوا۔

"رتلام میموریل اسپتال میں کون کون لوگ اس گھناؤنے کاروبار میں شامل ہیں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ "ان کے نام اور عہدے بتاؤ۔"

"پپ..... پانی..... مم..... میرا حلق خشک....." وہ کراہا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"یاد رکھنا، پانی پینے کے بعد کوئی ڈراما نہیں برداشت کروں گا میں تمہارا....." میں نے اس سے دانت پیس کر کہا اور اسی جلاد کو اشارہ کیا۔ اس نے جست کا ایک گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ غٹاغٹ چڑھا گیا۔

"اب جواب دو میرے سوال کا....." میں نے کہا۔

"اس اسپتال کا ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر اشوک اور ایڈمن ایم او... ڈاکٹر جیمس شامل ہیں۔" بالآخر کملیش نے بتانا شروع کر دیا۔ تین پیرامیڈکس کے نام بھی بتائے اس نے، جن میں ایک نرس بھی شامل تھی۔

"یہ لوگ ضرور وہاں اپنے گروگھنٹال شنکر چانکیہ کی پشت پناہی اور اسی کے کہنے پر اس اسپتال میں کالا دھندا کر رہے ہوں گے؟" میں نے دانستہ پینترا بدلا۔

"شش..... شنکر چانکیہ.....؟" وہ سوالیہ انداز میں بڑبڑایا تو میں نے جلاد کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم نے اس کا کیا منہ کھلوایا ہے؟ یہ اپنے گرو کا نام اس طرح لے رہا ہے جیسے آج پہلی بار میری زبان سے سن رہا ہے؟"

جلاد اسے خوں خوار آنکھوں سے گھورتا اور غوں غوں کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو کملیش ایک دم بولا۔

"بب..... بتا رہا ہوں..... بتا رہا ہوں۔"

میں نے یک دم ہاتھ کے اشارے سے جلاد کو اس کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھنے سے روک دیا۔

میرا نفسیاتی حربہ کامیاب گیا تھا۔ قریب خاموش کھڑے، ریٹا اور ڈوجا کے چہروں پر ہلکی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

"تت..... تم صحیح کہہ رہے ہو۔" کملیش نے اب بھی لفظوں کا مختصر استعمال کیا تو میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

"میں غلط کہہ بھی نہیں سکتا اس لیے کہ میرا ایک طویل عرصہ تمہارے ان سارے گروؤں کے ساتھ گزرا ہے۔" میں نے رعب جھاڑا۔ مقصد اسے جھوٹ بولنے کی کوشش سے مانع رکھنا تھا۔

ریٹا اور ڈوجا خاموشی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

"شنکر چانکیہ کے کہنے پر ہی تم نے رائے صاحب کے بھتیجے وجے کو تختۂ مشق بنایا تھا؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"جی جی..... یہ میری بھیانک غلطی تھی۔" کملیش خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "میرا دشواش کرو، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ وجے رائے صاحب کا بھتیجا ہے تو میں کبھی....."

"بکواس بند۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "جو سوال کروں اسی کا جواب دو۔" یہ کہتے ہوئے میں گاہے بہ گاہے قریب بہ ظاہر خاموش کھڑے ریٹا اور ڈوجا کے چہرے کی طرف بھی کن انکھیوں سے دیکھ لیتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری ''کارکردگی'' اور ''ذہانت'' کی ساری رپورٹ یہ دونوں من وعن رائے صاحب کو دیں گے اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ جسونت رائے کے دل میں اپنا سکہ جمالوں، کیونکہ اس دیارِ غیر میں بہرحال ایسا آدمی ہونا چاہیے جس کے کندھوں پر رکھ کے میں بندوق چلاسکوں۔

''اگر تم رائے صاحب کے عتاب سے خود کو بچانا یا کوئی رعایت حاصل کرنا چاہتے ہو تو..... چانکیہ کی کٹیا کھڑی کرنے کے لیے ہمارا پورا ساتھ دو اور اس کے پورے نیٹ ورک کے بارے میں بتاؤ، ساتھ ہی اس کے وہ خفیہ ٹھکانے بھی جہاں وہ قیام کرتا ہے۔''

''میں تیار ہوں۔'' وہ ایک دم بولا۔

''رتلام میموریل اسپتال کے علاوہ اور کن کن ہاسپٹلز میں اس کے کہنے پر یہ خونی کھیل کھیلا جارہا ہے؟''

میرے اس سوال کے جواب میں اس نے صرف دو ہی اسپتالوں کے نام اور وہاں کام کرنے والے چند لوگوں کے بارے میں بتایا۔ جو کسی معروف جگہ کے بجائے نواح میں واقع تھے، یوں بھی ایسے ''کام'' کے لیے یہ لوگ ایسے ہی علاقے چنتے تھے مذکورہ دو اسپتال ممبئی کے ہی تھے۔

میں نے دیکھا، ریٹا کے ہاتھوں میں اب ایک پاکٹ سائز ڈیجیٹل ڈائری نظر آرہی تھی۔ وہ یہ سب نوٹ کرتی جارہی تھی۔

شنکر چانکیہ کے ایک ہی ٹھکانے کے بارے میں وہ بتا سکا تھا جو ممبئی کے... نواح میں ساحلی مقام پر تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں زیادہ تر فلمی ستاروں اور پروڈیوسروں کی بیش قیمت محل نما رہائش گاہیں تھیں۔

اس کے علاوہ چند اور ضروری سوالات پوچھے تھے۔

اس کے بعد میں نے ریٹا اور ڈوجا کی طرف دیکھا۔

ہم عقوبت خانے سے باہر آگئے۔ ریٹا اور ڈوجا میری جانب دیکھنے لگے۔ میں ... ہونٹ بھینچے، کسی سوچ میں مستغرق رہا۔

دراصل جسونت رائے نے..... مجھے یہ ٹاسک دے رکھا تھا کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے انتقام کے ساتھ..... ساتھ..... اس کے مفادات کا بھی خیال رکھوں۔ وہ شنکر چانکیہ کو زندہ اپنے محل کے عقوبت خانے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کے لیے اس نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے صرف اپنے ہی مقصد پر توجہ مرکوز رکھی تو وہ یعنی جسونت رائے..... اسے کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

ظاہر ہے مجھے بھلا اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا، مقصد تو تب بھی ایک ہی تھا۔ فائدہ یہ ہوجاتا کہ جسونت رائے کی مدد بھی شامل ہوجاتی ہمیں.....

تاہم میں نے جسونت رائے پر اتنا ضرور ظاہر کردیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مجھے جلد از جلد اپنے دونوں ساتھیوں طارق اور رومی سے رابطہ کرنا ہوگا۔ جسونت رائے نے میرے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرلیے تھے۔ سردست تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

مجھے اب کب طارق اور رومی سے رابطہ کرنا تھا، اس کے لیے مجھے مناسب موقع کی تلاش تھی۔ جب تک میں اپنے طور پر یہاں خونی سوداگروں کا قلع قمع کرسکتا تھا، میں جسونت رائے کے آدمیوں (ریٹا اور ڈوجا) کے ساتھ اپنی سی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔

جسونت رائے کا ٹارگٹ شنکر چانکیہ تھا، جبکہ میرے اولین اہداف میں ڈاکٹر رمیش اگروال سمیت گوہر شاہ اور تاج تھے۔

جیسا کہ مذکور ہوا، وہ بھی پاکستان میں گرفتاری کے ڈر سے ادھر ہی چھپے بیٹھے تھے۔ طارق اور رومی ان کی گھات میں تھے۔

اگلے روز ایک تیز رفتار کار میں ہم تینوں رتلام اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ کملیش نے جو معلومات دینا تھی، وہ دے چکا تھا۔ جسونت رائے انتقام کی آگ میں بھرا ہوا تھا اور اس نے کملیش کو بڑی عبرت ناک موت سے ہمکنار کرڈالا تھا۔ اس نے بھتیجے کے قتل میں ملوث کسی بھی آدمی کو زندہ نہ چھوڑنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔

فی الوقت ہمارا ٹارگٹ رتلام اسپتال کا ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر اشوک اور ایڈمن ایم او ڈاکٹر جیمس تھے۔

کملیش سے فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ اسپتال کی رہائش گاہ 'میڈیکل آفیسرز کالونی' میں ہی مقیم تھے۔

ہم تیز رفتار کار میں..... وہاں پہنچ گئے۔ شاندار گاڑی اور آرام دہ سفر نے ہمیں بالکل بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہونے دی۔

نصف گھنٹے بعد ہم وہاں جا پہنچے۔ رات جھک آئی تھی۔ کار ہم نے اسپتال سے تھوڑی دور واقع ایک ایسے مقام پر روک دی تھی جو سنسان اور جنگلاتی علاقہ تھا۔

ہم کار سے نیچے اُتر آئے۔ چہار اطراف سناٹا اور

تاریکی تھی۔ ہمارے آگے پیچھے اور دائیں جانب جنگل اور جھاڑیاں تھیں۔ بائیں سمت پر قدرے بلندی تھی، اس سے پہلے درخت اور جھاڑیوں کے اوپر سے کچھ ٹیلوں کے اُبھرے ہوئے ہیولے دکھائی دیے۔ ان کے عقب میں اسپتال کی دومنزلہ عمارت نظر آرہی تھی۔

ہم تینوں نے ایسا سیاہ لباس پہنا تھا جس میں نیچے سے اُوپر تک زپ لگی ہوئی تھی۔ ہڈنما ماسک بھی اس میں لگا ہوا تھا۔

اب ہم سرتاپا سیاہ پوش بن چکے تھے اور تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے ایک ایک کان پر ائیر وائیز رلگا لیا تھا۔

اسپتال کے نقشے کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے..... ہم اس کی عمارت کے نزدیک پہنچ کر رک گئے اور درختوں کی اوٹ سے بہ غور سامنے کا جائزہ لیتے رہے۔

عمارت مستطیل تھی۔ اس کے سامنے بڑا سا باغیچہ تھا ایل شیپ میں اور اسی کے درمیان سے ایک پختہ روش نکل کر سڑک سے مل رہی تھی، جو آگے جا کر مین روڈ سے ملتی تھی۔ اسپتال کے مین گیٹ اور احاطے کے درمیان چپس اور ماربل کا فرش چمک رہا تھا، اس طرف چند چھوٹی بڑی ایمبولینس کھڑی تھیں۔ دیگر گاڑیاں ایک ترتیب سے دائیں بائیں پارکنگ میں لگی ہوئی تھیں۔ میڈیکل آفیسرز کالونی اس عمارت کے عقب میں کہیں تھی۔

ریٹا اور ڈوجا نے اپنے طور پر ان دونوں مذکورہ افراد کے بارے میں مریض یا اس کے لواحقین بن کے معلومات لے لی تھیں۔ وہ دونوں آج اپنی رہائش گاہ میں موجود تھے۔ صبح میں ڈیوٹی پر آتے اور شام پانچ بجے تک رہتے۔ ایمرجنسی میں انہیں کسی بھی وقت کال کرلیا جاتا تھا۔

''سیکیورٹی کا نظام کچھ خاص نظر نہیں آتا۔'' ریٹا نے سرسراتی سرگوشی میں تبصرہ کیا۔

''میرا خیال ہے، موقع ٹھیک ہے۔ ہمیں پیش قدمی کر لینی چاہیے، اس سے پہلے کہ ان دونوں کو کوئی ایمرجنسی کال آجائے۔'' ڈوجا بھی سرسرایا اور میری جانب دیکھا، گویا مجھ سے کہنا چاہتا ہو۔ ''کیا خیال ہے؟''

''بالکل ٹھیک خیال ہے۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ پھر تھوڑا گڑبڑا سا گیا مگر بات سے بات رہ گئی۔ ہم دائیں جانب کو بڑھ گئے۔ وہاں سے ایک طویل چکر کاٹ کر ہم رہائشی کالونی والی جگہ پر باؤنڈری وال کی جنوب مشرقی سمت کی طرف آگئے، اس سے آگے داخلی گیٹ تھا، وہاں چوکیدار۔ کا کیبن بنا ہوا تھا۔

ریٹا اور ڈوجا دیوار کی اُونچائی کا اندازہ کرنے لگے۔ اس کے بعد ریٹا نے پھرتی سے ہاتھ چلائے اور اگلے ہی لمحے اس کے ایک ہاتھ میں عجیب ساخت کی چھوٹی نال والی اسٹیل کی گن چمکتی نظر آنے لگی۔

یہ نقب لگانے والا ایک خودکار جدید آلہ تھا جو میں روی کے پاس بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ اسپائڈر گن تھی۔ اس کی نال کا رخ اُوپر کر کے اس نے ٹریگر دبایا اور اگلے ہی لمحے نال سے سرسراتی آواز نکلی اور ایک باریک سی چمکتی تار جو غور سے ہی دیکھنے پر نظر آئی تھی، سانپ کی طرح بل کھاتی اُوپر کو لپکی اور منڈیر پر جا اٹکی۔

دوسرے ہی لمحے، ریٹا اُوپر چڑھتی چلی گئی۔ منڈیر پر پہنچتے ہی اس نے پہلے اردگرد کی سن گن لی اور اس کے بعد وہ دوسری جانب اُتر کے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں اور ڈوجا وہیں دبکے کھڑے رہے۔ ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ اندر جا کے ریٹا کو ائیر وائزر پر ہمیں 'اوکے' کا اشارہ دینا تھا۔ یوں میں اور ڈوجا اسی کے منتظر رہے۔

کافی دیر بیت چلی تو ڈوجا بڑبڑایا۔ ''ریٹا کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟''

''تم ہی رابطہ کر کے پوچھ لو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''ہم.....'' ڈوجا کے منہ سے نکلا اور اس نے یہی کیا مگر چند..... لمحے بعد ہی بولا۔ ''وہ شاید کسی خطرے میں گھر گئی ہے۔'' اس کے سرسراتے ہوئے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔

''کیا مطلب؟'' میں بھی پریشان ہوگیا۔

''وہ اشارہ ریسیو کر رہی ہے نہ کال..... لگتا ہے، مجھے ہی جانا پڑے گا۔'' وہ بولا۔

''اور میں.....؟''

''تم اِدھر ہی رہو گے۔''

''لیکن میرے پاس تو ایسا کوئی آلہ نہیں، اگر تم بھی جا کر کسی مصیبت میں.....'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''یہ بعد میں دیکھا جائے گا، تم کوئی بڑا تیر نہیں مار لو گے۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنے سیاہ چست لباس میں ہاتھ ڈالا۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔

چند لمحے بعد وہ بھی اپنی اسپائڈر گن کے ذریعے اندر کود چکا تھا۔ میں ہونقوں کی طرح دیوار سے لگا کھڑا رہ گیا۔

وقت اندیشناک لمحوں کی دھمک دیتا بیتا جا رہا تھا اور

اب ڈوجا کو بھی گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ مجھے سچ معنوں میں فکر و تشویش نے آن گھیرا۔

’’اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘ میں نے خود سے سوال کیا۔ جواب ملا کہ تھوڑی دیر اور انتظار کر لینے میں چنداں حرج نہیں......

لہٰذا تھوڑی دیر اور بھی انتظار کر لیا اور ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں لوٹا۔

میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہتا اور کورا تھا میں...... ماسوائے اس کالی بلی جیسی سیاہ چست پوشاک کے......

میرے پاس کوئی اسپائڈر گن نہ تھی۔ لہٰذا دیوار پھلانگنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کیا کرنا چاہیے؟ ہماری کار تھوڑے فاصلے پر درختوں اور گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں کھڑی تھی، اسی میں لوٹ جاؤں؟ لیکن جسونت رائے کو کیا جواب دوں گا؟ جو اَب مجھ پر بھروسا کرنے لگا تھا۔ اب نجانے یہ میری کسی لنگڑی لولی کارکردگی کی بنا پر تھا یا پھر میرا جذبہ...... اب بہرحال مجھے ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

میں نے چند گہری سانسیں لینے کے دوران کچھ سوچا اوز واپس پلٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہی چھپتا چھپاتا ہوا اسپتال کے مین گیٹ کی طرف آ گیا۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنا سیاہ بلی جیسا چست لباس اُتار کے جھاڑیوں میں کہیں دبا دیا، اس کے بعد اپنا حلیہ کچھ ایسا کر ڈالا جیسے میں کسی ایمرجنسی ’’چیسٹ پین‘‘ (سینے کے درد) میں مبتلا ہوں۔

پھر اسی طرح میں ہانپتا کانپتا اور اپنا سینہ تھامے...... گرتا پڑتا گیٹ پر آ گیا، وہاں دو وردی پوش گارڈز موجود تھے، مجھے اس حالت میں دیکھتے ہی وہ سنبھالنے کو لپکے تھے، انہیں متوجہ پا کر میں پختہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا اور ساتھ ہی کھینچ کھینچ کر سانسیں لینے لگا۔

وہ دونوں مجھے اُٹھا کر اندر لے آئے...... لیکن کم بخت اب بھی مجھے اسپتال کے مرکزی دروازے کی جانب نہیں لے گئے بلکہ باہر ہی ایک کمرے میں لے آئے اور ایک اسٹریچر پر ڈال دیا۔

’’کیا ہوا ہے تمہیں......؟‘‘ ایک نے پوچھا۔

’’مم...... میں انجائنا کا...... مم...... مریض...... آہ...... درد...... آہ......‘‘ میں نے انجائنا کے مریض کی بھرپور ایکٹنگ کی تو دوسرے نے پہلے والے ساتھی سے کہا۔

’’یار اسے اندر ہی ایمرجنسی میں لے جاؤ، ہمیں ڈاکٹر اشوک کی ہدایت نہیں بھولنی چاہیے۔‘‘

اب نجانے ڈاکٹر اشوک کی ہدایت پر یا اپنے ساتھی گارڈ کی ہدایت پر، مجھے مرکزی دروازے کی سیڑھیوں کے متوازی بنی سلوپ نما جگہ سے جو وہیل چیئر اور اسٹریچر پر لدے ہوئے مریضوں کے لیے مستعمل تھی، سے اسپتال کے اندر لایا گیا اور وہاں پہنچتے ہی مجھے عملے کے مخصوص وردیوں میں ملبوس دو افراد کے حوالے کر دیا جو مجھے دیکھتے ہی لپک کر آگے گئے تھے۔

گارڈز مجھے اسٹریچر سمیت ان کے حوالے کر کے واپس پلٹ گئے تھے۔ میری ’’پیشہ ورانہ‘‘ نظروں نے فوراً تاڑ لیا تھا کہ یہ ایمرجنسی پیرامیڈکس عملے کے لوگ تھے۔

مجھے لیے وہ سیدھا ایک کھلے ڈلے کیبن میں...... آئے اور خود کار آلوں کی مدد سے میرے وائٹل سائن لینے لگے۔

اس دوران ایک نے کوئی گولی مجھے زبان کے نیچے رکھنے کو بھی دی۔ جو میں نے منہ میں لے تو لی، لیکن ہانپنے کی زبردست ایکٹنگ کے دوران وہ میں نے نظر بچا کر تھوک بھی دی۔ ورنہ میرے سینے کا جعلی درد کیا ٹھیک ہونا تھا اُلٹا میرا بی پی ہی لو ہو جانا تھا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ اس گولی کا بھی بھی کس قدر جادو اثر ہوتا ہے۔

مجھے آکسیجن بھی لگائی گئی۔ اب یہ ضروری تھا کہ میں خود کو کچھ بہتر ظاہر کر کے مقصد کی جانب آتا۔

’’شکریہ، اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔‘‘ میں نے ان سے کہا۔

’’کیا تمہاری کوئی پاسٹ میڈیکل ہسٹری ہے چیسٹ پین کی؟‘‘ ایک نے پوچھا۔

’’کچھ خاص تو نہیں، پر سینے میں درد ہوتا رہا ہے، جسے میں گیس کا درد سمجھ کر بہلاتا رہا ہوں۔‘‘

’’غلط، تمہیں فوراً کسی دل کے ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کروانا چاہیے تھا۔‘‘ دوسرا بولا۔

’’ارے بھائی! یہاں کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور تم کہتے ہو کہ......‘‘ اتنا ہی کہتے ہوئے میں پھر ہانپنے کی اداکاری کرنے لگا، اگرچہ یہ بس، ہو، سو، ہی تھی۔

میں ساتھ ہی ان دونوں کے چہروں کے بھی جائزے لے رہا تھا۔ ایک لمبا سا تھا اور دوسرا میانے قد و کاٹھ کا۔ لمبا کم عمر اور میانہ ذرا بڑی عمر کا تھا۔ وہی میرے اس جواب پر بغور مجھے تکنے لگا، پھر جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے جوان ساتھی پیرامیڈکس سے کہا۔

’’ریحان! تم اب جاؤ، میں اسے کچھ دیر کے لیے

pklibrary.com

آبزرویشن میں رکھ کے چھٹی کردوں گا۔ یہ اب اسٹیبل ہے۔"

"ٹھیک ہے موہن! جیسے تمہاری مرضی۔" ریحان نامی لڑکے نے کہا۔ وہ کیبن نما اس ایمرجنسی روم سے نکل گیا۔

ادھر بھی یہی 'وتیرہ تھا، پہلے پیرامیڈکس ایمرجنسی کو وائنڈل کرتا تھا، اس کے بعد ہی کسی ڈاکٹر کو کال کی جاتی تھی، لیکن 'معاملے' کو میں رفتہ رفتہ ہی آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

"شکر ہے تم نے ہی مجھے سنبھال لیا، ورنہ کسی ڈاکٹر کو کال کرتے تو وہ پتا نہیں کتنی فیس مجھ سے لے لیتا لیکن..... اب بھی کیا خبر کہ یہ اسپتال والے کتنا چارج کریں مجھ سے.....؟"

ریحان کے کمرے سے جانے کے بعد میں نے غربت کے مارے بدحال شخص کے سے انداز میں موہن سے کہا جو اب بھی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

میری بات سن کر ایسے چونک کر بولا جیسے واقعی وہ کچھ سوچنے میں محو ہو۔ بے تاثر سی مسکراہٹ تلے بولا۔

"چنتا مت کرو، اس طرح کی چھوٹی موٹی اور فوراری کور ہو جانے والی ایمرجنسی کے زیادہ چارج نہیں کیے جاتے اور یوں بھی یہ تو ایک میموریل اسپتال ہے۔"

"او کے اچھا، شکر ہے بھگوان کا۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

"ہاں تو بھئی کیا نام ہے تمہارا اور کیا کرتے ہو؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"میرا نام، چندری لعل ہے، گودی پر مزدوری کرتا ہوں۔ دنیا میں اکیلا ہوں۔"

"او..... اچھا۔" یکا یک میری بابت سنتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ وہ جو بغور میرا جائزہ لے رہا تھا یوں فوراً اس کی آنکھوں میں اُترتی ایک خاص چمک کو محسوس کیا۔ میرے اندر لمحہ بھر کو معنی خیزی سی پھیل ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے مجھے جانا چاہیے، اب میں ٹھیک ہوں۔" میں نے دانستہ ایسا کہا تو وہ یک دم بولا۔

"ہرگز نہیں، چندری بھائی! ابھی تو آپ کا تفصیلی معائنہ ہونا ہے، دیکھو نا بقول آپ کے یہ سینے کا درد پرانا ہے، بہتر ہوگا اب اپنا چیک اَپ کروا ہی لو، میں ڈاکٹر جیمس کو کال کر دیتا ہوں وہ یہاں کے سینئر ڈاکٹر ہیں۔"

ڈاکٹر جیمس کے نام پر میں ٹھٹک گیا۔ اشوک کے بعد یہی نام ایسا تھا جو ہمارا ٹارگٹ تھا۔ تو کیا یہ موہن پیرامیڈکس اس کے ساتھ ملا ہوا تھا؟ لیکن کملیش کے بتائے ہوئے تین پیرامیڈکس میں موہن نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ جبکہ مجھے یہ انہی کا ساتھی معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ موہن کا نام رہ گیا ہو یا پھر یہ ان کا کوئی نیا ساتھی بنا ہوا۔

"لل..... لیکن موہن بھیا! میں بہت غریب ہوں، خرچہ نہیں برداشت کر سکوں گا۔"

"ارے بھائی! تم سے خرچہ کون مانگ رہا ہے؟" موہن پھر مجھ سے شفی آمیز لہجے میں بولا۔ "بتایا تو تھا ابھی میں نے کہ یہ ایک چیریٹی ہاسپٹل ہے۔" یہ کہہ کر وہ آخر میں یہ بولتا ہوا چلا گیا کہ "ابھی آتا ہوں۔"

مجھے اپنی دال گلنے کی اُمید نظر آنے لگی۔ موہن مجھے خونی سوداگروں کا ناؤٹ ہی محسوس ہوا تھا۔

اسے شاید پہلے ہی سے یہ ہدایات تھیں کہ کوئی اکیلا دکیلا اور لاوارث غریب مریض آئے تو اسے پھانس کر رکھا جائے اور اب شاید وہ وہی کر رہا تھا۔

وہ شاید اب ڈاکٹر جیمس کو کال کرنے گیا تھا بہ الفاظ دیگر شکار کا بتانے گیا تھا۔ ریٹا اور ڈوجا کے مقابلے میں مجھے اپنا کام بہ ظاہر آسان بھی نظر آ رہا تھا لیکن یہ تصور کر کے مجھے جھرجھری سی بھی محسوس ہوئی تھی کہ کہیں میں سچ مچ اس 'مہم جوئی' کے دوران ان کے نرغے میں چلا گیا تو عالم بالا یا کسی آپریشن ٹیبل پر ہی میری آنکھ کھلے گی.....

یوں بھی پتا نہیں ریٹا اور ڈوجا کا کیا حشر ہوا تھا؟ وہ کم بخت میرے لیے ایک الگ معما بنے ہوئے تھے۔ اگر وہ پکڑے گئے تھے تو میرا بھی پول کھل سکتا تھا، لیکن عقل تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ دونوں پکڑے گئے ہوں، کیونکہ انہوں نے عام سی رہائش گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی، کوئی جیل یا بیرک توڑنے کے لیے تو نہیں گئے تھے، پھر رہائش گاہ بھی دو عدد ڈاکٹروں کی، بھلا وہاں کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ دونوں ہی دھر لیے گئے ہوں؟ یوں بھی اتنی آسانی سے دھر لیے جانے والے کہاں تھے وہ.....؟ تاہم اچانک میں اپنے کچھ اسی قسم کے پیش آمدہ واقعات یاد کر کے چونکا۔

جب میں امارات میں تھا۔ رومی اور میں بالکل اسی طرح جہنم واصل سرجن امرناگ کی رہائش گاہ میں نقب لگا کر گئے تھے تو دھر لیے گئے تھے۔ گویا یہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر اشوک اور ڈاکٹر جیمس کوئی عام افراد نہ تھے بلکہ خطرناک مجرم تھے۔ ایسے لوگ اپنی حفاظت کے لیے بھی سب کچھ کر سکتے تھے۔

خیر، اس وقت تو میرا دل چاہا کہ بھاگ جاؤں، کیوں

میں خود کو اس طرح دانستہ ایک عبرت ناک موت کے منہ میں دھکیلنے لگا ہوں؟ لیکن یہ خیال بس ایک لمحے کو ہی میرے ذہن میں آیا تھا اور دوسرے لمحے جھٹکنا پڑا۔

خود کو خطرے میں ڈالے بغیر اور کوئی رسک لیے بغیر میں بھلا کب اپنے بھائی عادل کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکتا تھا۔ اپنے معصوم بھائی کا خیال آتے ہی میرے اندر انتقام کا ساجوش بھر آیا اور میں..... موہن کا انتظار کرنے لگا۔

وہ تو نہیں آیا البتہ..... ایک فی میل اور ایک میل نرس اندر در آئے۔ میں اُلجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا اور پریشانی کا مظاہرہ کیا تو نرس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم آپ کو دوسرے کمرے میں شفٹ کر رہے ہیں۔ یہاں ایک اور ایمرجنسی لائی جا رہی ہے آپ ہی چندری لعل ہیں؟''

''وہ تو میں ہی ہوں، لل..... لیکن، موہن کہاں ہے؟ وہ تو ڈاکٹر جیمس کو کال کرنے گیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ابھی آجاتے ہیں.....'' میل نرس نے مجھ سے کہا۔ اس کے چہرے پر عجیب مگر سرد سی مسکراہٹ تھی۔

''دراصل ڈاکٹر جیمس خود ہی آرہے ہیں۔ انہیں پہلے ہی سے ایک اور ایمرجنسی کی کال ملی تھی، تم تو پھر بھی کچھ بہتر ہو۔ چلو شاباش! اُٹھو اور اسٹریچر پر آجاؤ۔'' وہ مجھے یوں پچکارنے لگا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔

نرس کی عمر مجھے تیس، پینتیس کے لگ بھگ لگی، وہ خاصی موٹی اور بھدے سے نقوش والی عورت تھی۔ جبکہ اس کا ساتھی میل نرس چالیس کے قریب تھا۔ دونوں کے رنگ سانولے تھے۔

اسی دوران میری نظر ان کے سینے پر لگے ٹیگ پر پڑی اور میں بُری طرح چونکا۔

نرس کا نام کلونتی تھا جبکہ میل نرس کا نریش۔ دونوں ہی نام پڑھ کر میں اندر سے بُری طرح جھرجھرا گیا۔ یہی وہ پیرامیڈکس کے نام تھے جو کملیش نے ہمیں ڈاکٹر اشوک اور ڈاکٹر جیمس کے بعد بتا رکھے تھے۔

''نریش! تم اس کی مدد کرو، اسٹریچر پر لادنے کی.....'' کلونتی اپنے ساتھی سے بولی تو میں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں، میں اپنے پیروں پر چل سکتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اُٹھنے لگا تو نریش نے میری مدد کی مگر کلونتی بولی۔

''ہمیں ڈانٹ پڑ جائے گی، کسی مریض کو ایمرجنسی کیبن سے اس طرح نہیں نکالا جاتا، کچھ ہماری نوکریوں کا ہی خیال کرلو، چلو شاباش! اسٹریچر پر آجاؤ۔''

وہ گویا ہاتھ آئے شکار کو پھانسنے کی پوری کوشش کر رہے تھے، کچھ سوچ کر مجھے ان کی بات ماننا پڑی لیکن ساتھ ہی مجھے ان دونوں سے لرزا دینے والا خدشہ بھی محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ مجھے شکار سمجھ کر دھوکے سے بے ہوش نہ کردیں۔

بہرحال مجھے وہ دونوں اسٹریچر پر ہی ڈال کر ایمرجنسی سے نکلے۔ کھلے اور چکنے فرش والے لاؤنج سے لے کر جب ایک دائیں جانب بنی راہداری کی طرف مڑنے لگے تو تب ہی میری نظر..... ایک سفید کوٹ پہنے ڈاکٹر پر پڑی۔

وہ خاصی درمیانی عمر کا تھا، قد مناسب اور رنگت قدرے گندمی تھی۔ اس کے چہرے سے عجیب قسم کی نحوست ٹپک رہی تھی۔

وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہمراہ پیرامیڈکس کے دو تین افراد بھی تھے اور انہی میں مجھے موہن بھی دکھائی دیا۔ یہ ایک وہیل اسٹریچر کے ساتھ تھے، ڈاکٹر نظر آنے والا شخص انہی کے ساتھ چل رہا تھا۔

اسٹریچر پر کوئی مریض بے ہوش پڑا تھا اور ان کا رخ اسی راہداری کی طرف تھا جہاں کلونتی اور نریش میرے اسٹریچر کو دھکیلے لے جا رہے تھے۔

ہم سے زیادہ شاید وہ لوگ جلدی میں تھے، اسی لیے ڈاکٹر نے ہمیں رکنے کا اشارہ کردیا، جبکہ نریش اور کلونتی انہیں جگہ دینے کے لیے پہلے ہی رک گئے تھے۔

وہ دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے اور ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ یہاں ایک سفید اور صاف ستھرا بیڈ بچھا ہوا تھا، مجھے اس پر آنے کی ہدایت کی گئی۔

''نریش! تم ذرا اِسے سنبھالو، میں ڈاکٹر جیمس کی طرف جاتی ہوں، شاید وہاں کوئی ایمرجنسی ہے، ڈاکٹر کو میری ضرورت ہوگی.....'' کلونتی نے اپنے ساتھی نرس سے کہا تو 'ڈاکٹر جیمس' کے نام پر میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ گویا وہ نحوست بکھیرنے والا چہرہ ڈاکٹر جیمس کا تھا۔

وہ چلی گئی۔ اب کمرے میں نریش اور میں رہ گئے تھے۔ میرا دھیان ڈاکٹر جیمس اور اس اسٹریچر والے مریض کی طرف لگا رہا۔ ایک کھد بدی لگ گئی جو مجھے ہمیشہ ورانا

وار کسی نہ کسی تحریک کے لیے مہمیز کرتی تھی۔

''خیریت ہے بھائی! کون تھا وہ مریض؟'' میں نے نریش سے پوچھا۔

''ہوگا کوئی تمہاری طرح کا ایمرجنسی کا مریض.....'' اس نے جواب دیا۔ پھر ایک طرف لگی شیشے والی الماری کی جانب بڑھا۔

میں نے لیٹے لیٹے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہاں انجکشن، وائل، ایمپولز، کاٹن کے پھائے اور گاز پیس رکھے ہوئے تھے۔

''میں تمہیں ابھی ایک آرام کا انجکشن لگائے دیتا ہوں، اس سے تمہیں سکون ملے گا، پھر ڈاکٹر جیمس فارغ ہو کے آئیں گے تو تمہارا تفصیلی معائنہ ہو جائے گا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے شیشے والی الماری کھولنے لگا۔

میرے اندر کی سنسناہٹیں بڑھتی جارہی تھیں۔ انجکشن لگنے کا مطلب بے موت مرنا تھا لیکن مجھے کسی ایسی چال سے کام لینا تھا جس سے کچھ زیادہ گڑبڑ بھی محسوس نہ ہو اور..... معاملہ بھی اسی 'معصومیت' اور 'بے خبری' سے نمٹتا رہے۔

نریش نے سرنج اور ایک ایمپول نکال کر اس کا سر توڑا اور اس میں سے سرنج کے اندر انجکشن کا محلول بھرنے لگا، پھر اسپرٹ کاٹن لیے میری جانب بڑھا۔

''ہم..... مجھے مسکن آور انجکشن سے ری ایکشن ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو اس کے بجائے کوئی گولی دے دو، وہ میں کھا لیتا ہوں۔'' میں نے ایک چال چلنے کی کوشش چاہی تو کم بخت نریش مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ انجکشن ری ایکشن کرے اور اس کی گولی نہ کرے، تم چنتا مت کرو چندری لعل..... یہ انجکشن تمہیں ری ایکشن نہیں کرے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آیا۔

میرے ہاتھ کی نس کو تاڑنے کے دوران جیسے ہی اس نے سوئی لگانا چاہی، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

ایک بیمار شخص..... سے نریش کو یقیناً اس دلیری اور طاقت کی چنداں توقع نہ تھی، نتیجے میں پہلے اس کی آنکھیں حیرت اور کچھ میرے ہاتھوں سے اس کی گردن دبانے پر ابلیں، اگلا لمحہ اس نے مدافعت پر ضائع کیا، جبکہ اس سے پہلے ہی میں اسے زور سے گھما کر دیوار پر مار چکا تھا۔

اس کے حلق سے کراہ نما چیخ خارج ہوئی اور وہ پل کے پل اتنا غافل ہوگیا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ مجھے اُمید تو تھی کہ باہر اس کی کراہ نما آواز شاید ہی کسی نے سنی ہوگی۔

میں نے فوراً وہی انجکشن اس کی نس میں انجیکٹ کر دیا جو وہ میری نس میں اُتارنا چاہتا تھا۔

اس نے جس ایمپول سے وہ محلول لیا تھا، وہ ایک سریع الاثر دوا تھی، جسے اسٹھیسا (بے ہوشی کے ڈاکٹر) کسی میجر (بڑی) سرجری کے کیس میں استعمال کیا کرتے تھے، مطلب وہ عمومی طور پر مستعمل ہونے والی دوا نہ تھی۔ اس کا اثر بھی چھ سے آٹھ گھنٹوں تک ہوتا تھا۔

مقصد ظاہر تھا کہ مجھے فوری دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دینا تھا۔ اس وقت تو میں نے اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ میں دبے پاؤں کمرے کے دروازے کی طرف آیا۔ اس کی ساتھی نرس کلونتی یا کسی اور کے بھی اندر... آنے کا شدید خطرہ تھا۔

دروازہ تھوڑا کھول کر باہر جھانکا۔ رات کا وقت اور آنے والی مذکورہ ایمرجنسی کے سبب شاید سب لوگ وہاں ڈاکٹر اشوک یا جیمس کے ساتھ مصروف تھے۔

یہاں میں نے پہلے ہی سے ایک سنگل پٹ کا دروازہ دیکھ رکھا تھا جو باہر کہیں اسپتال کے کھلے مگر اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔

اس طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے ڈسٹ بن بھی ذرا ذرا فاصلے پر رکھے نظر آتے تھے، گندی میلی روئی کے ڈھیر، استعمال شدہ گاز پیس وغیرہ کا ریختہ سا پھیلا ہوا تھا۔

وسط میں ایک الیکٹرک پول لگا ہوا تھا جس کے سرے پر گلوب روشن تھا، اس کی روشنی بھی بس بیماری ہی تھی۔ باقی اندھیرا تھا۔

میں جلدی سے کمرے سے باہر نکلا۔ مذکورہ دروازہ کمرے سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے تسلی کی کہ دروازہ بہ آسانی کھل سکتا تھا۔

اس کے بعد پلٹا اور اپنے کمرے میں آکر نریش کے بے سُدھ وجود کو جیسے تیسے گھسیٹ کر کمرے کے دروازے تک لایا، ایک بار پھر احتیاط کے پیش نظر میں نے دوبارہ راہداری میں جھانکا، وہ خالی دیکھ کر میں نریش کے بے ہوش جسم کو ٹانگوں سے کھینچتا ہوا سنگل پٹ والے دروازے کے قریب آیا اور اسے کھولا اور بے سُدھ نریش کو گھسیٹتے ہوئے اس گندی جگہ لا کے ذرا آگے جا کر ایک گڑھے میں پھینک دیا اور اس کے اُوپر اِدھر اُدھر سے کچرا لا کے ڈال دیا۔

اس مقصد کے لیے میں نے وسط میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی، کیونکہ راہداری کی اس دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شیشے کی کھڑکیاں بھی تھیں، کوئی میری حرکت دیکھ سکتا تھا، اسی لیے میں نے دیوار کے ساتھ یا قریب میں ہی بنے ایک گڑھے کا انتخاب کیا تھا۔

یہ کام نمٹا کے میں جلدی سے دوبارہ اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا، مگر اس سے پہلے میں نے تھوڑی دیر پہلے ہونے والی 'گڑبڑ' کے نشانات معدوم کر دیے تھے۔

ایک گھنٹا بیت گیا اور جب میں نے دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تو ایک دم سوتا بن گیا، مگر اس طرح کہ ایک ذرا آنکھ کی جھری سے جائزہ بھی لیتا رہا۔

دو افراد آپس میں دھیمے دھیمے انداز سے باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''میں نے کہا تھا نا سر! نریش نے اب تک اپنا کام نمٹا دیا ہوگا۔'' میری سماعتوں میں نرس کلونتی کی آواز سنائی دی۔ ''مگر پتا نہیں وہ اب اپنا کام نمٹا کر کہاں چلا گیا؟''

''ادھر ہی کہیں ہوگا، یہ بتاؤ اس کے ساتھ اور کوئی تو نہیں تھا نا.....؟ ایسا نہ ہو بعد میں اس کے ساتھ آنے والا کوئی آدمی اس کی پورے اسپتال میں ڈھنڈیا ڈال دے۔''

یہ ایک مردانہ اور بھاری آواز تھی جو ڈاکٹر جیمس کی تھی۔ اس کا لہجہ رازدارانہ تھا۔ یوں میں تب تک اپنی ایک آنکھ کی جھری سے ان دونوں کو دیکھ کر فوراً ہی پہچان گیا تھا۔

ڈاکٹر جیمس..... کو تو میں تھوڑی دیر پہلے ہی لاؤنج میں موہن کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے ہی میں نے بھانپ لیا تھا کہ میں اس وقت پوری طرح خونی سوداگروں کے نرغے میں ہوں۔

کلونتی اسے تسلی دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

''اس بات کی آپ بالکل چنتا مت کریں ڈاکٹر جیمس! بس، اپنا کام نمٹائیں اور ہاں..... جس دوسری ایمرجنسی کی کال پر آپ آئے ہیں، کیا وہ بھی کوئی شکار ہے؟''

''ایسا ہی سمجھو، وہ ایمرجنسی آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے۔'' میں نے اس منحوس صورت والے ڈاکٹر جیمس کی آواز سنی، وہ نرس کو آگے بتا رہا تھا۔ ''اور اس مریض کو ڈاکٹر اشوک صاحب نے مجھے اپنی رہائش گاہ پر کال کر کے میرے حوالے کیا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی کہ بھلا شکار یہاں آنے کے بجائے وہاں کیسے پہنچ گیا؟ اگرچہ کسی کو بہلاوا بھی دے دیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوئی، جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک نہیں دو شکار لیٹے ہوئے تھے مگر بدقسمتی سے ایک کو ہلاک کیا جا چکا تھا۔''

''کیا.....؟'' دوسرے ہی لمحے مجھے کلونتی کی متحیرانہ آواز سنائی دی۔ یہ سن کر میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ یہ ناہنجار ڈاکٹر کون سے دو شکار کی بات کر رہا تھا اور جن میں سے ایک مر بھی چکا تھا۔

اچانک ہی میرا ذہن ان دونوں کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ مردود، ریٹا اور ڈوجا کی تو بات نہیں کر رہا ہے؟ ہو سکتا ہے ریٹا نے پہلے ڈاکٹر اشوک کی رہائش میں نقب لگانے کی کوشش جاری ہو مگر کسی بنا پر دھر لی گئی، پھر ڈوجا جو اس کی تلاش میں گیا تھا، وہ بھی پکڑا گیا ہو، اب یہ منحوس صورت والا ڈاکٹر جیمس ان دونوں میں سے ایک کے مرنے کی اطلاع کلونتی کو دے رہا تھا، تو کیا ان دونوں میں سے ایک مارا جا چکا تھا؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''آگے سنو گی تو مزید حیران ہو جاؤ گی.....'' ڈاکٹر جیمس کا رازدارانہ انداز بیاں جاری تھا۔

''یہ دونوں شکار بنے بنائے نہیں تھے بلکہ ڈاکٹر اشوک کی زیرک دماغی اور محتاط مزاجی سے دھر لیے گئے، تمہیں معلوم ہے نا، شنکر چانکیہ نے ہمیں کس قدر سختی کے ساتھ محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔ دشمن ہمارے پیچھے لگ چکے ہیں، تین افراد پر مشتمل ایک پاکستانی گروپ، جس میں دو مرد اور ایک انٹرپول کی سیکریٹ ایجنٹ شامل ہے، نے تو ہمارے بخیے اُدھیڑ ڈالے ہیں۔ شنید ہے کہ ان میں سے دو مرد عورت ممبئی میں کہیں موجود ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ضرورت پڑنے پر کرائے کے مجرم بھی ہائر کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔''

جیمس نے ایک لمحہ توقف کیا، میں بے ہوش بنا بہت غور سے اس ناہنجار کی باتیں سن رہا تھا اور طارق، رومی اور خود پر (ذرا کم) فخر بھی محسوس کر رہا تھا۔

''اتنی خبر تو مجھ تک بھی اُڑتی اُڑتی پہنچی ہے، ڈاکٹر! یہ بتاؤ، یہ لوگ دونوں کہیں وہی تو نہیں ہیں، ایک مرد ایک عورت.....؟'' کلونتی نے کہا اور میں ایک بار پھر ہول کر رہ گیا، کہیں ایسا تو نہیں کہ جنہیں میں ریٹا اور ڈوجا سمجھے ہوئے ہوں، وہ درحقیقت طارق اور..... رومی نہ ہوں.....

یہ سوچ کر ہی میرا دل گھبرانے لگا، کیونکہ ان میں سے ایک ساتھی مر چکا تھا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں، ابھی ان کی شناخت باقی ہے، اس کے بعد جو شکار بچ گیا ہے، اس سے پوچھ گچھ کرنے سے ہی معلوم ہوگا۔ ویسے جو ساتھی ان کا بچ گیا ہے، وہ عورت

ہے۔ مرد ساتھی، ڈاکٹر اشوک کی رہائش میں نصب جدید الیکٹرک اینڈ وائرلیس سسٹم ٹریپ میں کافی دیر پھنسے رہنے سے ہلاک ہوا ہے۔"

"اوہو..... اِٹس امیزنگ....." کلونتی نے حظ اُٹھاتے ہوئے جیسے چٹخارہ لیا اور میرا جی چاہا کہ کسی ہارر، کامیڈی مووی کی زندہ لاش کی طرح ایک دم بستر پر اُٹھ بیٹھوں اور ایک زوردار چانٹا موٹی کالی کلونتی کے منہ پر مار کے دوبارہ سوتا بن جاؤں۔

میں بدستور اسی طرح ان کی باتیں سنتا رہا، وہ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ان کا ساتھی اسٹاف نرس نریش مجھے اپنے پلان کے مطابق بے ہوشی کا انجکشن لگا چکا ہے۔

"لیکن یہ نریش کہاں چلا گیا؟ اور اس چندری لعل کا کیا کرنا ہے؟" تھوڑے توقف کے بعد کلونتی نے پریشانی سے پوچھا۔

"اسے ابھی اِدھر ہی رہنے دو، ڈاکٹر اشوک آکر اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اُسے شبہ ہے کہ یہ بھی انہی کا وہ تیسرا ساتھی ہوگا جس کے قدموں کے نشانات اس کے باڈی گارڈ بنگو نے باؤنڈری وال کے باہر دیکھے ہیں۔"

ڈاکٹر جیمس کہہ رہا تھا اور میرے دل کی متوحش سی دھڑکنوں میں یکلخت تیزی آگئی۔ کم بخت یہ ڈاکٹر اشوک تھا کیا شے؟ خود مجھے بھی اس سے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں میں زیادہ ہوشیاری اور جاسوسی کے چکر میں پڑ کر اس کے خوف ناک چنگل میں ہی نا جا پھنسوں۔

ابھی ڈاکٹر جیمس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کوئی اندر داخل ہوا۔ کلونتی اور ڈاکٹر جیمس نے اپنی گردنیں موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا، میں نے بھی اپنی آنکھ کی جھری سے دیکھنے کی کوشش چاہی تو ایک ٹھگنے سے عجیب وضع کے شخص پر میری نظر پڑی۔

اس نے بھی سفید ایپرن کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں اسٹیتھو اسکوپ جھول رہا تھا۔ ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔ چہرے کی رنگت سیاہ تھی اور اس پر کالے موٹے فریم کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے پینتالیس اور پچاس کے آس پاس ہی لگا تھا۔ وہ خاصا بارعب نظر آرہا تھا مگر چہرے پر اس کے کرختگی کے آثار نمایاں تھے۔

مجھے یہی ڈاکٹر اشوک لگا جس کے بارے میں ابھی یہ دونوں ذکر کر رہے تھے۔

اسے دیکھتے ہی یکلخت نرس کلونتی اور ڈاکٹر جیمس ایک دم مؤدب ہوگئے۔

"یہی ہے وہ جس کے بارے میں مجھے موہن نے بتایا تھا؟" اس نے آتے ہی کھردری آواز میں کہا۔ اس کا لہجہ البتہ مجھے گھٹا گھٹا محسوس ہوا۔ اشارہ میری جانب ہی تھا۔

"یس سر!" کلونتی نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے اِس کا؟" ڈاکٹر اشوک نے ان سے پوچھا۔ نظریں میری جانب ہی تھیں۔

"چندری لعل۔"

"کس نے ہینڈ اوور کیا تھا؟"

"سر جیکل ٹیکنیشن موہن نے۔"

"سر! کیا اُس نے آپ کو اِس کی اطلاع نہیں دی تھی؟" کلونتی نے پوچھا۔

"کر دی تھی اسی لیے تو میں اسے دیکھنے اور اپنی تسلی کرنے آیا ہوں۔" ڈاکٹر اشوک سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اس کے جوتے اُتارو اور باہر بنگو موجود ہے اسے دے آؤ....."

یہ سن کر مجھے اچنبھا ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میں جان گیا وہ میرے جوتوں کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا، اسی اثنا میں ڈاکٹر جیمس نے حیرت سے پوچھا۔

"سر! اس کے جوتوں کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"میں نے ابھی بتایا نا کہ میری رہائش گاہ میں نقب لگانے والے دو نہیں بلکہ تین تھے، مجھے ان کے تیسرے ساتھی کی تلاش تھی جس کے قدموں کے نشانات، بنگو کو باؤنڈری وال کے آس پاس ملے تھے، میں اس کے جوتوں کے ذریعے اس کی تصدیق کروانا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر اشوک نے بتایا۔

"آئی سی....." کلونتی کے منہ سے برآمد ہوا۔

"مگر سر! یہ تو بیماری کی حالت میں یہاں آیا تھا؟" ڈاکٹر جیمس نے کہا۔

"تم بالکل گدھے ہو۔" معاً ہی ڈاکٹر اشوک نے اسے ڈانٹا۔ "تمہیں بھی ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"جی سر!" ڈاکٹر جیمس تھوڑا خفیف ہو کے بولا۔

اشوک کا بیان جاری تھا۔

"یہ تو شکر ہوا کہ انہوں نے پہلے میری رہائش گاہ کا رخ کیا اور میری احتیاط پسندی نے انہیں کوئی گل کھلانے کا موقع نہیں دیا، ہوسکتا ہے یہ ان کا تیسرا ساتھی ہو اور..... اپنے دو ساتھیوں کی ناکامی کے بعد اس نے بیماری کا ڈراما کھیلتے ہوئے ہم تک پہنچنے کی کوشش کی ہو۔"

''یس سر! میں اب سمجھا۔'' ڈاکٹر جیمس بولا اور اس وقت تک کم بخت کلونجی میرے پیروں سے دونوں جوتے اُتار چکی تھی۔

باہر ڈاکٹر اشوک کا وہی باڈی گارڈ بنکو موجود ہوگا۔ یہ وہی بنکو تھا جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر ہو رہا تھا۔

اِدھر میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں..... ڈاکٹر اشوک بے حد ہی خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔

تیسرے ساتھی کے ذکر پر جہاں میری پریشانی میں اضافہ ہوا تھا وہیں اس تشویش میں کمی بھی واقع ہوئی تھی کہ یہ ہم تینوں کا ہی ذکر ہو رہا تھا، یعنی میرا، ریٹا اور..... ڈوجا کا اور مبینہ طور پر مرد ساتھی ان کے کسی خودکار الیکٹرانک ٹریپ میں پھنس کر مر چکا تھا جو ظاہر ہے ڈوجا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا، یوں مجھے تسلی تو ہوئی کہ یہاں طارق اور رومی کا کوئی رول نہیں تھا۔

ڈوجا کے مرنے کا میں تھوڑا بہت افسوس کر سکتا تھا، لہٰذا اب جو دوسرا ساتھی یعنی خاتون قید کر لی گئی تھی، وہ ریٹا ہی ہو سکتی تھی۔

اب میری باری تھی..... میں یک دم محتاط ہو گیا بلکہ محتاط کیا ہونا، بیڈ پر ہی بہ ظاہر ان کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا۔

کلونجی میرے جوتے اُتار کر باہر بنگو کو دکھانے کے لیے لے جا چکی تھی اور میں تن بہ تقدیر ہو گیا تھا۔

اسے گئے تھوڑی ہی دیر بیتی ہوگی کہ اچانک میں نے ایک آنکھ کی جھری سے دیکھا کہ دروازے پر ایک لمبا تڑنگا، ورزشی جسم کا مالک اور کالا بھجنگ سا شخص اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر جوش طاری تھا اور..... حرکات و سکنات سے عجلت ہویدا ہوتی تھی۔

اس مُردار نے اپنے ہاتھ میں میرے جوتوں کی جوڑی پکڑ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ کلونجی بھی پریشان اور قدرے بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔

''ماسٹر! یہی وہ تیسرا شخص ہے جس کے پیروں کے نشانات میں نے دیکھے تھے۔ اسے میرے حوالے کر دو، میں ابھی اس کا بھرکس نکال دیتا ہوں۔''

''شٹ اَپ! اپنی اوقات میں رہو۔'' ڈاکٹر اشوک نے اس ناہنجار کو بُری طرح جھڑک دیا۔ خود مجھے بھی اس پر غصہ آنے لگا، لیکن فی الوقت میں ایک قسم کے خوف کا شکار تھا۔

''یہ پہلے ہی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ان دونوں کو اب ہم اپنا شکار بنائیں گے۔ ان کی سزا یہی بہت ہے۔'' ڈاکٹر اشوک کو جب میں نے یہ کہتے سنا تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ میرا خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔

''اسے پہلے والے قیدی عورت کے ساتھ روم نمبر تھری میں پہنچا دو، میں تھوڑی دیر میں وہیں پہنچتا ہوں.....'' ڈاکٹر اشوک، جیمس اور کلونجی کو ہدایت دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ان دونوں کو آج ہی کھوکھلا کر ڈالتے ہیں۔ تین گاہک..... لسٹ پر موجود ہیں اور روانگی بھی تیار ہے۔'' کہتے ہوئے جب وہ دروازے کی جانب مڑنے لگا تو جانے کیا سوچ کر وہ کم بخت دوبارہ پلٹا۔

میں اپنی بند آنکھوں کی جھری سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بہ غور میری جانب دیکھتا ہوا میرے بیڈ کے قریب آتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں پہلے اسے چیک کر لوں، پتا نہیں کیوں میرا من کہہ رہا ہے کہ یہ اب بھی ڈراما کر رہا ہے۔''

اس کا یہ کہنا تھا کہ مجھے اپنے پورے وجود میں سنسناتی ہوئی لہریں دوڑتی محسوس ہونے لگیں۔

کمرے میں اس کالے پہلوان بنگو سمیت سب ہی موجود تھے۔ اگر ڈاکٹر اشوک کو ذرا بھی بھنک مل جاتی کہ میں واقعی بے ہوشی کا ڈراما کر رہا ہوں تو یہ بہ آسانی مجھ اکیلے پر قابو پا کر اس بار سچ مچ بے ہوش کر سکتے تھے، تب پھر شاید میری آنکھیں اس آپریشن ٹیبل پر ہی کھلتیں جہاں میرے جسم کو ''کھوکھلا'' کرنے کے لیے لٹایا جا چکا ہوگا..... یہ تصور کرتے ہی میں سرتاپا کانپ گیا۔

ڈاکٹر اشوک میرے قریب آ کر جھکنے لگا اور میں نے شدید خوف سے آنکھیں پوری بھینچ لیں.....

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر؟ نریش اسے موہن کی ہدایت کے مطابق بے ہوشی کا انجکشن لگا چکا ہوگا؟'' مجھے اپنے کانوں میں کلونجی کی آواز سنائی دی جو دشمن اور ساتھ ہی بدصورت ہوتے ہوئے بھی مجھے کم از کم اس وقت دنیا کی خوب صورت ترین خاتون محسوس ہوئی۔

''یہ ہوش میں ہے۔'' اگلے ہی لمحے ڈاکٹر تقریباً چلّایا۔ میری سانسیں سینے میں اٹک گئیں۔

میں نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول دیں، یہی وہ وقت تھا جب ڈاکٹر اشوک اپنے بھونڈے سے چہرے سمیت مجھ پر اچھا خاصا جھک آیا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، آنکھیں کھولتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی..... اور یہی نہیں بلکہ اسے زور سے خود پر

سے پرے دھکیل دیا۔

وہ لوگ اس اچانک اُفتاد کے لیے شاید ذہنی طور پر تیار نہ تھے، بلکہ کلونتی اور ڈاکٹر جیمس تو چند ثانیے کے لیے ہکا بکا سے بھی رہ گئے، جبکہ میرا دھکا لگنے سے ڈاکٹر اشوک، لڑکھڑاتا ہوا پاس ہی عقب میں کھڑے بنگو سے جا ٹکرایا...... لیکن بدبخت بنگو نے ڈاکٹر اشوک کو کسی کھلونے کی طرح اپنے لمبے چوڑے بازوؤں کے حصار میں لے کر سنبھال لیا، ادھر میں بیڈ سے اُچھلا اور فرش پر آرہا۔

بنگو اپنے حلق سے خوف ناک غراہٹیں بلند کررہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اسی سے خطرہ تھا، کیونکہ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کے نرغے میں آنے سے بچنے کے لیے میں نے فرش سے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی تو بنگو نے بڑے آرام سے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے اس دیوزاد کے شکنجے میں پھنستے ہی یوں تڑپنا شروع کردیا جیسے مجھے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو، جس نے ایک لمحے کے لیے تو بنگو کو بھی حیران سا کردیا تھا، یہی ایک موقع ملا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر اپنے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار مُکّا رسید کردیا۔

اسے یقیناً یوں لگا ہوگا، جیسے کسی چیونٹی نے اسے کاٹا ہو، اس نے مجھے فرش پر پٹخ دیا۔ میرے حلق سے جگر پاش چیخ نکل گئی، اگرچہ اس 'چیخ' میں تکلیف کا عنصر کم اور مدد لینے کی غرض زیادہ شامل تھی، مگر محسوس پھر بھی مجھے یوں ہوا جیسے میرے جسم کی ہڈیاں چٹخ گئی ہوں۔

''منہ کیا تک رہے ہو تم دونوں؟ اسے بے ہوشی کا انجکشن لگاؤ۔'' ڈاکٹر اشوک نے جیمس اور کلونتی سے کہا۔ میں فرش پر پڑا ابھی ہائے...... ہائے ہی کررہا تھا کہ بنگو نے مجھے پھر دبوچ لیا۔

کلونتی اور جیمس، ڈاکٹر اشوک کے حکم پر چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور...... مجھے بے ہوش کرنے والا انجکشن بھرنے لگے۔ بنگو نے مجھے دبوچ لیا تھا، ایک ہاتھ اس مردار نے میرے منہ پر بھی رکھ لیا تھا۔ میں چیخ چلّا تو کجا آواز بھی اپنے حلق سے نکالنے کا روادار نہ رہا، سانس کی آوک جاوک بھی مشکل محسوس ہونے لگی۔

میں جانتا تھا اگر یہ انجکشن لگا دیا گیا تو کوئی بعید نہیں مجھے ہوش اب یا تو آپریشن ٹیبل پر آئے گا یا پھر آنکھ میری عالمِ بالا میں کھلے گی۔

بے بسی اور ایک خوف کے انتہائی احساس تلے مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وجود کی طاقت دم توڑنے لگی، چونکا تب جب ڈاکٹر جیمس میری نس میں سوئی گھونپ چکا تھا اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ ہی کتنے پل کا ہوتا ہے! آتی جاتی سانسوں کا بھلا کیا اعتبار، ایسے میں کوئی کسی کو ہلاک کرنے کا تہیہ بھی کرلے تو موت سے پہلے موت کا یقین ہونے لگتا ہے۔

یہ ایک خوف ناک لمحہ ہوتا ہے۔ نیند یا بے ہوشی کو بھی آدھی موت کہا جاتا ہے۔ اس آدھی موت سے میں کب بیدار ہوا تھا، مجھے نہیں معلوم، البتہ جب میری آنکھ کھلی تو پہلا احساس میرے نتھنوں کے ذریعے گھسنے والی مخصوص ادویات اور دیگر محلول کی بُو کا تھا پھر رفتہ رفتہ میرے دیگر حواسِ خمسہ بیدار ہونے لگے تو دماغ کی یادداشت کا خانہ بھرنے لگا، مجھے سب یاد آتا چلا گیا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا اور اب کیا ہونے والا تھا۔

حسبِ توقع میں نے خود کو آپریشن ٹیبل پر کچھ اس طرح پڑے پایا کہ میرے دونوں ہاتھ چمڑے کے بیلٹ سے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ایک بیلٹ میرے پیٹ سے بھی کسی سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

البتہ آپریشن ٹیبل پر لیٹے لیٹے میں اپنی گردن کو ضرور دائیں بائیں حرکت دے پارہا تھا۔

ماحول آپریشن تھیٹر کا ہی تھا اور منظر تو مجھے خوف ناک ہی لگ رہا تھا۔ اگرچہ وہاں کوئی بھی نہ تھا لیکن نہیں...... گردن دائیں جانب موڑنے پر میں بُری طرح چونکا۔

میرے دائیں طرف ایک اور آپریشن ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ اس پر میں نے ریتا کو بھی بالکل اپنی طرح لیٹے پایا۔

اسے شاید مجھ سے پہلے ہی ہوش آگیا تھا اور وہ لیٹے لیٹے اپنی گردن گھمائے میری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر بھی بے بسی اور خوف کا تاثر تھا مگر بقا کی جنگ کے جوش کی ایک تمازت بھی اس کی آنکھوں اور چہرے سے ہویدا تھی۔

''شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا۔ آوازیں دے دے کر تو میرا حلق بھی خشک ہوگیا تھا۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہوش میں آنے کے بعد مجھے کون سا تیر مار لینا تھا!'' اس کی بات پر میں جل کر بولا۔ بے بسی اور مایوسی نے مجھے جھلا کر رکھ دیا تھا۔ متوقع خدشات اور یقینی وسوسوں نے میرے دل و دماغ کو بھی خوف نے جکڑ لیا تھا۔

pklibrary.com

''ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں، کچھ سوچو، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ لوگ ہماری بلی چڑھانے لگے ہیں۔ کیا تم ایسی عبرت ناک موت سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو؟'' وہ بولی۔ اس کی بات نے مجھے جوش دلا دیا تھا۔ وہ نان مسلم تھی اور میں مسلمان، خواہ نام کا ہی سہی مگر بہرحال...... میرے لیے مایوسی گناہ تھی۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں، کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ آپریشن تھیٹر ہی تھا۔ یہاں میرے اور ریٹا کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔

''مگر یہ مردود لوگ ہیں کہاں؟'' میں نے کہا تو ریٹا دانت پیس کر بولی۔

''بونگے سوالات چھوڑو، ظاہر ہے وہ ہماری کاٹ پیٹ کرنے کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ مورکھ ڈاکٹر اشوک اور اس کے خونی ساتھی، ہمیں انتقاماً بے ہوش کرنے کے بجائے زندہ حالت میں ہی ہمارے اعضا نکالیں گے۔ تصور کرو اس گھڑی کا جب ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنا پیٹ اور سینہ چیرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے، ذرا ان جاں گسل لمحات کا ابھی سے تصور کرلو......''

''شٹ اَپ......'' میں زور سے چیخ کر بولا۔ اس کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان کو یکلخت بریک لگ گئے۔

''چپ ہوجاؤ، وقت سے پہلے خود ہی اپنی اور میری جان نکال رہی ہو۔'' میں جھرجھری لے کے بولا۔ وہ چپ ہوگئی۔

''کچھ کرنا چاہیے ہمیں...... میں اپنے ہاتھوں پیروں کو جھٹکے دے کر بیلٹ کھولنے کی کوشش کررہی ہوں اور تم بھی کرو۔''

''یہ بات تمہاری معقول ہے۔'' میں نے اس کی توصیف کرنا ضروری سمجھا اور ہم دونوں اسی کوشش میں لگ گئے۔

میں نے آپریشن ٹیبل پر پانی سے نکلی کسی مچھلی کی طرح زور زور سے تڑپنا شروع کردیا، نتیجے میں پوری آپریشن ٹیبل ہی نہیں بلکہ پورا کمرا ہلتا محسوس ہونے لگا، گویا زلزلہ آگیا ہو۔

ریٹا جو خود بھی ان جکڑ بندوں سے آزاد ہونے کے لیے ہل جل کر کوشش کررہی تھی، اس اُفتاد پر گھبرا گئی اور اپنی کوشش بھول کر مجھ سے چلا کر بولی۔

''ارے...... رے...... کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ خیریت سے تو ہو نا؟'' میں اس کی آواز سن کر رک گیا، گویا پورا لرزتا ماحول تھم گیا۔

''خود ہی تم کہہ رہی تھیں کہ ان جکڑ بندوں کو کھولنے کی کوشش کرو۔''

''ہاں مگر اس طرح نہیں جیسے تم کررہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''اس طرح تو مجھے ڈر ہے تم آپریشن ٹیبل سمیت ہی نیچے نہ گر پڑو۔''

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے سے...... چار افراد او۔ ٹی ڈریس میں داخل ہورہے تھے۔ میں انہیں ماسک میں بھی پہچان گیا۔

یہ موت کے ہرکارے تھے۔ انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوند کاری کرنے والے خونی سوداگر تھے، یعنی ڈاکٹر اشوک، اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر جیمس، نرس کلونتی اور سرجیکل ٹیکنیشن موہن تھا۔

ان چاروں نامرادوں نے...... سرجیکل ڈریس پہن رکھے تھے۔ چہروں پر ماسک تھے۔ کلونتی اور...... موہن جلدی سے قریب دھری...... ایک اسٹیل کی میز کھینچ کر سب سے پہلے میری ٹیبل پر لے آئے۔

میں نے دیکھا اس پر طرح طرح کے اسٹین لیس اسٹیل کے سرجیکل آلات لشکارے ماررہے تھے۔ گویا سب سے پہلے مجھے تختۂ مشق بنایا جانے والا تھا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

''تت...... تت...... تم لوگ میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے، میں...... میں تمہاری بوٹیاں نوچ لوں گا۔ تمہارے ساتھیوں کا بھی میں نے بُرا حشر کیا تھا، امرناگ کو بھول گئے، میں نے ہی اسے تصویرِ عبرت بنایا تھا، اگرچہ اس میں میرے جذبے سے زیادہ اناڑی پن کا دخل تھا لیکن...... لیکن......''

میں پاگلوں کی طرح چیخنے اور انہیں دھمکانے لگا۔

''اعضا رکھنے کے لیے...... محلول بھرے جار سامنے رکھو۔'' ڈاکٹر اشوک نے میرے چیخنے اور دھمکیاں دینے کی پروا کیے بغیر اپنے ماتحتوں سے کہا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنا 'کام' کرنے میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔

''کُتّو! رذیلو! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، تم مجھے نہیں جانتے، میں پاکستان سے یہاں تم سب کی گھٹیا حرکتوں کرنے آیا ہوں اور ایک دن ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا۔'' مجھ پر شاید خوف و دہشت نے دیوانگی طاری کردی تھی۔ میں شاید پاگل ہونے کے قریب تھا۔ مگر یہ بدبخت لوگ میری دھمکیوں کو یوں سمجھ کر مسکرانے لگے جیسے

میں انہیں لطیفے سنا رہا ہوں۔

تب پہلی بار ڈاکٹر اشوک مجھ سے مخاطب ہو کر سرد اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”اسی لیے تو ہم تمہیں زندہ حالت میں خالی کرنا چاہتے ہیں، جسمیں تو خالی ہونا تم نے دیکھی ہی ہوں گی اب ذرا اپنے شریر کو بھی اہم اعضا سے خالی ہوتا دیکھنا، مگر چیخنا مت کرو، میرا وعدہ ہے کہ میں اس صفائی اور مہارت سے کام کروں گا کہ تم اپنے شریر سے گردہ، پھیپھڑا اور جگر بھی نکل کر علیحدہ ہوتے دیکھو گے، سب سے آخر میں دل نکالوں گا تو اس کے بعد تمہاری آنکھیں بند ہونے لگیں گی۔ ذرا تصور کرو ڈاکٹر سیف.....! کیسا منظر ہوگا وہ.....“

میں اس کی بات پر لرز گیا۔ چونکا بھی کہ وہ میرے نام سے بھی واقف ہو چکا تھا، یہ کوئی بڑی بات تو نہ تھی، تاہم پھر بھی..... ان کی تیزی اور پھرتی پر مجھے حیرت ہوئی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ یہ لوگ پل پل کی خبریں اور حالات سے اپنی ’اعلیٰ قیادت‘ کو انفارم کر دیا کرتے تھے۔

”دیکھو، مت کرو میرے ساتھ ایسا..... تم..... تم لوگوں نے میرے معصوم بھائی عادل کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا تھا۔“ میں ان کی منت سماجت پر اُتر آیا مگر ان مردودوں کے کان پر ایک ذرا جوں تک نہیں رینگی تھی۔

”ارے نہیں.....“ اچانک وہ رک کر بولا۔ انداز سوچنے اور میری بے بسی اور خوف زدگی سے حظ اُٹھانے جیسا تھا۔ ”کیوں نہ ذرا یہ دلچسپ منظر تمہیں اور بھی زیادہ دھوم دھام سے دکھایا جائے۔ ہمم..... ہاں..... یہی ٹھیک رہے گا۔“

اس کی بات پر ایک نئی تشویش زدہ سی اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ ڈاکٹر اشوک نے قریب دھری آپریشن ٹیبل کی طرف اشارہ کیا جس پر ریٹا میری طرح رسن بستہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔

”سب سے پہلے اِسے خالی کرتے ہیں اور یہ منظر ہم اپنے پیارے دشمن سیف کو دکھائیں گے۔ اپنی خوب صورت ساتھی کا حشر دیکھ کر اسے بھی مزہ آئے گا اور ہمیں بھی.....“

میں نے لیٹے لیٹے گردن گھما کر بازو والی ٹیبل پر ریٹا کو دیکھا، وہ بھی اسی طرح گردن موڑے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سرخ تھا، پھر نیلا پڑا اور اب ڈاکٹر اشوک کی بات پر پیلا پڑنے لگا۔

”چلو، بھئی شروع ہو جاؤ ساتھیو.....!“ اشوک نے اعلان کیا، یوں جیسے دعوت اُڑانے والے ہوں۔

وہ سب گھوم کر ریٹا کی ٹیبل کے گرد جا کھڑے ہوئے، اس طرح کہ اس کے پیٹ اور سینے کا ایک حصہ مجھے نظر آتا رہے۔ میں نے ایک جھرجھری سی لے کر لیٹے لیٹے اپنی گردن دوسری جانب گھمالی۔

مجھے ریٹا کے خوف سے دبے دبے لہجے کی داد و فریاد سنائی دینے لگی۔

”ہے..... اس کی گردن اسی طرف موڑے رکھو، جاؤ جیمس.....!“ اشوک نے شاید میرا چہرہ دوسری طرف ہوتے دیکھ لیا تھا۔ جیمس میری طرف آیا اور اس کم بخت نے بینڈ یج کی پٹیوں ہی سے میرا منہ ریٹا کی ٹیبل کی جانب گھما کر مضبوطی سے اس طرح باندھ دیا کہ اب میں اسے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اپنی آنکھیں بند کرنے کا آپشن میرے پاس ہنوز تھا۔

ان ظالموں نے پورے انہماک کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ کمرا یقیناً ساؤنڈ پروف تھا۔ اسے سی چل رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ لرزا خیز منظر دیکھنا پڑا۔

ڈاکٹر اشوک..... ریٹا پر جھکا اس کے پیٹ پر تیز نشتر چلا رہا تھا۔ خون تیزی سے نکلنے لگا۔ کلونجی، ڈاکٹر اشوک کو مختلف انسٹرومنٹ تھمائے جاتی تھی۔ ڈاکٹر جیمس، ڈاکٹر اشوک کو ”اسسٹ“ کر رہا تھا۔

ریٹا کے حلق سے خرخراتی اور پھر دل دوز چیخیں نکلنے لگیں تو اشوک ہی کے اشارے پر جیمس نے اس کے منہ پر موٹا گاز پیس ٹھونس دیا۔ ریٹا نے بہ مشکل اپنا سر اُٹھا کر سینے اور پیٹ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں..... ڈاکٹر اشوک بڑی صفائی سے اس کی سرخ سرخ تلی نکال رہا تھا۔ کلونجی جلدی سے..... شیشے کا ایک محلول بھرا جار اُٹھا لائی تھی۔ اشوک سفید دستانوں میں ہلکی سیاہی مائل اور گاڑھی سرخ تلی اس کے اندر ڈال رہا تھا۔

ریٹا نے میری جانب گردن موڑی، میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اُف..... میں نے اپنی زندگی میں ایسی بے بسی، ایسی بے چارگی، ایسی لاچارگی اور..... ایسی مدد اور رحم طلب نگاہیں اور تاثرات نہیں دیکھے تھے جو اس وقت یقینی اور جاں گسل موت کی زردی لیے ریٹا کے حسین چہرے سے جھلک رہے تھے۔

میں نے یک دم اپنی آنکھیں موند لیں۔

”سر! اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔“ میں نے بند آنکھوں اور سنتی سماعتوں میں رذیل جیمس کی آواز سنی۔ اس کا اشارہ یقیناً میری جانب ہی تھا۔

''موہن! اس کی آنکھیں کھولو.....'' مجھے ڈاکٹر اشوک کی بھیڑیے جیسی غراہٹ سنائی دی۔ موہن میری جانب بڑھا تھا کیونکہ چند ہی لمحوں بعد اس نے سب سے پہلے تو میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا جس سے گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''آنکھیں کھلی رکھو، اگر دوبارہ بند کیں تو پپوٹوں پر ٹیپ لگا کر کھلی چھوڑ دوں گا جس سے تمہاری آنکھوں میں جلن بھی ہوگی اور پانی بھی بہتا رہے گا، سمجھے.....'' موہن نے غرا کر مجھ سے کہا اور دوبارہ لوٹ گیا۔

میرے پاس اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے ریتا کی یہ ظلم و جفا کی حالت کو دیکھتے رہنے پر مجبور رہوں۔

ریتا نے پھر سسکتے ہوئے اپنا سر تھوڑا اُٹھا کر اپنے کھلے ہوئے سینے اور کھلے ہوئے پیٹ کو دیکھا اور پھر نیچے سر کر لیا۔

یہ انسانیت سوز خونی کھیل اس وقت تک جاری رہا جب تک ریتا کا سر واقعی ایک جانب کو نہیں ڈھلک گیا۔

''ذرا فریش ہو کے آتے ہیں اور اس کے بعد تمہاری باری ہوگی۔''

ایک تھکی تھکی سی ہمکاری خارج کرتے ہوئے صفتِ ابلیس ڈاکٹر اشوک نے مجھ سے کہا اور اس کے ذرا دیر بعد وہ چاروں خونی لوگ آپریشن روم سے نکل گئے۔

ریتا کا حسین جسم اب کٹے پھٹے انداز میں گویا آپریشن ٹیبل پر پھیلا پڑا تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے ایک لمحے کو تو انسانیت سے ہی نفرت ہونے لگی لیکن نہیں، سب ایک جیسے بھلا کب ہوتے ہیں؟ نیک و بد ہی کی تو یہ دنیا ہے۔

میں خود کو حوصلہ دینے لگا۔ مجھے جلد از جلد اس مہلت سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ ریتا کے الفاظ مجھے یاد آرہے تھے۔ وہ مجھے بار بار یہی تلقین کر رہی تھی کہ کوشش کرو خود چھڑانے کی۔

میں نے اس بار ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے کی فضول کوشش کے بجائے ایک لمبی سانس کھینچ کر چند سیکنڈ غور کیا، میرے ہاتھ کلائیوں کی طرف سے چمڑے کی بیلٹ کے ذریعے بندھے ہوئے تھے اور یہی حال ٹانگوں کا تھا۔ میں نے سب سے پہلے صرف اپنے دائیں بازو پر زور دیا، جانتا تھا کہ ایک ہاتھ کے آزاد ہونے پر آگے بھی بہت کچھ کیا جاسکتا تھا اسی لیے میں نے اپنی ساری توجہ اسی زور آزمائی پر ہی مرکوز کر دی۔

یہ دھڑکا اپنی جگہ تھا کہ یہ خونی لوگوں کا..... جتھا نجانے کب دوبارہ آن دھمکے۔ اندازہ تو یہی تھا کہ آدھ، ایک گھنٹا تو ان مُرداروں کو لوٹنے میں ضرور لگے گا۔

تاہم کچھ بعید بھی نہ تھا کہ کس وقت اور جلدی ہی لوٹ آئیں۔ میں نے اپنی ہی کوشش تیز کر دی۔

جان بچانے کے جذبے کی قوت سمیت پورے جسم کی طاقت میں نے اپنے صرف اپنے ایک بازو پر صرف کر ڈالی اور..... کھینچ تان کرنے لگا۔ اس طرح کہ یا تو بیلٹ ٹوٹ جائے یا پھر..... میرا ہاتھ بیلٹ کے چرمی شکنجے سے باہر نکل آئے۔

ذرا ہی دیر میں میرا سانس بُری طرح پھول گیا۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود مجھے اپنے بدن میں اس مشقت سے پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔ پیشانی پر بھی پسینے کے کچھ قطروں کا احساس ہوا۔ نہیں ہوا تو..... یہ احساس کہ میرا دایاں ہاتھ چمڑے کی بیلٹ سے ایک تھوڑا سا بھی آزاد ہوا ہو..... یعنی، چمڑے کی بیلٹ پر اس طوفانی کھینچا تانی پر ایک ذرا بھی گزند نہ پہنچی تھی یا وہ تھوڑا ڈھیلا ہی ہوگیا ہو۔ بالکل نہیں، وہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔

دل و دماغ ایک بار پھر مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا تو میں نے فوراً سنبھالا لیا۔ اب بائیں بازو اور ایک دائیں ٹانگ کے ساتھ یہی مشقت بیک وقت شروع کر ڈالی، کیونکہ وقت بھی بچانا تھا۔ ابھی مجھے اس کوشش میں اندازاً پندرہ بیس منٹ ہی صرف ہوئے ہوں گے کہ اچانک دروازے پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔

میرا دل اپنے متوقع عبرت ناک حشر اور یقینی موت کے خوف سے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا کہ خونی بھیڑیوں کا ٹولا بس، آ ہی گیا ہو۔

دروازہ کھلا اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا اور پھر چند لمحوں بعد ہی میں نے جس آدمی کو دروازے پر دیکھا اسے دیکھتے ہی میں جیسے سانس لینا بھول گیا۔

اب شاید دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی تھی، ماسوائے اللہ کے، جس کا جتنا بڑا نام تھا اُتنا ہی بڑا آسرا تھا۔

دروازے پر بنگو کو دیکھتے ہی جو تھوڑی بہت آس اُمید تھی وہ بھی جاتی رہی لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت چھپی ہوتی ہے، جو کام ہمیں بہ ظاہر غلط یا اُلٹا اور مشکل ہوتا نظر آرہا ہوتا ہے، درحقیقت اسی میں آسانی مخفی ہوتی ہے۔ ہر غلط ہوتا اچھے ہونے کے لیے ہو رہا ہوتا ہے۔

گرانڈیل بنگو..... اپنے ہاتھی جیسے جثے سمیت اندر

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through

JASOOSI DIGEST SUSPENSE DIGEST MONTHLY PAKEEZA MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 3580 2552, 3580 4200-3589 5313 FAX : (92-21) 5802551
E.mail : jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوتل تھی اور وہ یقینی طور پر شراب ہی کی تھی۔

مجھے بے بسی کے عالم میں پڑا دیکھتے ہی اس کی باچھیں بدہیئت انداز میں پھیلی تھیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ بھلا یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ ہو سکتا ہے، انہی لوگوں نے اسے میری نگرانی کے لیے بھیجا ہو اور دل بہلانے کے لیے وہ شراب کی بوتل اُٹھا لایا ہو، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کسی اور جگہ مصروف ہو گئے ہوں اور انہیں لوٹنے میں دیر ہو رہی ہو۔ کچھ بھی تھا، ذرا بہتر ہی تھا لیکن بنگو کی موجودگی میں کم از کم مجھے تو کچھ بھی بہتر نہیں لگ رہا تھا۔

میں نے دیکھا، وہ اندر آیا۔ اپنی بوتل کو دیکھا، میری بھی یک ٹک نظریں اس کی بوتل پر جم گئیں، وہ ادھ بھری تھی۔

میں نے اسے دواؤں کی شیلف کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہاں سے اس نے گولیوں کا ایک ڈبا نکالا اور اسپرٹ کی بوتل۔ ڈبے پر لکھی گولی کا نام پڑھتے ہی میرے ذہن میں ایک معنی خیز جھماکا ہوا۔

یہ 'سی پی ایم' یعنی عام فہم میں ایول کی گولیوں کا ڈبا تھا جو الرجی یا نزلے زکام میں استعمال کی جاتی تھی۔ اس میں غنودگی ہوتی تھی۔

وہ مٹھی بھر کے اس کے اندر سے گولیاں نکال کر اپنی شراب کی بوتل میں بھرنے لگا، دو مٹھیاں گولیاں بھرنے کے بعد اس نے اسپرٹ بھی اُنڈیل لیا۔

مجھے ایک اسپتال کا وہ چوکیدار یاد آ گیا جو شراب کا عادی تھا اور دیسی ٹھرا اس کی پسندیدہ شراب ہوتی تھی۔ وہ اکثر چوری چھپے، اپنی شراب کا نشہ دوبالا اور تیز کرنے کے لیے ان مذکورہ دو چیزوں کا استعمال کرتا تھا۔

یہ مست ہاتھی بھی یہی کچھ کر رہا تھا، خواہ چوری چھپے سہی۔ یہ کرنے کے بعد اس نے بوتل سے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لیے تو جلد ہی وہ مست ہاتھی کی طرح جھومنے لگا۔

میرے لیے اس کی ان حرکات و سکنات میں کوئی مستفید ہونے والی بات نظر نہیں آتی تھی، ماسوائے اس کے کہ وہ میری نگرانی پر ہی مامور کیا گیا ہو۔

اچانک..... وہ لڑکھڑایا تھا... یا پھر یونہی وہ قریب دھری سرجیکل ٹرالی سے ٹکرایا، گرتے گرتے اس نے اپنا ہاتھ خود کو بچانے کے لیے اُٹھایا تو وہ اس پر دھری ٹرے سے اس زور سے لگا کہ کئی آلے اُچھل کر نیچے گر پڑے، یوں دوسرے ہی لمحے مجھے لگا جیسے کوئی سرجیکل آلہ..... میرے بائیں ہاتھ کے نیچے بھی اچھل کر آن پڑا ہو۔ میری کلائی بندھی ہوئی تھی مگر ہاتھ ایک حد تک آزاد تھا، میں نے کچھ سوچ کر جلدی سے اس آلے کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی... پھیلا کر اسے چھپا دیا۔

بنگو گھبرا گیا اور جلدی جلدی نیچے فرش پر گرے آلات سمیٹنے لگا اور پھر اس نے وہ سب ٹرالی پر رکھ دیے اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

شکر تھا کہ نہ اس کی نظر پڑی تھی نہ ہی اسے شبہ تک ہوا تھا کہ ایک سرجیکل آلہ اُچھل کر میرے ہاتھ کے قریب ٹیبل پر بھی آن پڑا تھا۔

میرا دل مسرت کے احساس سے زور زور سے دھڑکنے لگا، تائید ایزدی پر میرا ایمان پختہ ہونے لگا۔ اللہ کی مدد..... مچھلی کے پیٹ سے حاصل ہو یا اندھیرے... غار سے..... کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، شاید اسی لیے مایوس ہونے سے سخت مانع رکھا گیا ہے۔

جو آلہ اتفاق سے اُچھل کر میری ٹیبل پر بائیں ہاتھ کے قریب آن پڑا تھا، وہ ایک نشتر تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں مرتا مرتا زندہ ہو گیا ہوں۔ جیسے میں کسی اندھے گڑھے میں گرتا گرتا ایک دم ہواؤں میں اُڑتا ہوا ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔

میں نے سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس نشتر کو ہاتھ کی اُنگلیوں میں ایک مخصوص سمت سے اٹکانے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک اور غیر متوقع مدد ملتے ہی مجھ پر جوش کی بھی لرزاہٹ طاری ہونے لگی تھی لیکن یہ بات میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتی تھی، وہ آلہ جسے میں ایک حد تک پکڑ سکتا تھا، وہ میری ٹیبل سے نیچے فرش پر بھی گر سکتا تھا۔

میں نے پہلے چند سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کیا اور اپنے بدن اور ہاتھ کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی... اس کے بعد اپنا کام دھیرے دھیرے کرنا شروع کر دیا۔

اگلے چند ہی منٹوں بعد میں آزاد ہو چکا تھا۔ آزاد ہوتے ہی یکلخت میرے خوف پر ایک عجیب سا جوش غیظ عود کر آیا۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں سب کو اب پھاڑ کھاؤں گا۔ وقت نہ رہا تھا شاید کیونکہ اسی لمحے دروازے کے باہر مجھے ایک سے زائد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں

نے نہایت سرعت کے ساتھ سرجیکل ٹرالی کا رخ کیا اور..... اس پر سے دو عدد تیز دھار نشتر اُٹھا لیے اور ایک ایک ہاتھ میں پکڑ کر میں یک دم دروازے کے دائیں جانب جا دبکا۔

جوش اور غضب ناکی نے میرے وجود کے روئیں روئیں کو مرتعش کر رکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں تیز دھار نشتر دبے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے میں نے..... ڈاکٹر جیمس کو موہن کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا اور..... ان دونوں مردودوں کو دیکھتے ہی..... میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یہ دونوں کسی طور بھی معافی کے مستحق نہ تھے۔ میں کسی چیتے کی طرح ان پر عقب سے لپکا اور..... ایک نشتر میں نے ڈاکٹر جیمس کی گردن پر آزما ڈالا اور دوسرا موہن کی گدی پر..... جیمس کی شہ رگ نشانہ بنی تھی اور وہاں سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا۔ اس کے مکروہ چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے۔

موہن کی گدی سے بھی خون اُچھل پڑا تھا، اس نے تڑپ کر پلٹنا چاہا تھا کہ میں نے غضب ناک حالت میں غراتے ہوئے اس کے نرخرے پر نشتر سے دوسرا وار بھی کر ڈالا، وہ ذبح ہوئے جانور کی طرح ڈکراتا ہوا گرا۔

نشتر، چاقو نہیں ہوتا اسی لیے اس کے دور رس نتائج حاصل کرنے کے لیے میں نے اسے ان کے جسموں کے برہنہ حصوں کو نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی۔ لباس میں چاقو اُتر کر انسان کا کام تمام کر سکتا تھا مگر نشتر نہیں.....

میں نے دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہیں چڑھائی تھی، کیونکہ ابھی اصل شکار، یعنی ڈاکٹر اشوک باقی تھا، کلونتی کا بھی یہی حشر کرنا تھا۔

میں ہانپتی ہوئی سانسوں کے ساتھ کھڑا جیمس اور موہن کو انہی کے خون کی چھپڑی میں پڑے تڑپتے دیکھتا رہا اور چند ہی لمحوں بعد ان دونوں کے ناپاک وجود بے حس و حرکت ہو گئے۔

ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں نے چند لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کیا اور..... دوبارہ دروازے کی جانب بڑھا، اسے تھوڑا کھول کر جھری بنا کے باہر جھانکا تو راہداری سنسان پڑی نظر آئی۔ یہاں بلب بھی ایک دو ہی روشن تھے۔

مجھے ڈاکٹر اشوک کا بے چینی سے انتظار تھا..... میں دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ وہ یا تو اکیلا ہو یا پھر کلونتی ہی ساتھ ہو اس کے، اگر بنگو بھی ساتھ ہوا تو..... اپنے اصل شکار کو ٹھکانے لگانے..... کا معاملہ نہ صرف کھٹائی میں پڑ سکتا تھا بلکہ..... خود میں بھی دوبارہ اس درندہ صفت انسان کے نرغے میں پھنس سکتا تھا۔

میں اسی لیے دروازے میں جھری بنائے مسلسل خالی پڑی راہداری کو دیکھتا رہا.....

میرے پاس اور کوئی ہتھیار نہ تھا، سوائے ان نشتروں کے..... معاً ہی مجھے راہداری میں دو سائے نمودار ہوتے دکھائی دیے اور یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ راہداری میں روشنی بس اتنی ہی تھی کہ دور سے تو کوئی آتا ہوا ٹھیک سے نظر نہیں آتا تھا لیکن..... قریب پہنچنے پر پہچانا جاتا۔

جلد ہی عقدہ کھلا کہ آنے والے دو نہیں بلکہ تین تھے۔ تیسرا فرد تھوڑی دیر بعد ہی نمودار ہوا تھا۔ وہ کم بخت تو دور ہی سے اپنے جثے کے سبب پہچان لیا گیا۔ گویا وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ بنگو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

اول الذکر نمودار ہونے والے دونوں افراد جب قریب آئے تو حسب توقع وہ ڈاکٹر اشوک اور نرس کلونتی ہی تھے۔

اپنے اصل شکار اشوک کو دیکھتے ہی میرے اعصاب تن گئے اور کنپٹیاں انتقام سے سلگ اٹھیں، مگر اس بدبخت بنگو کو دیکھ کر میرا اُبال، صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھنے... لگا۔ اب کچھ تو کرنا ہی تھا، جان تو یوں بھی ہتھیلی پر ہی تھی میری، خطرہ دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں تو بند نہیں کی جا سکتی تھیں۔ یہ سوچ کر میری ہمت اور میرا جوش پھر بڑھنے لگا۔

بنگو ابھی دور تھا۔ وہ مست ہاتھی کی طرح اپنی ہی 'کِک' میں جھومتا جھامتا ہوا ان دونوں کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس ہاتھی کی نسل سے پہلے اشوک اور کلونتی اندر داخل ہوں گے اور میں سب سے پہلے اشوک اور پھر کلونتی کا کام تمام کرنے کی کوشش کروں گا، بعد میں چاہے، بنگو میرا کام تمام کر ڈالے۔

یہ تہیہ کرتے ہی میں دروازے سے ہٹ کر سابقہ پوزیشن میں مستعد اور دبک کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلا، میں نے سانس روک لی۔ سب سے پہلے اشوک اندر داخل ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے دونوں ہی نشتر اس سفاک اور ننگِ انسانیت کی گردن میں پیوست کرنے کا پکا تہیہ کر رکھا تھا۔

لہٰذا جیسے ہی میرا اصل شکار اندر داخل ہوا، میں مارے جوش کے اپنے حلق سے غراہٹ کو نہ دبا سکا، اشوک

اسی آواز پر چونک کر مڑا تھا کہ میں نے بیک وقت دونوں نشتروں سے اس پر حملہ کر ڈالا۔ نشانہ اس کی گردن ہی تھی۔

میرے دائیں ہاتھ کا نشتر اس کی گردن پر چلا لیکن میری بے اختیار مخرج ہونے والی جوش بھری غراہٹ سے وہ چونک کر مڑا تھا اسی لیے میرا نشتر اس کی گردن کے بجائے کاندھے پر پڑا، لباس کے سبب نشتر اپنا کام بہ احسن خوبی نہ انجام دے سکا۔ چرکا تو لگا مگر ہلکا، اشوک بُری طرح بدکا، میرے بائیں ہاتھ کے نشتر کا وار تو بالکل خالی چلا گیا، نتیجے میں، میرا توازن تھوڑا بگڑا اور میں نصف حد تک اپنے ہی زور پر گھوم گیا۔

کلونتی نے اس اچانک اُفتاد پر ایک روایتی سی زوردار زنانہ چیخ ماری اور دروازے سے ہی پلٹ کر واپس راہداری کی جانب بھاگی، اِدھر اشوک اپنے کندھے کے معمولی زخم کو خاطر میں لائے بغیر پھرتی کے ساتھ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا اور اس بدبخت نے میرے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ میں چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا۔ ضرب زوردار نہ تھی، میں سہہ گیا اور پھر خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔

اشوک نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی، شاید اسے اپنے ہاتھی جیسے باڈی گارڈ پر زیادہ ہی اعتماد تھا جس کے اب دوڑتے بھاری قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، اسے کلونتی نے چونکا دیا تھا۔

ہمت میں نے بھی نہیں ہاری تھی، اشوک پر میں پھر جھپٹا، مگر اس نے پاس پڑی ٹرالی کو میری جانب دھکیل دیا، میں پھرتی سے ایک طرف کو ہو گیا، میری سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور مارے جوشِ غیظ کے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔

اشوک اتنی سی مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، مجھ سے دور ہو گیا تھا، تب ہی اچانک.... اس کی چالاکی کو سمجھتے ہوئے میں نے اس کی طرف دوبارہ بڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور یک دم دروازے کے قریب سرک گیا اور اگلے ہی لمحے میری یہ چال کامیاب ثابت ہوئی، بنگو جیسے ہی جوش سے غراتا ہوا اندر داخل ہوا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے نشتر اُچھل کر اس کی گردن کے دونوں جانب آزما ڈالے لیکن میں خود کو بھی نہ سنبھال سکا، کیونکہ وہ بہر حال مجھ سے کچھ دراز قامت ہی تھا، پھر جوش و جذبے نے میرے وجود میں لرزش پیدا کر دی تھی۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا اور شاید یہی میرے لیے اچھا بھی ہوا تھا کیونکہ نشتر کے دو خطرناک وار سہتے ہی وہ پاگل ہاتھی کی طرح اپنے دونوں ہتھوڑے جیسے ہاتھوں کو پھیلا کر گھوما بھی تھا۔ انداز اس کا مجھ پر جھپٹنے کا ہی تھا، مگر اب شاید اسے دیر ہو چکی تھی، کیونکہ اس کی گردن کے ایک زخم سے خون فوارے کی طرح اُچھالیں مارنے لگا تھا، اگرچہ گردن کے دوسرے چرکے سے بھی خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

اُدھر ایک کونے میں محتاط کھڑے اشوک نے جو اپنے بنگو کا یہ حشر دیکھا تو پہلی بار اس کے منحوس و مکروہ چہرے پر تشویش اور خوف کے آثار نمودار ہوئے تھے اِدھر بنگو اپنے مہلک زخم پر دونوں ہاتھ رکھے لڑکھڑا کر فرش پر جا پڑا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ بروقت میں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ میں کبھی اس ہاتھی کی نسل پر سبقت نہیں لے سکتا تھا، لیکن دیکھا جائے تو یہ عقل بھی مجھے اشوک کی چالاکی نے ہی ردِعمل کے طور پر فراہم کی تھی۔

اشوک نے اب بھاگنے میں عافیت سمجھتے ہوئے دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔ میں اب اس سفاک انسان کو کہاں چھوڑنے والا تھا، دوسرے مجھے کسی اور کے بھی یہاں دوڑے چلے آنے کی فکر تھی، کیونکہ کلونتی بہر حال..... باہر نکل بھاگی تھی۔

اشوک جیسے ہی دروازے کے قریب آیا اور مجھ سے بھڑنے کی کوشش چاہی تھی کہ مجھے بائیں ہاتھ میں پکڑے نشتر چلانے کا موقع مل گیا، مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس بار بھی نشتر کا تیز دھار وار اس کی گردن کے بجائے چہرے پر پڑا۔ اگرچہ یہ چرکا زوردار ثابت ہوا۔ اس کے حلق سے کریہہ انگیز چیخ خارج ہو گئی اور چہرہ خون آلود ہو گیا۔

کچھ دیر پہلے بہادر نظر آنے والا یہ رذیل آدمی اب بُری طرح دہشت زدہ ہو گیا، وجہ یہی تھی کہ اس کا ہاتھی جیسا باڈی گارڈ تھوڑی دیر تڑپتے رہنے کے بعد ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا، دوسرے یہ کہ اشوک کو میری آنکھوں میں اُترا ہوا خون بھی نظر آ گیا تھا۔

اس نے باہر دوڑ لگانا چاہی تھی کہ میں نے اس کے پہلو میں لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا، اب میں اسے مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا، لپک کر.... ملک الموت کی طرح اس کے سر پر جا پہنچا، وہ دیوار سے لگا بیٹھا اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر میں اس بدذات اور ظالم انسان کو معاف کرنے والا کہاں تھا۔ دونوں نشتر ایک ساتھ میں نے اس کی گردن پر پھیر دیے، اس کے حلق سے خرخراتی آوازیں نکلنے لگیں، خون کے

فوارے چھوٹ پڑے۔

اس کا کام تمام کرتے ہی میں نے راہداری کا رخ کیا۔ کلونتی غائب ہو چکی تھی اور مجھے اس بات پر تھوڑی حیرت ہوئی تھی کہ ماحول ابھی تک خاموش کیوں تھا! ظاہر ہے وہ اپنے کرتوت ظاہر ہونے سے خوف زدہ ہوگی۔

بہر حال میں راہداری میں ہی بنے ایک دوسرے دروازے سے باہر آ گیا اور عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر کسی بڑے ہال سے کمرے کی بیرونی دیوار سے چپکا ہوا، جو مردہ خانے کی تھی، باہر آ گیا۔

ذرا دیر بعد میں جنگل کی جھاڑیوں میں تاریکی کا حصہ بنا کھڑا تھا۔ آئندہ کی حکمتِ عملی تیار تھی۔ وہاں سے میں نے اسی جگہ کا رخ کیا جہاں اپنی گاڑی گھنے جھنڈ کے پاس کھڑی کر رکھی تھی۔ خون آلودہ نشتر میں نے کسی گڑھے میں پھینک دیے تھے۔

وہاں پہنچا تو وہ اپنی جگہ موجود تھی۔ شکر تھا کہ ڈور لاک نہیں تھے اور اندر اگنیشن سوئچ میں چابی بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

ذرا ہی دیر بعد میری کار مین روڈ پر فراٹے بھر رہی تھی۔ میرا رخ جسونت رائے کی رہائش گاہ کی طرف تھا، اگرچہ ایک خیال مجھے یہ بھی آیا تھا کہ میں وہاں کا رخ نہ کروں، پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

فی الوقت مجھ اکیلے کو جسونت رائے جیسے ڈان..... کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

میں ایک لرزہ دینے والی موت سے..... بال بال بچا تھا، اللہ نے ہی مجھے بچایا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والے کی ذات سب سے زیادہ طاقت والی ہے۔ یہی نہیں دل بھی مطمئن تھا کہ میں نے معدودے چند ہی سہی مگر خطرناک اور سفاک انسانوں کو بھی جہنم واصل کر دیا تھا صرف اپنی جان بچا کے ہی واپس نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

اگلے ایک گھنٹے بعد میں اور جسونت رائے ایک دوسرے کے رُوبرو تھے۔ میں اسے ساری تفصیل بتا چکا تھا۔ یہ ساری کتھا سن کر اس کا بھاری چربیلا سا چہرہ پہلے تو مارے غیض کے سرخ پھر مغموم اور سُست کر رہ گیا۔ ''مجھے رینا اور ڈوجا کے ہلاک ہونے کا بے حد افسوس ہے۔'' جسونت رائے بوجھل سے لہجے میں کہنے لگا۔ اس کے سامنے شراب کی بوتل پڑی تھی اور سلگتا ہوا سگار اس کے ہاتھ کی اُنگلیوں میں دبا ہوا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ آدھ بھرا پیگ بھی اسی ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔

''یہ دونوں میرے وفادار اور خاص آدمی تھے، میں ان پر بے حد بھروسا کرتا تھا۔'' ایک ذرا توقف کے بعد وہ پھر کہنا شروع ہوا۔

''ویسے میں نے مزید حقائق جاننے کے لیے اپنے دو آدمیوں کو رتلام میموریل اسپتال کی طرف روانہ کر دیا ہے۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا بلکہ میرے سر سے ایک بوجھ اُتار دیا۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''ورنہ میں اب تک اندر سے اسی پریشانی کا شکار تھا کہ پتا نہیں آپ کو میری باتوں پر یقین آتا بھی ہے کہ نہیں، کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے ہی آپ کے دونوں ساتھیوں کو.....''

''بالکل نہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ آواز اب بھی اس کی بوجھل سی تھی۔ ''تمہاری حالت اور دوبارہ یہاں لوٹ آنا تمہارے بیان کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔''

''میری آخری حد تک کوشش تھی کہ کم از کم کلونتی کو میں یرغمال بنا کے یہاں لے آتا۔ اس سے ہمیں کافی مفید باتیں معلوم ہو سکتی تھیں، بالخصوص شنکر چانکیہ..... کے بارے میں.....'' میں نے کہا۔

''اب یہ کام میرے بھیجے ہوئے وہ آدمی بہ آسانی کر گزریں گے۔'' جسونت رائے بولا۔ ''میں نے انہیں یہی ہدایت کی ہے۔''

''میرا خیال ہے، مجھے ممبئی کا رخ کر لینا چاہیے۔ کملیش نے بھی تو ان لوگوں کے متعلق کافی معلومات دی ہیں۔ وہ مجھے ازبر ہیں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں، لیکن کیا تم اکیلے اس مہم پر جاؤ گے؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میں اکیلے ہی بہتر طور پر کام کر پاؤں گا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''البتہ آپ سے رابطے میں ضرور رہوں گا، آپ کی بیک سپورٹ مجھے درکار رہے گی۔''

''ضرور.....'' اس نے ایک چسکی لے کر کہا پھر سگار سے ایک کش لیا اور بولا۔

''پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ایک آدمی تو تمہارے ساتھ ضرور ہو، بلکہ مرد کے بجائے اگر ایک دلکش لڑکی ساتھ ہو تو بڑے بڑے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ وہ میری ایک گھاگ اور تجربے کار ساتھی ہوگی۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی

مسئلہ ہو وہ چٹکی میں حل کر لے گی۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے ہولے سے کہا۔ کمرے میں چند ثانیوں کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی اس کے بعد وہ بولا۔

"ایک بات کا دھیان رہے، مجھے شنکر چانکیہ..... زندہ حالت میں چاہیے اور تم بھی....."

میں اس کی آخری بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا اور اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"تم اس لیے کہ میں شنکر چانکیہ کی وہی حالت کروں گا جو اس نے میرے لاڈلے اور پیارے بھتیجے وچے کی، کی تھی اور اس جیسی حالت تم ہی اس کی کر سکتے ہو، کیونکہ تم ایک سرجن ہو ڈاکٹر ہو۔"

"میں خود بھی ان لوگوں کے ساتھ یہی حشر کرنے کے لیے بے چین ہوں، کیونکہ میرے معصوم بھائی عادل کے ساتھ بھی ان لوگوں نے ایسا ہی کیا تھا۔" میرا لہجہ بھی جوش سے لرزنے لگا۔

وہ رات میں نے آرام سے سو کر گزاری۔ دن چڑھے سوتا رہا۔ دوپہر کو جاگا۔ نہا دھو کر پُرتکلف ناشتا نما لنچ کیا۔ تین بج چکے تھے۔ مجھے ایک شاندار کمرا ملا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر شے موجود تھی، جو نہ تھی وہ بیل بجا کر منگوا لیتا۔

گویا جسونت رائے نے میرے یہاں ٹھاٹ کروا رکھے تھے۔ لمبی چوڑی مہمات میں ایسا ہی ہوتا ہے، نرم گرم حالات آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ تاہم گزرے ہوئے واقعات کا تصور کرتے ہی میں جھرجھرا جاتا۔

زندگی تھی کہ ایک عبرت ناک موت سے بچا تھا، ورنہ تو وہ خونی سوداگر مجھے کہاں چھوڑنے والے تھے۔

ریٹا کے حشر پر البتہ مجھے دُکھ ضرور ہوا تھا۔ ہمارا تھوڑا ساتھ ہی سہی مگر دوستانہ ضرور ہو گیا تھا۔ ڈوجا بھی نہیں رہا تھا۔

میں تیار ہوا تو اچانک دروازے دستک ہوئی۔

"یس کم اِن۔" میں نے ذرا اُونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا اور جو شے لہراتی مٹکتی اندر داخل ہوئی تھی، اس کے حسن کے ہوشربا ہونے کا یہ ثبوت کافی تھا کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ دُبلی پتلی، قدرے دراز قامت اور لچکیلی کمر، ٹائیٹ جینز کی پینٹ شرٹ میں وہ کوئی قاتلہ جاں ہی محسوس ہوتی تھی۔

وہ دیکھنے میں ہی نازک اندام اور..... ادائے شوخیِ دل آراء کی سی حرکات و سکنات..... کی حامل نظر آتی تھی۔ اس کے بال ہلکے براؤن مائل سیاہ تھے اور دراز بھی..... آنکھیں روشن اور چمک دار، بولتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ ہونٹ جیسے گلاب کی پنکھڑیاں ہوں، ستواں ناک اور صراحی دار گردن نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ سب سے زیادہ جو چیز اس میں لبھاتی تھی وہ اس کی کمر تھی۔ رنگت بھی گلاب جیسی اور..... آواز کا جادو بھی تب ہی پتا چلا جب اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ ہلا کر "ہائے" کہا۔ اس کی ہائے کہنے پر بے اختیار میرا دل "ہائے..... ہائے" کرنے کو تو چاہا مگر میں نے خود کو روکے رکھا اور صرف..... خیر مقدمی مسکراہٹ ہی اس کی جانب اُچھال دی۔

"میں رچنا ہوں، باس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا۔" قریب آ کر اس نے مصافحہ کے لیے میری جانب اپنا دایاں ہاتھ بھی بڑھا دیا جسے میں نے تھاما تو جیسے میرے پورے وجود میں یکلخت برقی رو دوڑ گئی۔

اس کا ہاتھ تھامتے ہی میری وہی کیفیت ہونے لگی، یعنی منہ اور ہونٹ خشک ہونے لگے۔ اس قدر نرم و نازک ہاتھ کا لمس تھا اس کا جو بیان سے باہر۔ مجھے لگا، جسونت رائے نے میرے ساتھ شاید 'خوب صورت' مذاق کیا ہے۔ کوئی لڑاکا، مستعد اور جنگجو ساتھی دینے کے بجائے رچنا کی صورت میں مجھے ایک 'سُپر ماڈل' دے ڈالی تھی۔

ایک خیال یہ بھی آیا کہیں رائے کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی تھی کہ وہ میرا دل بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ہم دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"ممبئی کے لیے کب نکلنا ہے؟" اس نے اسی طرح ہلکی مسکان نچھاور کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"بس، نکلتے ہیں، میں تیار ہوں۔" میں نے خشک پڑتے حلق سے کچھ نگلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواباً کہا۔

"میں بھی تیار ہوں۔" وہ بھی فوراً بولی، جیسے ابھی میرا ہاتھ تھام کر باہر کو چل دے گی۔

"لیکن..... تمہیں پورا یقین ہے کہ رائے صاحب نے ہی تمہیں میرے ساتھ ایک خطرناک مہم پر روانہ کرنے کے لیے یہاں میرے پاس بھیجا ہے؟"

میرا خیال تھا کہ وہ میرے اس سوال پر برا منائے گی لیکن اس کے برعکس اس نے بڑے دلکش انداز میں حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً..... کیا آپ کو کوئی شبہ ہے ڈاکٹر سیف؟"

گویا اسے میرا نام بھی بتا دیا گیا تھا۔

"نہیں، شبہ تو نہیں، کچھ حیرت ضرور ہوئی تھی۔"

"کس بات پر.....؟"

"شاید ابھی وہ بات میرے ذہن میں پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ہے۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں؟" اس نے اُلجھن زدہ سی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"یہی سب کچھ تو سمجھنے کی میں پچھلے چند منٹوں سے کوشش کر رہا ہوں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"آپ شاید مذاق کے موڈ میں ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی در آئی۔

"ہرگز نہیں، مذاق سے تو مجھے سخت چڑ ہے۔" میں نے فوراً کہا اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے اضطراب تلے پہلو بھی بدلا تو اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور بولی۔

"اینی وے.....! میں باس کے حکم کے مطابق آپ کے پاس آ چکی ہوں۔ آگے آپ کی مرضی۔"

میں اندر سے گڑبڑایا ہوا تھا، بولا۔ "میرا خیال تھا کہ اس خطرناک اور اہم مہم پر رائے صاحب میرے ساتھ کسی دبنگ قسم کے مرد کا انتخاب کریں گے جبکہ آپ....." یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو..... میرا خیال تھا کہ وہ کچھ بولے گی مگر وہ عجیب سے انداز میں میرا چہرہ تکتی رہی تو میں نے پھر کہا۔

"دراصل، بات یہ ہے کہ اس سے پہلے ریٹا اور ڈوجا بھی میرے ساتھ گزشتہ دنوں ایک خطرناک اور اہم مہم پر نکلے تھے، شاید تمہارے علم میں ہو، کیونکہ یہ دونوں رائے صاحب کے خاص آدمی تھے اور بہت تربیت یافتہ بھی، لیکن خطرناک دشمنوں نے ان دونوں کو پلک جھپکتے ہی عبرت ناک موت سے ہمکنار کر ڈالا، خود میں بھی موت کے شکنجے میں آنے سے بال بال بچا تھا۔ اسی لیے میرا خیال تھا کہ اب کی بار رائے صاحب کسی ایسے فرد کا انتخاب کریں گے جس کا حشر ریٹا اور ڈوجا جیسا نہ ہو۔"

رچنا نے شاید پہلی بار میری یہ بات غور سے سنی تھی۔ بولی۔ "یہ آپ کی بات مجھے قابلِ غور لگی....." کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔ "اس بارے میں یہی کہوں گی کہ باس نے میرا انتخاب سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں بالکل کوئی چنتا نہ کریں، جب وقت آئے تو آپ..... کو پتا چل جائے گا۔ باس کا انتخاب غلط نہیں ہوا کرتا۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔ بھلا اور کہتا بھی کیا۔ جب ایک نازک اندام وجود کو مجھ پر مسلط کر ہی ڈالا تھا تو میں کیا کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل سے مختصراً آگاہ کرنے کے بعد ہم ایک سفید کار میں ممبئی کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا ارادہ سب سے پہلے طارق اور رومی کو تلاشنے اور ملنے کا تھا۔ نیٹ پر ان دونوں سے ابھی تک رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ نجانے کہاں چلے گئے تھے؟ رائے صاحب نے مجھے البتہ ایک اسمارٹ سیل فون دے دیا تھا جس میں نیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ یہ پری پیڈ تھا۔

میرا ارادہ ممبئی پہنچ کر دوبارہ واٹس ایپ یا اسکائپ پر ان دونوں سے رابطہ کرنے کا تھا۔ اس بار پیغام رسانی کے بجائے میں ان سے ڈائریکٹ رابطہ کر کے اور ان دونوں پر حیرتوں کے پہاڑ توڑتے ہوئے یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ میں بھی ممبئی میں قدم رنجہ فرما چکا ہوں۔ وغیرہ۔

کار رچنا ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ ممبئی یہاں سے..... ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ رچنا کو سارے حالات سے متعلق پیشگی بریفنگ دے دی گئی تھی۔

ریٹا اور ڈوجا کو وہ بھی جانتی ہو گی اور وہ ان کے دردناک انجام سے بھی واقف ہو چکی ہو گی، باوجود اس کے میں نے اس کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیا تھا، وہاں کہیں ایک ذرا بھی خوف یا ڈر کی رمق تک موجود نہ تھی۔

"ریٹا اور ڈوجا کے انجام کے بارے میں جاننے کے باوجود تم بالکل بھی خوف زدہ نہیں نظر آ رہی ہو؟"

میں نے وقت گزاری کے لیے اس سے باتیں شروع کر دیں۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا گرم تھی۔ کار میں اگرچہ اے سی آن تھا۔ ڈرائیونگ وہی کر رہی تھی اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

سڑک دور تک ویران تھی۔ چند ٹرکوں یا کسی بس کی آمد و رفت دیکھنے میں آ جاتی تھی، یا پھر کوئی پرائیویٹ گاڑی وغیرہ۔

"باس سے وفاداری کا دم بھرنے کے بعد..... ڈر اور خوف بے معنی رہ جاتا ہے۔" اس نے جواب میں کہا۔

"باس، اپنے خاص آدمی تو ایک طرف معمولی نوکر یا چوکیدار کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"تمہارا شمار ان کے خاص آدمیوں میں ہوتا ہے

یا....."

"عام ہوتی تو تمہارے ساتھ اس خطرناک مہم میں شامل نہ ہوتی۔" اس نے ذومعنی جواب دیا۔

"ہمم....." میرے منہ سے برآمد ہوا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر بولی۔ "تم نے ابھی میرے سامنے اپنا کوئی پروگرام واضح نہیں کیا ماسوائے ممبئی پہنچنے کے....."

"آں..... ہاں!" میں جیسے کسی سوچ سے بیدار ہوا۔ "دراصل ابھی میں دوسرے مرحلے پر غور ہی کر رہا ہوں۔ ابھی تو ہم..... ممبئی والی رہائش گاہ میں ٹھکانا کریں گے، وہاں پہنچ کر میں اپنے دو ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا، وہ مل گئے تو سارے حالات اب تک کے ان کے سامنے رکھوں گا اور پھر آگے ہم سب اپنی اپنی حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہی کچھ حتمی فیصلہ کریں گے۔"

"اچھا.....!" رچنا کے منہ سے دھیرے سے برآمد ہوا۔ سفر جاری رہا۔

ممبئی شہر کی حدود شروع ہوگئی۔ بہ قول رچنا کہ جسونت رائے کی یہاں دو تین شاندار رہائش گاہیں تھیں۔ دو تو شہر کے وسط میں معروف ترین مقامات پر اور تیسری قدرے نواح میں تھی، میں نے نواحی رہائش گاہ کو عارضی ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

آخرالذکر رہائش گاہ کے بارے میں رچنا نے بتایا تھا کہ وہ..... ساحلِ سمندر کے قریب تھی۔ وہاں چند نوکروں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ جبکہ شہر والی رہائش گاہ میں اس کی بیوی بچے اور دوسری شہر والی جگہ میں وہ خود بھی کبھار جا کر رہ لیتا ہے، جب کوئی خاص دوست ہو۔ "خاص دوست" سے اس کی مراد میں سمجھ سکتا تھا۔

تاہم رچنا نے بتایا تھا کہ رائے کا فلم انڈسٹری سے بھی رابطہ رہتا ہے، دوسری والی رہائش گاہ میں وہ اہم میٹنگز بھی کرتا رہتا ہے، جن میں کاروباری لوگوں کے علاوہ فلمی ستارے بھی ہوتے ہیں۔

ممبئی شہر کے وسطی حصے سے گزر کر ہم جنوب مغربی سمت کی شاہراہ پر آگئے۔ ممبئی کی سڑکیں، گلیاں اور بازار دیکھ کر مجھے یہی لگا جیسے میں کراچی یا لاہور میں گھوم رہا ہوں، کچھ فرق نظر نہیں آتا تھا دونوں میں..... کہیں ٹوٹے بوسیدہ مکانات اور گھروں کی کالونیاں تھیں، تو کہیں کوٹھی بنگلے اور کمرشل دفاتر کی سربہ فلک بلڈنگیں۔

یہاں بھی غربت کے جلووں میں ہی امارت دکھائی دیتی تھی۔ شہر اور یہاں کے ریسٹورنٹ ہوٹلز دیکھ کر میرے اندر چائے اور سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی، نجانے کیوں آج کل سگریٹ کی طلب بڑھتی جا رہی تھی، ڈاکٹر تھا میں، اس کے نقصانات سے بھی واقف تھا مگر ہوتا یہی ہے کہ جسے زیادہ نقصانات کا علم ہو وہ اور زیادہ سگریٹ نوشی کرتا ہے، کم از کم ہمارا تو یہی ٹرینڈ ہے۔ تاہم اپنی جگہ یہ امر مسلمہ ہے کہ نقصان دینے والی شے نقصان ہی دیتی ہے۔

رچنا کو ایسی کوئی طلب نہیں ستا رہی تھی شاید، وہ مسلسل ایک سے ڈیڑھ گھنٹا ڈرائیونگ کرتی رہی، البتہ پانی کی بوتلیں آگس باکس میں رکھی تھیں، میں اور وہ پیتے رہے۔

یہ الگ بات تھی کہ رچنا جیسی حسین ساتھی کی ہمراہی نے مجھے بور نہیں ہونے دیا تھا، کبھی باہر کے یکسانیت زدہ مناظر سے بور ہونے لگتا تو آنکھیں سینکنے اور دل لبھانے کے لیے اس کی جانب دیکھ لیتا یا اس سے کوئی بات کر کے، اس کی مترنم آواز اور لہجے کی شیرینی ہی خیالات کی چائے میں گھول کر پی لیتا۔

پتا نہیں کیوں مزاج میں آج کل بذلہ سنجی اور رومانس کچھ زیادہ ہی در آنے لگا تھا، وجہ اس کی نفسیاتی بھی ہوتی ہے، نامساعد حالات، دشمنوں کے ساتھ کشاکشی، یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ڈپریشن کے مریض کو بھوک زیادہ ستاتی ہے اور وہ بے تحاشا پُرخوری کرنے لگتا ہے۔ الا..... بلا.....

گاڑی اب ساحلی علاقے کی جانب گھوم گئی تھی۔ کار کے شیشے بند تھے اسی لیے گرم اور مرطوب فضا کا تو پتا نہیں چلتا تھا، لیکن..... ساحل کا اندازہ میں نے اپنے بائیں جانب قدرے دور نظر آنے والی سمندری پٹی کو دیکھ کر لگایا تھا۔

میرے استفسار پر رچنا نے بتایا کہ اب ہم 'پالی ہلز' شاہراہ سے گزر رہے تھے اور پھر وہاں سے ہم..... 'باندرہ ویسٹ' کے علاقے میں داخل ہو جاتے، اس کے بعد ہماری منزل قریب تھی، جو ان دونوں مذکورہ علاقوں کے مشترکہ نام سے موسوم تھی، یعنی 'پالی باندرہ بٹس' بلکہ یہی نہیں یہاں 'باندرہ ورلی سی لنک' نامی ایک برج کے ذریعے ہمیں اس مقام تک پہنچنا تھا، رچنا کے بقول وہ رہائش گاہ سمندر کے پانیوں میں بنی ہوئی تھی، ایک جزیرے کی شکل میں..... جس کے ساحل پر کھڑے ہو کر ہمیں ممبئی شہر اور اس کی آبادی کے آثار بھی صاف نظر آتے تھے۔

سی لنک سے وہاں تک پہنچنے میں ہمیں مزید بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ ایسی خوب صورت آب و ہوا والی جگہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ دن میں ہی یہ علاقہ اس قدر بھلا معلوم ہوتا

تھا تو رات میں تو اس کی دلکشی دیکھنے والی ہوتی ہوگی۔

ہم ایک شاندار سے ہٹ نما بنگلے کے سامنے رکے تھے۔ کار سے نیچے اُترے تو مرطوب ہواؤں نے استقبال کرنا شروع کر دیا۔ کار آرام دہ تھی، اس کے باوجود بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ سا گیا تھا۔

میں نے چاروں طرف سمندری اور پُرسکون ماحول پا کر ہلکی پھلکی ورزش شروع کر دی۔ رچنا مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔

اس قدر حسین ماحول میں رچنا جیسی حسین ساتھی کا ساتھ کس کم بخت کو برا لگتا ہوگا، اس پر مستزاد یہ رومانوی سا ہٹ.....

اس دوران میں چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا۔ دیگر بنگلے ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے، پام کے درخت، سمندری جھاڑیاں، اُونچے نیچے ریت کے ٹیلے بھی جا بجا پھیلے دکھائی دیے۔ بنگلا قدرے اُونچے ٹیلے پر بنا، چہار اطراف سے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ ایک ہی منزلہ تھا۔

گیٹ پر دو چست وردی پوش گارڈز فوراً ہماری جانب لپکے، انہیں ہماری اطلاع مل چکی تھی۔ یوں وہ رچنا سے بھی واقف تھے، کیونکہ وہ دونوں اس سے نہایت مؤدبانہ انداز میں ''میڈم جی'' کہہ کر ہی مخاطب ہوئے تھے، مجھ سے انہوں نے سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہم اندر آ گئے۔ اندر کا ماحول بھی شاہانہ تھا۔ ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہاں ہم بیٹھ کر ذرا تھکن اُتارنے لگے تو ہمارے لیے انہی مذکورہ دونوں افراد نے ایک بڑی سی ٹیبل قسم کی ٹرالی میں کھانے پینے کی چیزیں سرو کر دیں۔ نیچے والی سطح میں بیش قیمت برانڈ کی کینڈین وہسکی ریڈ لیبل اور بلیک لیبل بھی تھی، ساتھ ہی آئس باکس رکھا تھا۔

رچنا وہسکی سے شغل کرنے لگی تو میں کھانے پینے کی اشیا پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

''تم وہسکی نہیں پیتے؟'' رچنا نے ایک بلوریں پیگ بناتے ہوئے کہا، وہ میرے لیے بھی بنانے لگی تھی۔

''نہیں، میں ڈرنک نہیں کرتا۔ سگریٹ ضرور پیتا ہوں۔''

''او کے، باٹلز کے ساتھ سگار باکس رکھا ہوا ہے۔''

رچنا بولی اور میرا گلاس خالی چھوڑ کر اپنے میں آئس باکس سے کیوب ڈالنے لگی، اور ایک لیموں بھی نچوڑا۔

اچھی طرح کھا پی کر میں نے چائے پی اور آخر میں سگار باکس سے ایک براؤن رنگ کا سگار نکال کر اس کا کونا توڑا اور لائیٹر سے سُلگا لیا، جو سگار باکس کے اندر ہی کونے میں سجا تھا۔

میں نے سگار کا ایک گہرا کش لیا تو مجھے دماغ سمیت پورا وجود ہی گھومتا محسوس ہوا۔

ذرا دیر بعد یہ کیفیت بہتر ہونے لگی اور رچنا کی سنگت مزید کشش انگیز محسوس ہونے لگی۔

''ان میں سے لمبے قد والے کا نام امجد ہے اور دوسرا جو درمیانی قامت کا ہے یہ..... نارائن ہے۔'' رچنا نے وائن کی چسکی لیتے ہوئے مجھے ان دونوں مذکورہ افراد کے بارے میں بتایا۔

''انہیں صرف ملازم سمجھنے کی غلطی مت کرنا، ایک نمبر کے لڑاکا اور ہر قسم کے اسلحہ چلانے کے ماہر ہیں۔ میں انہیں آزما چکی ہوں، باس کے ایک دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے ہم تینوں..... نے اکٹھے مار کٹائی کا بازار گرم کیا تھا اس کے بڑے سے دفتر میں۔ اس نے باس کے ٹینڈر ہضم کر لیے تھے، بغیر ڈکار کے..... اسے سبق سکھانے کا حکم ملا تھا باس کی طرف سے ہمیں۔''

وہ اپنی پنک میں بولے جا رہی تھی اور میں سگار کے کش لینے کے دوران سوچ رہا تھا کہ کب مجھے تنہائی ملے اور میں طارق اور رومی سے بات کروں۔

''تم کہیں کھوئے ہوئے ہو؟'' رچنا نے اچانک پوچھا۔

''نن..... نہیں، بس یہی سوچ رہا تھا کہ اپنے دونوں ساتھیوں سے جلد رابطہ کرنے کی کوشش کروں اور رائے صاحب اور اپنے دشمنوں پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑوں۔''

میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ اس نے اب ٹرالی میں بچی کچھ کھانے کی چیزوں پر ہولے ہولے سہی، ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔

گھنٹے بھر بعد امجد اور نارائن نے ہمیں اپنے اپنے کمرے دکھا دیے اور میں فریش ہونے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔

اگلے پندرہ، بیس منٹ بعد میں فریش ہو کے بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سیل پر نیٹ آن کیا اور ای میل سمیت اپنی اسکائپ آئی ڈی بھی اوپن کر دی۔

طارق اور رومی کے میسجز موجود تھے۔ حمیرا کا صرف اسکائپ پر چیٹ میسج آیا ہوا تھا۔ حمیرا کا میسج دیکھتے ہی میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

''کل میں پاکستان کے اُوپر سے گزری تھی، دل میں

ایک ہوک بھی اٹھی، بے اختیار نگاہیں کھڑکی سے نیچے کسی کی تلاش میں اُتریں، مگر دھند ایسی چھائی رہی کہ کچھ دکھائی نہ دیا، ہاں! دل ایسی دُھند سے صاف تھا، تصور ایسی رکاوٹوں سے مبرّا تھا، تمہارا خیال ہی خیالوں میں پیکر بنتا رہا۔"

یہ چیٹ میسج میں نے بظاہر آنکھوں مگر دل کی گہرائی سے پڑھا۔ جدائیاں اور دوریاں کیسے اچھے بھلے پریکٹیکل انسان کو حسنِ جمالیات کی دولت بخش دیتی ہیں۔ اُداسیاں، حسرتیں، کس طرح لفظوں کو آپوں آپ ہی شعر و سخن کے روپ میں ڈھالتی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے حمیرا کے اس درد بھرے پیغام سے ہوا تھا۔ آگے آخری دو سطریں تھیں۔

"میں بھارت پہنچ چکی ہوں۔ بتایا تھا نا، ایک سیمینار ہے۔ ممبئی کے مورت ہوٹل میں پانچ دن کا قیام ہے۔

خدا حافظ۔

حمیرا۔"

میرے دل فگار میں ایک دم تڑپ جاگی۔ میں بھی تو ممبئی میں تھا۔ اُڑ کر پہنچ جاؤں؟ خود سے سوال کیا۔ اس کا جواب خود ہی اپنے پاس محفوظ رکھ کے میں نے ای میل دیکھی۔ وہاں صرف طارق کی میل تھی۔ وہ بھی ایک، لکھا تھا۔

"تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ آسکتے ہو بھارت تو آجاؤ..... رومی کھو چکی ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے جیسے وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اسے غائب ہوئے آج چوتھا دن ہے۔ میں نے اسے بہت تلاشنے کی کوشش کی مگر بے سود، وہی دشمن جنہیں ہماری یہاں آمد پر شبہ ہو چکا تھا۔ ان کے دو ساتھیوں نے ویٹرز کے روپ میں ہم پر ہلّا بولا تھا۔ جو ہم دونوں نے ناکام تو بنا دیا تھا مگر ان میں سے کوئی ہمارے ہتھے نہیں چڑھ سکا۔ اس کے اگلے دن ہی رومی پُراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ غلطی میری ہی تھی، مجھے اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہیے تھا، پیچھے سے دشمن نے کام دکھا دیا۔ بہر حال..... تم بھارت آنے کی کوشش کر سکو تو بہتر ہے ورنہ..... رومی کے لیے دعا کرنا اور میرے لیے بھی.....

خدا حافظ۔

طارق مجید"

میرا دل کانپنے لگا۔ رومی سے میری لاکھ چپقلش سہی مگر وہ سب دوستانہ انداز کی تھی، اس میں بغض یا عداوت کا قطعاً دخل نہ تھا۔ مجھے رومی کی تشویش لاحق ہو گئی۔ حالات خراب ہو گئے تھے۔ یہ تو شکر تھا کہ میں پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ طارق نے یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔

اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا، میں نے فوراً نہ صرف طارق کو فوراً جواب لکھا بلکہ اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا۔ میں نے اسے یہی لکھا تھا کہ میں بھارت میں ہی ہوں اور باقی کی تفصیل تم سے رُوبرو مل کر ہی بتاؤں گا۔ وغیرہ۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سیل فون رکھا اور دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔

"یس کم اِن....."

دروازہ کھلا اور رچنا اندر آگئی۔ اس نے حسبِ سابق چست اور سیکسی سا لباس پہن رکھا تھا۔ بال شانوں تک جھول رہے تھے۔ عجیب بات تھی، اس وقت مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی، اگرچہ اس نے اس کا پورا "اہتمام" کر رکھا تھا لیکن اس وقت میرے دل و دماغ پر حمیرا سمیت کچھ اور مسائل سوار تھے۔ میں سنجیدہ تھا۔

رچنا مٹکتی چال کے ساتھ مسکراتی ہوئی میرے قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے، کافی سیریس دکھائی دے رہے ہو؟" اس نے اپنی کشادہ اور دلکش آنکھوں سے بہ غور جیسے میرا چہرہ پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے ساتھی مشکل میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"اوہ..... کیسی مشکل؟"

میں نے اسے رومی کے متعلق بتایا اور طارق کی میل کے بارے میں بھی.....

"اسے بتانا تو چاہیے تھا کہ وہ کس ہوٹل میں مقیم ہے؟" رچنا نے کہا۔

"ابھی اس نے یہ ضروری نہیں سمجھا ہو، ظاہر ہے اسے بھلا کیا پتا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ بھارت میں ہوں۔"

"تم نے جواب تو لکھ دیا ہے، میرا خیال ہے وہ اب یہ جان لینے کے بعد براہِ راست تم سے فون پر بات کرے گا۔" رچنا بولی۔

"یقیناً، میں اسی کی کال کا منتظر ہوں....." میں نے کہا۔

یوں کمرے میں ذرا دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی پھر رچنا بولی۔

"چائے کا موڈ تو ہوگا، نشست گاہ میں چل کر پیو گے یا اِدھر ہی منگوالوں؟"

"اِدھر ہی منگوالو۔" میں نے کہا۔

رچنا اُٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لوٹ آئی۔ چند منٹوں بعد ہم چائے پی رہے تھے۔

اس وقت میرا دل و دماغ اَن گنت سوچوں میں گھرا

ہوا تھا۔ طارق، رومی اور حمیرا..... کی سوچوں نے میرا دماغ شل کر ڈالا تھا۔ کبھی دل کرتا کہ طارق کی کال آتی رہے گی، کیوں نا ابھی مورت ہوٹل کا رخ کروں اور حمیرا کا دیدار کر لوں..... ایک عرصہ ہی تو بیت چلا تھا اسے دیکھے ہوئے۔ اب ذرا دیکھوں تو اسے..... وہ کتنی بدل گئی ہو گی جسمانی طور پر..... مجھ سے دور رہتے ہوئے..... اس کی باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے ابھی تک بھلا نہ پائی تھی بلکہ میری طرح یادوں میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ تڑپ مزید سوا ہو گئی ہو گی۔ کیسا محسوس کرے گی وہ جب میں اچانک اس کے سامنے جا کر اسے حیران کر دوں گا؟ اسے تو شاید اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آئے۔

لیکن..... کیا مجھے اُس سے ملنا چاہیے؟ اس سے رابطہ کرنا چاہیے، جبکہ بقول طارق کے..... وہ رومی کی وجہ سے ایک اضافی پریشانی اور تشویش میں مبتلا تھا، اسے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ طارق جیسے پروفیشنل آدمی کا میری ضرورت محسوس کرنا کوئی معنی رکھتا تھا، صاف مطلب تھا کہ دشمن اس کے خلاف روز بروز گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

میں نے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے طارق سے رابطہ ہونا چاہیے، تاکہ ایک تو اس کے مورال میں اضافہ ہو دوسرے یہ کہ ہم دشمنوں کا قلع قمع کرنے سمیت رومی کو بھی مل کر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ رہی حمیرا، تو بقول اس کے وہ ابھی پانچ روز تک بھارت میں ہی تھی۔

میں نے رچنا کو البتہ حمیرا کے بارے میں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور خود ہی نیٹ پر مورت ہوٹل کے بارے میں چیک کیا۔ ہوٹل شہر کے قلب میں معروف ترین شاہراہ پر واقع تھا۔ یہاں سے تیس کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

میں نے میپ پر اس کا پتا ذہن نشین کیا، ایسے میں دلِ بے اختیار نے چاہا بھی کہ اسی وقت ہوٹل کی انتظامیہ کو فون کر کے حمیرا کے بارے میں دریافت کروں، اس سے دو گھڑی بات ہی کر لوں، اس کے مترنم لہجے کی آواز اور مٹھاس اپنے اندر بھر لوں مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔

''تم کچھ زیادہ ہی نہیں سوچنے لگ گئے ہو یہاں آ کر.....؟''

مجھے مسلسل خاموش اور سوچ میں غلطاں پا کر رچنا نے مجھے چھیڑا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ظاہر ہے، ہم مشن کی ابتدا کرنے والے ہیں، اب اس کے لیے کوئی مربوط اور منظم حکمتِ عملی تو تیار کرنا ہی ہوگی۔''

''وہ تو تقریباً تیار ہو چکی۔'' رچنا بولی۔

''وہ کیسے؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''طارق سے تمہارا رابطہ، بس سمجھو ہونے ہی والا ہے۔ ہم اسی کی طرف چلے چلیں گے یا پھر اسے یہاں بلوا لیں گے۔''

''اسے ہم یہاں نہیں بلوا سکتے، دشمن اس کی گھات میں ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم چلے جائیں گے اُس سے ملنے..... اس کے بعد ہی ہم طارق سے تمام حالات سن کر کوئی آئندہ کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔ اب ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر طارق کی کال کا انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو وہ ایک دلنشیں مسکراہٹ سے بولی۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، وہ جلد ہی رابطہ کر لے گا تم سے..... ای میل تو پڑھتا ہی رہتا ہوگا وہ..... تم اسے اپنے سیل نمبر کے علاوہ یہاں کا لینڈ لائن نمبر بھی دے دیتے۔''

''ہم.....'' میں نے اسی پر اکتفا کیا۔ میری طبیعت بے چین تھی۔ ایک ''ڈیڈ لاک'' سا لگا محسوس ہوتا تھا۔ میں جلد از جلد طارق سے رابطے میں آنا چاہتا تھا تاکہ مشن کو فیصلہ کن موڑ تک پہنچانے کے لیے آگے بڑھ سکیں۔ شرط یہی تھی کہ وہ اب میرا ای میل جلدی دیکھ لے..... ورنہ ای میل کون اتنی جلدی دیکھتا ہے۔ اس کے لیے کم از کم چوبیس گھنٹے بھی انتظار کیا جا سکتا ہے اور کئی دن بھی۔ ممکن تھا کہ آج کل کے حالات کے مطابق..... طارق بھی میری طرح جلدی جلدی ای میل دیکھ لیتا ہو۔

کیا کیا جائے؟ میں کئی... اُلجھی ہوئی سوچوں میں گھرا رہا۔ مجھے بالکل کھویا ہوا پا کر رچنا بھی خاموشی سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ تاہم اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اِدھر ہی ہے اور میں اسے کسی بھی وقت بلا سکتا ہوں۔

اچھا ہی ہوا وہ چلی گئی۔ اس کی موجودگی کو اس وقت تو میں کم از کم ''مس فٹ'' ہی محسوس کر رہا تھا۔ بالخصوص اس وقت میں تنہائی چاہتا تھا۔ میرا دل بے چین تھا۔ میرا دھیان بار بار اپنے سیل فون کی طرف جاتا تھا کہ کیا خبر طارق نے میری ای میل جلدی پڑھ لی ہو۔

میں نے وقت دیکھا۔ شام ہو چلی تھی۔ مجھے اسی طرح بیٹھے بیٹھے رات ہو گئی۔ آٹھ بج گئے۔ طارق کی کال نہیں آئی۔

ای میل باکس بھی چیک کر ڈالا۔ کوئی جواب نہیں۔ کوئی نیا پیغام نہیں۔

مجھے کوفت ہونے لگی اور چڑچڑا بھی ہونے لگا۔ دل و دماغ کی بے چینی زیادہ بڑھنے لگی تو کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اسی وقت سیل فون کی بیل گنگنائی اور میرا دل مسرت سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ لیکن جب اسکرین پر نظر پڑی تو اوس پڑ گئی۔ جسونت رائے کی کال تھی۔

''جی جناب!'' میں نے سیل کان سے لگاتے ہی ازراہِ احترام کہا۔

''کیا بات ہے؟ رچنا بتا رہی تھی کہ تم..... شہر جا کے ٹھپ ہو گئے ہو۔'' دوسری جانب سے جسونت رائے کی آواز اُبھری۔ مجھے اس کی بات ناگوار گزری مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں رائے صاحب؟''

''رچنا بتا رہی ہے کہ تم جام ہو گئے ہو اور تم سے کوئی آگے کی حکمتِ عملی طے نہیں پا رہی ہے۔''

''یہ اس نے کیسے کہہ دیا؟'' میں کچھ تلخی اور حیرانی سے بولا۔ ''کیا اس نے آپ کو نہیں بتایا کہ میں اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھا ہوں؟''

''بتایا تھا.....'' کہتے ہوئے اس نے طارق کے ای میل والی بات دہرا دی۔ ''لیکن ڈاکٹر سیف! اس طرح کے ای میل والے رابطوں میں بہت تاخیر بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ نریش کی بتائی ہوئی معلومات کے مطابق..... فوراً ان دونوں مذکورہ اسپتالوں اور ان کے خفیہ ٹھکانوں میں جا کے..... شنکر چانکیہ کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ بس، ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ وہ مردود ہے کس ٹھکانے پر، میرے آدمی..... پر لگا کر وہاں تک پہنچ جائیں گے۔''

''یقیناً۔'' میں نے جیسے تلخ گھونٹ سا حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔ ''میں آج کی رات اپنے ساتھی کی کال کا انتظار.....''

''کال تو تمہیں وصول ہو ہی جائے گی سیف!'' دوسری جانب سے جسونت رائے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی مسئلہ نہیں اور اگر کال نہیں آئی تو تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے۔ میرا خیال ہے رچنا کے ساتھ تم اسی وقت نکل جاؤ۔''

''آپ کی بات قابلِ غور ہے، مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ میں اسی سوچ میں اُلجھا ہوا تھا، آپ نے مجھے ہلکا کر دیا۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''گڈ! میں رچنا سے بات کر لیتا ہوں اور تم دونوں نکلنے کی تیاری کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ تمہیں امجد اور نارائن فوراً مہیا کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب! شکریہ۔'' میں نے کہا اور دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں نے سیل فون بند کر کے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ گویا رچنا اب تک کے بیتے حالات کی منٹ منٹ کی خبریں جسونت رائے تک پہنچا رہی تھی۔ مجھے اس کی حرکت پر غصہ تو آیا مگر پھر ذرا وسیع النظری سے غور کیا تو مجھے رچنا کا اس میں کوئی قصور محسوس نہیں ہوا۔

ضرور اُسے یہ ہدایت جسونت رائے سے ہی ملی ہوں گی، یوں رچنا نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔

رچنا دوبارہ آن دھمکی۔ میں تب تک اس کے حوالے سے اپنی نفی کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا پروگرام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بس، نکلیں گے ابھی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''گڈ..... ! آئی ایم ریڈی.....''

''کچھ سنبھالنا ہے؟ میرا مطلب ہے، اسلحہ وغیرہ؟ ممکن ہو سکے تو مجھے بھی اپنی حفاظت کے لیے کوئی چھوٹا موٹا پستول دلوا دو۔ زیادہ بھاری نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ جواباً وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

مجھے طارق پر غصہ آنے لگا، جب حالات اس نہج پر تھے تو اسے فوراً ای میل چیک کر لینا چاہیے تھا لیکن اب انتظار جیسی کوفت سے گزرے بنا چارہ بھی نہیں تھا۔

اچھا ہی ہوا کہ میں اور رچنا پالی ہلز سے نکل آئے تھے۔ جیسا کہ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ رات میں پالی ہلز کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں گے، ایسا ہی تھا۔ دور نزدیک دو اطراف سے ساحل تک ٹمٹماتی روشنیوں کی کہکشاں سجی ہوئی تھی۔ بحری جہاز اور بوٹس پانی کی بیکراں سطح پر تیرتی دلکش آبی پرندوں کا سا منظر پیش کرتی تھیں۔

تیسری جانب شاہراہیں تھیں اور ان کے جلووں میں الیکٹرک پولز کے بلب روشن تھے۔ چوتھی سمت سناٹا اور ویرانی کا راج تھا۔

ہم شاہراہوں کی جانب محوِ سفر تھے۔ جلد ہی شہر جانے والی شاہراہ پر آ گئے۔ کار اب بھی رچنا ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے میری خواہش کے مطابق مجھے ایک ہلکی سطح کا مگر کارآمد پستول دے دیا تھا۔ اپنے پاس بھی یقیناً اس نے رکھا

ہوگا، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہتھیار اس نے رکھے ہوں گے۔ سرِ دست تو مجھے اس کے پاس ایک ہی ہتھیار پاور فل نظر آرہا تھا جو شاید یہ آخری آپشن کے طور پر ایٹم بم کی طرح استعمال کرتی ہوگی، وہ تھا اس کا حسن و شباب.....

میرے یہ کہنے کی ایک وجہ تھی۔ راستے میں جن لوگوں کی بھی اس پر نظر پڑتی تھی، وہ دوبارہ اسے دیکھنے کے لیے گردن موڑتا یا اُونچی ضرور کر لیتا تھا۔ ایسا ہی ایک شاخسانہ پیٹرول پمپ پر ہوا۔

یہ پیٹرول پمپ شہر میں داخل ہونے والی شاہراہ کے بالکل شروع میں تھا، وہاں سُپر اسٹور بھی تھا۔

فیول ڈلوانے کے بعد رچنا کو کچھ ضروری چیزوں کی ضرورت پڑ گئی اور اس نے کار اسی سُپر اسٹور کے قریب روک دی۔ مجھے بھی اس نے اُترنے کو کہا تھا جبکہ مجھ پر جانے کیوں آلکسی سوار تھی۔ طوعاً و کراہاً ہی میں بھی کار سے اُترا۔

ہم شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ جوان مرد ہی نہیں، عمر رسیدہ بھی اپنی عاقبت خراب کرنے میں لگ گئے۔ وہ رچنا کو بار بار گھورے جاتے تھے۔

رچنا کے لیے جیسے یہ معمول کی بات تھی، وہ بے پروا انداز میں اسٹور کے مختلف گوشوں میں پھرتی رہی اور مجھے بھی ساتھ لیے رکھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر جسونت رائے کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی کہ ایک حسین و جمیل لڑکی میرے ساتھ کر دی تھی۔

دفعتاً جس وقت وہ بیوریج والے پورشن میں کھڑی کچھ بیئرز کے کین وغیرہ خرید رہی تھی تو میں ایک شخص کو دیکھ کر چونکا۔ وہ میرا آشنا تو نہیں تھا، البتہ وہ..... رچنا کو ضرور گھورے جا رہا تھا۔ اب تک یہ "منظر" میرے لیے عام ہی ہو چکا تھا لیکن جانے کیوں مجھے اس آدمی سے متعلق عجیب قسم کی کھٹک لگ گئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز عام سا نہ تھا۔

میں یک دم محتاط ہو گیا اور رچنا سے تھوڑا فاصلہ کم کرنے لگا کہ اگر اس نے رچنا پر ہلا بولا بھی تو میں اس کی مدد کے لیے کچھ کر سکتا یا کم از کم بھاگ ہی سکتا۔

وہ آدمی بھی شیلف پر دیکھتا دیکھتا اسی کی جانب کھسکتا ہوا آنے لگا اور میں نے موقع تاک کر شیلف پر ہی اپنی نظریں گاڑھے رکھتے ہوئے..... رچنا کے کان کے قریب سرگوشی کر ڈالی۔

"ایک آدمی تمہیں گھور رہا ہے، ہوشیار، یہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔"

اپنا فرض ادا کر کے میں تھوڑا دور ہو گیا۔ رچنا نے میری بات جیسے سنی اَن سنی کر ڈالی تھی۔ یوں جیسے اس نے میری بات کو درخورِ اعتنا ہی نہ جانا ہو۔ مجھے اس پر غصہ تو آیا مگر پی گیا۔

وہ آدمی اب..... رچنا کے بالکل قریب آ گیا تھا اور اسی دوران اس نے مجھ پر بھی نظر ڈالی تھی۔

وہ مجھے اچھے قماش کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لمبا چوڑا قد تھا اور جسم بھی کسرتی تھا، عمر اس کی خاصی لگتی تھی، سر گنجا تھا۔ رنگت خالص انڈین جیسی سانولی تھی۔ اس نے ٹی شرٹ اور نیچے ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ وہ انڈین فلموں کا کوئی ولن ہی محسوس ہوتا تھا مجھے.....

"ہائی ہن.....! تم کہاں اچانک کھسک گئے تھے۔"

اچانک ہی جب وہ شخص رچنا کے قریب آنے کی کوشش میں تھا کہ ایک مترنم سی نسوانی آواز اس کے عقب سے اُبھری۔ میں نے ایک سانولی مگر پرکشش نوعمر حسینہ کو اس کی جانب بے چینی سے بڑھتے دیکھا۔

اس آدمی نے نہایت ہی کسیلی نظروں سے "ہنی" کا شارٹ کٹ "ہن" بولنے والی کی طرف دیکھا اور ساتھ ہی اسے گھور کے کچھ کہا تو میں نے کن انکھیوں سے لڑکی کی کیفیت کو یک دم ایک اُلجھن آمیز پریشانی میں بدلتے محسوس کیا اور یوں اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی بھی کوشش چاہی تھی، پھر وہ وہاں سے کھسک گئی۔ چند لوگ اس طرف متوجہ ہوئے تھے، پھر اپنی خریداری میں مشغول ہو گئے۔

اب میں اس آدمی کو "ہن" ہی کہوں گا۔ وہ ہن ایک بار پھر رچنا کی جانب لپکا اور تب ہی میں نے دیکھا، وہ رچنا کے ساتھ بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

رچنا بھی وہیں جام ہو گئی۔ ہن نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھنے کی کوشش کی، شاید وہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں جو کرنے والا تھا، وہ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا۔

میں یک دم سائڈ میں ہو گیا جہاں کچھ خشک خوراک کے ڈبوں کا چمکتے فرش پر مینار سا بنا ہوا تھا، میں اسی کی آڑ میں چلا گیا مگر اس کے ایک درمیانی روزن سے اس طرف تکے جاتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے غور کیا تو ہن کا ایک ہاتھ باہر تھا، جو خالی تھا۔ جبکہ دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا، وہ کچھ پھولی ہوئی لگی، اس نے رچنا سے سرگوشی میں کچھ کہا تھا اور رچنا نے بے اختیار اپنی گردن موڑ کر تھوڑا سر جھکا کے اس

کی جیب میں گھسے ہوئے ہاتھ کی جانب بھی دیکھنے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ یوں ہن کے ساتھ چل پڑی جیسے مسمرائز کردی گئی ہو۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''تعاقب۔'' مجھے ایک جواب ملا، لیکن دوسرا جواب مجھے کان کے قریب ہی نسوانی لہجے میں موصول ہوا۔

''خبردار! میرے پرس میں خطرناک پستول ہے۔ چلتے رہو خاموشی سے اپنی ساتھی کے پیچھے.....'' میں نے چونک کر دیکھا، وہی ''ہن'' کہنے والی حسینہ..... میرے قریب عقب میں کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک پرس یوں تھما ہوا تھا جیسے وہ اس میں سے کچھ نکالنا چاہ رہی ہو۔

''بہتر ہوتا اس خطرناک پستول کا دیدار بھی مجھے کروا دیتیں۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''شٹ اَپ! مسخرے کہیں کے..... چلتے رہو۔'' وہ جنگلی بلّی کی طرح غرائی۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا اور اس کے حکم کی فوراً تعمیل کر ڈالی مگر اس طرح کہ میں نے اپنا ایک پاؤں دانستہ ڈبوں کے مینار کے سب سے نچلے ڈبے سے ٹکرا دیا۔ نتیجے میں..... کھلونا سے پہاڑ کے ڈھیر کی بنیاد ہلی اور وہ سب ڈبے نیچے آرہے..... حسینہ کا پاؤں کسی ڈبے پر پڑا اور میرا بھی، ہم دونوں ہی پھسل کر گرے، لڑکی مضطربانہ انداز میں چلّائی اور میں اس کے اُوپر آن پڑا۔ پستول والا پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے موقع تاک کر اسے تھپڑ جڑ دیا جو اس نے بڑے آرام سے گال پر سہا اور چاہتی تھی کہ میں ایک اور رسید کردوں، میں اس کے اُوپر سے ہٹ کر اُٹھا مگر اس نے بھی کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں بھاگنے ہی لگا تھا کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی، میں اوندھے چکنے فرش پر گرا، میری پیشانی ٹکرائی اور درد کے مارے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اس چوٹ پر میرا دماغ بُری طرح بھنّا گیا اور میں نے لیٹے لیٹے دوسری ٹانگ اس کے منہ پر ماردی۔ وہ بھی بلبلا کر چیخی۔ میں سنبھالا لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ صرف ایک نظر اس سانولی حسینہ پر ڈالی، جو میری طرح چوٹ سہتے ہوئے تیزی سے کراالنگ کرتی ہوئی اپنے زمین بوس پرس کی جانب لپک رہی تھی۔

میں نے دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ اسٹور میں ہڑبونگ اس وقت زیادہ شدت اختیار کرگئی جب اس سانولی حسینہ نے اپنے پرس سے پستول نکال کر مجھ پر گولی چلادی۔ ایک دھماکا ہوا۔ چیخیں اُبھریں، لیکن میں تب تک شیشے والے دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ عقب میں دوسرا فائر ہوا، اس بار شیشے ٹوٹ کر بکھرنے کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔

میں باہر آچکا تھا اور میری نظریں اس گنجے گرانڈیل پر پڑیں جو رچنا کو بظاہر نامعلوم طریقے سے یرغمال بنائے اپنے ساتھ ایک قریب کھڑی سفید کار کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس ہڑبونگ پر وہ چونک کر رکا، رچنا کو موقع ملا اور اس نے نہایت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی بڑے زور سے اس کے پہلو میں رسید کی اور یہی نہیں خود کو بچاتے ہوئے وہ پھرکی کی طرح گھومی اور اس کی بائیں ٹانگ کی سینڈل کی ایڑی گنجے گرانڈیل کے پیٹ کے نچلے نازک مقام پر بھی پڑی۔

دوسرے وار پر گنجے گرانڈیل کی حالت پتلی ہوگئی اور وہ گھٹنوں کے بل جھول کر دہرا ہوگیا۔ میں تب تک بھاگتا ہوا اس کی جانب لپکا۔ وہ مجھے اپنی طرف اندھا دھند دوڑتا ہوا آتے دیکھ کر چلّائی۔

''اپنی کار کی جانب دوڑو.....''

میں وہیں سے ہی بنا رکے گھوما اور..... قوس بناتے ہوئے کار کی جانب بھاگا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم اپنی کار میں تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس نے سنبھال لی تھی۔ اگلے ہی لمحے کار ہوا سے باتیں کرنے لگی اور ہائی وے پر آگئی۔

''ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔'' رچنا نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ میں نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔ ایک سیاہ کار ہماری جانب آندھی طوفان کی طرح چلی آرہی تھی۔

''چنتا مت کرو، یہ ہمارا شکار ہیں۔'' رچنا دوبارہ بولی۔ اس کا حسین چہرہ اس وقت جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

''لل..... لیکن وہ گنجا گرانڈیل کون تھا، کہیں ایسا تو نہیں ہمارا اصل شکار وہی ہو؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''وہ بھی اسی کار میں موجود ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اور اسے پہچان کر ہی میں نے جان بوجھ کر اسٹور کا رخ کیا تھا۔ اس کا نام راٹھوری ہے۔ یہ شنکر چانکیہ کا خاص آدمی ہے۔''

رچنا کے اس انکشاف پر میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہوگئی۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے
نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

بعض سفر بہت عجیب ہوتے ہیں... وہاں پہنچ کے پتا چلتا ہے کہ حالات سازگار نہ ہوں تو انسان سوچتا ہے کہ وہ غلط جگہ پر غلط وقت پر پہنچ گیا ہے... خوشگوار زندگی بسر کرنے والے ایک شادی شدہ جوڑے کا قصۂ فسوں... وہ تفریح کے موڈ میں تھے... دنیا کی دلکشی اور خوبصورتی سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے... اپنے پسندیدہ ملک پہنچ کے ہوائوں نے اپنا رخ بدل لیا... نفرت و عداوت نے دلوں میں جگہ بنانی شروع کر دی...

مختلف معاوضے میں ایک ہی کام کو سرانجام دینے والے فتنہ پرور کا شاخسانہ......

معاوضہ

اعتزاز سلیم وصلی

pklibrary.com

”لنڈا بہت اچھی عورت تھی۔ اس کے ساتھ تعلق بنائے مجھے تقریباً ایک سال ہوگیا تھا اور مجھے اس سے بس ایک شکایت تھی۔ وہ نشے میں قابو سے باہر ہوجاتی تھی۔ ویسے مجھے ایسے لوگ بھی پسند نہیں آئے جو نشے میں توڑ پھوڑ کریں یا گالیاں دیں مگر لنڈا کی خوب صورتی اور اس کا مجھ سے سلوک اتنا اچھا تھا کہ اس ایک خامی کی وجہ سے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

”تم نشے میں چیخا مت کرو۔“ میں نے کئی بار اسے ٹوکا۔ وہ ہر بار وعدہ کرکے بار میں جاتی اور ہر بار مجھے اس کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ تنگ آکر میں نے اس کے ساتھ بار میں جانا چھوڑ دیا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں اپنے خرچے پر بار جاتا، اس لیے میری یہ تفریح ختم ہوگئی۔“

وہ گہری سانس لے کر چپ ہوگیا۔ کی بورڈ پر حرکت کرتی میری انگلیاں بھی رک گئیں۔ میں نے کی بورڈ سے ہاتھ

pklibrary.com

ہٹا کر کافی کا کپ تھاما۔ موسم آج کافی خوشگوار تھا۔ میرے دماغ میں الفاظ ناچ رہے تھے۔ میری انگلیاں انہیں ٹائپ کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میرا لیپ ٹاپ میری کہانی کا انتظار کر رہا تھا مگر میں اس وقت لیپ ٹاپ پر کہانی کے بجائے اس شخص کے بیان کیے گئے واقعات لکھ رہا تھا۔ اس شخص کا نام فریڈرک تھا۔ عمر یہی کوئی پینتالیس سال کے اوپر نیچے ہوگی۔ بال سنہرے رنگ کے تھے جن میں سفیدی اترتی محسوس ہوتی تھی۔ چہرے پر سنجیدگی تھی اور اس نے گود میں ایک چیز ایسی رکھی تھی جس کی وجہ سے میں اس کے بیان کیے گئے واقعات لکھنے پر مجبور تھا۔

"لنڈا تمہاری زندگی میں آنے والی تیسری عورت تھی؟" میں نے پوچھا۔ اس کی اس فضول داستان میں مجھے بالکل دلچسپی نہیں تھی نہ ہی مجھے مزید جاننے کا شوق تھا۔ میرے سوال کا مقصد بس یہی تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنی کہانی ختم کرے اور دفع ہو جائے۔

"دوسری....." اس نے عورتوں کی تعداد غلط بتانے پر غصے سے مجھے دیکھا۔ "مارینا کے بعد لنڈا آئی۔"

"مگر ابھی تم نے جیا کا ذکر کیا۔"

"وہ انڈین۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ کتابس چند دنوں کے لیے آئی تھی میری زندگی میں۔" اس نے زیرِلب کچھ مزید گالیاں جیا کے نام کیں۔ "اس کے بعد اس کا اور میرا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ تو میں بات کر رہا تھا لنڈا کی جس کے ساتھ میں نے بار میں جانا بند کر دیا۔ اس نے کئی بار ضد کی مگر میں دوستوں کے سامنے مزید شرمندگی نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

لنڈا کا سابقہ بوائے فرینڈ اسے چھوڑ گیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ لنڈا اور اس کی شادی سے پہلے اولاد ہو چکی تھی۔ لنڈا اپنی بیٹی کے لیے سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی مگر میں بے روزگار تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ جب میری نوکری لگ گئی تو میں اس سے شادی ضرور کروں گا۔ وہ اپنے خرچے پر مجھے ساتھ رکھنے پر تیار تھی مگر میں دوستوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا....." اس نے مسکرا کر ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ میں نے لیپ ٹاپ سے نظر گھما کر اسے دیکھا۔ مسکرانے کے بعد دوبارہ اس کے چہرے پر سنجیدگی لوٹ آئی۔

"تھک تو نہیں گئے تم؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے دونوں مشہور ناول پڑھے ہیں..... اس کے علاوہ تمہارے مضامین اور مزاح سے بھرپور بلاگ بھی پڑھے ہیں جو تم اکثر اپنی ویب سائٹ پر لگاتے ہو۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شکریہ تمہارا۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہاری کہانی بھی لکھوں گا۔"

"یاد رہے فریڈرک میرا فرضی نام ہے اور کہانی کے ہیرو کا یہی نام ہو۔" اس نے ہدایت دی۔ میں نے سر ہلا دیا۔

"تم اپنی کہانی ختم کرو۔"

"نہیں، تم تھک چکے ہو..... اب تم آرام کرو۔ میں کل دوبارہ آؤں گا۔" وہ کھڑا ہوا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ پلٹا۔ "اور ہاں، پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے یاد رکھنا کہ تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے، ایسی پھر نہیں ملے گی۔" اس نے پستول جیب میں رکھا۔ یہی پستول گود میں رکھ کر اس نے مجھے اپنی کہانی لکھنے پر مجبور کیا تھا۔

☆☆☆

میرا تیسرا ناول مارکیٹ میں آنے سے دو دن پہلے ایمیلیا، میری بیوی نے مجھ سے فرمائش کی۔ "ہم بہت دنوں سے کہیں سیر پر نہیں گئے۔"

"نہ تمہیں جاب سے فرصت ہے اور نہ میں وقت نکال سکتا ہوں۔" میں نے اس کی وجہ بیان کی۔ اس نے بیویوں والا مخصوص لاڈ دکھایا اور میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

"میں نے پورے سال میں ایک چھٹی بھی نہیں کی، اب میں پندرہ چھٹیاں کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنی انگلیاں میری انگلیوں سے جوڑیں۔ "تمہارا ناول بھی مارکیٹ میں آنے والا ہے یعنی پھر تم بھی کچھ دنوں کے لیے فارغ ہو جاؤ گے۔ ہم چلتے ہیں گھومنے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ "قبرص چلتے ہیں یا پھر اسکاٹ لینڈ یا پھر..... برازیل۔" اس نے اپنے پسندیدہ ممالک کے نام گنوائے۔

"فیصلہ کر لو..... چلتے ہیں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ ایمیلیا خوش ہو گئی۔

اگلے دن ہی اس نے آفس میں چھٹی کے لیے بات کی۔ وہ ایک مشہور کمپنی میں کام کرتی تھی۔ باس سے چھٹی کی منظوری لینے کے بعد اس نے کال پر مجھے اطلاع دی۔

"بیس دن کی چھٹی مانگی تھی..... پندرہ دن کی مل گئی ہے، تیاری پکڑو۔" میں نے اسے مبارک دے کر کال بند کی۔ پبلشر سے بات کرنے کے بعد میں نے اپنے وقت کا حساب لگایا۔ ایک ٹی وی چینل پر میرا انٹرویو تھا مگر میں نے میزبان سے کال

کر کے معذرت کی۔ میرا اپنا بھی کافی دنوں سے گھومنے پھرنے کا ارادہ تھا مگر وقت کی کمی کی وجہ سے ہر بار یہ پروگرام بس باتوں کی حد تک محدود رہ جاتا تھا۔ شام کو ایمیلیا گھر واپس آئی تو میں نے پوچھا۔

"تم نے بھی چھٹی لے لی۔ میں نے بھی وقت نکال لیا..... اب بتاؤ جانا کس ملک ہے؟"

"یہ فیصلہ کھانے کے بعد کریں گے۔" اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر کچن میں مصروف رہنے کے بعد اس نے مجھے مدد کے لیے بلایا۔ ہم نے مل کر کھانا تیار کیا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم دونوں ٹیرس پر آ گئے۔ اس نے کافی کا کپ مجھے تھمایا۔

"اب بتاؤ، تم کونسی جگہ جانا چاہتے ہو؟"

"اٹلی..... یا پھر فرانس۔" میں نے جواب دیا۔

"اپریل ختم ہو رہا ہے۔ موسم دونوں ممالک میں کیسا ہو گا؟ تفریح کے لیے مناسب رہے گا؟" اس نے پوچھا۔ میں نے کچھ سوچا اور پھر جواب دیا۔

"پھر قبرص چلتے ہیں۔"

"برازیل کیسا رہے گا؟ براسیلیا..... بہت پیارے مقامات ہیں وہاں پر۔"

"تم کب گئیں وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"شادی سے پہلے۔" اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر براسیلیا کے بارے میں بات کرنے کے بعد ہم نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔ براسیلیا، برازیل کا دارالحکومت ہے اور ان مہینوں میں یہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ میں اس سے پہلے کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ ایمیلیا نے بہت تعریف کی تو میں نے بھی ہاں کر دی۔

منگل کو ہم دونوں روانہ ہوئے۔ براسیلیا کا ائرپورٹ چند مصروف ترین ائرپورٹس میں سے ایک ہے۔ یہاں ہمیں کافی وقت لگا۔ ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی خدمات حاصل کیں جس کی انگلش بس گزارے لائق تھی۔ ایمیلیا کو پرتگالی زبان کے کچھ جملے یاد تھے۔ یوں پورے راستے ڈرائیور اور ایمیلیا نے انگلش اور پرتگالی غلط بولنے کا ریکارڈ بنایا۔ ہماری منزل مشہور تاریخی میوزیم کے پاس موجود ہوٹل تھا۔ براسیلیا کا موسم بہترین تھا۔ درجۂ حرارت بیس سے کچھ اوپر تھا۔ یہ شہر انسانی ہاتھوں سے بنایا گیا ایک شاہکار ہے۔

"اسے بلاوجہ ڈیزائن کا شہر نہیں کہا جاتا۔" ایمیلیا نے میری تعریف کے جواب میں کہا۔ "باقاعدہ منصوبے سے تعمیر کیا گیا ہے یہ شہر..... یہاں آزادی کی یادگار بھی موجود ہے۔ بہت خوب صورت مقام ہے وہ۔" اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ہم دونوں نے ہوٹل میں کمرا چیک کروایا۔ سفر کی تھکن تھی۔ میں اس نرم بیڈ پر ایسا گرا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ صبح ساڑھے دس بجے میری آنکھ کھلی تو ایمیلیا موجود نہیں تھی۔ میں کچھ دیر پڑا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ایمیلیا کی واپسی ہوئی۔

"تم یہاں سونے آئے ہو۔" مجھے ویسے ہی پڑا دیکھ کر وہ ہنسی۔ "اتنے خوب صورت شہر میں بھی رائٹر صاحب کی آنکھ جلدی نہیں کھلی۔"

"تھکن بہت تھی۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں گئی تھیں؟"

"میوزیم کے اردگرد کا علاقہ دیکھا ہے۔ میوزیم میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے کہا۔ ہم نے مل کر ناشتا کیا۔ ایمیلیا اور میری شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے شادی سے پہلے تقریباً تین ماہ ساتھ گزارے تھے اور ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھ کر شادی کی تھی۔ وہ بہت اچھی بیوی تھی مگر مزاج کی ذرا تیز تھی۔ اس لیے جیسے ہی میں نے کچھ دیر اور آرام کرنے کا کہا۔ اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔ "پھر میں اکیلی ہی گھوم لیتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے ارے..... چلتے ہیں..... ناراض نہ ہو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لباس تبدیل کر کے ہم باہر آ گئے۔ وہ سارا دن ہمارا گھومنے میں گزر گیا۔ براسیلیا نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہاں ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد ایسے مقامات تھے جہاں سیاحوں کے لیے کشش تھی۔ یہاں دنیا بھر سے لوگ آتے تھے۔ ہم آزادی کی یادگار کے پاس موجود تھے جب ایک شخص تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔

"پیڈرو تم.....!" ایمیلیا اس سے لپٹ گئی۔ وہ پینتیس سال کا ایک خوش شکل شخص تھا۔ میں نے رنگت سے پہچان لیا کہ وہ مقامی ہے۔

"ایمیلیا..... اتنے دنوں بعد دیکھا تمہیں..... کتنی بدل گئی ہو تم، بہت مشکل سے پہچان سکا۔" انگلش بولتے ہوئے اس کا لہجہ صاف تھا۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے آتے ہیں جن کو دیکھتے ہی ہمارے اندر منفی جذبات ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پیڈرو بھی پہلی نظر میں مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ایمیلیا کی طرف دیکھا۔

"کارٹر..... جب میں پچھلی بار برازیل آئی تھی تو پیڈرو سے دوستی ہوئی تھی۔" اس نے پیڈرو کی طرف دیکھا۔ "پیڈرو..... یہ کارٹر فیلکس ہیں، میرے شوہر۔"

"شادی کر لی؟ واؤ..... تم جیسی آزادی پسند لڑکی کو شادی

کرنی پڑی آخر۔" وہ دونوں ہنس پڑے۔ میں مسکرا بھی نہ سکا۔ مجھے ایمیلیا کا اس سے بات کرنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہم تینوں قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پیڈرو نے جوس منگوایا۔ میں پینے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اس کے اصرار پر پینا پڑا۔ ایمیلیا اور وہ تیس چالیس منٹ باتیں کرتے رہے۔ میں بور ہو گیا۔

"اب چلیں ایمیلیا؟" میرے کہنے پر ایمیلیا کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے لہجے میں سختی محسوس کر لی تھی۔ وہ پیڈرو سے اجازت لے کر میرے ساتھ آ گئی۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔ رات کا اندھیرا اس خوب صورت شہر کی مصنوعی روشنیوں میں ڈوب رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا منگوایا۔ ایمیلیا نے کوئی بات نہ کی۔

"سوری ایمیلیا..... مگر میں بور ہو گیا تھا۔" میں نے اس سے معذرت کی۔

"پیڈرو کیا سوچے گا میرے بارے میں؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے پسند نہیں آیا وہ شخص۔" میں نے صاف بات بتائی۔ "نہ ہی مجھے اس کا تم سے بات کرنا اچھا لگا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ نہیں معلوم۔"

"تم کالج بوائے ہو نہ میں اسکول میں پڑھنے والی بچی..... یہ باتیں ہماری عمر کے لوگوں کو زیب نہیں دیتیں۔" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "پیڈرو اور میں اچھے دوست ہیں مگر میں تمہاری بیوی ہوں۔"

"ہم آئندہ اس سے نہیں ملیں گے۔" میں نے واضح کیا۔ وہ خاموش ہو گئی مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اس معاملے میں مجھ سے اتفاق نہیں کر رہی۔ اس کی ناراضی کے باوجود میں اس معاملے میں نرمی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح موسم خوشگوار تھا۔ میری آنکھ نو بجے کھل گئی۔ ایمیلیا نہا رہی تھی۔ باتھ روم سے باہر آ کر اس نے میری طرف دیکھا مگر کوئی بات نہ کی۔ میں نے کچھ وقت تیاری میں لگایا۔ کپڑے بدل کر میں نے پوچھا۔ "ناشتا منگواؤں؟"

"میں نے کر لیا ہے۔" یہ ناراضی کا ثبوت تھا مگر پیڈرو کی وجہ سے اس کا ناراض ہونا میرے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے لیے ناشتے کا کہا۔ ویٹر ناشتا لے کر آیا اور میز پر سجا دیا۔ اسی دوران ایمیلیا بغیر کچھ کہے باہر چلی گئی۔ ناشتے کے بعد میں نے لیپ ٹاپ نکالا۔ یہ شاید موسم کی خوشگواریت کا اثر تھا جو میں خراب موڈ کے باوجود کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران ویٹر ایک بار پھر اندر داخل ہوا۔ وہ ویٹر مقامی ہرگز نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"آپ کا نام کارٹر ٹیلکس ہے..... آپ ایک مشہور ناول نگار ہیں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"دو ناول لکھ کر کوئی مشہور ناول نگار نہیں بن جاتا۔" میں نے وہی جواب دیا جو میں اکثر ایسے سوال کرنے والوں کو دیتا تھا۔

"آپ کے پہلے ناول نے ہی کامیابی کے ریکارڈ بنا دیے تھے۔" وہ جو کوئی بھی تھا، میرے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ میں یہی سمجھا کہ شاید وہ آٹوگراف لینے کے چکر میں ہے۔ "آپ مجھ پر بھی کہانی لکھیں۔" اس نے عجیب فرمائش کی۔ ایسی فرمائش لکھاری سے اکثر لوگ کر دیتے ہیں مگر برا سیلیا کے ایک ویٹر کی کہانی کیا ہو سکتی ہے؟ یہی سوال میں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں، تم میں ایسا کیا ہے؟"

"بہت کچھ۔" اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اکتا گیا۔

"پھر آنا..... ابھی کام کر رہا ہوں۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں، ابھی لکھیں میری کہانی۔" اس کا جواب سن کر مجھے غصہ آ گیا۔

"دفع ہو جاؤ ورنہ میں شکایت کر دوں گا مالک سے۔"

"پلیز.....!" اس کا انداز ہرگز درخواست کرنے والا نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بیڈ کے نیچے جھک گیا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیڈ کے نیچے ہاتھ مارا اور تیزی سے اٹھا۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"پلیز سر....."

"یہ کک..... کیا کر رہے تم؟" میرا جسم خوف کی وجہ سے کانپ اٹھا۔ ایسی صورت حال کا سامنا مجھے پہلی بار کرنا پڑ رہا تھا۔

"پلیز سر..... میری کہانی لکھیں ابھی۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لیپ ٹاپ کھولا۔

"میں تمہاری شکایت کر دوں گا۔"

"اس کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا۔ دیکھنے میں وہ عام سا شخص لگتا تھا مگر مضبوط جسامت کی وجہ سے لڑکیوں کے لیے اس میں کشش ضرور تھی۔ "اب لکھنا شروع کرو..... ڈرو مت، جب تک تم کچھ غلط حرکت نہیں کرو گے تب

تک میں بھی کچھ نہیں کروں گا۔" اس کی بات سن کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بادلوں نے اس خوب صورت شہر کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ درجۂ حرارت عام دنوں کی نسبت کم تھا اور ٹھنڈی ہوا اس کی کو مزید نیچے لے جانے کا باعث بن رہی تھی۔

"میں تیار ہوں..... بتاؤ کیا خاص ہے کہانی میں؟"

"میں کیلیفورنیا سے ہوں۔ میرا نام فریڈرک ہے..... والدین کون تھے..... یہ نہیں علم مجھے، میں نے دنیا بھر میں آوارہ گردی کی ہے۔ کچھ ماہ ملازمت کرتا ہوں پھر پیسے جوڑ کر کہیں گھومنے نکل جاتا ہوں۔ تین ماہ سے یہاں براسیلیا میں ہوں اور....." اس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"اس میں کہانی لکھنے کے لیے خاص کیا ہے؟ یہ تو ہر دوسرے امریکی نوجوان کی کہانی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"یہ ہے۔" اس نے پستول اٹھایا۔ "اس میں جتنی گولیاں ہیں ساری تمہارے سینے میں اتاروں گا اب اگر میری بات کاٹی تو....." غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کی گالیوں کے جواب میں، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے چپ چاپ لکھنا جاری رکھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ ایمیلیا یہاں نہ آئے ورنہ کچھ بھی بُرا ہو سکتا تھا۔

"میں اصل میں کہانی ان دو لڑکیوں کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں جو میری زندگی میں آئیں..... کچھ وقت میرے دل اور جذبات سے کھیل کر مجھے چھوڑ گئیں۔" اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نمی کی وجہ سے مجھے یقین ہوا کہ وہ واقعی جذبات رکھتا ہے۔ "مارینا اور لنڈا۔" اس نے دو نام گنوائے۔ "سب سے پہلے مارینا ملی تھی مجھے..... اس سے میری ملاقات پیرس میں ہوئی۔ ان دنوں میرے پاس کافی پیسے تھے۔ مارینا بھی میری طرح آوارہ گرد تھی۔ ہم دونوں نے پیرس میں چند یادگار دن گزارے۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی یہی کوئی بیس بائیس سال کی عمر تھی اس کی....." وہ اٹھا اور پانی کی بوتل منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس نے بات دوبارہ شروع کی۔ "مارینا اور میں پیرس میں ملے اور وہیں جدا ہو گئے، یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں مسٹر فیلکس، کسی دوست کو نہیں بتائی کیونکہ مجھے دوستوں کے سامنے شرمندہ ہونا پسند نہیں۔"

"جدا کیوں ہوئے؟" میرے اندر کا لکھاری جو ایک طویل اور دلچسپ محبت کی داستان سننے کے لیے تیار تھا..... اس کی یہ بات سن کر حیران ہوا۔

"اصل میں میرا پروگرام پیرس سے واپس کیلیفورنیا جانے کا تھا جہاں میں کچھ پیسے اکٹھے کر کے مارینا سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ہماری لڑائی ہوئی..... وہ وہیں پیرس میں رک گئی اور میں واپس کیلیفورنیا چلا آیا۔" اس نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔

"دوسری چولڑ کی میری زندگی میں آئی وہ جیا تھی..... وہ صرف ایک ماہ میرے ساتھ رہی۔ وہ انڈین تھی اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیوزی لینڈ آئی تھی۔ وہاں کافی انڈین ہیں اور میں حیران تھا کہ اس نے مجھے کیوں چنا ہے۔ ایک ماہ بعد ہی مجھے اس کی حقیقت کا علم ہو گیا۔ وہ مجھے کوئی امیر شخص سمجھ رہی تھی۔ جیسے ہی پیسے ختم ہوئے، وہ مجھے چھوڑ گئی۔" اس کے بعد اس نے لنڈا کا ذکر شروع کر دیا۔ لنڈا کی کہانی سنانے کے بعد وہ انجام کل سنانے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دن نائن زیرو پر کال کرنے کا سوچا۔ یہ براسیلیا پولیس کی ہیلپ لائن تھی۔ کال کے پانچ منٹ بعد یہاں پولیس موجود ہوتی..... ابھی میں کال کرنے کا سوچ رہا تھا کہ ایمیلیا اندر داخل ہوئی۔ اس کا موڈ بہتر تھا۔

"کوئی آیا تھا یہاں؟" اس نے پوچھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں سوچ آئی کہ اسے سب بتا دوں مگر پھر میں نے ارادہ بدل لیا۔

"نہیں..... ویٹر تھا ایک، آٹوگراف لینا چاہتا تھا۔" وہ مسکرا دی۔

"ظاہر ہے تم مشہور لکھاری جو ہو۔"

"کہاں گئی تھیں تم؟"

"کہیں نہیں..... بس چند عمارتیں دیکھی ہیں..... دوسرے مشہور میوزیم جانے کا ارادہ تھا لیکن وہ زیادہ فاصلے پر ہے یہاں سے۔"

"تو چلی جاتیں۔"

"تمہارے بغیر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ اس کا موڈ اچھا ہونے کے باوجود میرے تلخ لہجے کی وجہ سے سرد مہری برقرار رہی۔

رات نو بجے اس نے مجھے باہر چلنے کا کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس نے بھی ضد کرنے کے بجائے تیاری پکڑی اور اپنا کیمرا اٹھا کر ہوٹل سے باہر چل پڑی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں بھی باہر آ گیا۔ ایک جگہ سے کیپ خریدنے کے بعد میں نے فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں کہاں جاتی ہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد جب وہ ایک پارک میں بینچ پر بیٹھ کر تصویریں لینے میں مصروف

تھی، کوئی آکر اس سے لپٹ گیا۔ میں نے پہچان لیا..... وہ پیڈرو تھا۔ میرے جسم میں خون کی حرکت تیز ہوئی۔ دل کی دھڑکن نے بھی دل ٹوٹنے کا اشارہ کیا۔ ایمیلیا کی کہیں اور جانے کے بجائے براسیلیا جانے کی ضد، یہاں پیڈرو کا ملنا اور ان کا آپس میں تعلق..... سب میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگا۔ پیڈرو اور اس کا ملنا اتفاق ہرگز نہیں تھا۔ مجھے ایمیلیا سے یہ امید نہ تھی۔ میں چپ چاپ واپس آگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح ایمیلیا نے ایک بار پھر مجھے ساتھ چلنے کا کہا اور اس بار بھی میں نے انکار کردیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد فریڈرک وہاں آگیا۔ میں نے اسے وہسکی لانے کا کہا تھا۔ میں ایمیلیا کی بے وفائی کو بھلانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے تھے اس لیے میں فریڈرک سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ''آج اگر تم نے مجھے مجبور کیا تو ساری زندگی برازیل کی کسی جیل میں گزارو گے مسٹر فریڈرک۔'' میں بڑبڑایا۔

''یہ لیں۔'' اس نے بوتل میز پر لا کر رکھی۔

''اب تم جاؤ۔''

''میری کہانی کا آخری حصہ.....''

''دفع ہو جاؤ۔'' اس کی بات کاٹ کر میں چیخا۔ ''نہیں لکھنی مجھے تمہاری کہانی..... پاگل انسان۔'' میرے چیخنے پر وہ ہنس پڑا۔ میں نے اسے گالیاں دیں مگر وہ خاموش رہا۔ تنگ آکر میں نے موبائل اٹھالیا۔ ابھی میں پولیس کو بلانے ہی والا تھا کہ اس نے موبائل میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

''بیوی کی بے وفائی کا غصہ مجھ پر نہ نکالو۔'' میں اچھل پڑا۔

''تت..... تمہیں کیسے پتا ہے؟''

''میں سب جانتا ہوں مسٹر فیلکس۔'' وہ ہنسا۔ ''میری ڈیوٹی یہاں رات نو بجے کے بعد شروع ہوتی ہے اور صبح ختم ہو جاتی ہے۔ ہوٹل کے مالک کو میں نے کہا ہے کہ تم میری کہانی لکھ رہے ہو اس لیے وہ مجھے ڈیوٹی کے بعد بھی رکنے کی اجازت دیتا ہے..... رات جب میں ہوٹل آرہا تھا تب میں نے تمہیں ایمیلیا کا تعاقب کرتے دیکھا اور اس کے بعد ایمیلیا کو ایک دلکش برازیلی نوجوان کی بانہوں.....'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔

''مزید بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنی گردن مجھ سے آزاد کروائی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ دوبارہ ہنس پڑا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ پانی پی کر اس کی حالت بہتر ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''تم جیسے مرد ان عورتوں کے غلام ہوتے ہو..... بیوی کی بے وفائی دیکھ کر پاگل ہو رہے ہو۔''

''تم بھی کل یہاں لڑکیوں کی بے وفائی یاد کر کے رو رہے تھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں کس نے کہا کہ میں ان کی بے وفائی یاد کر کے رو رہا تھا؟'' اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ ''تم اتنے بڑے لکھاری ہو کر بھی لوگوں کو سمجھ نہیں سکتے..... تمہارا قصور نہیں، انسان کو سمجھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔''

''پھر کیوں رو رہے تھے کل؟''

''اصل میں وہ سب لڑکیاں مرنے کے بعد میرے خواب میں آتی ہیں۔''

''وہ مر چکی ہیں؟'' میں نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں..... مارینا پیرس کے ایک قبرستان میں دفن ہے..... لنڈا کے کچھ ٹکڑے اپنے فلیٹ میں پڑے ہیں اور کچھ میں نے دریا میں پھینک دیے..... جیا کی موت خودکشی قرار دی تھی آکلینڈ پولیس نے۔'' فریڈرک اگر خود کو بھوت بھی کہہ دیتا تو میں اتنا نہ ڈرتا جتنا اس کے اعتراف نے مجھے ڈرایا تھا۔ میرے ہاتھ پیر کانپنے لگ گئے۔ میری حالت دیکھ کر اس نے تسلی دی۔

''میں نے آج تک کسی مرد کو قتل نہیں کیا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہ یقین کرو..... کوئی مسئلہ نہیں مگر..... ایک بار کہانی لکھنے سے انکار کر کے دیکھو۔'' اس نے پستول اٹھایا۔ میں نے جلدی سے لیپ ٹاپ آن کیا اور اسے بولنے کا اشارہ کیا۔ اس نے لنڈا، مارینا اور جیا کے قتل کی تفصیل بتانا شروع کردی۔ وہ واقعی ماہر قاتل تھا۔ جس طرح اس نے منصوبے اور قتل کی تفصیل بیان کی..... مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ قاتل ہے۔

''تم بہت ذہین ہو۔'' میں نے اعتراف کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ دوست..... کل ملیں گے۔'' وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کردیا۔ میرے دماغ میں ایک خیال نے جنم لیا..... فریڈرک اپنے کام میں ماہر تھا..... مجھے بھی ایمیلیا کو سزا دینی تھی..... نہیں، ایمیلیا میری محبت ہے، اسے میں کیسے قتل کرسکتا ہوں؟ میرے ضمیر نے میرے خیالات سے اختلاف کیا۔ میرے اندر ایک جنگ شروع ہوگئی۔ ایمیلیا کی بے وفائی سے نفرت اور میری اس سے

محبت..... نفرت جیت گئی۔ میں فریڈرک کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سوئمنگ پول کے قریب موجود تھا۔ پانی کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔ ”مجھے یقین تھا تم میرے پیچھے ضرور آؤ گے۔“

”کیوں؟“

”بے وفاؤں کو میں سزا دیتا ہوں اور تم بھی دینا چاہتے ہو۔“

”میں ایمیلیا کی لاش یہیں چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔“

”حق بنتا ہے تمہارا۔“

”تم اسے قتل کرو گے۔“

”دس ہزار ڈالرز لوں گا..... پیسے لے کر قتل کرنا میرا کام نہیں مگر تم سے ہمدردی ہے کیونکہ تم میری کہانی لکھو گے..... دس ہزار ڈالرز اس لیے مانگے ہیں کیونکہ قتل کے بعد میں ملک چھوڑ دیتا ہوں۔ برازیلیا میں ویسے بھی کافی دن گزار لیے۔“

”منظور ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پانچ ہزار ڈالرز شام تک تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ہوں گے باقی پانچ ہزار کام کے بعد۔“ میں نے اس سے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل لی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ برازیل آتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں مجھے اپنی بیوی کو قتل کروانے کے لیے ایک قاتل کو پیسے دینے پڑیں گے۔ یہ صرف چند دنوں میں ہوا تھا..... صرف چند دن۔ برسوں کی محبت اور ایمیلیا کی بے وفائی..... زندگی مجھے عذاب لگ رہی تھی۔ واپس آ کر میں نے وہسکی کی پوری بوتل خالی کی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ مجھے سکون کی تلاش تھی۔

☆☆☆

یہاں آئے ہمیں دس دن گزر گئے۔ تین دن بعد ہمیں یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کیے گئے اس خوب صورت شہر کے خوشگوار موسم اور خوبصورت مناظر کی کشش کئی سیاحوں کو کھینچ لائی تھی۔ یہ شہر جہاں پورے برازیل کی حکومت کو سنبھالے ہوئے تھا وہیں اس کے ایک مہنگے ہوٹل میں، میں اپنے دل کو سنبھالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ ایمیلیا نے مجھے منانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ نہ میرا سرد رویہ بدلا اور نہ ہی منفی جذبات مثبت میں تبدیل ہوئے۔ صرف دس دنوں میں میری پوری زندگی بدل گئی۔ ہم لکھاری لوگ حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ ہماری کہانیوں میں لوگوں کی زندگیاں جھٹکا کھا کر بدل جاتی ہیں، ہمارے کردار سنبھل جاتے ہیں مگر حقیقت میں ہماری زندگی کو کوئی جھٹکا لگے تو ہمارا سنبھلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجھے فی الحال ایمیلیا کی بے وفائی کے اثر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ فریڈرک نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایمیلیا کو جلد مار دے گا۔ میں نے بار بار اپنے فیصلے پر سوچا مگر ایمیلیا کے لیے میرے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اسے مارنا میرا جذباتی فیصلہ ہرگز نہ تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں نے زندگی کی ہر سہولت اسے دی تھی..... اپنی محبت اسے دی تھی مگر اس نے دکھ کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔

یہ برازیلیا کے نرم موسم کی ایک اداس شام تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں سوئمنگ پول کے قریب بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں سگار تھا اور دماغ میں کئی طوفان تھے۔ کوئی چپکے سے میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے خوشبو محسوس کی..... یہ خوشبو میرے لیے انجان نہیں تھی۔ یہ ایمیلیا تھی۔

”مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ پیڈرو سے ایک ملاقات کی وجہ سے تم مجھ سے اتنا ناراض ہو گے۔“ اس نے عام سے انداز میں بات شروع کی۔ ”تمہارا رویہ ایک سنجیدہ انسان کے بجائے ایک کالج بوائے جیسا ہے..... کارٹر، بہت مایوس کیا تم نے۔“

”اگر بات ایک ملاقات تک محدود رہتی تو میرا رویہ بدل جاتا..... ایمیلیا، بہت دکھ ہوا..... مایوس کیا تم نے۔“ میں نے جواب دیا۔ الفاظ کافی دنوں سے دماغ میں تھے مگر آج اس شام انہیں زبان پر لانے کا بہترین موقع تھا کیونکہ میں جانتا تھا..... ایمیلیا جلد مرنے والی ہے۔ میرے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔

”کک..... کیسے کہہ سکتے ہو تم؟“

”میوزیم، آزادی کی یادگار اور یہ ہوٹل..... یہاں میں تمہارے ساتھ تھا مگر برازیلیا کے مشہور گرجا کے ساتھ جو ہوٹل ہے وہاں تمہارے ساتھ دن میں پیڈرو کئی گھنٹے گزارتا رہا..... یقیناً تم دونوں اپنی پرانی دوستی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔“ میں نے نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ ”شرم کرو..... ایمیلیا..... شرم۔“

”جھوٹ ہے یہ سب۔“ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

”میری آنکھوں نے جو سب دیکھا ہے..... اگر وہ جھوٹ ہے تو ساری دنیا جھوٹی ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے گہری سانس لی۔

”تو اب تم مجھ سے علیحدگی چاہتے ہو؟“

”اتنی بھی کیا جلدی ہے..... ابھی میری بیوی بن کر ہی اس پیڈرو کی بانہوں میں کچھ دن گزار لو..... پھر یہیں رک جانا۔“ میں کھڑا ہوا۔ وہ بیٹھی رہی۔ ”کاش..... ہم یہاں نہ آئے ہوتے مگر شاید..... یہاں آنا ہی میری قسمت میں اچھا تھا

جو تمہاری حقیقت کا علم ہو گیا۔" میں واپس کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ رات میں نے ہوٹل کے اس کمرے میں اکیلے ہی گزار دی۔ ایمیلیا نہیں آئی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے علم تھا کہ وہ اب پیڈرو سے رات کو بھی ملنے گئی ہوگی۔ میری طرف سے وہ آزاد تھی۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ دوپہر ایک بجے فریڈرک نے مجھے ہوٹل سے باہر بلایا۔ "غائب کر دی ہے تمہاری پیاری بیوی۔" اس کی بات سن کر میرا دل دھڑکا۔

"کہاں؟"

"موت کی بانہوں میں۔" اس نے سفاکی سے کہا۔

"لاش کہاں ہے؟"

"دیکھنا پسند کرو گے؟" اس نے ایسے کہا جیسے لاش نہ ہو بلکہ کوئی خوب صورت مقام ہو۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا دیا۔ "آؤ۔" اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ برازیلیا شہر سے کوئی چودہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم شمالی ونگ کی طرف آ گئے۔ ٹیکسی روڈ پر ہی چھوڑ کر ہم پیدل چلتے ہوئے درختوں کی جانب گئے۔

"اتنی دور کیسے لے آئے تم اسے؟"

"بے ہوش کر کے..... چوری کی گاڑی میں۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ تھوڑے فاصلے پر آ کر وہ رکا۔ "میرے باقی کے پانچ ہزار ڈالر؟"

"مل جائیں گے۔"

"ابھی میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا مگر اس وقت میں مجبور تھا۔ میں نے جیب سے موبائل نکال کر بینک کی مخصوص ایپلیکیشن آن کی۔ اس کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار بھیجنے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے جواب دیے بغیر پستول میرے ماتھے پر رکھا۔

"پلیز..... خدا کے لیے..... تم نے کہا تھا تم مرد کو نہیں مارتے۔" وہ خاموش رہا۔ میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ میں تیزی سے جھکا اور لات گھما کر اسے مارنی چاہی..... مگر وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ تیزی سے ایک جانب ہٹا اور گولی چلا دی۔

☆☆☆

"فریڈرک نے اپنا کام مکمل کر دیا ہوگا۔" ایمیلیا نے پیڈرو سے پوچھا۔

"ہاں، وہ اپنے کام میں ماہر ہے....." اس نے جواب دیا۔ "جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم کارٹر سے جان چھڑانا چاہتی ہو تو مجھے فریڈرک سے بہتر کوئی نہیں ملا۔ میں نے اسے پہلے تیار کر رکھا تھا۔ ہوٹل میں وہ بھیس بدل کر رہتا ہے....."

"پولیس کو شک تو نہیں ہوگا؟"

"لاش ملنے تک وہ ملک چھوڑ چکا ہوگا۔" پیڈرو ہنسا۔ "اپنے کام میں ماہر ہے وہ، تم احتیاط کرنا..... کسی کو تم پر شک نہ ہو..... اب تم میری ہو۔" پیڈرو نے اسے بانہوں میں سمیٹا۔

"اور کارٹر کی دولت ہماری ہے۔" ایمیلیا ہنسی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد فلیٹ پر دستک ہوئی۔ آنے والا فریڈرک تھا۔

"آؤ میرے عزیز دوست۔"

"کام مکمل کر دیا ہے۔" فریڈرک نے جیب سے موبائل نکال کر پیڈرو کو کارٹر کی لاش کی تصویریں دکھائیں۔

"بہت اعتماد تھا مجھ پر اسے..... چپ چاپ ایمیلیا کی لاش دیکھنے میرے ساتھ چل دیا۔" فریڈرک ہنسا۔ ایمیلیا اور پیڈرو خوش دکھائی دیے۔

"تمہارے باقی کے پانچ ہزار کام مکمل ہونے سے پہلے ہی تمہارے اکاؤنٹ میں بھیج دیے تھے..... مجھے یقین تھا تم اپنے کام میں ماہر ہو۔" پیڈرو نے اس کی تعریف کی۔ وہ مسکرا دیا۔

"اگر کام نہ ہوتا تو میں تمہارے پیسے واپس کر دیتا مسٹر پیڈرو....." اس نے جواب دیا۔ "کیونکہ جس کام کے لیے معاوضہ مل جائے..... وہ کام مکمل کیے بنا نہیں چھوڑتا میں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے پسٹل نکالا اور ایمیلیا کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں..... پیڈرو اچھل پڑا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟"

"اس کو مارنے کے پورے پیسے مل گئے تھے مجھے۔" فریڈرک نے جواب دیا۔ پیڈرو تیزی سے ایمیلیا کی طرف بڑھا۔

"ایمی..... یہ کیا ہوا....." وہ فریڈرک کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں..... زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔"

"بلا لو..... میں کہوں گا ایمیلیا اور کارٹر کو مارنے کے لیے تم نے مجھے پیسے دیے تھے..... ثبوت کے طور پر تمہارے اور میرے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل دیکھ لیں۔" وہ یہ کہہ کر مڑا اور باہر چل دیا۔ اسے اب یہ ملک چھوڑنا تھا..... نئے کام کی تلاش میں.....

❖❖❖

دائرہ

خام بٹ

انسان بے اختیار ہے... مگر با اختیار بننے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے... اپنی عقل کے مطابق سوچتا ہے... اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے... مگر حالات و واقعات کی اپنی گردشیں اپنے دائرے بن رہے ہوتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی کتھا... جو اپنا ہویا کاٹ رہا تھا...

عیش..... امید اور شک کے دائروں میں زاد سفر ڈھونڈتی کہانی.....

سہ پہر اپنی مخصوص رفتار سے شام کی جانب گامزن تھی۔ وقت کی یہ پیش قدمی عاصم کے اندر ایک عجیب سے اضطراب کو جگا رہی تھی۔ وہ ایک فیملی پارک کے سامنے گاڑی میں بیٹھا اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ انیتا نے ٹھیک پانچ بجے وہاں آنے کو کہا تھا اور پانچ بجنے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ یہ دل دھڑکا دینے والے بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔

عاصم اس سے پہلے بھی کئی بار انیتا سے مل چکا تھا مگر

آج کی ملاقات بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس ملاقات میں وہ انیتا کو پرپوز کرنے والا تھا۔ اس نے انیتا کے لیے ایک خوب صورت گولڈ کی رِنگ بھی خرید لی تھی اور یہ گاڑی اس کے ایک دوست کی تھی۔ انیتا کی آمد پر وہ دونوں کسی کافی شاپ میں جاکر بیٹھتے اور رومان پرور باتیں کرتے اور ملاقات کے اختتام پر عاصم اپنا پرپوزل اس کے سامنے رکھ دیتا۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہوتی ورنہ وہ دونوں دل و جان سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنانے کے لیے پُرجوش بھی۔

عاصم ایک ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح دس سے شام چھ بجے تک تھی لیکن آج اس نے ایک ضروری کام کا بہانہ کرکے لنچ کے بعد چھٹی کرلی تھی اور یہ ضروری کام تھا، انیتا کو پرپوز کرنا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے دوست کی گاڑی بھی مانگ لایا تھا اور اب کی تھی تو صرف اور صرف انیتا کی۔ عاصم بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔ یہ انتظار بھی بڑی کمینی شے ہے، اچھے خاصے انسان کو بعض اوقات دو کوڑی کا کرکے رکھ دیتی ہے۔

ٹھیک پانچ بجے عاصم کی بے قراری عروج کو پہنچ گئی۔ اس نے گاڑی کے اندر رہتے ہوئے گاڑی سے باہر تاحدِ نگاہ انیتا کو تلاشنے کی کوشش کی مگر وہ اسے کسی سمت دکھائی نہ دی۔ اس نے انیتا کو کال کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

انیتا ایک کافی شاپ میں تنویر کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ تنویر کا تعلق بزنس کمیونٹی سے تھا۔ اس نے اپنے بزنس کو سیٹ کرنے کے لیے دن رات محنت کی تھی اور بالآخر کاروبار کی دنیا میں اس نے وہ مقام حاصل کرلیا تھا جو کسی بھی بزنس مین کا خواب ہوتا ہے۔

تنویر اور انیتا کی شناسائی کا عرصہ چند ملاقاتوں پر محیط تھا۔ ایک اتفاقی ملاقات نے انہیں ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا تھا۔ انیتا کی خوب صورتی اور دلکشی نے تنویر کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیا تھا۔ وہ جاگتے میں انیتا ہی کو سوچتا تھا اور سوتے میں اسی کے سپنے دیکھتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر انیتا کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور آج والی یہ ملاقات اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس ملاقات میں تنویر نے اسے پرپوز کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

تنویر سے ملنے سے پہلے، انیتا عاصم کی دوست تھی اور اس دوستی کے عقب میں اس کا ایک خاص مقصد پوشیدہ تھا۔

خیر..... ''دوست'' تو وہ اب بھی عاصم کی تھی مگر اس دوستی کے اندر سے وہ جذبہ غائب ہوگیا تھا جس کے تحت ایک انسان کسی دوسرے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالیتا ہے۔ تنویر سے ملاقات کے بعد حسبِ پروگرام اس جذبے نے اپنی سمت تبدیل کرلی تھی۔ اب وہ تنویر سے شادی کا اٹل فیصلہ کرچکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تنویر نے آج سہ پہر میں اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو وہ ہر چیز کو پسِ پشت ڈال کر تنویر سے ملنے اس کافی شاپ میں چلی آئی تھی حالانکہ آج پانچ بجے اس نے عاصم سے ملاقات کا وعدہ کررکھا تھا۔

عاصم کو یہ یقین تھا کہ انیتا اس کی محبت میں گرفتار ہے اور ایسا ہی یقین تنویر کو بھی تھا لیکن انیتا ایک سمجھ دار اور موقع شناس لڑکی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے محبت کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اس نے کافی غور و خوض اور ناپ تول کے بعد تنویر کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت عاصم کے ساتھ نہیں، تنویر کے ساتھ تھی۔

''انیتا! تمہیں اپنے بارے میں شاید ایک بات کا علم نہیں ہے۔'' تنویر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کون سی بات؟'' انیتا نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''تم بہت خوب صورت ہو۔''

قبل اس کے کہ انیتا اپنی تعریف کے جواب میں کچھ کہتی، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ان دونوں کے سیل فونز ٹیبل پر ہی رکھے ہوئے تھے۔ انیتا نے اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

سیل فون کے ڈسپلے پر عاصم کا نام چمک رہا تھا۔

☆☆☆

عاصم سیل فون کو اپنے کان سے لگائے انیتا کی آواز سننے کا منتظر تھا۔ دوسری جانب گھنٹی مسلسل بج رہی تھی مگر انیتا اس کی کال پک نہیں کررہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

''کم آن انیتا.....'' وہ بے صبری سے بولا۔ ''فون اٹھاؤ یار..... میں یہاں پارک کے باہر گاڑی میں بیٹھا سوکھ رہا ہوں اور تمہارا کچھ اتا پتا ہی نہیں۔''

ایک مخصوص وقت تک گھنٹی بجنے کے بعد ریکارڈنگ چلنے لگی۔ عاصم نے دوبارہ، سہ بارہ کوشش کی مگر ہر مرتبہ اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف بیل تو جارہی تھی لیکن

انیتا اس کی کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے انیتا کا نمبر ٹرائی کرتا چلا گیا۔ اس دوران میں اس کا ذہن بے نام خدشات کی آماجگاہ بنا رہا۔

''کہیں انیتا کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی.....؟'' اس نے خود کلامی کی۔ ''وہ وقت اور وعدے کی پابند ہے۔ پھر آج ایسا کیوں..... اگر وہ فون اٹینڈ کرلے تو کچھ پتا بھی چلے۔''

انیتا کے بارے میں فکرمندی سے سوچتے ہوئے وہ مسلسل اس کا نمبر بھی ٹرائی کر رہا تھا لیکن ہر بار ایک جیسی ریکارڈنگ اس کے درِ سماعت پر دستک دیتی۔

''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر کے بعد کوشش کریں۔''

''بی بی! میں تھوڑی، تھوڑی دیر کے بعد ہی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ، میرے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول کیوں نہیں ہو رہا۔''

ظاہر ہے، اس کی جھلاہٹ کا جواب نہیں آسکتا تھا کیونکہ دوسری طرف کوئی سننے والی موجود نہیں تھی۔ وہ سسٹم کی ریکارڈنگ تھی اور سسٹم اپنی کمانڈ کے مطابق کام کرتا ہے، سوال و جواب نہیں۔ ریکارڈنگ کی تکمیل کے بعد یہی پیغام انگلش میں دہرایا جانے لگا۔ ''دا نمبر یو ہیو ڈائلڈ از ناٹ ریسپونڈنگ ایٹ دا مومنٹ۔ پلیز ٹرائی لیٹر.....''

عاصم نے سیل فون کو اپنے پہلو میں، سیٹ پر رکھ دیا اور انیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ انیتا سے پہلے اس کی زندگی میں دو لڑکیاں آئی تھیں۔ حنا اور انیقہ۔ حنا بلاواسطہ اور انیقہ بالواسطہ۔ حنا اس کی خالہ زاد تھی اور عاصم کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی حنا سے کریں۔ حنا، عاصم کی والدہ روشن آرا کی چھوٹی بہن جہاں آرا کی اکلوتی اولاد تھی مگر عاصم، حنا کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے دوٹوک انداز میں روشن آرا سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر حنا سے شادی نہیں کرے گا۔ عاصم کے اس جارحانہ فیصلے نے روشن آرا کو حد درجہ ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔ وہ بیٹے سے ایسے رویے کی توقع نہیں رکھتی تھیں۔ جیسے حنا، جہاں آرا کی اکلوتی اولاد تھی، ویسے ہی عاصم کا بھی کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی اور کافی عرصہ پہلے اس کے والد امین الدین کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ روشن آرا نے عاصم کو صرف ماں ہی نہیں بلکہ باپ بن کر بھی پالا تھا۔ وہ حنا کو اپنے گھر کی بہو بنا کر اس خاندان کی مضبوطی میں اضافہ کرنے کی خواہاں تھیں مگر عاصم نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ عاصم کے اس حتمی فیصلے کے بعد روشن آرا بجھی بجھی سی رہنے لگی تھیں۔ انہیں ایک بے نام سی چپ لگ گئی تھی۔

والدین کا اپنی اولاد سے توقعات باندھ لینا سراسر جائز ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے لیکن ایسے خوش قسمت والدین بہت ہی کم دیکھنے کو ملتے ہیں، اولاد جن کی توقعات پر پوری اترتی ہو۔ روشن آرا بھی ایک ایسی ہی بدنصیب ماں تھیں۔

حنا صورت شکل کی کوئی ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ وہ کسی مرد کی آنکھوں میں جچ نہ پاتی لیکن اس کا کیا کیجیے کہ عاصم کی نگاہ انیقہ پر جمی ہوئی تھی۔ انیقہ سے اس کی رفاقت ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی اور اس گہرائی میں وہ بعض ممنوعہ مقامات سے بھی بلا لائسنس گزر گئے تھے، اس یقین کے ساتھ کہ بالآخر انہیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بن جانا ہے۔

انسان اپنی عقل کے مطابق سوچتا ہے مگر حالات و واقعات اکثر انسان کے سوچے ہوئے کا سواستیاناس مار کر رکھ دیتے ہیں اور یہی زندگی کی حقیقت بھی ہے جو خاصی کڑوی اور کسیلی ہے۔ کسی دوست نما بدخواہ نے عاصم کے ذہن میں، انیقہ کے ماضی کے حوالے سے شک کا ایسا بیج بویا کہ سب کچھ خلط ملط اور الٹ پلٹ کر رہ گیا۔

شک کا بیج بڑا توانا اور طاقتور ہوتا ہے اور اس سے پھوٹنے والی کونپل کی بڑھوتری، رفتار میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شک کا زہر عاصم کے رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ انیقہ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر عاصم کی سوچ کی سوئی ایک مقام پر اٹک کر رہ گئی تھی اور وہ مقام تھا..... انیقہ کا داغ دار ماضی!

انیقہ اور عاصم میں بریک اپ ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد انیتا سے اس کی دوستی ہو گئی... پھر ان کی یہ دوستی اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ ایک دوسرے کے بغیر انہیں جینے کا تصور بھی محال لگنے لگا۔ بقول کسے، وہ ایک دوسرے کی محبت میں گردن گردن ڈوب چکے تھے اور اسی تعلق کو قانونی شکل دینے کے لیے عاصم نے آج انیتا کو باقاعدہ پرپوز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

عاصم نے دوبارہ اپنا سیل فون اٹھا لیا۔ انیتا کے لیے وہ بہت زیادہ فکرمند ہو رہا تھا۔ اگر فون پر ہی اس سے بات ہو جاتی تو عاصم کی تسلی ہو جاتی مگر دوسری جانب سے کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا اور یہی بات عاصم کو تشویش

میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر انیتا کا نمبر ٹرائی کیا مگر اس دفعہ تین بیل کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔

''لگتا ہے، انیتا یہاں پہنچنے ہی والی ہے اسی لیے اس نے کال پک نہیں کی۔'' عاصم نے خود کلامی کی اور متلاشی نظر سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔

اسی لمحے اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کی گاڑی کی جانب آرہا تھا۔ وہ شخص عاصم کے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن اس کے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خصوصی بالخصوص عاصم ہی سے ملنے آرہا ہے۔

عاصم نے اپنی توجہ مردِ مذکور پر مرکوز کردی۔

☆☆☆

انیتا نے کئی بار عاصم کی کال کو خالی جانے دیا تھا اور اب کی مرتبہ اس نے لائن کٹ کردی تھی۔ اس دوران میں وہ تنویر کے ساتھ رومانی گفتگو میں بھی مصروف تھی۔ تنویر، انیتا کے سیل فون کی گھنٹی کی وجہ سے خاصی بے کلی محسوس کررہا تھا۔ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''انیتا! جو کوئی بھی تمہیں کال کررہا ہے، وہ کسی پریشانی میں لگتا ہے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے تنویر۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''پریشانی کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ وہ اس وقت ذہنی اذیت سے گزر رہا ہے۔''

''اوہ......!'' تنویر نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تو تم کال اٹینڈ کرکے اس کی تکلیف دور کردو نا۔''

''میں اس کمینے کو درد کی شدت سے تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں تنویر۔'' انیتا نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''اس کی ذہنی اذیت میرے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے۔ وہ جتنا زیادہ تڑپے گا، میں اتنی ہی زیادہ راحت محسوس کروں گی۔''

''کیا میں اس کمینے کا نام جان سکتا ہوں؟'' تنویر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیلاً بتا چکی ہوں۔'' انیتا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اس دنیا میں، میں صرف ایک ہی شخص سے شدید نفرت کرتی ہوں۔''

انیتا نے بات ادھوری چھوڑی تو تنویر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں تمہارا اشارہ اس شخص کی طرف تو نہیں جس نے تمہاری دوست کی زندگی برباد کردی تھی؟''

''ایگزیکٹلی!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''اس بدذات نے انیقہ کے جذبات، احساسات اور عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا اور آخر میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر اپنی زندگی سے باہر پھینک دیا اور وہ بھی انیقہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے بعد۔'' لمحاتی توقف کرکے انیتا نے اپنے حواس کو شانت کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے اسے ذلیل و خوار کرنے کے لیے ہی اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسایا تاکہ اس کم ظرف سے انیقہ کی ذلت و رسوائی کا انتقام لے سکوں۔ وہ اس وقت پوری طرح میری مٹھی میں ہے۔ میں نے آج پانچ بجے ایک پارک میں اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ مانگے کی گاڑی میں بیٹھا، وہاں میرا انتظار کررہا ہے اور میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے نہ پہنچنے نے اس کی حالت خراب کررکھی ہوگی اسی لیے وہ بار بار مجھے کال کررہا ہے۔''

''تم نے مجھے انیقہ اور عاصم کے بارے میں بتا رکھا ہے۔'' تنویر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں اب اس کھیل کو ختم کردو۔''

''اتنی آسانی سے کیسے ختم کردوں۔'' انیتا نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''اس نے جتنا بڑا جرم کیا ہے، اس کی سزا بھی اتنی ہی طویل اور کربناک ہونا چاہیے۔''

''میں تمہارے احساسات اور اپنی دوست انیقہ کے لیے تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں انیتا۔'' تنویر نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ''مگر میں اس وقت بہت اچھے موڈ میں ہوں۔''

انیتا ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھی نہیں؟''

''میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔'' وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ پر دباؤ ڈال کر دہراتے ہوئے بولا۔ ''تم صرف اور صرف میری ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری توانائی عاصم جیسے فضول لوگوں پر صرف ہو لہٰذا اس گیم کا آج ڈراپ سین ہوجانا چاہیے۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟''

''کچھ کچھ۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔

''کچھ کچھ نہیں، سب کچھ سمجھ میں آنا چاہیے۔'' وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ گھماتے ہوئے خوش انداز میں بولا۔ ''تمہارے ذہن میں عاصم کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ اب اس کا فون آئے تو دوٹوک الفاظ میں اس کھیل کو ختم کردینا۔''

''لل..... لیکن میں..... اس سے کہوں گی کیا.....؟''
انیتا نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں نے تو اس کھیل کو ختم کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔''

''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔'' تنویر کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ اس کام کا۔''

انیتا نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی خوب صورت مخملیں ڈبیا دیکھی جیسی کہ طلائی زیورات کو رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ یقیناً تنویر اس کے لیے کوئی قیمتی گفٹ لایا تھا۔

''یہ..... یہ کیا ہے؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''اپنا ہاتھ مجھے دو۔'' تنویر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔

انیتا نے بے چون و چرا اپنا بایاں ہاتھ تنویر کے سامنے رکھ دیا۔ تنویر نے مخملیں ڈبیا سے ڈائمنڈ جڑی وہائٹ گولڈ کی ایک حسین اور قیمتی انگوٹھی نکالی پھر وہ انگوٹھی انیتا کی رنگ فنگر میں پہنانے کے بعد گہری سنجیدگی سے بولا۔

''انیتا! تم میری ہو۔ عاصم جیسے شکی اور کم ظرف لوگوں کے منہ لگنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اس کی کال آنے دو۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔ یو گاٹ مائی پوائنٹ؟''

انیتا چند لمحات تک جذب کے عالم میں تنویر کے چہرے کو تکتی رہی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''گاٹ اِٹ.....!''

☆☆☆

وہ شخص سیدھا عاصم کے پاس پہنچا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے شیشہ گرانے کو کہا۔ عاصم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس اجنبی کی فرمائش پوری کردی اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی، فرمائیں؟''

''سر! مجھے آپ کی مدد چاہیے۔'' وہ شخص لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

عاصم نے اپنی جیب میں سے والٹ نکالا لیکن قبل اس کے کہ وہ والٹ سے کچھ رقم نکال کر اس کی جانب بڑھاتا، وہ شخص نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بہ قدرِ بلند آواز میں بولا۔

''سر! میں کوئی بھکاری یا ضرورت مند نہیں ہوں۔''

''پھر تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟'' عاصم نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

جون 2021ء کے شمارے کی جھلکیاں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

مرزا امجد بیگ کے دلائل،
خطوط کی محفل
اور محفل شعر و سخن

حاصل

آخری صفحات پر **کبیر عباسی** کے قلم سے ایک دلچسپ کہانی..... رشتوں کی الجھی ڈوری اور مشاورت کی رسا کشی کا عجب ماجرا

بساط

ماضی کے اوراق پر ایک دلگداز محبت کے غمگین و سنگین واقعات کا احاطہ..... ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کی سحر انگیزی.....

شہ زوج

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

ان کے علاوہ

تنویر ریاض، مظہر سلیم ہاشمی، آصفہ ضیا احمد، ناہید سلطانہ اختر، منظر امام، اعتزاز سلیم وصلی، اور شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

"تھوڑی دیر کے لیے آپ کی گاڑی چاہیے۔" اس بندے نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"وہاٹ.....؟" عاصم نے خشمگیں نگاہ سے اسے گھورا۔

"ایک ایمرجنسی ہے سر....." وہ منت ریز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پچھلے سگنل پر ایک ایمبولینس کا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔ مریض کی حالت تشویشناک ہے۔ اگر اسے فوری طور پر اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی میں اس مریض کو اسپتال تک لے جانے کے لیے راضی ہو جائیں تو یہ آپ کی بہت بڑی نیکی....."

"سوری....." عاصم نے قطع کلامی کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔"

"سر! آپ یہاں ایسے ہی تو کھڑے ہیں۔" وہ شخص خفگی بھرے انداز میں بولا۔ "کسی کے کام آجائیں گے تو....."

"میں یہاں پر خواہ مخواہ ہی نہیں کھڑا۔" عاصم نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ بس، وہ پہنچنے ہی والا ہے۔ آپ میرا دماغ نہیں کھاؤ اور کوئی رکشا، ٹیکسی دیکھ لو۔"

"سر! آج سی این جی کی بڑی خوفناک اسٹرائیک ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "پبلک ٹرانسپورٹ سڑکوں سے غائب ہے۔ آپ کو یہاں کھڑے دیکھا تو میں آپ کی منت سماجت کرنے ادھر چلا آیا۔ آپ اس مریض کو بچانے کے لیے میری مدد کریں سر....."

"نہ..... کیا یہ اسٹرائیک میں نے کرائی ہے.....؟" عاصم نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "میری جان چھوڑو اور کہیں اور ٹرائی کرو۔"

"اس دنیا میں انسان باقی ہیں مگر انسانیت ختم ہو گئی ہے۔" وہ شخص عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔ "ڈرو اس وقت سے جب کسی ایمبولینس میں تمہارا کوئی پیارا، موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا اسی طرح بے یار و مددگار پڑا ہو۔"

عاصم کو اس شخص کی بات پر غصہ تو بہت آیا لیکن کوئی سخت یا ترش جواب دینے کے بجائے اس نے شیشہ چڑھا لیا۔ عاصم کے اس عدم تعاون رویے سے مایوس ہو کر وہ بندہ پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلا گیا۔

عاصم نے دو تین گہری سانسیں لے کر اپنے دماغ کو ٹھنڈا کیا پھر سیل فون اٹھا کر انیتا کا نمبر ٹرائی کرنے لگا۔

☆☆☆

گھنٹی بجتے ہی انیتا نے سیل فون اٹھا لیا۔ حسب توقع یہ عاصم ہی کی کال تھی۔ انیتا نے اپنا سیل فون تنویر کی جانب بڑھاتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

"کمینہ، رذیل..... منحوس الدہر عاصم....."

"ہیلو.....!" تنویر نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

عاصم، دوسری طرف سے انیتا کی آواز سننے کی توقع کر رہا تھا۔ ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"انیتا.....!"

"انیتا نہیں، تنویر....." تنویر نے سپاٹ آواز میں کہا۔

عاصم نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "تم کون ہو..... انیتا کہاں ہے..... اس کا فون تمہارے پاس کیسے آگیا؟"

"اس نے اپنا سیل فون خود مجھے دیا ہے۔" تنویر نے اس کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے اور میں....." ڈرامائی انداز میں توقف کرنے کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "میں انیتا کا ہونے والا شوہر ہوں۔ آئندہ ماہ ہماری شادی ہونے والی ہے۔"

تنویر کے آخری الفاظ نے عاصم کے دماغ کو گیارہ ہزار وولٹ کا جھٹکا دیا۔ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

"یہ..... یہ تم کیا بک رہے ہو؟"

"میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔" تنویر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "وہ حقیقت جو پتھر پر لکیر کے مانند ہے۔"

"م..... میں انیتا سے..... بات کرنا چاہتا ہوں۔" عاصم ہٹپٹا کر بولا۔ "اگر وہ تمہارے سامنے موجود ہے تو فون اسے دو۔"

"بات کا مطلب ہے، بات..... باتیں نہیں۔" تنویر نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں صرف ایک منٹ دے سکتا ہوں۔ تم انیتا سے جو بھی کہنا چاہتے ہو، کہہ لو مگر کوئی بدتمیزی اور بے ہودگی نہیں۔ سمجھ گئے نا؟"

بات کے اختتام پر تنویر نے سیل فون انیتا کی جانب بڑھا دیا۔ انیتا نے بلاتمہید پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

''تم نے میری دوست انیقہ کو کھلونا سمجھ کر، اس کی عزت کو مٹی میں ملا دیا تھا، میں نے تمہارے جذبات کے ساتھ یہ اذیت ناک کھیل، کھیل ڈالا۔ حساب برابر، گیم اوور.....''

''انیتا..... میری بات سنو..... تم ایسا نہیں کر سکتیں..... کہہ دو کہ یہ سب ایک بھیانک مذاق ہے۔''

پتا نہیں، عاصم بوکھلاہٹ میں اور کیا کیا کہتا چلا گیا۔ انیتا نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد سیل فون تنویر کو تھما دیا تھا۔ تنویر نے عاصم کو مخاطب کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''ابے او چُغد.....! میں نے تمہیں زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا تھا نا.....؟ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی اوقات میں رہو۔ وہ اوقات جو ابھی انیتا نے تمہیں ذہن نشین کرائی ہے۔ اگر آئندہ کبھی تم نے انیتا کو کال کرنے یا اس سے ملنے کی کوشش کی تو میری ایک فون کال تمہیں عرصہ دراز کے لیے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچا دے گی..... فیک کیئر!''

''ویل ڈن.....'' انیتا نے پُرجوش انداز میں کہا۔

تنویر زیرِلب مسکراتے ہوئے انیتا کی آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

عاصم کے سر میں اینٹی دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ وہ ہو گیا تھا جس کی اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی توقع نہیں کی ہوگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انیتا، انیقہ کی دوست ہوگی۔ وہ تو انیقہ کو بھول بھال چکا تھا لیکن یہ زندگی ایک دائرے میں رواں دواں ہے اور اس کی یادداشت بھی بڑی قوی اور توانا ہے، یہ ایک ذرا سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ انسان کے اعمال اور افعال اس دائرے میں ہر لمحہ اس کا تعاقب کرتے رہتے ہیں اور مناسب مقامات پر جزا اور سزا کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

عاصم دونوں ہاتھوں سے اپنا سر۔ تھامے پیش آمدہ اس واہیات صورتِ حالات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہاں ایک ان نائون نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے کسی سحر زدہ انسان کے مانند وہ اجنبی کال پک کر لی۔

''ہیلو۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''عاصم.....'' ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

وہ ان لمحات میں اذیت اور کرب کی بلند منازل سے گزر رہا تھا، دوسری طرف بولنے والی کی آواز کو وہ پہچان نہیں سکا۔ اس نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

''تم کون ہو اور میرے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں حنا ہوں..... تمہاری خالہ جہاں آرا کی بیٹی.....''

''حنا! تمہاری آواز سے پریشانی جھلک رہی ہے۔'' عاصم نے متوحش انداز میں پوچھا۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' حنا کی روہانسی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ ''تم جہاں بھی ہو، فوراً کارڈیو آجاؤ۔''

''کارڈیو..... وہ کس لیے؟'' عاصم نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''تمہاری امی تو خیریت سے ہیں نا؟''

''روشن خالہ نہیں رہیں۔'' حنا نے گلوگیر آواز میں بتایا۔ ''انہیں شدید نوعیت کا ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ ہم نے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ تم آفس میں موجود نہیں ہو۔ تمہارا سیل فون بھی مسلسل بزی مل رہا تھا۔ میں نے ایک ایمبولینس منگوائی اور روشن خالہ کو اس میں لے کر دل کے اسپتال کی جانب روانہ ہو گئی مگر بدقسمتی سے بیچ راستے میں ایمبولینس کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ سی این جی کی وجہ سے آج پبلک ٹرانسپورٹ کی اسٹرائیک ہے۔ میں نے ایک نزدیکی پارک کی دیوار کے ساتھ، ایک کار کو کھڑے دیکھا تو ایمبولینس کے ڈرائیور کو اس کی طرف دوڑایا لیکن وہ کار والا کوئی بہت ہی گھٹیا اور ذلیل انسان تھا۔ اس مردود نے تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور کسی طرح خالہ کو اسپتال پہنچا دیا لیکن.....'' اس کا گلا رندھ گیا۔ لحاتی توقف کے بعد اس نے دل گرفتہ آواز میں اضافہ کیا۔

''لیکن ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے بہت دیر کر دی۔''

سیل فون عاصم کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا، وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا اور بلک بلک کر چلانے لگا۔ ''امی کو ہارٹ اٹیک نے نہیں، میں نے مارا ہے۔ میں ان کا قاتل ہوں۔ میں مردود، ذلیل، کمینہ اور گھٹیا انسان ہوں۔''

اس نے انیتا کی فریبی محبت کا شکار ہو کر اپنی ماں کے ارمانوں کا خون کیا تھا۔ ماں کا دل دکھانے والا کبھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ یہی زندگی کا دائرہ ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

❖❖❖

دورِ حاضر کی رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں نے انسان کی زندگی کو آسان تر اور تعیش پسند بنا دیا ہے... اس قدر جدیدیت کے باوجود توہم پرستی اور بھوت پریت کے تصورات سے چمٹا ہوا ہے... ایک ایسے شخص کا ماجرا جس کے مکان سے ماورائی اور تحیر انگیز عناصر شہرت پا چکے تھے...

پُراسرار انداز میں در آنے والی خوش قسمتی کا احوال.....

آسیب زدہ

تنویر واسطی

برائن ٹرنر کا چہرہ کسی شکست خوردہ شخص کے مانند اُداس لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی کار اسی جگہ کھڑی کی تھی جس کا پتا اس نے مجھے فون پر بتایا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لینن کا سوٹ شکن آلود تھا۔ وہ اپنی اسکائی بلیو لنکن کار کے ساتھ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور میں نے اس کے مکان کے سامنے سڑک کے کنارے جیپ روک کر انجن بند کر دیا۔

اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور ٹیکساس کی گرمی اپنا

رنگ دکھا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میرا بندر رنگو بھی سورج کی تپش سے بوکھلایا ہوا تھا اور جیپ سے اُتر کر میرے پیچھے سست رفتاری سے چل رہا تھا۔

''بلی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس بندر کو میرے مکان میں لے کر نہیں آؤ گے۔'' ٹرنر نے اپنا سگریٹ رنگو پر پھینکتے ہوئے کہا جو دھوپ سے بچنے کے لیے لنگن کے بمپر کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ میں مکان کے اندر آؤں تو یہ میرے ساتھ ہی ہوگا۔'' میں نے اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

ایک داڑھی والے بھاری بھرکم آدمی نے چلتے چلتے ٹرنر کو طنزیہ انداز میں سیلوٹ کیا۔ اس نے نیوی کی بیس بال کیپ پہنی ہوئی تھی۔ ٹرنر نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا جب تک کہ وہ شخص قریب کھڑی ہوئی وین تک نہ پہنچ گیا۔ اس نے ٹارچ جلا کر ٹول بکس کھولا اور پلاسٹک کی پیالی میں مشروب بھر لیا۔

''مجھے اس مکان کو بیچنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے اسے خطرہ ہو کہ کوئی اس کی بات سن نہ لے۔

اس کی آواز ہتھوڑوں کے شور اور آریوں کی بھنبھناہٹ میں دب گئی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر جھکتے ہوئے کہا۔ ''دوبارہ کہو۔''

ٹرنر نے دونوں بازو باندھے اور جھکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی اس مکان کو خریدنا نہیں چاہتا۔ میں نے اسے جنوری میں خریدا تھا اور سات مہینے سے بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''کیا تم نے اسے خفیہ رکھا ہے؟ اس کا اشتہار نہیں دیا؟''

میں نے مکان کو غور سے نہیں دیکھا کیونکہ میں ٹرنر سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ لہٰذا دوبارہ دیکھنے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ ایک حیران کن عمارت تھی جس کی تعمیر میں ہسپانوی پتھر اور سنگ مرمر کا چونا استعمال کیا گیا اور چھت میں ٹیراکوٹا ٹائلز لگائے گئے تھے۔ واک وے کے دونوں طرف پام کے درخت اور چکردار ڈرائیوے کے وسط میں ایک فوارہ تھا۔ داخلی دروازے کے تین اطراف خوب صورت ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ تیسری منزل پر ایک بالکونی اور بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کی اونچائی فرش سے چھت تک تھی۔ وہ مکان اس پورے علاقے میں مرکزِ نگاہ تھا۔

''عمدہ جگہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کوئی ماہر تو نہیں لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ تیل ہے جس کی وجہ سے معیشت متاثر ہو رہی ہے۔ افراطِ زر بڑھ گیا ہے۔ اسی لیے لوگ مکانوں میں سرمایہ کاری نہیں کر رہے۔''

رنگو اس بھاری بھرکم شخص کو دیکھ رہا تھا جو دوبارہ ہمارے پاس سے گزرا، اور اس نے بہ آوازِ بلند ٹرنر سے کہا۔ ''مت بھولنا کہ میں ہفتے کو کام پر نہیں آؤں گا۔''

''کیا تم نہیں سمجھتے کہ تمہیں اسی کام کا معاوضہ ملتا ہے۔'' ٹرنر نے غصے سے کہا۔

وہ شخص واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''اس روز میری شادی ہے۔ آخر تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ اوپر کی منزل پر ڈکٹ کا کام پیر تک مکمل ہو جائے۔'' ٹرنر نے کہا۔ وہ شخص مڑا، اور ان مزدوروں میں شامل ہو گیا جو مٹی سے بھری ہوئی ٹرالیاں لے جا رہے تھے۔

ٹرنر نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسے سڑک پر پھینک دیا اور مزدوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بہت سست لوگ ہیں۔''

''تم میری بات کا بُرا مت منانا۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی ایک دن چھٹی کرنے کی ضرورت ہے۔''

ٹرنر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور سیدھا کھڑا ہو کر اپنے بازو پھیلا دیے۔ ''میں اس مکان کا مالک ہوں۔ میرے اور بھی کئی مکانات ہیں۔ اگر میں نے اسے جلد فروخت نہ کیا تو اپنے دوسرے معاہدے پورے نہ کر سکوں گا۔ میں اس مکان کو فروخت کرنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر اس کی تزئین و آرائش کر رہا ہوں لیکن اس کی لاگت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے اس مکان کی ایک مناسب قیمت رکھی ہے اور میری کوشش ہے کہ یہ بڑھنے نہ پائے۔''

اس نے میری کہنی پکڑی اور ہم دونوں مکان سے دور سڑک کی طرف چل دیے۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ٹرنر نے میرا منہ مکان کی طرف کر دیا تاکہ میں اسے فاصلے سے دیکھ سکوں۔ ''اس کام کے مکمل ہونے کے بعد مجھے اس کی اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ یہ ایک خوب صورت مکان ہے لیکن اس کا سودا نہیں ہو رہا۔''

''کیا وجہ ہے؟ لوگ سرمایہ کاری نہیں کر رہے؟''

''نہیں، یہ وجہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔''

''آسیب زدہ۔''

ٹرنر نے آنکھیں بند کیں اور سر ہلا دیا۔ میں خاموش رہا۔

''مجھے صرف ایک ماہرانہ رائے چاہیے۔ اس کے بعد پڑوسی کیمپ فائر کے گرد بیٹھ کر کہانیاں سنانا بند کر دیں گے اور میں اس مکان کو فروخت کر سکوں گا۔''

نوعمر لڑکوں سے بھری ہوئی ایک سرخ رنگ کی ڈاج ڈائٹونا کار وہاں سے گزری اور مکان کے سامنے اس کی رفتار رینگنے کی حد تک آہستہ ہوگئی۔ انہوں نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کر ہم آواز ہو کر کہا۔ ''تم کسے بُلا رہے ہو؟ بھوت کو بھگانے والو۔'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''تم نے دیکھا کہ میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں؟'' پھر وہ تیسری منزل کی بڑی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لوگوں نے اسے وہاں دیکھا ہے۔''

''کسے؟''

''الکالیڈ کی آنکھیں۔''

ٹرنر اس کے بعد مجھے مکان دکھانے لے گیا۔ اس کمرے میں بہت گرمی تھی۔ ہمیں کام کرتے ہوئے مزدوروں، ڈبوں، بالٹیوں اور کاٹھ کباڑ کے درمیان سے گزرنا پڑا۔ ''ہمیں کام کی وجہ سے چند ہفتوں کے لیے بجلی بند کرنا پڑی۔ اس لیے اے سی نہیں چل رہا۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

رنگو ہمارے ساتھ چل رہا تھا اور اس کے راستے میں جو چیز آئی اسے منہ میں لینے کی کوشش کرتا۔ ان میں قالین، کپڑے کے ٹکڑے، فرش پر پڑا ہوا رنگ اور استر کاری کا مسالا شامل تھا۔

''ہسپانوی ٹیکساس۔'' ٹرنر نے کہا۔ ''بلکہ میکسیکن دور سے بھی پہلے الکالیڈ کا عہدہ میئر کے برابر تھا اور وہ شہر کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا۔ وہ تنازعات کا فیصلہ کرتا، ترقیاتی کام کرواتا اور پرانی ہسپانوی روایات کے مطابق شہر کا انتظام چلانے کی کوشش کرتا۔''

ہم ایک چوڑے زینے کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچے۔ ٹرنر نے مجھے ایک طویل اور تنگ راہداری میں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ٹرنر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک روایت یہ ہے کہ الکالیڈ ہمیشہ اس علاقے کے مختلف مکانوں میں رہتا رہا ہے اور یہ ہسپانوی دور کے بعد سے تیرھواں مکان ہے۔

ٹیکساس کے امریکا میں شامل ہونے کے بعد الکالیڈ کا دور ختم ہوگیا۔ ان میں کچھ امریکی تھے جو ٹیکساس آگئے۔ ان میں کئی ایک سٹی کونسل کے میئر بن گئے۔ کچھ پبلک لائف سے دور ہوگئے اور چند ایک پرانے میکسیکو چلے گئے لیکن کہا جاتا ہے کہ آخری الکالیڈ نے اسی جگہ اپنے آپ کو لٹکایا تھا۔ یہ 1845ء کی بات ہے۔''

میں نے راہداری کے آخری سرے پر پہنچ کر سگریٹ سلگایا۔ ''مجھے ایک پڑوسی نے یہ قصہ سنایا تھا۔'' ٹرنر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ راہداری کا اختتام ایک بڑے بیڈ روم پر ہوا جس کی دیواروں پر فرش سے چھت تک پتھر لگایا گیا تھا۔ اس کا فرش لکڑی کا اور بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ایک دیوار کے وسط میں آتش دان اور اس کے عین اوپر ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے کمروں کے مقابلے میں اس کمرے کی گنجائش زیادہ تھی اور بڑی کھڑکیوں کی وجہ سے یہ کمرا کافی روشن تھا۔

ہم چلتے ہوئے کمرے کے وسط میں آئے۔ ٹرنر نے اپنے بازو کھولتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ وہ جگہ ہے جہاں انہیں دیکھا گیا۔''

''کس کو؟''

''الکالیڈ کی آنکھیں۔ دو سرخ روشن آنکھیں۔ ان میں ان لوگوں کے لیے غصہ تھا جنہوں نے الکالیڈ کے اختیارات چھین لیے اور اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دو روشن سرخ آنکھیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہو گے؟'' ٹرنر نے کہا۔ ''جیسے کسی بھوت کی آنکھیں؟ تم یہی کہہ رہے ہو نا؟ تمہارا خیال ہے کہ اس کمرے میں کسی بھوت کی آنکھیں ہیں؟''

ٹرنر نے سر ہلایا۔ ''یہ سُن کر مجھے بھی ہنسی آئی تھی لیکن اس علاقے میں بہت لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں اور اب مجھے بھی یقین آگیا ہے۔''

''تم نے بھوت کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ تم یہی کہہ رہے ہو نا؟''

ٹرنر کھڑکی تک چلتا ہوا گیا اور باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ شب پی وی سی پائپ منگوائے تھے لیکن ایک ورکر

نے غلط جگہ اتار دیے۔ میں اپنی کار میں آیا لیکن میں نے ڈرائیوے میں وہ پائپ نہیں دیکھے لہٰذا میں اپنی کار کھڑی کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے وہ پائپ مکان کے عقبی حصے یا کہیں اور رکھ دیے ہوں گے۔ جب میں کار سے باہر آیا تو وہ آنکھیں وہاں موجود تھیں۔ آگ کی طرح سرخ اور وہ مجھے گھور رہی تھیں جیسے شیطان کی آنکھیں ہوں۔"

"شیطان۔"

"اور یہیں پر بات ختم نہیں ہوئی۔" ٹرنر نے کہا۔ "جیسے ہی میں مکان کے قریب پہنچا۔ میرے کانوں میں ہسپانوی موسیقی کی آواز آئی۔ وہ سرخ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور میں بے یار و مددگار کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔"

"حیرت ہے۔"

"تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں نے ایک ہاتھ کو آگے بڑھتے دیکھا جو کسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ برسوں پہلے مرا ہوا الکالیڈ ایک بددروح کی طرح پنجے نکالے ہوئے تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے حرکت کی لیکن وہ وہاں بھی تھا۔ میں نے ایک ہاتھ دیکھا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو میں دہشت زدہ ہو گیا پھر میں نے جو دیکھا اسے سمجھنے کی کوشش کی، اس کے بعد میں پاگل ہو گیا۔ میرا مکان خطرے میں ہے اور میں نے اس پر ایک بڑی رقم خرچ کی ہے۔"

"اسی لیے تمہیں غصہ آ رہا ہے؟"

"نہیں، مجھے غصہ الکالیڈ، اس کے قصوں اور اس کی روشن سرخ آنکھوں پر ہے، جس کی وجہ سے خریدار قریب نہیں آ رہے اور پیسا لگانے پر تیار نہیں۔" ٹرنر کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "پُرسکون ہو جاؤ۔ تم نے جلا ہوا توس نہیں سونگھا۔"

"نہیں، میں اپنے نقصان کی بو سونگھ رہا ہوں۔ بہرحال گزشتہ شب میں اس کا شور سن کر آیا۔" ٹرنر نے کہا۔ "میں سامنے والے دروازے پر گیا لیکن اس میں تالا لگا ہوا تھا کیونکہ سب لوگ کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ میں اپنی چابی اور ٹارچ لینے کار پر گیا۔ اس وقت بھی میں نے ہسپانوی موسیقی کی آواز سنی اور ان سرخ روشن آنکھوں کو دیکھا۔ میں نے جلدی سے دروازے کا تالا کھولا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا لیکن جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔"

"تم نے کچھ دیکھا اور سنا جب تم کمرے میں آئے؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب میں کمرے میں آیا تو یہاں مکمل تاریکی تھی۔ میں نے اس کے علاوہ دوسرے کمرے بھی دیکھے۔ اس وقت یہاں صرف میں تھا اور ایک بے وقوف شرابی کی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔"

"لیکن تم نے سڑک سے دو روشن سرخ آنکھیں دیکھیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، میں نے موسیقی سنی اور کسی چیز کو حرکت کرتے ہوئے بھی دیکھا لیکن جب میں اوپر آیا تو....." اس نے کندھے اچکا دیے۔ "اب میرا ارادہ ہے کہ اس کام کے ختم ہونے کے بعد ہوسٹن اور ڈلاس کے اخبارات میں اشتہار دوں۔ اُمید ہے کہ کوئی ایسا گاہک مل جائے گا جس کی یہاں پڑوسیوں سے بات نہ ہوئی ہو۔"

میں نے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی بھی سرخ رنگ کی چیز نہیں تھی جو روشنی پڑنے پر چمکنے لگتی پھر میں کھڑکی پر گیا اور باہر دیکھا۔ سڑک کے پار مکانات تھے اور نیچے اس مکان میں داخل ہونے کا دروازہ۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔

وہ بھاری بھرکم شخص ایک دوسرے مزدور کے ساتھ کمرے میں آیا اور رنگ کی بالٹیاں رکھ کر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد ٹرنر نے اپنی جیکٹ کے بٹن کھولے اور ایک بٹوے سے پانچ سو ڈالر کے نوٹ نکالے۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری فیس بھی اس مکان کی مرمت و آرائش پر ہونے والے اخراجات کا حصہ ہے۔ تم اس بھوت کو باہر نکالو تاکہ میں اور میری فیملی سکون کا سانس لے سکیں۔"

"میں لائسنس یافتہ پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور نہ ہی مجھے برسوں پہلے مرے ہوئے کسی ہسپانوی بیوروکریٹ سے نمٹنے کا تجربہ ہے۔"

"لیکن تم نے پہلے بھی اس طرح کے کیس حل کیے ہیں۔" ٹرنر نے کہا اور قمیص کی جیب میں نوٹ ڈال دیے۔ "تم اس کام کے لیے بالکل مناسب ہو۔"

میں فیس کے بغیر بھی اس کی مدد کرتا کیونکہ مجھے بوریت سے بچنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت تھی۔ ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے۔ اپنی کار کے پاس پہنچ کر ٹرنر نے

میرے ہاتھ پر ایک چابی رکھی۔

"یہ بیرونی دروازے کی ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے ایک لنچ میں جانا ہے لیکن تم اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان لوگوں سے کہہ سکتے ہو۔" اس نے وہاں کام کرتے ہوئے مزدوروں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے جیپ سے دو لان چیئرز نکالیں اور انہیں بیرونی صحن میں رکھ دیا اور ان کے درمیان ایک چھتری بھی لگا دی پھر میں نے کولر سے ایک ٹھنڈی بیئر کا ٹن نکالا اور اسے کھول کر ایک گھونٹ لیا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی اور میں مزدوروں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

میرا ارادہ ان مزدوروں سے بات کرنے کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے کچھ سنا ہو لیکن وہ مسلسل کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بیئر ختم کی اور رگھو سے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت یہ لوگ مجھ سے بات کر سکیں گے۔"

میں نے خالی ٹن جیپ کے پچھلے حصے میں پھینکا اور پھر کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ایک دروازے پر گیا۔ شمال کی جانب پہلے اور دوسرے گھر میں کوئی نہیں تھا لیکن تیسرے گھر میں مجھے ایک درمیانی عمر کی عورت پورچ میں کھڑی نظر آئی۔ میں فٹ پاتھ سے اُتر کر اس کی جانب بڑھا۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"میرا نام بلی ہے اور میں اس بڑے مکان کے مالک ٹرنر بروکس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔" میں نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے وہاں کوئی غیر معمولی بات دیکھی ہے؟"

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "صرف بڑے بڑے بدنما ٹرک، وین اور ٹریکٹرز جن سے ڈر لگتا ہے۔ اگر ان مزدوروں نے میرے گھر کے سامنے گاڑیاں کھڑی کرنا بند نہ کیں تو میں ایسوسی ایشن یا سٹی کونسل میں شکایت کر دوں گی اور ان کا اجازت نامہ منسوخ ہو جائے گا۔"

"تو تم نے وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی؟" میں نے پوچھا۔ "مثلاً کام کے اوقات کے بعد لوگوں کا آنا جانا؟ کوئی ایسی بات جو معمول سے ہٹ کر ہو؟"

"تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا میرا کام لوگوں کی نگرانی کرنا ہے؟ انہیں بتا دو کہ سڑک کے کنارے ریت بجری کا ڈھیر نہ لگائیں، سمجھ گئے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے سڑک پر بنے ہوئے دوسرے مکانوں کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں سے کچھ معلوم نہ ہوا۔ صرف ایک پڑوسی نے دعویٰ کیا کہ اس نے آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ عورت ٹرنر کے مکان کے بالکل سامنے سڑک کے پار رہتی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اس قسم کی احمقانہ باتوں پر یقین رکھتی ہوں۔" گریس ویلنٹائن نے کہا۔ "لیکن تم نے پوچھا ہے کہ میں نے ایسی کوئی چیز دیکھی تو مجھے سچ بتانا ہوگا۔" اس نے سگار جلا کر ایک کش لیا اور ٹرنر کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہاں اوپر کی منزل پر ایک بڑی کھڑکی ہے۔ اس میں دو سرخ روشن آنکھیں نظر آتی ہیں۔"

"واقعی؟"

"میں صبح پانچ بجے کے قریب صحن میں اخبار اٹھانے گئی تب میں نے وہ آنکھیں دیکھیں۔ انہیں دیکھ کر بدن میں سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے موسیقی کی آواز بھی سنی۔"

"وہ کس قسم کی موسیقی تھی؟"

"ہسپانوی طرز کی۔ اس کا مجھ پر ناخوشگوار ردِعمل ہوا کیونکہ میں لاطینی موسیقی پسند کرتی ہوں۔ کیا میں جان سکتی ہوں کہ تم کیا تلاش کر رہے ہو؟"

ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ گزشتہ کرسمس میں اپنی عمر رسیدہ ماں کی دیکھ بھال کے لیے لاس اینجلس سے یہاں آئی تھی۔ اس کی ماں ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہے پھر وہ اپنے کتے کو لے کر اٹھی اور گھر کے اندر چلی گئی۔

جب میں واپس آیا تو مزدور اپنا کام ختم کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے اور کچھ پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا کہ کیا انہوں نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی ہے۔ ان میں زیادہ تر مزدور میکسیکن تھے اور میری ہسپانوی اتنی زیادہ اچھی نہیں ہے پھر ایک مزدور نے ترجمہ کر کے میری بات دوسروں تک پہنچائی۔

جب ایک بار سب لوگ سمجھ گئے تو انہوں نے میری طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ چند ایک نے قہقہہ لگایا۔ کسی نے بھی ان آنکھوں کے بارے میں نہیں سنا تھا یا کم از کم ان کے پاس اس بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی۔ نیوی کیپ والے بھاری بھر کم شخص نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ آنکھیں گھماتا ہوا اپنی وین میں بیٹھ کر چلا گیا۔ جب سب مزدور چلے گئے تو میں نے ایک سگار سلگایا اور سیاہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا پھر میں نے بالائی منزل کی کھڑکیوں کو دیکھا۔ وہاں بھی تاریکی اور خاموشی تھی۔

سگار ختم کرنے کے بعد میں رنگو کو لے کر ایک مقامی ریستوران میں ڈنر کرنے چلا گیا۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور بقیہ پیک کروا لیا۔ دس بجے کے قریب ہماری واپسی ہوئی اور ہم دوبارہ ٹرنر کے مکان کی طرف چل دیے۔ میں نے ٹرنر کی دی ہوئی چابی سے دروازہ کھولا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ پہلی منزل پر مکمل تاریکی تھی۔ میں نے اپنی ٹارچ جلائی تو میں نے دیکھا کہ میرے بالکل سامنے اور سر کے اوپر تین آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

میں زور سے چلایا اور پیچھے کی طرف اچھلا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو معلوم ہوا کہ میرے سر کے اوپر ایک کرسٹل کا فانوس آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے اور میری ٹارچ کی روشنی اس کے بیضوی شیشوں پر پڑ کر منعکس ہو رہی ہے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی بقیہ دالان پر ڈالی۔ وہاں رنگ اور پلاستر کی بالٹیاں اور ٹائلز دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

میں بڑی مشکل سے زینہ چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچا۔ وہاں شدید گرمی تھی۔ جس بیڈ روم میں مبینہ طور پر الکالینڈ کی ناراض آنکھوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا، وہاں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جو میں نے سہ پہر میں دیکھا۔ وہی بڑی کھڑکیاں، آتش دان، اس کے اوپر لگا ہوا آئینہ اور گرد آلود لکڑی کا فرش۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اردگرد آوازوں کو سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل خاموشی تھی۔ میں سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا اور رنگو کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔

جیپ سے مجھے مکان کی بالائی منزل بالکل صاف نظر آ رہی تھی جہاں مبینہ طور پر وہ آنکھیں دیکھی گئیں۔ میں نے جیپ کی چھت کھول دی تاکہ ہوا اندر آ سکے پھر سیٹ کی پشت پر ٹیک لگا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے رنگو کے منہ پر تولیا ڈال دیا اور جونہی اس نے آنکھیں بند کیں۔ میں نے دھیمی آواز میں ریڈیو آن کر دیا۔

میں بڑے آرام سے بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا اور میری نظریں کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی تک وہاں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اچانک میری جیپ سفید روشنی میں نہا گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا چند سیکنڈ بعد میں نے آنکھیں چندھی کر کے دیکھا تو مجھے ایک سر نظر آیا۔ اس کے منہ سے روشنی باہر آ رہی تھی اور اس کی دونوں آنکھیں ونڈ شیلڈ کی طرح صاف تھیں۔

عیدی خوشیوں سے مزین مئی 2021 کا شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

افشاں آفریدی، نایاب جیلانی

کے سلسلے وار ناول ایک دلچسپ دوراہے پر

عنیزہ سید کا خوب صورت مکمل ناول،

سانجھ بھئی چودیس

عالیہ حرا اور فوزیہ سرور

کے شاہکار ناولٹ

اندازِ نو میں ملیے ...... ریڈیو کی

گنگناتی آواز عروج فاطمہ سے

بُخل، مذمّت الٰہی ......

اختر شجاعت کا پُر اثر مضمون

شائستہ زرین کا شاندار سروے

اس کے علاوہ

اُمِ ارسلان، سعدیہ ہما شیخ،

قرۃ العین سکندر، انعم سجیل،

روبینہ شاہین، عائشہ تنویر

کی دلچسپ تحریریں......

پُر تنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں سے مزین، شعر و شاعری سے مرصع اور حُسن و صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے ......

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک پولیس آفیسر مجھے جگانے کے لیے سیٹی بجا رہا تھا پھر اس نے میرے چہرے پر اپنی بھاری ٹارچ سے روشنی ڈالی۔

''بلی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' آفیسر نے کہا۔

میں نے دو سال مقامی پولیس میں ملازمت کی تھی۔ اس لیے بیشتر پولیس والے مجھے جانتے تھے۔ ''ٹومی لوہیز؟'' میں نے اپنا چہرہ ملتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا گولف کیسا چل رہا ہے؟''

''افسوس ناک لیکن میں کم از کم اپنی کار میں نہیں سو رہا۔''

میں جیپ سے اُترا اور اسے بھوت کی آنکھوں کے بارے میں بتایا۔ وہ میرے قریب آیا اور میرا منہ سونگھ کر دیر تک گھورتا رہا۔ غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نشے میں ہوں۔ اس نے مجھے چند ناگوار القابات سے نوازنے کے بعد حکم دیا کہ میں سورج نکلنے تک مزید نشہ نہ کروں اور اس کے بعد اپنی کشتی پر واپس چلا جاؤں پھر وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میری گھڑی میں صبح کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب الکالیڈ کی آنکھیں نظر نہیں آئیں گی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اس سے پہلے کہ میں ہیڈ لائٹس کا سوئچ آن کرتا۔ دو روشن سرخ آنکھیں اوپر کی منزل والی کھڑکی میں نمودار ہوئیں۔

میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور منہ پر تھپڑ مارا تاکہ یقین ہو جائے کہ میں پہلے کی طرح خواب نہیں دیکھ رہا۔ میں نے دوبارہ کھڑکی پر نظر ڈالی۔ وہ آنکھیں وہاں موجود تھیں۔ میں نے جیپ کا انجن بند کیا اور اُتر کر ٹرنر کے مکان کی طرف چل دیا۔

دروازے میں چابی لگاتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا شور سنائی دیا۔ اس گانے میں ایک وارننگ تھی جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو۔ اس میں گٹار اور بگل کے ساتھ تین یا چار آدمیوں کے گانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ وہ کوئی پرانا اور روایتی ہسپانوی گانا تھا۔ مجھے ہسپانوی زبان پر اتنا عبور نہیں تھا کہ میں اسے سمجھ سکتا۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا اس دوران گٹار کی آواز خالی مکان میں گونجتی رہی۔ ابھی میں دوسری منزل پر تھا کہ وہ آواز رک گئی۔ میں نے تیسری منزل کی طرف دیکھا۔ اب بھی ایک مدھم سرخ روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اوپر جانے میں ہر ممکن تیزی دکھائی لیکن جیسے ہی میں تیسری منزل پر پہنچا وہ روشنی غائب ہو گئی۔ میں جلدی میں ٹارچ لانا بھول گیا تھا۔ اس لیے اندھیرے میں راہداری عبور کرنے اور بیڈ روم تک جانے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

جیسے ہی راہداری ختم ہوئی، میرا دل اچھلنے لگا۔ یوں لگا کہ جیسے میرا خون سمٹ کر کانوں میں آ گیا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ بڑی کھڑکیوں سے روشنی اندر آ رہی تھی اور میں وہاں ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ بڑی کھڑکیاں، گرد آلود لکڑی کا فرش، آتش دان اور اس کے اوپر لگا ہوا بڑا سا آئینہ اور پتھروں سے بنی ہوئی اندرونی دیوار۔

رنگو نے فضا میں کسی چیز کی بُو محسوس کی اور میرے کندھے سے اتر کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کی دم تیزی سے ہل رہی تھی۔ وہ جوش کے عالم میں ایسا ہی کرتا تھا۔ میں کھڑکی کی طرف گیا۔ میں نے باہر لان، فوارہ، سڑک اور اپنی جیپ دیکھی، اندر مکمل تاریکی تھی اور نیچے سے صرف جھینگر کے ٹرانے کی آواز آ رہی تھی۔

''اچھوا!''

''خدا تم پر رحم کرے۔'' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

پھر میں نے جو کچھ سنا، اس نے میرے دماغ کو جکڑ لیا۔ میں تیزی سے گھوما۔ کمرا خالی پڑا ہوا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میری کھوپڑی جھنجھنانے لگی۔ پہلے تو میں حرکت ہی نہ کر سکا پھر آہستہ آہستہ وہ منظر واضح ہونے لگا۔ رنگو جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔

پھر سب کچھ ایک دم ہی ہو گیا۔ رنگو نے ایک پتھر پکڑا جو دیوار سے آیا تھا۔ دیوار کا پانچ فٹ حصہ قبضوں پر باہر کی جانب گھوم گیا پھر کمرے میں سرخ روشنی پھیل گئی۔ دیوار کے اندر سرخ روشنی تھی جیسے کسی شخص کا جسمانیت سے محروم چہرہ ہو۔

میری چیخ نکل گئی۔ رنگو چلّایا۔ وہ چہرہ بھی چلایا۔ اس کی گھنی داڑھی سرخ ہو رہی تھی۔

پولیس کی ملازمت کے دوران میرا ایک ٹرینر سے دو بدو مقابلہ ہوا۔ اس کا ایک ہی اصول تھا کچھ کرو، کچھ بھی۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ اس وقت مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ میں نے اپنی چابیاں اس کے سر پر دے ماریں۔

''او۔'' اس کے حلق سے آواز نکلی اور سرخ روشنی بجھ گئی۔ کوئی بھاری وجود شے فرش سے ٹکرائی۔

"او، او، او۔" اس چہرے نے کہا جو ایک بھاری بھرکم شخص سے جڑا ہوا تھا اور وہ دیوار میں بننے والی محفوظ جگہ سے باہر آرہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جھک کر وہ چیز اٹھائی جو اس نے پھینکی تھی۔ وہ ایک ٹارچ تھی۔ میں نے اسے آن کیا اور ایک سرخ بلب جل اٹھا جس کی روشنی ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھی۔

"یہ واقعی تکلیف دہ ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

یہ ٹرنر کے عملے کا وہی بھاری بھرکم شخص تھا جسے چھٹی نہ ملنے کی شکایت تھی۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں؟" میں نے کہا۔ "تم اپنے آپ کو کیوں بھوت کے روپ میں ظاہر کر رہے ہو؟"

وہ دبی زبان سے ہنسا اور میری کار کی چابیاں واپس کرتے ہوئے بولا۔ "میرا اس جگہ کو آسیب زدہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ہفتے کے روز کسی بے وقوف کی طرح نظر نہیں آنا چاہتا تھا اور یہ واحد جگہ ہے جہاں میں تنہائی میں پریکٹس کر سکتا ہوں۔ میری اس ہفتے شادی ہے اور مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔ ہمارے خاندان میں اس کا رواج نہیں ہے۔"

اس نے فرش میں بنا ہوا خفیہ دروازہ کھول کر میوزک پلیئر اور دو بڑے اسپیکر نکالے اور انہیں فرش پر رکھ کر ایک بٹن دبایا۔ اسپیکر سے ہسپانوی موسیقی کی تیز آواز آنے لگی پھر اس موٹے تازے آدمی نے مجھ سے ٹارچ لے کر آتش دان کے اوپر اس طرح رکھ دی کہ اس کے بلب کا رخ کھڑکی کی طرف ہو، جب اس کی روشنی آئینے میں منعکس پڑتی تو ایک جیسے سرخ ڈیلے نظر آتے اور سڑک پر سے دیکھنے والا انہیں بھوت کی آنکھیں سمجھتا۔

موسیقی کی دھن پر اپنا سر ہلاتے ہوئے وہ شخص کمرے کے وسط میں آیا اور اس نے دونوں بازو اس طرح پھیلا دیے جیسے کسی پارٹنر کے ساتھ رقص کر رہا ہو۔ میں نے اسے ٹارچ کی سرخ روشنی میں دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"تم واقعی ڈانس نہیں کر سکتے۔"

"ماریا کی فیملی بہت روایتی ہے۔" اس نے کہا۔ "استقبالیہ کونزل میں ہوگا اور انہوں نے خاص طور پر اس موقع کے لیے ایک بینڈ کی خدمات حاصل کی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے احمق نظر آؤں۔"

جا...

"تم نے یہ سرخ روشنی والی ٹارچ کہاں سے حاصل کی؟" میں نے پوچھا۔

"نیوی۔" اس نے کہا۔ وہ ڈانس کرتے کرتے رک گیا اور اس نے اپنی کیپ اتار کر مجھے دے دی۔ میں نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ لکھا تھا۔ "ایس ایس این ناروا۔"

"میں وہاں سب ڈرائیور تھا۔ ہم کشتی چلاتے ہوئے راستہ تلاش کرنے کے لیے اسے استعمال کرتے تھے۔ یہ اس گھر کا سب سے بڑا کمرا ہے اور میں اپنے گھر میں پریکٹس نہیں کر سکتا کیونکہ ماریا کو معلوم ہو جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ سرخ روشنی دیکھ کر لوگ یہی سمجھیں گے کہ مکان میں چور یا وحشی آ گئے ہیں۔"

"لیکن اب لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بات کیسے شروع ہوئی؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تم معلوم کر سکتے ہو۔ میں صرف ہفتے کے لیے تیار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے اکالیڈ کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔ میرے پاس صرف تین دن باقی ہیں اور ابھی تک میں نہیں جانتا کہ کیسے ڈانس کیا جاتا ہے۔"

"تم یہاں کیسے آئے؟" میں نے پوچھا۔ "گھر کے سامنے کوئی ٹرک یا دوسری گاڑی نہیں کھڑی ہے۔"

"میں نے چند گھر چھوڑ کر گاڑی کھڑی کی اور پیدل چل کر یہاں تک آیا۔"

"اوہ، میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم نے کس مکان کے سامنے گاڑی کھڑی کی ہے۔ تم ماریا کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تمہیں ڈانس کرنا نہیں آتا۔ اگر وہ تم سے محبت کرتی ہے تو اس پر اصرار نہیں کرے گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اسے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے ڈانس کرنا آتا ہے۔ ہم چار سال سے ساتھ ہیں اور جب بھی ہمیں ڈانس پر جانا ہوتا ہے تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا ہوں۔"

اس کے کندھے ڈھلک گئے۔ "معاف کرنا، میں نے تمہیں ڈرا دیا۔ اس مکان کا پہلا مالک بہت بڑا شکاری تھا۔ اس نے اپنی بندوقیں رکھنے کے لیے دیوار میں وہ خفیہ جگہ بنائی تھی اور جب میں نے ٹرنر اور اس کے بعد تمہیں اوپر آتے سنا تو فوراً اپنا سامان لے کر اس میں چھپ گیا۔"

میری قوت برداشت...

... جواب دے چکی تھی۔ میں نے ...یوزک پلیئر بند کیا اور اسے فرش سے اٹھا لیا پھر میں نے

راہداری سے رنگو کو لیا اور اس شخص سے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ناشتا کرواتا ہوں۔'' اس کے بعد میں نے اسے ریستوران کا پتا سمجھایا اور مکان کو مقفل کر کے باہر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی وین کی طرف چل دیا۔

میں نے اپنی جیپ میں سوار ہوتے وقت دیکھا کہ گریس ویلنٹائن لان سے اخبار اٹھا رہی ہے۔ میں سڑک پار کر کے اس کے پاس چلا گیا۔

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''مس ویلنٹائن؟''

اس نے اخبار اپنی بغل میں دبایا اور مجھ سے ملنے کے لیے دروازے پر آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑا ہوا تھا جس پر ٹیکسی اسٹوڈیوز لکھا ہوا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔ ''تم صبح جلدی کام شروع کر دیتے ہو۔''

''ہاں اور شام کو دیر تک مصروف رہتا ہوں۔ مجھے ایک بات بتاؤ، تم اپنی ماں کی مدد کے لیے لاس اینجلس سے آئی ہو جو کہ ایک ٹیچر تھی۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔''

''کیا اسے تاریخ پڑھانے کا موقع ملا؟''

وہ مسکرائی۔ ''یہ بھی صحیح ہے۔ اس نے ساتویں کلاس کو ٹیکساس کی تاریخ پڑھائی تھی۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کون الکالیڈ کے بارے میں افواہ پھیلا سکتا ہے؟ بلکہ اب کون ہے جو اس کے بارے میں جانتا ہے؟''

''تمہیں میری ماں پر تہمت لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بے چاری نوے برس سے زیادہ کی ہے۔ میں ہسپانوی دور کے ٹیکساس کے بارے میں اس کی کتابیں پڑھ رہی تھی جب میں نے ایک رات اس مکان میں سرخ لائٹس دیکھیں تو میرے ذہن میں الکالیڈ کا خیال آیا۔ میں نے ان لائٹس کی حقیقت جاننے کے لیے اپنی دوربین استعمال کی۔ کیا تم یقین کرو گے کہ وہ شخص ناچ رہا تھا؟''

''بہت خوفناک۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے الکالیڈ کی کہانی گھڑ کر بے چارے ٹرنر کا بہت نقصان کیا ہے۔ اس نے اس مکان پر جو سرمایہ کاری کی تھی وہ پھنس گئی ہے۔ لوگ اسے آسیب زدہ سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی اسے اس مکان کو [illegible] نہیں خرید رہا۔''

اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹرنر سے کہو کہ ابھی اس مکان کو فروخت نہ کرے۔ الکالیڈ کی کہانی اب محض افواہ نہیں بلکہ اسکرپٹ ہے جو فروخت ہو گیا ہے اور اس پر فلم بن رہی ہے۔''

''اوہ، جب تم نے بتایا کہ تمہارا تعلق لاس اینجلس سے ہے تو اس کا مطلب ہالی ووڈ تھا؟''

اس نے آنکھیں جھپکائیں اور بولی۔ ''اس کی فلم بندی تین مہینے بعد شروع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ ٹرنر کو لوکیشن فیس لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، یہ مکان بہت مشہور ہو جائے گا کیونکہ ہر کوئی ایسی کہانی پسند کرتا ہے۔''

ریستوران میں سب میزیں بھر چکی تھیں۔ جب مالک کی بیوی جولیا نے ایک ہسپانوی دھن پر اس بھاری بھرکم شخص کے ساتھ رقص شروع کیا تو وہاں موجود لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام مائیک یوکی ہے اور اس نے پوری کوشش کی کہ اپنی ہم رقص کے ساتھ قدم ملا کر رقص کرے۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی اطمینان ہو گیا کہ اب اسے شادی کے استقبالیہ میں اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے شرمندگی نہیں ہوگی۔

''مجھے تمام مزدوروں کو فارغ اور اس عورت پر مقدمہ کر دینا چاہیے۔'' ٹرنر نے ناشتا ختم کرنے کے بعد کہا۔ وہ بہت غصے میں تھا جب اسے ان آنکھوں کی حقیقت معلوم ہوئی۔

''یہ احمقانہ بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا مکان بہت شاندار ہے اور کام بھی تقریباً مکمل ہونے والا ہے اور اگر واقعی وہ فلم بنتی ہے تو تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ جس مکان میں اینٹی ول ہارر کی شوٹنگ ہوئی تھی وہ تقریباً دس لاکھ ڈالر میں فروخت ہوا۔ اس کے علاوہ تمہیں لوکیشن فیس بھی ملے گی۔''

''واقعی؟'' وہ اپنی تھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''ہو سکتا ہے کہ آج میں اس عورت کے گھر جاؤں۔ اس سے پوچھوں گا کہ فلم کا پروجیکٹ کس مرحلے میں ہے۔ شاید لوکیشن فیس کے بارے میں بھی کوئی بات ہو۔''

مجھے ٹرنر کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ اسے جن آنکھوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہی اس کے لیے لامحدود آمدنی کا ذریعہ بن گئیں۔ دیکھا جائے تو اس کا سہرا مائیک کو جاتا ہے اگر وہ یہ ناٹک نہ رچاتا تو ٹرنر کو بھی میری خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور نہ میں بھی معاملے کی تہ تک نہ پہنچ پاتا۔ اب مجھے صرف یہ حساب لگانا تھا کہ ٹرنر کو ملنے والی رقم میں میرا حصہ کتنا ہوگا...

❖❖❖

pklibrary.com

وحشی

مرزا عمران بیگ

دولت کی ہوس انسان کو وحشی بنا دیتی ہے... ایسی وحشت جس میں مبتلا ہو کے ہر وہ قدم اٹھاتا ہے جس کے بارے میں سوچنا ممکن نہ ہو... کھیلی گئی بازی کو جیت لینے کے لیے وہ پتھروں سے ٹکرا گئی...

ایک فتنہ ساماں حسینہ کی چالاکیاں..... ہوسِ زر نے اسے وحشی بنا دیا.....

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں نیند کی گولیوں کی شیشی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ ہتھیلی میں گولیاں بھر کر آہستہ آہستہ اپنے منہ کی جانب لے جا رہی تھی۔ وہ ان گولیوں کو کھانے کی ہمت کر رہی تھی۔ اس کے ارادے خطرناک تھے۔ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہ رہی تھی۔ اسی وقت اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے ہلا اور گولیاں فرش پر بکھر گئیں۔ اس کی وجہ کمرے میں آنے والی ایک دوسری لڑکی تھی جس نے بروقت اس کی جان بچائی تھی۔

pklibrary.com

"یہ کیا کر رہی ہو تم.....؟" نووارد لڑکی نے چلاتے ہوئے پوچھا۔

"جانتی تو ہو تم۔" پہلی لڑکی نے جواب دیا۔

"فرزانہ..... یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔" دوسری لڑکی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے سمجھایا۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ..... کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ فرزانہ کو گلے لگا کر تھپکنے لگی لیکن اس کی آنکھیں گہری سوچ میں گم تھیں۔

☆☆☆

پولیس کا عملہ اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مصروف تھا کہ وہی جوان اور خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی جس نے فرزانہ کی جان بچائی تھی۔

"جی محترمہ..... فرمایئے۔" ایک پولیس اہلکار نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"مجھے انسپکٹر زوار سے ملنا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"مجھے بتایئے..... کیا کام ہے؟" پولیس اہلکار نے کہا۔

"نہیں..... مجھے انہی سے ملنا ہے۔" لڑکی نے اصرار کیا۔

"بتائیں تو سہی..... معاملہ کیا ہے؟" پولیس اہلکار نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں انہی کو بتاؤں گی۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"ایسی کون سی بات ہے جو صرف انسپکٹر صاحب کو ہی بتائی جائے گی۔" پولیس اہلکار نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اکبر خان!" اس سے پہلے کہ لڑکی جواب دیتی، انسپکٹر کے کمرے سے آواز آئی اور وہ پولیس اہلکار مستعد ہو کر اس کمرے کے دروازے تک گیا۔ "جی صاحب۔"

"اندر آنے دو اسے۔" اندر سے حکم ملنے کے بعد اس نے جلدی سے لڑکی کو انسپکٹر کے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ لڑکی اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی انسپکٹر بیٹھا تھا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم ہانیہ ہو؟" انسپکٹر زوار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ شاہد احمد خان کی بیٹی۔"

باپ کے ذکر پر لڑکی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ کا ذکر بہت سنا ہے گھر میں..... جبھی آپ سے ملنے پر اصرار کیا۔"

"ہم..... سیٹھ صاحب بہت مہربان آدمی ہیں۔" زوار نے کہا۔ "ان کے بہت سے مسئلے حل کروائے ہیں میں نے۔"

"جانتی ہوں۔" ہانیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اکثر اپنے گھر میں دیکھتی تھی۔"

"جی جی۔" زوار ہنستا ہوا مخجل سا ہو گیا "خیر..... اب بتاؤ کیا کام ہے؟"

"مجھے آپ کی مدد چاہیے۔" ہانیہ نے کہا۔ "اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں..... میں بہت سوچ سمجھ کر آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"ہاں تو بتاؤ۔" زوار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم تو بیٹھے ہی آپ لوگوں کی خدمت کے لیے ہیں۔ آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔"

"لیکن اس سلسلے میں آپ کسی شخص کے دباؤ میں نہیں آئیں گے۔" ہانیہ نے کہا۔ "خواہ وہ شخص سیٹھ شاہد ہی کیوں نہ ہو۔" زوار کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ کے ان سے گہرے مراسم ہیں..... آپ ان کے کام آتے ہیں اور وہ آپ کے..... لیکن یہ تعلقات انصاف پر اثر انداز نہیں ہوتے ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" زوار جیسے کچھ مزید کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہیں پایا۔

"اس کے علاوہ میں آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گی۔" ہانیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس سے پہلے کہ زوار کچھ بولتا، ہانیہ نے کہا۔ "اس میں مالی تعاون بھی شامل ہے۔"

زوار کچھ دیر کشمکش و پیچ کا شکار رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہانیہ اس کی اور سیٹھ شاہد کی ملی بھگت کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ سیٹھ شاہد کے بیشتر کاروباری مسائل اپنے عہدے کے بل بوتے پر حل کروا دیا کرتا تھا اور اس کے بدلے مالی فائدہ حاصل کرتا تھا۔ اسے ہانیہ کی پیشکش پر انکار یا اعتراض کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی۔ وہ سر کھجا کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے..... آپ بتایئے۔"

"ہم....." ہانیہ اطمینان سے مسکرائی اور بولی۔ "میں ایک شخص کے خلاف شکایت درج کروانا چاہتی ہوں۔"

"کس شخص کے خلاف.....؟" زوار نے پوچھا۔

"کفیل الدین۔" ہانیہ نے مختصر جواب دیا۔ "ہمارے علاقے کا ڈریس ڈیزائنر ہے۔"

زوار نے ہانیہ کی طرف چونک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اور شکایت کیا ہے؟"

جواب میں ہانیہ نے نظریں جھکا لیں جیسے کچھ بتانے کی ہمت جمع کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے

تھے۔

☆☆☆

ایک سادہ سے بوتیک میں ایک شخص سر جھکائے اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ کسی کپڑے کے معیار کو جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بوتیک میں ایک طرف مردانہ پوشاکیں لگی ہوئی تھیں تو دوسری طرف زنانہ۔ جبکہ ایک کونے میں بچوں کے کپڑے بھی سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اس کام میں اتنا محو تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کے بوتیک کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ انسپکٹر زوار کار سے اتر کر اس کی دکان میں داخل ہوا اور میز پر ہاتھ مار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ کام میں مصروف شخص نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پینتیس سے چھتیس برس کا ایک خوش شکل شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔

"جی فرمایئے۔" اس شخص نے کہا۔

"کفیل الدین۔" زوار نے اس کے نام کی تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہی نام ہے نا تمہارا۔"

"جی بالکل۔" کفیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کرتے ہو؟" زوار نے سوال کیا۔

"آپ دیکھ سکتے ہیں..... پیشے کے لحاظ سے ایک ڈریس ڈیزائنر ہوں۔" کفیل نے مسکرا کر جواب دیا۔

"زنانہ اور مردانہ دونوں لباس سیتے ہو.....؟" زوار نے ایک اور سوال داغا۔

"جی ہاں..... بچوں کے بھی۔ اپنے ڈیزائن کردہ لباس مختلف درزیوں سے سلواتا ہوں۔ آپ بتایئے..... آپ کو کس کے لیے کپڑے سلوانے ہیں۔" کفیل بتانے لگا۔

"ناپ بھی تم خود ہی لیتے ہو؟" زوار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں..... یہاں تو میں سارا کام خود ہی کرتا ہوں، جبھی اس علاقے میں میرا کام مشہور ہے، اس بوتیک میں ملازم کوئی نہیں رکھا۔" کفیل نے جواب دیا۔

"اچھا..... اور ناپ لیتے ہوئے..... غیر اخلاقی حرکتیں بھی کرتے ہو؟" زوار اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ کیسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہیں؟" کفیل حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

"بات بے ہودہ ضرور ہے لیکن غلط تو نہیں ہے نا۔" زوار نے کہا۔

"تم کون ہو.....؟ میں تمہاری شکایت کر دوں گا۔" کفیل نے غصے سے کہا۔

"کس سے شکایت کرو گے..... اس کے لیے تم کو میرے ہی پاس آنا پڑے گا۔" اپنی وردی پر لگے بیج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تم اس پر دیکھ سکتے ہو..... میرا نام انسپکٹر زوار ہے۔ تمہارے خلاف تھانے میں شکایت درج کرائی گئی ہے۔"

"کس نے شکایت درج کروائی ہے..... میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔" کفیل نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"سیٹھ شاہد احمد خان کی بیٹی ہانیہ نے۔" زوار نے جواب دیا۔

"لیکن یہ سب جھوٹ ہے..... الزام ہے مجھ پر۔" کفیل نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہ ساری باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "باہر پولیس موبائل کھڑی ہے..... خاموشی سے باہر آ جاؤ..... ورنہ مجھے طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔"

کفیل اپنی عزت کی خاطر اور محلے میں بدنامی کے ڈر سے چپ چاپ اپنے بوتیک کو بند کر کے ان کے ساتھ چلا گیا لیکن اتنی دیر میں اس کی دکان کے باہر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ہانیہ، فرزانہ کے پاس بیٹھی سکون کے ساتھ گرم گرم چائے کے مزے لے رہی تھی۔ اس کے سامنے فرزانہ پریشان چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟" ہانیہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں..... کچھ غلط نہ ہو جائے۔" فرزانہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔" ہانیہ نے اعتماد سے کہا۔

"لیکن کفیل..... اسے میں پسند کرتی ہوں۔" فرزانہ نے کہا۔ "میں اس کا برا نہیں چاہتی۔"

"بس کرو..... اب زیادہ ملکۂ جذبات بننے کی کوشش نہ کرو۔" ہانیہ نے غصے سے کہا۔ "اور اپنا منہ بند رکھنا..... آئی سمجھ.....؟"

فرزانہ دھیرے سے گردن ہلا کر رہ گئی تھی لیکن اس کے تاثرات سے واضح تھا کہ اس کی پریشانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ دراصل وہ کفیل کو پسند کرتی تھی لیکن کفیل اسے پسند نہیں کرتا تھا اور نہ جانے ان دونوں کے درمیان ایسا کیا ہوا تھا کہ فرزانہ

خودکشی کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ ہانیہ نے اسے خودکشی سے بچایا تھا اور اب وہ کفیل سے فرزانہ کا بدلہ لینا چاہتی تھی جس کا وہ آغاز کر چکی تھی۔ اس نے کفیل کے خلاف تھانے میں مقدمہ درج کروا کر اسے بے عزت کر دیا تھا لیکن کفیل سے محبت کرنے والی فرزانہ اس بات سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ وہ اس کو تکلیف میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ شاہد اپنے عالیشان گھر کے باغیچے میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے سفید بے داغ قمیص شلوار اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ عام طور پر کاروباری اور امن و امان کے حالات ان سب کی گفتگو کا موضوع ہوتے تھے۔

"محلے کے ایک انتہائی شریف فرد کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" شاہد کے ایک باریش دوست نے اطلاع دی۔ "کفیل الدین نام ہے اس کا..... بہت معزز شخص ہے..... لیکن اندر سے ایسا ہوگا کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا۔"

"کفیل الدین وہی جو بلاک بی میں رہتا ہے۔" شاہد نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور ساتھ ہی اس کا اپنا بوتیک بھی ہے۔"

"ہاں وہی۔" باریش دوست نے جواب دیا۔ "اس پر ایک لڑکی نے نازیبا حرکات اور بدسلوکی کا الزام لگایا ہے۔"

"میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔" دوسرے دوست نے کہا۔ "اس سے ایسی کسی بے ہودہ حرکت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

اس وقت سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سیٹھ شاہد کا کوئی خاص ملازم ہے۔ شاہد نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "ہاں جنید، بولو کیا بات ہے؟"

"سیٹھ صاحب..... آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔" جنید نے کہا تو شاہد اس کی پریشانی بھانپ کر اس کے ساتھ باغیچے کے ایک گوشے میں آ گیا۔

"علاقے کا ایک شخص ہے..... کفیل الدین، وہ جو ڈریس ڈیزائنر ہے، اس کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کی گئی ہے۔" جنید بتا رہا تھا کہ سیٹھ بات کاٹ کر بولا۔

"ہاں..... میں نے بھی سنا ہے..... لیکن تم کیوں پریشان ہو؟"

"وہ رپورٹ ہانیہ میم نے درج کروائی ہے۔" جنید نے آہستہ سے کہا۔

"ہانیہ نے.....؟ لیکن کیوں.....؟" شاہد نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بدسلوکی کا الزام لگایا ہے کفیل پر۔" جنید نے بتایا۔

"لیکن وہ اس کے پاس کب گئی.....؟ اور کیوں گئی؟" شاہد نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ تو مہنگے اور برانڈڈ کپڑے پہنتی ہے..... اس کا اس معمولی ڈیزائنر سے کیا تعلق؟"

"یہ سب تو میں نہیں جانتا..... کہ وہ وہاں کیوں گئی تھیں۔" جنید نے جواب دیا۔ "لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصے سے وہ اس کے بوتیک پر جا رہی تھیں۔"

اس انکشاف پر شاہد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کرختگی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

کفیل حوالات میں گندے فرش پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اوپر اچانک پڑنے والی اس افتاد پر پریشان تھا کہ اسے اس کی بیوی شبانہ کے آنے کی اطلاع ملی۔ شبانہ ایک خوب صورت اور سادہ سی عورت تھی۔ وہ سادہ سے کپڑے پہنے اور بڑی سی چادر لپیٹے ہوئے تھی۔ کفیل نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے شمار سوالات نظر آئے۔

"یہ سب کیا ہے.....؟" شبانہ نے کفیل سے پوچھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔" کفیل نے روہانسا ہو کر کہا۔

"لیکن تم پر یہ الزام کیوں لگا؟" شبانہ نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا۔" کفیل کے لہجے میں مایوسی عیاں تھی۔

"کوئی تو گڑبڑ ہوگی۔" شبانہ نے بالآخر اپنا شک سامنے رکھ دیا۔

"تم..... مجھ پر شک کر رہی ہو؟" کفیل حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شک..... یہ صرف شک نہیں ہے..... کچھ تو گڑبڑ ہے۔" شبانہ آنسو بہاتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" کفیل نے کہا۔

"کوئی لڑکی اپنی عزت کو اس طرح بلاوجہ داغ دار نہیں کر سکتی۔" شبانہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔" کفیل نے جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔ "لیکن میں بے گناہ ہوں..... بے قصور ہوں۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔ "میرا یقین کرو۔"

"بزرگوں سے سنا تھا..... آج پتا چلا۔" شبانہ جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی۔ "جہاں نصیب ہوتا ہے..... وہیں پانی جاتا ہے۔"

''دیکھو..... تم تو مجھے غلط نہ سمجھو نا۔'' کفیل نے کہا۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' شبانہ نے کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر جارہی ہوں..... میں اس طرح تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' کفیل اس کی بات سُن کر دم بخود رہ گیا تھا۔ ''تم میری بیوی ہو..... مشکل وقت میں مجھے چھوڑ کر جارہی ہو۔''

شبانہ نے اس کی ایک نہ سنی اور چلی گئی۔ وہ اپنے شوہر کو غلط سمجھ رہی تھی۔ کفیل اس کے جانے سے گویا ٹوٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

سیٹھ شاہد مہمان خانے میں داخل ہوا جہاں زوار پہلے سے موجود تھا۔

''آپ نے بُلایا تھا سیٹھ صاحب۔'' زوار نے خوش آمدانہ لہجے میں کہا۔

''یہ سب کیا چل رہا ہے انسپکٹر۔'' شاہد کی گرجدار آواز گونجی۔ ''میں کفیل کے کیس کی بات کررہا ہوں۔''

''سیٹھ صاحب..... اس پر الزام ہے کہ.....'' زوار نے بولنا ہی شروع کیا تھا کہ شاہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہانیہ کے تھانے پہنچنے پر تمہیں مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔'' شاہد کی بات پر زوار خاموش رہا اور شاہد نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کیس کو ختم کرو..... اس طرح میری اور میری بیٹی کی بدنامی ہورہی ہے۔''

''سیٹھ صاحب..... آپ کی بیٹی نے ہی ایف آئی آر درج کروائی ہے۔'' زوار نے شاہد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''انہی کے کہنے پر یہ کیس ختم ہوسکے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ انہیں سمجھائیں۔''

شاہد اس کی بات سُن کر غصے سے باہر نکل گیا اور اسی وقت ہانیہ کے کمرے میں پہنچا۔

''آپ.....'' ہانیہ نے اسے دیکھ کر طنزیہ کہا۔ ''آج میرا خیال کیسے آگیا۔''

''مجھے تم سے کفیل..... کیس کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔'' شاہد نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تمہیں یہ کیس ختم کرنا ہوگا۔''

''آپ یہ چاہتے ہیں کہ جس نے غلط کیا ہے اسے سزا نہ ملے۔'' ہانیہ نے کہا۔

''اسے سزا ملے گی..... میں خود سزا دوں گا۔'' شاہد نے رعونت سے کہا۔ ''عبرت کا نشان بنادوں گا اسے..... تمہارے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا اسے..... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کہاں گیا۔ کچھ عرصے بعد لوگ اسے خود ہی بھول جائیں گے۔''

''لیکن میں اس کا بھیانک چہرہ معاشرے کو دکھانا چاہتی ہوں۔'' ہانیہ نے کہا۔

''لیکن اس سے ہمارا نام خراب ہوگا۔'' شاہد نے کہا۔

''مجھے اپنی اور تمہاری عزت کی فکر ہے۔''

''آپ کو صرف اپنی عزت اور اپنے نام کی فکر ہے۔'' ہانیہ نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' شاہد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''میں نے تمہاری مرحومہ ماں سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں گا۔''

''اور یہ وعدہ آپ کو صرف آج یاد آیا ہے..... آپ کو میری کبھی کوئی فکر نہیں رہی۔'' ہانیہ نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''مجھے بھی آپ کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے خود سزا دوں گا۔'' شاہد نے کہا۔ ''لیکن اس طرح نہیں۔''

''اور مجھے اسے عدالت میں گھسیٹنا ہے۔ سب کو اس کی اصل شکل دکھانی ہے۔'' ہانیہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

کفیل حوالات میں بند تھا اور محلے کے کچھ لوگ اس سے ملنے آئے تھے لیکن وہ ہمدردی کے بجائے اسے طعنے دے رہے تھے۔

''واہ کفیل صاحب..... آپ کا اصل روپ تو ہمیں اب نظر آیا ہے۔'' ایک دُبلے پتلے نوجوان نے کہا۔

''ارے اسی کو تو کہتے ہیں بھیڑ کے روپ میں چھپا ہوا بھیڑیا۔'' ایک موٹا شخص بولا۔

''آپ سب لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔'' کفیل نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ایسا نہیں ہے۔''

''تو پھر سچ کیا ہے..... تم ہی بتادو نا۔'' ایک بڑی عمر کے سنجیدہ نظر آنے والے صاحب نے کہا۔

''رفیق بھائی، یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' شاہد نے کہا۔

''تو پھر وہ جو اتنے بڑے گھر کی لڑکی ہے، سیٹھ شاہد کی بیٹی، وہ پاگل ہے کیا جو تم پر اتنا بڑا الزام لگا رہی ہے۔'' انسپکٹر زوار نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔" کفیل نے کہا۔

"دیکھو..... تم ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔" رفیق نامی شخص نے کہا۔ "کوئی ایسی بات ہوئی ہو..... جس سے اسے غلط فہمی ہوئی ہو؟"

"میں نے کبھی بھی کسی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا رفیق بھائی۔" کفیل نے کہا۔ "یہ بات میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں۔"

"اب تو تم عدالت جا کر ہی حلف اٹھاؤ گے۔" موٹے شخص نے کہا جو غالباً وہاں مزے لینے کے لیے آیا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں اس کو باہر نکالو..... اس کا حساب کتاب تو ہم یہیں چکتا کر دیں گے۔" ایک نوجوان بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"آپ لوگ بے فکر رہیں..... یہ اب قانون کی گرفت میں ہے۔" زوار نے کہا۔ "اس کو ایسی کڑی سزا ملے گی کہ زندگی بھر یاد رہے گی۔"

"ارے ہم سے غلطی ہوئی جو اس کو پہچان نہیں سکے۔" ایک اور ادھیڑ عمر صاحب بولے۔ "ہمارے محلے اور گھروں کی عورتیں اس کے بوتیک پر جاتی تھیں۔"

"میں تو کہتا ہوں چاچا..... اس کے بوتیک کو ہی ختم کر دو۔" ایک نوجوان نے غصے سے کہا تو سب اس کے ہم نوا ہو کر روانہ ہو گئے۔

"تم بے فکر رہو۔" رفیق نے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری مدد کریں گے..... اللہ پر بھروسا رکھو..... اگر تم بے گناہ ہو تو باعزت رہا ہو جاؤ گے۔"

"ہاں میاں پریشان نہ ہونا۔" دوسرے صاحب نے کہا۔ "اور محلے کے لوگوں کو ہم سمجھاتے ہیں جا کر..... جذباتی لوگ ہیں..... سچ معلوم ہوگا تو ضرور تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"بڑے صاحب۔" زوار نے کہا۔ "آپ لوگ جائیں، کیوں اس کے ساتھ سر کھپا رہے ہیں۔ جائیں یہاں میلہ نہ لگائیں..... بس ہو گئی ملاقات۔"

سب لوگ چلے گئے لیکن دوسری طرف محلے کے جوانوں نے مل کر کفیل کے بوتیک کا تالا توڑ دیا اور خوب توڑ پھوڑ مچائی اور کچھ لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر خاصا سامان بھی لوٹ لیا۔ بعد میں پولیس نے وہاں پہنچ کر لوگوں کو منتشر کر کے معاملہ قابو میں کیا۔ تھوڑی دیر میں زوار بھی پہنچ چکا تھا۔

"آپ لوگ اپنے جذبات قابو میں رکھیں۔" زوار انہیں سمجھا رہا تھا۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، مجرم کو سزا ضرور ملے گی۔ مجھے اس مظلوم لڑکی کی سچائی کا یقین ہے، میں اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔"

"لیکن اگر کفیل بے گناہ ہوا تو..." رفیق نے وہاں پہنچتے کہا۔ "پھر اس پر ظلم کیوں.....؟"

"واہ بڑے صاحب واہ۔" زوار نے طنزیہ کہا۔ "آپ لوگوں کو کفیل سے تو ہمدردی ہے لیکن اس مظلوم لڑکی کو آپ کیا منہ دکھائیں گے..... اور نہ جانے اس نے کتنی لڑکیوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہوگی، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے، کچھ خوفِ خدا کریں۔"

رفیق ایک سمجھ دار اور سنجیدہ مزاج شخص تھا۔ وہ جذبات کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ اور سوچ سمجھ کر بات کر رہا تھا۔ لیکن اس جیسے شریف النفس اور نرم مزاج آدمی کی اتنی بے عزتی دیکھ کر پھر کسی اور میں کفیل کی حمایت کرنے یا اس سے ہمدردی جتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا لیکن کفیل کی زندگی جیسے ایک جگہ ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ حوالات کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا کہ زوار نے سلاخوں کے نزدیک آ کر اسے آواز دی۔ قریب جانے پر کفیل نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"تمہارے لیے تحفہ ہے..... تمہاری بیوی کی طرف سے۔" زوار نے لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ..... مجھے دو۔" کفیل نے کہا۔

"کیا ہو سکتا ہے..... ظاہر ہے تمہارے کارنامے دیکھ کر محبت نامہ تو ہو نہیں سکتا۔" زوار نے کہا۔

کفیل نے ایک ٹھنڈا اور لمبا سانس لینے کے بعد پوچھا۔ "مجھے بتاؤ..... کیا ہے.....؟"

"خلع کا نوٹس ہے۔" زوار نے کہا۔ "وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔"

اس کی بات سن کر کفیل کو گہرا صدمہ ہوا۔ وہ گم صم سلاخوں سے سر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب کیا فائدہ پچھتانے کا۔" زوار نے کہا۔ "یہ سب تو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

اس سے پہلے کہ کفیل کچھ بولتا، حوالدار نے ہانیہ کی آمد کی اطلاع دی۔

"وکیل بھی بیٹھا ہے، میں ان دونوں سے ملتا ہوں جا کر۔" زوار نے جاتے ہوئے کہا۔ "اب تیاری کرو کٹہرے میں کھڑے ہونے کی۔"

کفیل حوالات کی سلاخوں سے پشت ٹکا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر زوار اپنے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ہانیہ بیٹھی تھی ساتھ ہی ایک وکیل بھی۔

"مس ہانیہ۔" زوار نے وکیل کو دیکھتے ہوئے پہلے ہانیہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ہیں بیرسٹر صادق احمد..... ایک معتبر وکیل۔" زوار نے وکیل کا تعارف کرایا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ہانیہ نے وکیل صادق سے کہا۔

"اور مجھے خوشی اُس وقت ہوگی جب آپ دونوں کیس جیت جائیں گے۔" زوار نے ہانیہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل۔" صادق نے کہا۔ "مس ہانیہ..... انسپکٹر زوار نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کر دیا ہے..... اب میں آپ کی زبانی بھی کچھ باتیں جاننا چاہوں گا۔"

"جی میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔" ہانیہ نے کہا۔ "اور اپنے معاوضے کی آپ کوئی فکر مت کیجیے گا۔"

"بات صرف معاوضے کی یا فیس کی نہیں ہے۔" صادق نے کہا۔ "عدالت میں بہت سے پہلوؤں کو دیکھا جاتا ہے..... بہت سے عوامل کو جانچا جاتا ہے۔"

"آپ کھل کر بات کیجیے۔" ہانیہ نے جذباتی ہو کر کہا۔ "میرا مقصد مجرم کو سزا دلوانا ہے اور بس۔"

"آپ نے کفیل پر الزام لگایا۔" صادق نے ہانیہ کی بات کی تصحیح کی۔ "اس پر جرم ثابت نہیں ہوا..... وہ ابھی صرف ملزم ہے..... مجرم نہیں۔"

"وکیل صاحب..... آپ کی بات درست ہے۔" زوار نے مداخلت کی۔ "لیکن مس ہانیہ اتنا بڑا جھوٹ تو نہیں بولیں گی نا۔"

"لیکن ملزم بھی صحتِ جرم سے انکار کر رہا ہے۔" صادق نے مزید وضاحت کی۔

"دو ہاتھ کھا کر مجرم تو کب کا اقرارِ جرم کر لیتا۔" زوار نے بتایا۔ "لیکن مس ہانیہ نے مار پیٹ کے بجائے عدالت جانا زیادہ مناسب سمجھا۔"

"مار پیٹ سے تو کوئی بھی اقرارِ جرم کر لیتا ہے۔" ہانیہ نے کہا۔ "اور بعد میں مکر بھی سکتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں..... عدالت سے اس کا ریمانڈ لے کر اقبالِ جرم کروائیں گے۔" زوار نے اپنی رائے پیش کی۔

"آپ کوئی اور راستہ نکالیے وکیل صاحب۔" ہانیہ زوار کی بات سے متفق نہیں تھی۔ "مجھے بتائیے..... اس کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟" صادق نے کہا۔ "یا کوئی اور گواہ؟"

"کیا اس پر میری گواہی کافی نہیں ہوگی.....؟" ہانیہ نے دوبارہ سوال کیا۔

"آپ بذاتِ خود ایک فریق ہیں۔" صادق نے کہا۔ "لیکن عدالت میں پیش کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت یا کوئی اور گواہ بھی درکار ہوگا..... اچھی طرح سوچیے..... اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو مجھے بتائیے۔"

ہانیہ جواب دیے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ہانیہ، فرزانہ کے پاس موجود تھی۔ وکیل کی بات سن کر اس نے اپنے منصوبے میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ وہ اپنے کیس کو مضبوط کرنے کے لیے فرزانہ کو گواہی کے لیے تیار کر رہی تھی لیکن فرزانہ اس کے لیے راضی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جھوٹی گواہی کے لیے تیار نہیں تھی۔

"نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے انکار کی صورت میں گردن ہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ "نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" ہانیہ نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "آخر کیوں؟"

"میں نہیں کر سکتی۔" فرزانہ نے ہانیہ کی دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔

"کر سکتی ہو تم۔" ہانیہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور تم یہ کرو گی۔"

"لیکن ہانیہ۔" فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔

"بس خاموش ہو جاؤ..... اور میری بات سنو۔" ہانیہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی جان لینا چاہ رہی تھیں..... اس وقت تم بے وقوفی کر رہی تھیں..... لیکن اپنی زندگی ختم کرنے سے بہتر ہے کہ دوسرے کی زندگی برباد کر دو..... اس شخص کی زندگی جہنم بنا دو جو تمہارے دل کو جلانے کا سبب بنا ہو..... اسے اپنی جان لینے پر مجبور کر دو۔"

"لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "وہ مجھے پسند نہیں کرتا اور بس۔"

"ٹھیک ہے تمہیں پسند نہیں کرتا..... لیکن اسے تمہاری بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔" ہانیہ نے غصے سے کہا۔ "تم اپنی توہین کو بھول رہی ہو فرزانہ۔"

"میں اپنی توہین کو بھول نہیں سکتی۔" فرزانہ نے کہا۔
"لیکن اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتی۔"
"تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔" ہانیہ نے کہا۔ "بس تم میرا ساتھ دو..... اور یہ سب میں صرف تمہارے لیے ہی تو کر رہی ہوں۔" فرزانہ کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے دوبارہ بولی۔ "اچھا ٹھیک ہے..... ہم اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچنے دیں گے، بس اسے اس کی غلطی کا احساس دلائیں گے، بعد میں ہم اس سے عدالت کے باہر ملیں گے۔ ایک بار وہ تم سے اپنی بدتمیزی پر معافی مانگ لے..... اس کے بعد وہ اپنے راستے اور ہم اپنے راستے۔"
"ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے کہا۔
"شاباش۔" ہانیہ فاتحانہ انداز میں بولی۔ "اب بس تمہیں وہ کہنا ہے جیسا میں کہوں..... بلکہ میرے ساتھ دہراؤ اور ایک ایک بات کو ذہن نشین کر لو۔"
ہانیہ، فرزانہ کو بہلا پھسلا کر جھوٹی گواہی دینے پر راضی کر چکی تھی اور اب اسے عدالت میں دیا جانے والا بیان حرف بہ حرف یاد کروا رہی تھی۔

☆☆☆

عدالت میں تقریباً سب ہی لوگ موجود تھے۔ وکیل صادق نے ہانیہ اور کفیل دونوں سے فرداً فرداً جرح کی۔ ان دونوں سے خاص طور پر جرم کے وقت اور دن کے حوالے سے پوچھا گیا۔ اس کے بعد کفیل کے وکیل شارق علی نے بھی دونوں سے جرح کی۔
ہانیہ کے مطابق یہ واقعہ پچھلے ماہ یعنی مارچ کی چار تاریخ کو شام کے وقت پیش آیا تھا۔ اس کے بعد کفیل نے اسے متعدد مرتبہ بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جبکہ کفیل بدستور صحتِ جرم سے انکار کر رہا تھا لیکن ان دونوں کے پاس ہی اپنی اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔
"محترم جج۔" شارق علی نے جرح مکمل ہونے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "مس ہانیہ کے پاس میرے مؤکل کو مجرم ثابت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے..... اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ کفیل الدین بے گناہ ہے..... اور اس پر الزام لگایا گیا ہے۔"
ہانیہ کے باپ کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے جبکہ ہانیہ فکرمندی سے صادق کی طرف دیکھ رہی تھی جو اطمینان سے بیٹھا تھا۔
"لہٰذا میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ میرے مؤکل کفیل الدین کو باعزت بری کیا جائے۔" شارق علی کہہ رہا تھا کہ صادق نے کھڑے ہوتے ہوئے فرزانہ نام کی ایک خاتون کو بطور گواہ پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ عدالت کی اجازت کے بعد فرزانہ گواہی کے لیے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک گھر میں تنہا رہتی ہے اور محلے کی خواتین کے کپڑے سی کر گزارہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں کفیل کے پاس سے بھی اسے کچھ کام مل جاتا تھا۔
"آپ کو کفیل سے کوئی شکایت ہے؟" صادق نے سوال کیا۔
"اس نے میرے ساتھ..... بدتمیزی کی تھی۔" فرزانہ نے ہکلاتے ہوئے بمشکل کہا۔
"صرف بدتمیزی یا کچھ اور بھی..." صادق احمد نے وضاحت چاہی۔
"غیر اخلاقی حرکت کرنے کی کوشش کی تھی۔" فرزانہ نظریں جھکا کر رونے لگی۔ "میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔" عدالت میں مکمل سناٹا چھا چکا تھا۔ سب لوگ سکتے کی حالت میں تھے۔ کفیل پریشانی سے سب کو دیکھ رہا تھا مگر کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔
"معزز عدالت کے علم میں یہ بات آ چکی ہے۔" صادق نے کہنا شروع کیا۔ "کہ ملزم کفیل ایک عادی مجرم ہے..... اور وہ صرف مس ہانیہ کے ساتھ ہی نہیں..... مس فرزانہ کے ساتھ بھی غیر اخلاقی حرکات کا مرتکب ہوا ہے..... اسی لیے سزا کا مستحق ہے۔"
صادق اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد شارق علی نے فرزانہ سے جرح شروع کی۔
"کیا آپ کچھ وضاحت کر سکتی ہیں؟" شارق نے پوچھا۔
"میں نے کہا نا..... میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔" فرزانہ نے روتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" شارق نے کہا۔ "آپ کو یہ تو یاد ہوگا کہ یہ واقعہ کس دن پیش آیا۔"
"دو ماہ پہلے..... فروری کی تیرہ تاریخ تھی۔" فرزانہ نے بتایا تو کفیل نے چونک کر دیکھا۔
"وقت بھی یاد ہے آپ کو.....؟" شارق نے دریافت کیا۔
"جی ہاں..... دوپہر کا وقت تھا..... تقریباً دو بجے کا۔"
فرزانہ بتا رہی تھی اور کفیل اسے کھڑا دیکھ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہ

رہا ہو۔

''اور آپ کس کام سے گئی تھیں ان کے پاس.....؟'' شارق نے ایک اور سوال کیا ہی تھا کہ کفیل درمیان میں بول پڑا۔

''یہ سب جھوٹ ہے..... اس دن تو میں شہر میں ہی نہیں تھا۔'' کفیل کی بات پر کمرائے عدالت میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ صادق اور زوار بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جج کے آرڈر پر خاموشی چھائی اور شارق نے کفیل سے سوال کیا۔

''تو اس روز کہاں تھے آپ.....؟'' شارق نے پوچھا۔

''میں بہاولپور گیا تھا..... اپنے ایک دوست کی شادی میں..... تین دن رہا تھا وہاں.....''

''آپ کو یہ تو یاد ہوگا کہ کس تاریخ کو یہاں سے روانہ ہوئے تھے اور کس تاریخ کو واپس آئے تھے؟'' شارق نے کفیل سے پوچھا۔

''میں گیارہ تاریخ کی رات کو روانہ ہوا تھا۔'' کفیل تفصیلات بتانے لگا۔ ''تین روز اس کی شادی میں شرکت کر کے پندرہ تاریخ کی دوپہر تک واپس پہنچا تھا..... تقریباً تین بجے تک۔''

''جی مس فرزانہ۔'' اب شارق علی فرزانہ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ ''اچھی طرح سوچ لیں آپ..... کیا وقوعہ کی یہی تاریخ ہے..... جو آپ نے بتائی ہے..... یعنی تیرہ فروری۔''

''جی یہی تاریخ ہے۔'' فرزانہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔'' اس لمحے کمرائے عدالت میں موجود تمام افراد الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔

''اپنی بات کی وضاحت میں آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟'' شارق نے پلٹ کر کفیل سے پوچھا۔

''میرے پاس سارے ثبوت موجود ہیں۔'' کفیل جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''ٹرین کے ٹکٹ..... میرے دوست کی شادی کا دعوت نامہ..... وہاں موجود دوستوں کے ساتھ تصویریں اور وڈیوز وغیرہ..... اس کے علاوہ کراچی کے دو دوست ذاکر اور اسد بھی میرے ہمراہ ہی گئے تھے..... اور ہم ساتھ ہی واپس آئے تھے..... اسد اس وقت یہاں موجود ہے..... آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔''

کمرائے عدالت میں بیٹھے ہوئے اسد نام کے شخص کو بلا کر سوالات کیے گئے۔ اس نے کفیل کی باتوں کی تائید کی۔ اس کے علاوہ ثبوت کے طور پر اس نے اپنے موبائل میں موجود بارہ، تیرہ اور چودہ فروری کی تاریخوں کی تصاویر اور وڈیوز بھی دکھائیں۔ جج نے بھی موبائل میں موجود ان تصاویر کا جائزہ لیا جو انہی تاریخوں میں کھینچی گئی تھیں۔ ان سب باتوں سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ کفیل ان تاریخوں میں شہر میں نہیں تھا۔ اس دوران ہانیہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی نظر آ رہی تھی۔ فرزانہ کو دوبارہ عدالت کے روبرو پیش کیا گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ بار بار ہانیہ کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ ہانیہ کسی اور سوچ میں گم تھی۔ دوسری طرف صادق کے پاس مایوسی سے پہلو بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''آپ نے وقوعہ کی جو تاریخ بتائی کیا آپ اب بھی اس پر قائم ہیں؟'' شارق نے فرزانہ سے سوال کیا۔

''شاید ایک دو دن آگے پیچھے ہوں۔'' فرزانہ نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''آپ نے شاید غور سے نہیں سنا۔'' شارق نے کہا۔ ''کفیل الدین تین روز کے لیے گئے تھے۔ اچھی طرح سوچ لیں۔''

''یہ..... شاید ایک ماہ پرانی بات ہو۔'' فرزانہ اب گڑبڑانے لگی تھی۔

''مطلب آپ کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا..... اور آپ کو خود اس بات کا علم نہیں کہ یہ کس دن کی بات ہے۔'' شارق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ وکیل کے تند و تیز سوالات جاری رہے۔ جن کے جال میں الجھ کر فرزانہ ایک کے بعد ایک غلطی کرتی جا رہی تھی۔ درمیان میں صادق نے اعتراض اٹھانے کی کوشش بھی کی لیکن عدالت نے اسے مسترد کر دیا اور وکیل صفائی کو کارروائی جاری رکھنے کو کہا۔ فرزانہ اب بری طرح پھنس چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں گھبراہٹ کے عالم میں اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''سچ بتاؤ..... سچ کیا ہے۔'' شارق علی نے سختی سے کہا۔

''یہ سب جھوٹ بولا تھا میں نے۔'' فرزانہ نے روتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... اور کس کے کہنے پر.....؟'' شارق نے سوال کیا۔ گویا وہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

''ہانیہ..... ہانیہ کے کہنے پر۔'' فرزانہ کے اس جواب پر ہانیہ غصے سے چلانے لگی اور عدالت میں ایک شور برپا ہو گیا۔ جج کے آرڈر دینے پر خاموشی ہوئی۔ ہانیہ کا وکیل اب بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ سب لوگ کمرائے عدالت میں ششدر بیٹھے تھے۔ بازی پلٹ چکی تھی۔

''اپنی بات پوری کرو۔'' جج نے فرزانہ سے کہا۔

''بس یہی بات ہے..... ہانیہ نے یہ سب کرنے کو کہا تھا۔''

''لیکن کیوں.....؟'' شارق نے اس سے سوال کیا۔

''میری خاطر۔'' فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کس بات کا کیا جواب دے لہٰذا اس نے ہر بات کا سیدھا اور صاف جواب دیا اور سچ بولتی چلی گئی۔

فرزانہ سے جرح کے بعد ہانیہ وکیل صفائی کے سوالات کے جواب دینے لگی۔ اب ہانیہ کے پاس بھی سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''میرا کوئی کیس نہیں تھا۔'' ہانیہ نے کہا۔ ''یہ سب میں نے فرزانہ کی وجہ سے کیا تھا۔''

ہانیہ اور فرزانہ کے عدالت میں بیان کے مطابق ان دونوں کی ملاقات دو ماہ قبل ہی ہوئی تھی جب ہانیہ سے کسی نے فرزانہ کے کام یعنی سلائی کی تعریف کی تھی۔ اس دوران ان دونوں میں دوستی ہوگئی۔ تب فرزانہ نے ہانیہ کو اپنے دل کی بات بتائی کہ وہ کفیل سے محبت کرتی تھی لیکن کفیل کا اس سے رویہ کافی سرد تھا۔ اس دوران ہانیہ نے فرزانہ کی مدد کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ جا کر کفیل کو منانے کی کوشش بھی کی لیکن سب بے سود تھا۔ کفیل نے ہانیہ کے سامنے فرزانہ کی بے عزتی کی۔ وہ شادی شدہ اور عزت دار شخص تھا اور اس طرح کی کسی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بے عزتی کی وجہ سے فرزانہ بہت مایوسی کا شکار تھی اور اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہانیہ نے اسے عین موقع پر بچالیا۔ ہانیہ نے فرزانہ کی بے عزتی کو اپنی شکست سمجھا۔ اس نے اپنی شکست اور فرزانہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کفیل کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اسی سلسلے میں یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔

☆☆☆

کفیل باعزت بری ہوچکا تھا۔ اب ہانیہ تھانے میں بیٹھی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جبکہ سامنے بیٹھا زوار اپنے دیگر کاموں میں مصروف تھا۔

''آپ نے مجھے بلوایا تھا۔'' ہانیہ نے کافی انتظار کے بعد کہا۔

''ہاں..... بیٹھو..... سیٹھ صاحب کو بلوایا ہے۔'' زوار نے منہ بنا کر کہا۔

ہانیہ صبر سے بیٹھی رہی۔ اس کے سوا اور کر بھی کیا کرسکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا باپ سیٹھ شاہد آگیا اور اسے دیکھ کر نظر انداز کرتے ہوئے زوار کے سامنے جا بیٹھا جو سیٹھ کو دیکھ کر خوشامدی انداز میں استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا تھا۔

''اب یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔'' شاہد نے رعونت سے کہا۔ ''بولو..... کیوں بلایا ہے مجھے.....؟''

''یہ کفیل الدین کی طرف سے۔'' زوار نے شاہد کی طرف ایک فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ہانیہ پر ہتکِ عزت اور دس کروڑ روپے ہرجانے کا دعویٰ کیا ہے۔''

شاہد نے فائل میں لگے کاغذ پر نظر ڈال کر غصے سے فائل میز پر پٹخ دی۔ وہ شدید غصے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تھانے سے باہر نکل گیا۔

''کیا کوئی درمیانی راستہ نہیں نکل سکتا.....؟'' ہانیہ نے انسپکٹر زوار سے مصالحت کی بات کی۔ جواب میں زوار بغور اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کفیل نے دستک کے بعد دروازہ کھولا تو سامنے اس کی بیوی شبانہ کھڑی تھی۔

''اب کیسے آنا ہوا؟'' کفیل نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ تم باعزت بری ہوگئے۔'' شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے..... مجھے ایک امید تھی کہ تم بے گناہ ہوگے۔''

جب ہی چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔'' کفیل نے طنزیہ کہا۔

''میں محلے والوں کے طعنوں سے تنگ آگئی تھی۔'' شبانہ شرمندگی سے بولی۔ ''پھر جب اپنے گھر والوں کو صورتِ حال بتائی تو انہوں نے کہا کہ واپس آجاؤ۔''

''اب واپس کیوں آئی ہو؟'' کفیل نے اجنبی لہجے میں سوال کیا۔

''اس لیے کہ تم بے گناہ ثابت ہوگئے ہو۔'' شبانہ نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''اور اگر میں بے گناہ ہونے کے بعد بھی..... بے گناہ ثابت نہ ہو پاتا تو۔'' کفیل کے لہجے کی تلخی بڑھتی جارہی تھی۔

''کیوں نہ ہو پاتے۔'' شبانہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تم نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تو ایسا کیسے ہوتا؟''

''تم ہی نے تو کہا تھا..... جہاں نصیب ہوتا ہے..... وہیں پانی مرتا ہے۔'' کفیل نے اسے یاد دلایا۔

''اچھا اب بس..... مجھے معاف کردو۔'' شبانہ اسے منانے کی کوشش کرنے لگی لیکن کفیل اس کا ہاتھ جھٹک کر اس سے دور ہوگیا۔

''تم واپس جاسکتی ہو۔'' کفیل نے سرد لہجے میں کہا۔

"میری زندگی میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔" شبانہ نے بے ساختہ اس کے قریب آنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "جلد ہی تمہیں طلاق نامہ مل جائے گا۔"

شبانہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ کفیل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں..... اب کیا ہوا..... خلع کا نوٹس تم نے ہی بھیجا تھا نا۔"

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک طرح گھر سے نکل جانے کا اشارہ تھا۔ شبانہ کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگی تھیں۔ نہ جانے وہ سچے آنسو تھے یا مگرمچھ کے۔ بہرحال وہ خاموشی سے آنکھوں میں آنسو لیے باہر نکل گئی اور کفیل اپنے ہی گھر میں تنہا رہ گیا۔

☆☆☆

مجسٹریٹ کے کمرے میں ہانیہ کے ساتھ اس کا باپ اور کفیل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں فریقین میں پانچ کروڑ ہرجانے پر صلح ہو گئی تھی۔ شاہد احمد کو اپنی عزت اور ساکھ کی زیادہ فکر تھی۔ اسی لیے وہ فوری ہرجانے کی رقم کی ادائیگی پر بھی راضی ہو گیا۔ لیکن وہ اتنی بڑی رقم کیسے اتنی آسانی سے جانے دے سکتا تھا بہرحال وہ راضی نامے پر دستخط کر کے گھر واپس آ گیا اور اپنے گھر کے مہمان خانے میں جنید کے ساتھ موجود تھا۔

"لیکن سیٹھ صاحب..... یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔" جنید نے کہا۔ وہ حیران تھا کہ سیٹھ اتنی بڑی رقم اتنی آسانی سے دینے پر کیسے آمادہ ہو گیا۔

"اتنی رقم لے کر وہ کہاں جائے گا۔" شاہد نے اطمینان سے کہا۔ اس کے چہرے پر پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ "رہے گا اسی شہر میں..... یا اسی ملک میں۔"

"ہمم..... تو پھر۔" جنید نے شاہد کا خیال جاننا چاہا۔

"اس شخص پر نظر رکھنی ہوگی۔" شاہد نے اسے اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا۔ "ایک ماہ کے انتظار کے بعد اسے اٹھا لیں گے پھر اپنی رقم نکلوا کر ٹھکانے لگا دیں گے۔"

اپنے منصوبے کی تفصیلات بتا کر سیٹھ مہمان خانے سے نکلا تو اسے سامنے ہانیہ کھڑی نظر آئی۔

"تم۔" شاہد اسے دیکھ کر غصے سے غرایا۔ "تم جا سکتی ہو یہاں سے۔"

"کیا مطلب.....؟" ہانیہ نے حیرت سے پوچھا۔ "میں کہاں جاؤں گی؟"

"بھاڑ میں جاؤ۔" شاہد چلایا۔ "میں تمہیں اب اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا..... تمہیں اپنے خاندان کی عزت کا کوئی پاس نہیں۔"

"آخر کو آپ سوتیلے باپ جو ٹھہرے۔" ہانیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ کو تو بہانہ چاہیے تھا مجھ سے جان چھڑانے کا۔"

"فوراً اپنا سامان سمیٹو..... اور جاؤ یہاں سے۔" پھر شاہد نے جنید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو کچھ دن کے گزارے کے لیے کچھ رقم دے کر روانہ کرو..... باقی یہ خود اپنا بندوبست کرے گی۔"

"آپ سے کچھ نہیں چاہیے مجھے۔" ہانیہ نے چڑتے ہوئے کہا۔ "اپنا گزارہ کر لوں گی میں۔"

☆☆☆

باپ کے گھر سے نکالنے کے بعد ہانیہ، فرزانہ کے گھر گئی۔ فرزانہ اسے دیکھ کر بہت جذباتی ہو گئی اور رونے لگی۔

"ہانیہ..... تم نے میری خاطر کتنا بڑا قدم اٹھایا۔" فرزانہ نے روتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تمہارا ساتھ نہ دے سکی....."

"ایسی بات نہیں ہے۔" ہانیہ نے آہستگی سے کہا۔ "تم نے جو کیا ٹھیک کیا۔"

"اور تمہارے والد وہ کیا کہتے ہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔" ہانیہ نے بتایا۔

"کیا..... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے نا۔" فرزانہ دوبارہ رونے لگی۔ "اب تم میرے ساتھ رہو۔"

"نہیں۔" ہانیہ نے کہا۔ "مجھے یہ شہر چھوڑنا ہے۔"

"لیکن کہاں جاؤ گی..... کیسے رہو گی..... اکیلے گزارا کیسے کرو گی؟" فرزانہ پے در پے سوالات کرنے لگی۔

"ارے بابا..... تم پریشان مت ہو۔" ہانیہ نے کہا۔ "دراصل میں اپنے باپ سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس کچھ رقم ہے اور میری ماں نے میرے لیے کچھ زیور چھوڑا تھا..... وہ ہے میرے پاس..... میں رہ لوں گی۔"

"لیکن میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔" فرزانہ نے کہا۔

☆☆☆

کفیل اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ اس دوران فون پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔

"رقم مل چکی ہے مجھے، اب میں یہاں نہیں رہوں گا..... اب لاہور میں ہی اپنا مستقل ٹھکانا بناؤں گا..... ویسے

بھی یہ گھر اور بوتیک نما دکان کرائے کی ہی تھی، اب سب کچھ اپنا خریدوں گا..... ہاں، ہاں پتا بتا دوں گا تمہیں..... ہاں ٹھیک ہے..... انتظار کروں گا..... اللہ حافظ۔"

کفیل نے اپنا سامان سمیٹا پھر اپنے مکان پر جو کبھی اس کا گھر تھا الوداعی نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی تباہ حال دکان کو ایک نظر دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ آس پاس کے کچھ لوگوں نے اسے مخاطب کیا لیکن بغیر رکے وہ چلتا رہا۔ محلے دار اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے کیونکہ وہ سب پہلے اسے غلط سمجھ رہے تھے اور اس سے شرمندہ تھے۔ لیکن کفیل کسی سے بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کسی کو جواب دیے بغیر چلتا رہا اور محلے سے نکل گیا۔

☆☆☆

کفیل لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو ایک کار اس کے لیے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے راستے سے ہی فون پر اپنے لیے ایک اپارٹمنٹ بک کروالیا تھا۔ ساتھ ہی ایک کرائے کی گاڑی بھی منگوالی تھی۔ آخر کو وہ کروڑ پتی بن چکا تھا۔ وہ اس شاندار گاڑی میں بیٹھ کر اپنے خوبصورت اپارٹمنٹ پہنچا۔ باہر ہی اس کا ایجنٹ کھڑا تھا۔ "بیگم صاحبہ بھی پہنچ چکی ہیں.....؟" سلام کرنے کے بعد ایجنٹ نے اسے بتایا۔

کفیل نے مسکرا کر اس سے چابی لی اور اپنے شاندار اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

"خوش آمدید کیف۔" اس کی سماعت سے ایک مانوس سے آواز ٹکرائی۔ سامنے ہانیہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت فون پر اس نے ہانیہ سے ہی بات کی تھی۔

☆☆☆

دراصل یہ سب ہانیہ اور کفیل کی منصوبہ بندی تھی۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ہانیہ کو فرزانہ نے کفیل کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس محبت کرتی ہے لیکن وہ اسے نظر انداز کر رہا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت غم زدہ تھی۔ ہانیہ نے فرزانہ کے ساتھ کفیل سے اکیلے ملنے کی منصوبہ بندی کی۔ لیکن کفیل نے ہانیہ کی بات سُن کر فرزانہ جیسی دقیانوسی اور بے وقوف عورت کا مذاق اڑایا البتہ ساتھ ہی ہانیہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ہانیہ کو بھی وہ پہلی نظر میں پسند آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کے اندر چھپے ایک سازشی انسان کو پہچان گئی تھی۔ اب ہانیہ نے باپ سے دولت ہتھیانے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں کفیل کو اپنا رازدار بنایا۔ ان دونوں میں یہ گفتگو کفیل کے بوتیک پر ہوئی تھی۔

"ماں کی موت کے بعد سے ہی میں اپنے باپ سے جان چھڑانا چاہ رہی ہوں۔" ہانیہ کفیل کو بتا رہی تھی۔ "لیکن ساری دولت میرے باپ کے پاس ہے، اسے چھوڑ دینے کے بعد میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"مطلب ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" کفیل نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"کیا مطلب.....؟" ہانیہ نے چونک کر پوچھا۔

"تم اپنے باپ سے تنگ ہو اور میں اپنی بیوی سے۔" کفیل نے بتایا۔ "اس کے علاوہ ایک معمولی ڈریس ڈیزائنر کی تنگدستی کی زندگی سے بیزار ہوں۔ ان سب میں میری پسند کہیں نہیں، شادی ماں کی پسند کی اور پیشہ باپ کی پسند کا..... جو خود ایک درزی تھا۔ کاش میں ان سب سے جان چھڑا سکتا، میرا کوئی بڑا کاروبار ہوتا اور..... تم جیسی بیوی ہوتی۔"

"ان سب چیزوں سے جان چھڑانا مشکل نہیں۔" ہانیہ نے شوخی سے کہا۔ "لیکن مجھ جیسی بیوی ملنا ضرور مشکل ہو سکتا ہے۔"

"کیا یہ سب ناممکن ہے؟" کفیل نے کہا۔

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں..... اس کے لیے ہم دونوں کو کچھ کرنا ہوگا۔" ہانیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا کرنا ہوگا۔" کفیل نے بے تابی سے کہا۔ "تمہیں اور دولت کو پانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی..... کچھ انا کی..... کچھ عزت کی۔" ہانیہ نے مبہم سا جواب دیا۔

"کیسی قربانی.....؟" کفیل نے سوال کیا۔ اس کے بعد ہانیہ نے کفیل کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا اور ان دونوں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہانیہ نے فرزانہ کے ساتھ کفیل کو فرزانہ سے شادی پر منانے کے لیے اس سے ملاقات کی جس پر کفیل نے فرزانہ کو خوب بے عزت کیا۔ جس کے بعد فرزانہ ٹوٹ سی گئی اور ہانیہ کی مزید کوششوں سے اس نے خودکشی جیسا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ہانیہ نے منصوبے کے مطابق خود ہی اسے بچایا اور فرزانہ کے ساتھ مل کر کفیل کو سبق سکھانے کا وعدہ کیا۔

اس سارے کھیل میں انسپکٹر زوار کسی کٹھ پتلی کی طرح استعمال ہوا تھا۔ زوار ایک لالچی آدمی تھا۔ سیٹھ سے رقم کے عوض اس کے کاروباری مسائل حل کروا دیا کرتا تھا جو ہانیہ جانتی تھی اور باتوں باتوں میں زوار سے اس کا ذکر بھی کیا۔ اس طرح اس نے اسے کچھ دھمکا کر اور کچھ الو بنا کر اپنی باتوں میں الجھایا اور یوں اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ لیکن اسے کفیل پر تشدد

سے باز رکھا۔

وکیل صادق سے ملاقات کے بعد ہانیہ نے فرزانہ سے مل کر اسے کفیل پر الزام لگانے اور گواہی دینے پر راضی کیا۔ اسے دانستہ طور پر ایسی تاریخ یاد کروائی گئی جب کفیل شہر میں موجود ہی نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ پھنس گئی اور ان دونوں کی عین توقع کے مطابق اس نے گھبرا کر سچ بول دیا۔ جس کے بعد کفیل باعزت بری ہو گیا اور ہانیہ پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ ہرجانے کی رقم ہانیہ کے سوتیلے باپ کو ہانیہ کی طرف سے ادا کرنی پڑی۔

فرزانہ اس پورے کھیل میں بے وقوف بنی تھی اور آخر تک ان دونوں کے منصوبے سے لاعلم رہی تھی۔

☆☆☆

اب کفیل اور ہانیہ اتنی دولت کے ساتھ اکٹھے تھے۔

"اب کھیل ختم ہو گیا..... کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور ہم مال دار ہو گئے۔" کفیل نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"کھیل ابھی ختم نہیں ہوا کیفی ڈیئر۔" ہانیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب۔" کفیل نے اسے چونک کر دیکھا۔

"کہیں تم..... میرے ساتھ نوسر بازی تو نہیں کر رہیں۔" کفیل کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

"نہیں۔" ہانیہ نے بے فکری سے جواب دیا۔ "لیکن ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے..... سب سے پہلے رقم میرے بیرونِ ملک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو۔"

"اچھا۔" کفیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو تم مجھ پر بھروسا نہیں کر رہیں..... یا میرے ساتھ کوئی چال چل رہی ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" ہانیہ نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے..... ہمیں جلد ایک دوسرے سے الگ ہونا ہے۔"

"لیکن میں باقی زندگی تمہارے ساتھ....." کفیل کہہ ہی رہا تھا کہ ہانیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"فی الحال یہ ممکن نہیں۔" ہانیہ نے اسے بتانا شروع کیا۔ "میرے باپ کے کارندے ایک ایک پل تمہاری نگرانی کر رہے ہوں گے..... میری بات مانو گے تو ان سے بچ سکو گے۔"

اس کے بعد ہانیہ نے اسے بتایا کہ گھر میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے سوتیلے باپ اور اس کے وفادار منیجر جنید کی باتیں سن چکی تھی۔ جس میں شاہد نے جنید کو کفیل پر نظر رکھنے اور ایک ماہ بعد اسے اغوا کر کے اپنی رقم واپس حاصل کرنے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے کا کہا تھا۔

"تو پھر کیا کریں.....؟" کفیل اس کی بات پر پریشان ہو گیا۔ جواب میں ہانیہ نے اس کے سامنے اپنا منصوبہ تفصیل کے ساتھ رکھ دیا۔ جس کے مطابق کفیل کو پوری رقم ہانیہ کے بیرونِ ملک اکاؤنٹ میں منتقل کرنی پڑی کیونکہ کفیل کا باہر کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا۔ پھر اس نے دونوں کے باہر ملک کے الگ الگ ٹکٹ بک کرائے۔ تاکہ ہانیہ، کفیل سے دور رہ کر اپنے باپ کے کارندوں کی نظروں سے بچ سکے۔ اس کے علاوہ اس نے ہانیہ کے کہنے پر اپنی حفاظت کے لیے ایک پستول بھی لے لیا۔

فلائٹ کے روز کفیل ائرپورٹ جا رہا تھا کہ دو گاڑیوں نے اچانک اس کی گاڑی کو گھیر کر اس کا راستہ روک لیا۔

دراصل کفیل جب لاہور پہنچا تھا تو سیٹھ شاہد کے جاسوس بھی اس کے پیچھے لاہور پہنچ گئے تھے۔ ان کے مطابق کفیل پوش علاقے میں تھا اور تنہا ہی رہ رہا تھا۔ سیٹھ شاہد کے جاسوس اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک لمحے کی خبر جنید کو اور جنید شاہد کو پہنچا رہا تھا۔ ان کے مطابق کفیل ایک بین الاقوامی ٹریول ایجنسی کے دفتر بھی گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ باہر جانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ جاسوسوں کو مستعد رہنے کو کہا گیا اور جب وہ ائرپورٹ کی جانب رواں دواں تھا تو دو گاڑیوں نے اچانک اس کا راستہ روکا اور اسے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ کفیل نے اپنی جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی اور اسی اثنا میں اپنے پاس موجود پستول سے ان پر فائر بھی کیا جس کے نتیجے میں جوابی فائرنگ سے کفیل زخمی ہو گیا۔ اغوا کار اسے اٹھا کر لے گئے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے اس کو دی جانے والی رقم نہ تو سیٹھ شاہد کو واپس مل سکی اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ مل سکا۔ اب سیٹھ شاہد کے پاس پچھتانے اور اپنے آدمیوں پر چیخنے چلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جنہوں نے کفیل کو جان سے ہی مار دیا تھا۔ کیف کے مرنے کے بعد اس کی لاش کو چوری چھپے ٹھکانے لگا دیا گیا۔

☆☆☆

اس سارے واقعے کے دوران ہانیہ بالکل غائب تھی۔ کیونکہ وہ بیرونِ ملک جا چکی تھی۔ رقم اس کے پاس تھی۔ نفرت کی وجہ سے اس کے باپ نے اس کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی دولت پر اس کی سوتیلی بیٹی ہانیہ عیش کر رہی ہے۔ اس کہانی کا ہر کردار اندر سے وحشی تھا۔ ایسے وحشی لوگ جو دولت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں...

❖❖❖

سرورق کی پہلی کہانی

فریبی چہرے

نجمہ مودی

خواب دیکھنا مشکل نہیں... ہر شخص خوابوں کے محل تراشتا ہے... کچھ لوگ محنت اور لگن سے اپنی تعبیر پالیتے ہیں... اور کچھ کا خیال اس کے برعکس ہوتا ہے... کچھ جلدباز... عاقبت نااندیش مالِ مفت کی تاک میں رہتے ہیں... ایسے ہی فریبی چہروں کے پیچھے چھپی کہانی کے دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ... ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر تھی...

سرورق کے صفحات پر بکھرے جفا پیشہ و فریب کاروں کا کھیل.....

نادر نے اِدھر اُدھر سے اس طرح معلومات حاصل کیں کہ کسی کو اس کی اپنی ذات مشکوک دکھائی نہ دے۔ اسے پتا چلا کہ ڈیفنس فیز ٹو کے اس حصے میں ایک ہی ریسٹورنٹ ایسا تھا جس میں لڑکیاں سرو کرتی تھیں۔ اسے پتا چلا تھا کہ غزالہ ڈیفنس کے کسی ریسٹورنٹ میں ویٹرس کے طور پر کام کررہی تھی۔ محض اس سراغ کی بنا پر کسی لڑکی کو تلاش کرنا خاصا مشکل کام تھا لیکن نادر کو بہرحال یہ کام کرنا ہی تھا۔ وہ دُھن کا پکا تھا اور اس کا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم اپنی منزل کے راستے میں پہلے پڑاؤ کے قریب پہنچ چکا ہے۔

وہ جب اس ریسٹورنٹ پر پہنچا تو باہر سے اُسے دیکھ کر کچھ خاص متاثر نہیں ہوا لیکن جب وہ دروازہ کھول کر اندر پہنچا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر کا ماحول خاصا خوابناک سا تھا۔ روشنی کم تھی۔ شور نہیں تھا۔ لوگ تہذیب اور شائستگی سے، نیچی آوازوں میں گفتگو کررہے تھے۔ مغربی موسیقی کی مدھم لہریں گویا دیواروں سے پھوٹ رہی تھیں۔ فرنیچر عمدہ تھا۔ وہاں بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ریسٹورنٹ میں اچھے طبقے کی آمدورفت تھی۔ ریسٹورنٹ چھوٹا، مگر معیاری تھا۔ نادر کی اوقات اس قسم کے ریسٹورنٹس میں نشست و برخاست رکھنے کی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ ایک مشن پر تھا جس کی تکمیل کے لیے وہ کہیں بھی جاسکتا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور دو نشستوں والی ایک میز خالی دیکھ کر اس پر جا بیٹھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا، اس نے وہیں کھانا کھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جلد ہی ایک ویٹریس اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ نادر نے ریسٹورنٹ کے چھوٹے سے ہال میں ابھی تک صرف اسی ویٹریس کو

مختلف میزوں پر آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ بظاہر مینیو دیکھ رہا تھا لیکن کن انکھیوں سے اس نے ہال کے کونے کھدروں تک کا جائزہ لے لیا تھا۔

''یس سر.....؟'' ویٹریس کی دھیمی اور سپاٹ سی آواز اس کے کانوں میں آئی تو اس نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ نظر کی عینک کے عقب سے دو سیاہ آنکھیں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

''پہلے تو مجھے ایک چکن کارن سوپ دے دیجیے۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کھانا چاہیے۔'' نادر نے ایک شائستہ اور مہذب انسان کا سا انداز گفتگو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا حلیہ بھی اس وقت معقول ہی تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے جیل سے رہا ہوئے چند ہی دن گزرے تھے۔

''او کے سر۔'' نادر کو یوں لگا جیسے ویٹریس کی آواز کسی ٹیپ ریکارڈر سے آئی ہو۔ وہ چند سیکنڈ میں آرڈر ایک رائٹنگ پیڈ پر نوٹ کر کے مشینی انداز میں گھومی اور میزوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ایک پارٹیشن کے پیچھے غائب ہو گئی۔ نادر ایک بار پھر غیر محسوس سے انداز میں گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ اسے اب بھی وہاں کوئی دوسری ویٹریس دکھائی نہ دی۔

تھوڑی دیر میں اس کا سوپ آ گیا۔ ویٹریس نے سوپ کا باؤل اور اس کے لوازمات وغیرہ ٹرے سے نکال کر ایک مخصوص مہارت اور سلیقے سے اس کے سامنے سجا دیے۔ آرڈر سرو کرتے ہی وہ مشینی انداز میں گھوم کر واپس جانے لگی تو نادر نیچی آواز میں جلدی سے بول اٹھا۔ ''سنیے.....''

ویٹریس جس طرح جانے کے لیے گھومی تھی، اسی طرح واپسی کے لیے گھومی۔ ''جی.....؟'' اس بار اس نے ذرا گہری نظر سے نادر کی طرف دیکھا۔

''کیا یہاں غزالہ نام کی کوئی ویٹریس بھی کام کرتی ہے؟'' نادر نے یہ پوچھنے سے پہلے اطمینان کرلیا تھا کہ کسی دوسری میز سے کوئی اس کی طرف متوجہ تو نہیں تھا۔

''میں ہی غزالہ ہوں۔'' ویٹریس نے بلا تامل جواب دیا۔

نادر کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے اب اس خیال سے ویٹریس کے چہرے کا جائزہ لیا کہ کہیں وہ اس سے مذاق تو نہیں کررہی تھی، لیکن اسے احساس ہوا کہ وہ ریسٹورنٹ میں آنے والے گاہکوں سے شاید مذاق کرنے کی قطعی عادی نہیں تھی لیکن دوسری طرف نادر کو اس کی بات پر یقین کرنا بہت مشکل محسوس ہورہا تھا۔ جیل کی گندی اور تنگ سی کوٹھڑی میں مراد جب اس کے ساتھ رہتا تھا تو دن رات اپنی بیوی غزالہ کے قصیدے پڑھتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں نادر کو خاص طور پر بتاتا رہتا تھا۔ ''میری بیوی بہت خوب صورت ہے۔ فلم اور ٹی وی کی کئی ایکٹریسوں سے زیادہ خوب صورت ہے۔ میں تو بس اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے آدمی کو ایسی بیوی مل گئی۔''

نادر کو حیرت ہوتی تھی کہ بعض اوقات تو اپنی بیوی کے حُسن و جمال کے قصیدے پڑھتے پڑھتے وہ کچھ زیادہ ہی آگے چلا جاتا تھا۔ نادر نے اس سے پہلے کبھی کسی مرد کو کسی دوسرے مرد کے سامنے اس طرح اپنی بیوی کی خوب صورتی کے افسانے بیان کرتے نہیں سنا تھا۔ مراد نے صرف قصیدے پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ کہیں چھپائی ہوئی ایک پاسپورٹ سائز تصویر بھی نکال کر نادر کو دکھائی تھی۔ اس تصویر میں غزالہ اتنی خوب صورت تو دکھائی نہیں دے رہی تھی جتنا نادر بیان کرتا تھا لیکن بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔

''دراصل میں اس کی زیادہ اچھی اور بڑی تصویریں تو جیل میں نہیں لاسکا۔ بس یہ ایک ہی کسی طرح میرے ساتھ آگئی تھی۔'' مراد نے اس کی بھی وضاحت کردی۔ ''ایک مرتبہ تو باقاعدہ ایک فیشن فوٹوگرافر نے اس کی تصویریں کھینچی تھیں اور بڑے بڑے پرنٹ نکالے تھے۔ اگر تم وہ تصویریں دیکھ لیتے تو یقیناً یہی کہتے کہ یہ کسی سُپر ماڈل کی پکچرز ہیں۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے کہا۔ ''مراد بھائی آپ اپنی بیگم کو فیشن کی فیلڈ میں کیوں نہیں لاتے یا ٹی وی آرٹسٹ کیوں نہیں بناتے؟'' میں انہیں یہی کہتا..... کہ بھئی، نہ مجھے ان کاموں سے دلچسپی ہے اور نہ میری بیگم کو۔ ضروری نہیں ہے کہ سب خوب صورت لڑکیاں ماڈل یا ٹی وی آرٹسٹ بنیں۔ مجھے پتا ہے خوب صورت لڑکیوں کو بھی شوبز کی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہم ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ پھر ویسے ہی میں جیل پہنچ گیا۔ اگر ہمارے کچھ منصوبے تھے بھی، تو وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔''

وہ سب باتیں نادر کے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن اس وقت وہ اپنے سامنے کھڑی جس لڑکی..... بلکہ عورت کو دیکھ رہا تھا، اس میں اس حُسن و جمال کا عشرِ عشیر بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا جس کا لفظی نقشہ مراد کھینچا کرتا تھا۔ یہ غزالہ، مردانہ سفاری سوٹ کے انداز کی یونیفارم میں تھی اور کسی حد تک فربہ اندام نظر آرہی تھی۔ نیوی بلیو کلر کی اس یونیفارم میں اس کا جسم پھنسا پھنسا سا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرہ بھی گول مٹول تھا۔ اوپر سے، اچھے خاصے موٹے شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ تاہم یہ پتا ضرور چل رہا تھا کہ اس کا رنگ کافی گورا تھا اور سر پر رکھی، ائرہوسٹسوں جیسی کیپ کے نیچے سے جھانکتے ہوئے بال بھورے تھے۔ شاید یہ اس ''حسینہ'' کی خوب صورتی کی بچی کھچی نشانیاں تھیں۔

نادر کو احساس ہوا کہ ویٹریس ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ منتظر تھی کہ اس کا نام جاننے کے بعد نادر آگے بھی کچھ بولے۔ آخر نادر سنبھل کر بولا۔ ''کیا یہاں کوئی اور ویٹریس بھی کام کرتی ہے؟''

''دن کی شفٹ میں صرف میں ہوتی ہوں۔ شام پانچ بجے دوسری ویٹریس آتی ہے لیکن اس کا نام خورشید ہے۔'' غزالہ نے گویا اس کے ذہن میں ابھرتے ہوئے کسی اور امکان کا گلا گھونٹ دیا۔

نادر نے گویا مزید وضاحت کی۔ ''مجھے جس غزالہ کی تلاش ہے، وہ پہلے شانتی نگر میں رہتی تھی اور مراد علی نامی ایک شخص سے اس کی شادی ہوئی تھی۔''

اس عورت نے خاصی دیر میں پہلی مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے نادر کا جائزہ لیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی۔ ''میں وہی غزالہ ہوں..... لیکن تم کون ہو اور کیوں یہ سب کچھ پوچھ رہے ہو؟''

''میرے پاس تمہارے لیے تمہارے شوہر کی طرف سے ایک اہم پیغام ہے۔'' نادر بولا۔

''میرے شوہر کا تو انتقال ہو چکا ہے۔'' غزالہ کی نظروں میں کچھ شک سا جھلک آیا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' نادر کی آواز کچھ اور نیچی ہو گئی۔ ''اس کے انتقال سے کچھ دیر پہلے تک میں اس کے ساتھ تھا۔ میرا نام نادر ہے..... میں اور مراد علی جیل میں دو سال تک ایک ہی کوٹھری میں رہے تھے۔''

غزالہ کا چہرہ اب بھی سپاٹ ہی رہا اور اس کی آواز تقریباً سرگوشی کی حد تک دھیمی ہو گئی۔ ''کیا پیغام ہے تمہارے پاس؟''

نادر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ابھی تک کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور نہ ہی کسی نے آرڈر دینے یا بل منگوانے کے لیے غزالہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود نادر نے وہاں مزید بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور بدستور دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں یہاں بات نہیں کر سکتا۔ تمہاری ڈیوٹی کتنے بجے ختم ہوتی ہے؟''

''شام پانچ بجے۔'' غزالہ نے بھی اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد جواب دیا۔ ''اس کے بعد چند چھوٹے موٹے کاموں میں تھوڑی دیر لگ جاتی ہے۔''

''کیا تم ڈیوٹی کے بعد مجھے باہر کہیں مل سکتی ہو؟'' نادر اب اصل سوال پر آ گیا۔

غزالہ نے ایک لمحے سوچا پھر گویا دل ہی دل میں فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ''یہاں قریب ہی مزارِ شہید پارک ہے۔ کافی مشہور ہے۔ اگر تمہیں پتا نہ ہو تو کسی سے پوچھ لینا۔ اس میں داخل ہونے کے بعد گیٹ سے قریب ترین جو بھی بینچ خالی ملے، اس پر بیٹھ جانا۔ میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔ میں چھ بجے پہنچوں گی۔ احتیاطاً مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔''

اس نے نوٹ پیڈ اور بال پوائنٹ یوں سنبھال لیا جیسے اس کا آرڈر نوٹ کرنے لگی ہو۔

نادر ایک لمحے کے لیے ہچکچایا لیکن پھر اس نے نمبر بتا دیا۔ غزالہ نمبر نوٹ کر چکی تو نادر بولا۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہاں تم سے ملنے کے علاوہ میں کھانا کھانے کے ارادے سے بھی آیا تھا۔ مجھے ایک زنگر برگر بھی لا دینا۔''

''اوکے سر۔'' غزالہ کا لہجہ فوراً ویٹریس والا ہو گیا۔ اس نے زنگر برگر کا آرڈر بھی نوٹ کر لیا اور نادر پر مزید ایک نظر ڈالے بغیر رخصت ہو گئی۔

غزالہ کو ڈھونڈ نکالنا ایک طرح سے نادر کی ایک اہم کامیابی تھی لیکن عجیب بات تھی کہ یہ مرحلہ سر کر لینے کے بعد اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ جب گلستان جوہر سے اس مشن پر روانہ ہوا تھا تو غزالہ کو ڈھونڈ لینے کے تصور سے اس کے دل میں جذبات کی کچھ عجیب سی لہریں اٹھ رہی تھیں مگر اب دل میں گویا کچھ سکوت سا چھا گیا تھا۔ وہ جس قسم کی لڑکی یا عورت سے ملنے کا تصور ذہن میں لیے روانہ ہوا تھا، وہ تصور پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر مراد علی کی بیوی اس قسم کی تھی تو اسے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کی کیا ضرورت تھی؟

دو سال تک وہ جیل کی کوٹھری میں اس کے کان کھاتا رہا تھا اور اس کا موضوعِ گفتگو زیادہ تر اس کی بیوی ہوتی تھی۔ نادر کو زندگی میں اس سے پہلے کبھی کسی ایسے آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جو اپنی بیوی کا اتنا زیادہ تذکرہ کرتا ہو اور اس کے حسن کی اتنی تعریفیں کرتا ہو۔ نادر کو جب مراد کے ساتھ گزاری ہوئی دو سال کی مدت کا خیال آیا تو پہلی بار ایک جواز اس کی سمجھ میں آیا۔ یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ ایک امکان اسے نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید دو سال جیل میں رہنے اور عورت کی شکل تک نہ دیکھنے سے محرومی کے باعث شاید تصور ہی تصور میں اسے اپنی بیوی بہت حسین محسوس ہونے لگی ہو لیکن پھر نادر کو خیال آیا کہ جس غزالہ سے وہ ابھی ملا تھا، وہ تو اس غزالہ جیسی بھی نہیں تھی جس کی تصویر اس نے مراد کے پاس دیکھی تھی۔

پھر نادر نے سوچا کہ شاید مراد کے جیل جانے کے بعد غزالہ کو جن حالات سے گزرنا پڑا ہو، انہوں نے بھی اس کی ظاہری شخصیت کو برباد کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہو۔ اس کے بارے میں ایک حیران کن بات یہ بھی تھی کہ وہ کبھی جیل میں مراد سے ملنے نہیں آئی تھی۔ نادر بس مراد کی زبانی اس کے قصے ہی سنتا رہا تھا۔ نادر کو بہرحال اس بات کی زیادہ فکر نہیں تھی کہ اس نے غزالہ کے حسن کے جو قصے سنے تھے، وہ محض قصے ہی ثابت ہوئے تھے۔ اسے تو صرف یہ فکر تھی کہ مراد نے جو کہا تھا کہ اس نے پولیس کے ہتھے چڑھنے سے پہلے دو کروڑ کی رقم کہیں چھپا دی تھی، بس اس کی یہ بات سچ ہو۔ نادر کی نظر میں ساری اہمیت ہی صرف اس بات کی تھی۔

☆☆☆

غزالہ اپنے دیے ہوئے وقت کے بھی تقریباً آدھے گھنٹے بعد پارک میں پہنچی۔ اس وقت تک شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نادر کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے غزالہ کے ساتھ پارک کی بینچ پر بیٹھے دیکھے۔ اس میں کوئی خاص خطرہ تو نہیں تھا لیکن نادر اپنی مہم کے سلسلے

میں شروع سے ہی کچھ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

غزالہ کو شاید اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ نادر کو گیٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بینچ خالی مل گئی تھی۔ غزالہ سیدھی چلتے چلتے، اِدھر اُدھر دیکھ کر، غیر محسوس سے انداز میں مڑی اور آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے بینچ میں کوئی خاص فاصلہ نہیں رکھا تھا۔ یونیفارم کی نسبت وہ عام زنانہ لباس میں قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ نادر کو اس کے وجود سے ہلکی سی مگر عمدہ خوشبو بھی آئی۔ نادر کے دل کی دھڑکنیں ایک لمحے کے لیے کچھ تیز ہوئیں مگر فوراً ہی معمول پر آ گئیں۔ دراصل نادر کو فوراً ہی اپنا اصل مقصد یاد آ گیا تھا۔

اس نے اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے سگریٹ کا سہارا لینے کا ارادہ کیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا ہی تھا کہ اس کی نظر کچھ دور، چھوٹے سے ایک پول پر لگے ہوئے بورڈ پر پڑ گئی جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا۔ ”پارک میں سگریٹ نوشی سخت منع ہے۔“

اس نے سگریٹ کا پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا۔ وہ آج کل اس قسم کے چھوٹے موٹے قوانین کی پابندی کرنے کی مشق کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی نظر میں آنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

بینچ پر اور اس کے آس پاس ملگجا اندھیرا ہونے کے باوجود نادر نے محسوس کر لیا کہ غزالہ مجسس سی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ نادر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بات چیت کا آغاز کیا۔

”مراد آپ کی بہت باتیں کیا کرتا تھا۔ بہت یاد کرتا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر میں نے جیل میں ہی یوں محسوس کرنا شروع کر دیا تھا جیسے میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

غزالہ نے ایک لمحے کے لیے افسردگی آمیز انداز میں سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھا کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں شرم کی وجہ سے کبھی اُس سے ملنے جیل تو نہیں آ سکی لیکن میں اسے خط لکھتی رہتی تھی اور اس کے خط بھی مجھے ملتے رہتے تھے۔ ان میں آپ کا بہت تفصیل سے ذکر ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ لکھتے تھے، جیل میں نادر میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ ان کے خطوں میں آپ کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہوتا تھا کہ میں بھی محسوس کر رہی ہوں، جیسے میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”ہم واقعی ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔“ نادر اب روانی سے بات کر رہا تھا۔ ”کبھی کبھی میں جیل کی اس تکلیف دہ کوٹھری کو دیکھتا تو سوچا کرتا کہ قسمت نے ہمیں نہ جانے کیوں وہاں پہنچا دیا تھا۔ ہم دونوں ہی اس قسم کے آدمی نہیں تھے جنہیں دیکھ کر کوئی کہہ سکتا کہ ہاں، انہیں جیل میں ہی ہونا چاہیے تھا...... لیکن بس...... ہر انسان سے زندگی میں بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا کندھا غزالہ کے کندھے کے ساتھ لگ چکا تھا۔ غزالہ نے پرے کھسکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جسم کا حرارت آمیز گداز نادر کو اچھا محسوس ہوا۔ کافی عرصے بعد گویا اس کی زندگی کی ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے کوئی ننھا سا پتھر پھینکا تھا۔ دائرہ در دائرہ ابھرتی ہوئی لہریں فرحت کا احساس دلا رہی تھیں۔

نادر کو احساس ہوا کہ مزید اپنائیت کی فضا پیدا کرنے کے لیے اسے گفتگو جاری رکھنی چاہیے۔ ایک لمحے کی، افسردگی آمیز خاموشی کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”معلوم نہیں وہ میری غلطی تھی یا بدقسمتی، جس نے مجھے جیل پہنچایا لیکن یقین کرو، میں بھی کوئی پیشہ ور یا عادی مجرم نہیں تھا اور مراد بھی میرے ہی جیسا تھا۔ میں نے انٹر پاس کیا تو ٹرین کے ایک حادثے میں میرے والدین کا انتقال ہو گیا اور میں دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ بہن بھائی کوئی نہیں تھا۔ مکان کرائے کا تھا۔ کم عمری میں ہی زندگی آزمائش بن گئی۔ جب تقریباً فاقوں کی نوبت آ چکی تھی تو ایک مہربان شخص کی عنایت سے ایک پرائیویٹ فرم میں کلرکی مل گئی اور میں سر جھکا کر دل و جان سے محنت کرتے ہوئے کئی سال تک یہ نوکری کرتا رہا اور کسی حد تک سکون سے وقت گزرتا رہا لیکن پھر شہر کے حالات خراب رہنے لگے جن کی وجہ سے اس فرم کا کام بھی کم ہوتے ہوتے آدھا رہ گیا۔ مجبوراً مالکان نے ڈاؤن سائزنگ کی اور اسٹاف بھی آدھا کر دیا۔ بادلِ ناخواستہ انہوں نے مجھے بھی نکال دیا۔ جن صاحب نے یہ نوکری دلائی تھی، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ کافی عرصے تک ایک بار پھر دھکے کھاتا رہا۔ حالات ایک بار پھر تقریباً پہلی والی ڈگر پر آ گئے۔“ اس نے ایک طویل اور افسردگی آمیز سانس لے کر مسکراتے ہوئے غزالہ کی طرف دیکھا۔

وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور نہایت کم روشنی میں بھی نادر دیکھ سکتا تھا کہ غزالہ کی آنکھوں میں اس کے لیے

pklibrary.com
pklibrary.com

ہمدردی تھی۔ نادر نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اپنے اور اس کے درمیان اپنائیت کا بندھن تخلیق کرنے کے سلسلے میں کافی پُرامید تھا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ غزالہ نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ تب نادر نے اس کا ہاتھ پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ غزالہ نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ چھوٹے سائز کے کسی بن کی طرح گول مٹول اور گدیلا سا تھا لیکن اس میں زندگی کی حرارت تھی جو فوراً ہی گویا نادر کے وجود میں بھی منتقل ہونے لگی۔

اس نے اب ذرا طمانیت سے اپنی داستانِ حیات کا سلسلہ جوڑا۔ ''عین اس وقت جب دوبارہ تقریباً فاقوں کی نوبت آگئی تھی، مجھے ایک اور دفتر میں نوکری مل گئی۔ میں اتنا عقلمند تو نہیں تھا لیکن قدرت نے مجھ سے ایک عقل کا کام کرا دیا تھا کہ اپنی پہلی نوکری کے دوران میں نے کچھ کمپیوٹر کورسز کر لیے تھے جو میرے کام آگئے۔ انہی کی بنیاد پر مجھے دوسری نوکری ملی تھی۔ بظاہر وہ ایک کمپنی کا دفتر تھا۔ وہاں سارا کام کمپیوٹرز پر ہوتا تھا لیکن نہ جانے کہاں کہاں سے بہت سے لوگ کیش لے کر آتے رہتے تھے۔ دفتر دوپہر کے بعد کھلتا تھا اور شام تک وہاں بہت کیش جمع ہو جاتا تھا۔''

''کیا کاروبار تھا اُن لوگوں کا؟'' غزالہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ نادر کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کی آواز دلکش تھی۔ نادر کو غزالہ کی یہ آواز اس آواز سے کافی مختلف محسوس ہوئی جو اس نے ریسٹورنٹ میں سنی تھی۔

''میں اتنا احمق تھا کہ مجھے کافی دیر میں جا کر اندازہ ہوا کہ وہ سٹے کا کاروبار تھا جو بڑے منظم انداز میں کیا جا رہا تھا۔'' نادر ہولے سے، قدرے استہزائیہ انداز میں گویا اپنے آپ پر ہنسا۔ ''کئی بڑے بڑے بکیز ان کے پارٹنر تھے۔ کرکٹ میچ، گھوڑوں کی ریس، فٹ بال میچ اور ایسے کئی اسپورٹس پر وہ لوگ سٹا کھلاتے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا لیکن مجھ احمق کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ غیر قانونی کام تھا۔ سنگین جرم تھا۔ مجھے جس طرح ہدایات ملتی تھیں، میں ان کے مطابق آرام سے بیٹھا، کمپیوٹر پر کام کرتا رہا۔''

نادر نے خاموش ہو کر ملگجے اندھیرے میں غزالہ کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھیں ملگجے اندھیرے سے کافی حد تک مانوس ہو چکی تھیں اور وہ غزالہ کا چہرہ تقریباً صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر نہایت مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ یہ مسکراہٹ نادر کو اچھی خاصی دلکش محسوس ہوئی۔ اسے ریسٹورنٹ میں غزالہ کو دیکھ کر جو تاثر ملا تھا اب وہ اسے اس سے کافی مختلف لگ رہی تھی۔

''پھر وہاں چھاپا پڑ گیا ہوگا؟'' غزالہ نے دھیمی آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

''ہاں۔'' نادر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''باس نے مجھے ایک مضبوط سا بریف کیس دیا اور کہا۔ 'تم تو بلڈنگ کے پچھلے دروازے سے بھاگ جاؤ۔ ہم بعد میں تم سے رابطہ کریں گے۔ اس میں پچاس لاکھ روپے ہیں۔ اپنی جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرنا۔' باس نے شاید اس لیے رقم میرے حوالے کی تھی کہ اس دوران وہ لوگ مجھے اچھی طرح پرکھ چکے تھے کہ میں بہت سیدھا اور ایماندار آدمی ہوں۔ شاید اُن دنوں میں شکل سے بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ باس کا کہنا تھا کہ پولیس والے اسے شکل سے پہچانتے تھے۔ اگر انہوں نے اسے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیا تو شاید گولی مار دیں۔ میں جب بریف کیس لے کر دفتر سے نکلا تو سیڑھیوں پر پولیس والوں کے بھاری جوتوں کی دھڑ دھڑ سنائی دے رہی تھی۔ وہ کرخت آوازوں میں ایک دوسرے کو ہدایات بھی دے رہے تھے۔ بلڈنگ کا پچھلا دروازہ ایک قسم کا چور دروازہ تھا۔ میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جیسے ہی میں اسے کھول کر باہر نکلا، مجھے اس کے سامنے بھی دو پولیس والے کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑی گن بھی تھی۔ شاید کلاشنکوف تھی جو اس نے فوراً مجھ پر تان لی۔''

''اور تم پکڑے گئے۔'' غزالہ نے گہری سانس لے کر گویا کہانی مکمل کی۔

''میں صرف پکڑا ہی نہیں گیا، بلکہ پکڑے جانے سے پہلے مجھ سے ایک خوفناک حماقت بھی ہو گئی۔ میرے سر پر باس کی وفاداری کا بھوت سوار تھا۔ مجھے گرفتاری سے بچنے کی فکر اپنی خاطر نہیں تھی بلکہ میں ہر حال میں باس کی رقم کو بچا کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے غیر ارادی سے انداز میں بریف کیس اس پولیس والے کے سر پر دے مارا جس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ بریف کیس نہ جانے کس میٹریل کا تھا۔ بہت ٹھوس قسم کا تھا۔ پولیس والا پٹ سے گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ میں گلی کے سرے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ دوسرے پولیس والے نے میرے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کی، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گلی کے سرے پر بھی دو پولیس والے شاید پہلے ہی سے ہوشیار تھے اور گھات لگائے کھڑے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے مجھے اپنے ساتھی پولیس والے کے سر پر بریف کیس مارتے

بھی دیکھ لیا ہو۔ انہوں نے مجھے اسی طرح دبوچ لیا جس طرح بلی چوہے کو دبوچتی ہے اور بلی بھی ایک نہیں، دو تھیں۔"

"یوں تم جیل پہنچ گئے۔" غزالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میری گرفتاری صرف اس الزام میں نہیں ہوئی کہ میں بڑے بازوں کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں قتل کا مجرم بھی ثابت ہو گیا۔" نادر نے بتایا۔ "جس پولیس والے کے سر پر میں نے بریف کیس مارا تھا، وہ موقع پر ہی مر گیا تھا۔"

"اوہ....." غزالہ نے گہری سانس لیتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"مجھے دس سال کی سزا ہوئی تھی جو بعد میں کم کر کے سات سال کر دی گئی۔" نادر بولا۔

"اور پچاس لاکھ کی اس رقم کا کیا ہوا جو بریف کیس میں تھی؟" غزالہ کے لہجے سے ہلکی سی دلچسپی جھلک رہی تھی۔

"پولیس والوں نے جب مجھے پکڑا تو بریف کیس مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ معلوم نہیں، پولیس ہضم کر گئی یا دفتر والوں کے ساتھ ان کا کوئی نمک مکا ہو گیا۔ میں نے مقدمے کی کارروائی کے دوران ان کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ میرا ذہن اپنی ہی مصیبت میں پھنسا رہتا تھا۔ میں بریف کیس کو تقریباً بھول ہی گیا تھا، حالانکہ ایک بار "آلۂ قتل" کے طور پر اسے عدالت میں پیش کیا گیا تھا لیکن اس وقت بھی رقم کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حیرت انگیز طور پر رقم کے بارے میں کسی نے کوئی سوال ہی نہیں کیا۔" نادر نے بتایا۔

غزالہ نے قدرے تاسف آمیز انداز میں صرف "اوہ" کہنے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نادر بولا۔ "مراد میری سزا کے آخری دو سالوں میں میری کوٹھری میں آیا تھا۔ اس سے پہلے میرے ساتھ کوٹھری میں دوسرا قیدی تھا۔ وہ سزا پوری کر کے چلا گیا۔ اس سے میری دوستی نہیں ہو سکی۔ وہ بالکل اُجڈ اور گنوار سا آدمی تھا۔ اس سے میرے بس رسمی سے تعلقات رہے۔ اس کے بعد مراد کو میری کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ اسے دیکھ کر اور جان کر مجھے یقین ہی نہ آیا کہ اسے قتل اور دو کروڑ روپے کی رقم غائب کرنے کے الزام میں پانچ سال قید کی سزا ہوئی ہے۔ وہ تو اتنا شریف، شائستہ اور مہذب آدمی لگتا تھا کہ کوئی اس پر قتل اور اتنی بڑی رقم غائب کرنے کا شبہ تک نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہی نہیں، اس پر تو مقتول کی لاش بھی غائب کرنے کا الزام تھا۔ لاش اور رقم نہ ملنے کی وجہ سے ہی اسے کم سزا ہوئی تھی۔ کوئی ثبوت نہیں تھا، اسے صرف واقعاتی شہادتوں پر سزا سنائی گئی تھی۔ ایک گواہ سامنے آ گیا تھا جس نے مقتول پرویز کو، ایک بریف کیس لیے، اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں... بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔"

غزالہ ہولے سے کسمسائی اور یوں لگا جیسے وہ نادر کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لینا چاہتی ہو لیکن نادر نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ تب غزالہ نے دوبارہ ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور کمزور سی آواز میں بولی۔ "میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"میری تم سے یہ پہلی ملاقات ہے اور اس ملاقات کو بھی زیادہ دیر نہیں گزری لیکن تمہارے بارے میں ایک رائے قائم کر چکا ہوں اور وہ میری حتمی رائے ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک باحوصلہ اور مضبوط عورت ہو۔ حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہو اور بے پناہ حقیقت پسند بھی ہو۔ تم جیسی عورت کو حقائق سے گھبرانا نہیں چاہیے۔" نادر کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی اور خود اعتمادی بھی۔

غزالہ نے سر جھکا لیا۔ نادر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ نادر نے مطمئن سا ہو کر بات آگے بڑھائی۔ "کہا تو یہی جاتا ہے کہ جو ہو چکا، سو ہو چکا، ماضی کی باتوں کو دہرانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا..... لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی ماضی کو ضرور دہرانا چاہیے اور حالات کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ بعض اوقات اس میں فائدے کا کوئی پہلو نکل آتا ہے۔"

غزالہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چارگی تھی۔ اس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔ نادر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات جاری رکھ سکتا ہے۔ اس نے پہلے سے زیادہ خود اعتمادی سے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں جہاں تک اس کہانی کو سمجھ سکا ہوں، وہ کچھ یوں ہے کہ تمہارا شوہر مراد جس کمپنی میں کام کرتا تھا، پرویز وہاں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کمپنی کے دفتر میں کیش ڈیلنگ بہت زیادہ تھی اور کیش، بینک میں جمع کرانے چیف اکاؤنٹنٹ پرویز خود جاتا تھا۔ اکثر وہ بڑی رقوم بھی لے کر جاتا تھا لیکن کوئی گارڈ وغیرہ اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ بینک دفتر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔"

غزالہ یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے نادر یہ کہانی اُسے نہیں، کسی اور کو سنا رہا ہو۔ نادر نے بات جاری رکھی۔ ''ایک روز پرویز بریف کیس میں دو کروڑ روپے لے کر بینک میں جمع کرانے کے ارادے سے نکلا۔ پارکنگ میں آ کر اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن گاڑی اسٹارٹ ہو کر نہ دی۔ اسی وقت تمہارا شوہر مراد بھی دفتر سے نکلا تھا اور اپنی پرانی سی گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ اسی دفتر میں کام کرتا تھا اور اس روز اس نے جلدی چھٹی کر لی تھی۔ بقول اس کے، اسے گھر پر کوئی کام تھا۔ وہ بھی اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں ہی کام کرتا تھا اور اسے علم تھا کہ پرویز دو کروڑ روپے بینک میں جمع کرانے جا رہا ہے۔ اس روز سنیچر تھا۔ بینک کا ہاف ڈے تھا۔ بینک بند ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ نہ ہونے سے پرویز پریشان ہو گیا۔ مراد اُسے دیکھ رہا تھا اور اس کی پریشانی کا اندازہ کر چکا تھا۔ وہ جگہ ایسی تھی جہاں جلد کوئی سواری ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ مراد نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اپنی گاڑی میں بینک تک چھوڑ دے گا۔ دفتر میں مراد کو ایک شریف اور اچھا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ شاید پرویز نے یہ بھی سوچا ہو کہ ایک سے دو بھلے۔ وہ اپنی گاڑی چھوڑ کر جلدی سے اس کی کھٹارا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چھوٹی سی اس پارکنگ میں اس وقت کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔''

نادر خاموش ہوا تو غزالہ نے دھیمی آواز میں بات آگے بڑھائی۔ ''اس کے بعد پرویز کو کبھی نہیں دیکھا گیا۔ جب وہ بینک سے واپس نہیں آیا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ بینک پہنچا ہی نہیں تھا۔ دوسرے روز اتوار تھا۔ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ پیر کو مراد معمول کے مطابق دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت تک پرویز کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی گئی تھی جس میں یہ بھی درج کرایا گیا تھا کہ وہ دفتر سے دو کروڑ روپے لے کر بینک کے لیے روانہ ہوا تھا مگر اس کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی پائی گئی تھی۔ پولیس کو یہ شک بھی ہوا کہ کہیں وہ خود ہی تو رقم لے کر غائب نہیں ہو گیا تھا؟ لیکن دفتر والوں کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے نزدیک پرویز بے حد قابلِ اعتماد آدمی تھا اور اس سے پہلے بھی بارہا بڑی رقمیں لے کر بینک جا چکا تھا۔ پولیس کی تفتیش جاری رہی تو ایک گواہ سامنے آ گیا جو مراد کو پہچانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسی دفتر میں کام کرتا تھا جہاں پرویز چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس نے گواہی دے دی کہ اس نے پرویز کو مراد کی چھوٹی سی، پرانی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے پاس ایک بریف کیس بھی تھا۔ اس گواہی کی وجہ سے مراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے اس پر بہت تشدد کیا لیکن وہ اپنے اسی بیان پر قائم رہا کہ وہ پرویز کو بینک کے قریب گاڑی سے اتار کر گھر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اگلے روز، یعنی اتوار کو بھی پورا دن گھر پر ہی رہا تھا، اسے نہیں معلوم کہ پرویز رقم سمیت کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے بھی عدالت جا کر اس کے حق میں گواہی دی اور اس کے بیان کی تائید کی لیکن عدالت نے میری گواہی قبول نہیں کی، کیونکہ میں اس کی بیوی تھی۔ واقعاتی شہادت کی بنیاد پر اسے پانچ سال کی سزا سنا دی گئی۔ ہم نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ وہاں اس کی سزا ایک سال کم کر دی گئی لیکن بری نہیں کیا گیا۔''

''مگر وہ جیل میں صرف دو سال گزار پایا۔'' غزالہ کے خاموش ہونے پر نادر نے کہا۔ ''وہ جب جیل میں آیا، اس وقت بھی اس پر پولیس تشدد کے اثرات باقی تھے۔ اس کی حالت کافی خراب تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ہو گیا لیکن جیل والوں کی بھی اس پر نظر تھی۔ باہر کی پولیس کے چنگل سے نکلنے کے بعد وہ جیل کی پولیس کے شکنجے میں آ گیا تھا۔ انہیں بھی یقین تھا کہ دو کروڑ کی رقم اس نے کہیں چھپائی ہوئی ہے اور وہ اس فکر میں تھے کہ رقم اس سے ہتھیا لیں۔ اس کی موت کی خبر آنے سے دو دن پہلے وہ اسے جیل کی کوٹھری سے نکال کر کہیں لے گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بس، خبر ملی کہ جیل کے اسپتال میں ہارٹ اٹیک سے اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے شک ہے کہ انہوں نے رقم کے بارے میں جاننے کے لیے اس پر تشدد کیا ہو گا اور اس بار وہ تشدد کی تاب نہیں لا سکا ہو گا۔ مر گیا ہو گا۔ ضابطے کی کارروائیوں میں یہی لکھا گیا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کئی جیلوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ تشدد سے قیدی کو مار دیتے ہیں۔ باہر خبر یہی آتی ہے کہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا یا ہنگامہ آرائی کے دوران چھت سے گر کر مر گیا۔''

پھر نادر کو گویا کوئی خیال آیا اور وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''اگر مراد ہارٹ اٹیک سے ہی مرا ہو گا، تب بھی میرے خیال میں اسے تشدد کی وجہ سے ہی ہارٹ اٹیک ہوا ہو گا۔ دو دن پہلے جب اسے میری کوٹھری سے لے جایا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ جیل والوں کے لیے یہ خبر جاری کرانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں کہ فلاں ہارٹ اٹیک سے مر گیا یا اس نے کسی چیز کا پھندا بنا کر، کہیں لٹک کر خودکشی کر

لی۔"

"مراد کی لاش میں نے وصول کی تھی۔" غزالہ دھیمی آواز میں بولی۔ اس کے لہجے میں کوئی خاص دکھ یا تاسف نہیں تھا۔ "نہلانے والوں نے بتایا تھا کہ اس کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔"

"ممکن ہے انہوں نے ٹارچر کے ایسے طریقے استعمال کیے ہوں جن سے جسم پر کوئی نشان نہ پڑا ہو۔" نادر اپنے موقف پر قائم رہا۔ "پولیس والے چاہے کسی بھی ڈپارٹمنٹ کے ہوں، بڑے استاد ہوتے ہیں۔ جہاں تک جانا ہو، چلے جاتے ہیں، قدموں کے نشان نہیں چھوڑتے۔"

غزالہ کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا ہاتھ اب بھی نادر کے ہاتھ میں تھا اور دونوں ہاتھوں میں زندگی کی حرارت کچھ بڑھ چکی تھی۔ نادر نے نہایت آہستگی سے کچھ ایسے انداز میں اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا جیسے غزالہ کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ غزالہ نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ تب نادر نے گہری سانس لی اور آخر وہ سوال کر ہی ڈالا جو وہ ملاقات کے آغاز سے ہی دل میں دبائے بیٹھا تھا۔

"کیا اس نے تمہیں بھی نہیں بتایا کہ اس نے رقم یا پرویز کی لاش کہاں چھپائی تھی؟" نادر کا پوچھنے کا انداز بظاہر سرسری سا تھا۔

"اگر بتایا ہوتا تو کیا تمہارے خیال میں پھر بھی میں آج کل محمود آباد میں ایک کمرے کے پورشن میں کرائے پر رہ رہی ہوتی اور زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں وہ بے ہودہ سی نوکری کر رہی ہوتی؟" غزالہ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ "مراد کی گرفتاری سے پہلے ہم گلشن اقبال میں کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ فلیٹ زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن بہرحال کافی حد تک باعزت تھا۔ مراد کی گرفتاری کے بعد میں گویا فلیٹوں کے اس پورے پروجیکٹ میں مشہور ہو گئی۔ آتے جاتے، راستوں میں لوگوں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ خوف مجھے نوجوان لڑکوں سے آتا تھا۔ سب کو پتا چل چکا تھا کہ میں اکیلی فلیٹ میں رہتی ہوں۔ ہمارا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ ایک مخصوص قسم کے خوف کے علاوہ مجھے ان نوجوانوں سے یہ خوف بھی محسوس ہوتا تھا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ میرے شوہر کی غائب کی ہوئی رقم شاید میرے پاس محفوظ ہے۔ کہیں موقع دیکھ کر ان میں سے کوئی رات گئے یا دن دہاڑے ہی میرے فلیٹ میں نہ گھس آئے۔ اس خوف کے تحت پہلے تو میں نے اپنے آپ کو بدصورت بنانے کی مہم شروع کی۔ زیادہ کھا کھا کر اپنا وزن بڑھایا۔ پھر آنکھوں پر موٹے سے فریم اور زیرو نمبر کے شیشوں کی یہ عینک لگالی۔ اس دوران میرے لیے اس فلیٹ کا کرایہ ادا کرنا اور گزر بسر کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار میں وہاں سے نکل ہی گئی۔ محمود آباد میں بہت کم کرائے کا ایک کمرا مجھے مل گیا۔ تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کر کے یہ ویٹریس والی نوکری بھی مل گئی۔ ڈیفنس کا وہ ریسٹورنٹ محمود آباد سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ سیدھی بس جاتی ہے۔"

غزالہ کی ان باتوں سے نادر کی ایک اُلجھن تو دور ہو گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ غزالہ کے فربہ وجود اور گول مٹول چہرے کے پیچھے ایک خوب صورت لڑکی چھپی ہوئی تھی۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا یہ "شبہ" درست تھا۔ غزالہ اتنی خوب صورت تو شاید نہ رہی ہو، جتنے مراد اس کے قصیدے پڑھتا تھا لیکن بہرحال اس کا شمار خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا ہوگا۔ نادر کو بہت اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قسم کی لڑکیوں کا دنیا میں تنہا رہ جانا ان کے لیے کتنے وبال کا باعث بنتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد غزالہ قدرے افسردہ اور تاسف زدہ سے لہجے میں بولی۔ "دو کروڑ کی رقم کے لیے مراد نے بہت زیادہ لالچ اور خودغرضی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے مجھے بھی اس راز میں شریک نہیں کیا کہ اس نے واقعی پرویز کو قتل کیا تھا یا نہیں، رقم اس کے پاس تھی یا نہیں، اگر تھی، تو اس نے کہاں چھپائی تھی؟ حالانکہ میں نے اس سے شادی کر کے ایک طرح سے قربانی دی تھی۔ اپنی بیوہ والدہ کو ناراض کیا تھا۔ انہوں نے میرے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کیا ہوا تھا جو اُن کے خیال میں مراد سے کہیں بہتر تھا لیکن معلوم نہیں کیوں میں مراد کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ نوجوانی میں اکثر لڑکیاں شاید آنکھیں بند کر کے محبت کرتی ہیں۔ وہ اچھا بُرا یا نفع نقصان وغیرہ نہیں دیکھتیں۔ میرا خیال ہے، میری والدہ مرتے دم تک دل ہی دل میں اس بات پر مجھ سے ناراض تھیں۔"

پھر جیسے غزالہ کو کوئی خیال آیا۔ وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بہرحال، میں اب بھی مراد کے بارے میں خوش گمان رہنا چاہتی ہوں۔ عین ممکن ہے، رقم کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہو۔ شاید وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہو۔ مسئلہ یہی ہے کہ انسانوں کے بہت سے

منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مراد نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا لیکن ہوا یہ کہ اس رقم کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی۔''

نادر کو ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی جاننا چاہتا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا بے حد ضروری تھا۔ جلد بازی سے کام بگڑ سکتا تھا۔ اس لیے وہ بظاہر دلچسپی اور انہماک سے سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہی اس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اتنے کم وقت میں غزالہ اس کے ساتھ اتنی کھل گئی تھی اور اچھی خاصی اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیے بیٹھی تھی۔

نادر بظاہر سرسری لیکن اپنائیت بھرے انداز میں بولا۔ ''ویسے تمہاری ذاتی رائے کیا ہے...... مراد پر جو الزامات آئے، وہ ٹھیک تھے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' غزالہ کے لہجے میں اب بھی افسردگی تھی۔ ''مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وقوعے کے روز مراد دفتر سے جلدی چھٹی کر کے نکلا تھا لیکن وہ گھر جلدی نہیں آیا تھا۔ وہ شام کو گھر آیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر کئی جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ کچھ وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اگر ضرورت پیش آئی تو میں یہی بیان دوں کہ وہ آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ میرے اصرار پر بھی اس نے اصل بات مجھے نہیں بتائی۔ پھر بھی اسے بچانے کے لیے میں نے عدالت میں یہی بیان دیا کہ وقوعہ کے روز وہ آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے اس بیان سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس نے اپنی محبت کرنے والی اور ہر حال میں اپنا ساتھ دینے والی بیوی کو بھی اپنا رازدار نہیں بنایا۔ اسی لیے تو میں جیل میں بھی اس سے ملنے نہیں آئی۔ میں اس سے ناراض تھی لیکن شاید اسے میری ناراضی کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔''

نادر نے طمانیت کی گہری سانس لی اور محبت آمیز انداز میں غزالہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہ رہا تھا، وہ اسے معلوم ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نادر کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ پہلا مرحلہ غزالہ کو تلاش کرنا تھا۔ دوسرا مرحلہ اس سے معلومات حاصل کرنا تھا۔ اب اسے تیسرے اور اہم ترین مرحلے کی طرف بڑھنا تھا جو اس کے منصوبے اور جدوجہد کا تقریباً آخری مرحلہ تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ ''غزالہ! اگر وہ رقم تمہیں مل جائے تو تم کیا کرو گی؟ کیا پولیس کو دے دو گی؟''

''کیوں...... کیا میں پاگل ہوں؟'' غزالہ نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس رقم کی خاطر انہوں نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔ کیا میں ان کے اس ''کارنامے'' پر وہی رقم انہیں انعام کے طور پر دینے جاؤں گی؟''

نادر نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اپنے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات لانے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد غزالہ نرم لہجے میں بولی۔ ''میں ایماندار اور باکردار ضرور ہوں لیکن اتنی بھی نہیں کہ اب وہ رقم پولیس کو دینے چلی جاؤں، جب میں اپنا سب کچھ کھو چکی ہوں۔ میرا گھر اجڑ چکا ہے۔ میرا شوہر اس دنیا سے جا چکا ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ میں کتنی مشکل اور تکلیف دہ زندگی گزار رہی ہوں۔ اگر وہ رقم مجھے مل جائے تو میں اسے اپنی سمجھوں گی۔ اس پر میرا حق ہے۔ میں بھی ذرا ڈھنگ سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری جو بھی مدد کر سکا، وہ کروں گا۔ یوں سمجھو، وہ رقم ہم دونوں کی ہے۔'' نادر نے اس بار گویا اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

غزالہ نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ رقم کہاں ہے؟'' اس نے اپنے لہجے سے جھلکتے تجسس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''مجھے پوری طرح معلوم نہیں...... لیکن مجھے کچھ اشارے ضرور ملے تھے۔ میرا خیال ہے، اگر ہم مل کر کوشش کریں تو ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' نادر نے اپنے ساتھ ساتھ گویا غزالہ کو بھی امید دلانے کی کوشش کی۔ ''مجھے جیل کے اسپتال میں چند منٹ کے لیے مراد کے پاس جانے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ چونکہ آس پاس کئی پولیس والے بھی موجود تھے، اس لیے اس نے اکھڑی اکھڑی سی سانسوں کے درمیان کچھ ادھوری اور گول مول سی باتیں کیں۔ اس کی باتوں میں اشارے تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے، اس کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہوگا۔''

غزالہ خاموش رہی لیکن اس کی خاموشی گویا رضامندی کا اظہار تھی۔ اس کے چہرے پر اب ذرا بھی اجنبیت نہیں تھی۔ نادر کی خود اعتمادی میں گویا اضافہ ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ غزالہ کے ہاتھ سے ہٹا کر بازو عقب سے اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس کے کندھے پر ٹکا لیا۔

اب ان کے انداز سے پہلے کی نسبت زیادہ اپنایت کا اظہار ہو رہا تھا۔ غزالہ نے نہ تو اس کا بازو اپنے کندھوں سے ہٹایا اور نہ ہی اس کے پاس سے کھسکنے کی کوشش کی۔ اس کے قرب کے خوشگوار احساس سے نادر کو طمانیت بھی ملی اور مزید خود اعتمادی بھی۔

غزالہ گردن موڑے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نادر اس کی سانسوں کی حرارت اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ غزالہ شاید رقم کے موضوع پر مزید کچھ سننا چاہتی تھی لیکن نادر نے اس کے بجائے کہا۔ ''یہ بتاؤ، کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو؟ کیا میں تمہارے کمرے میں یا اس کی کسی راہداری وغیرہ میں دو چار دن قیام کر سکتا ہوں؟ میرے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ میں اسٹیشن کے قریب ایک سستے سے ہوٹل میں پڑا ہوں، لیکن وہ بڑی واہیات جگہ ہے۔ رات بھر شور شرابا رہتا ہے۔ سونا مشکل ہوتا ہے۔''

غزالہ گویا سوچ میں پڑ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی، پھر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''وہ غریبانہ اور کافی گنجان آباد سا علاقہ ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ لوگ وہاں ایک دوسرے کی زیادہ ٹوہ میں نہیں رہتے اور کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ مالک مکان بھی بہت اچھا ہے۔ کرایہ تک لینے نہیں آتا۔ میں خود ہی جا کر دے کر آتی ہوں۔ میرے کمرے کا راستہ بھی الگ تھلگ ہے۔'' اس کا انداز خود کلامی کا سا ہو گیا تھا اور سر جھک گیا تھا۔ دونوں ہاتھ گود میں لگے ہوئے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا فیصلے پر پہنچ گئی۔ ایک بار پھر سر اٹھا کر اس نے نادر کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''ہاں..... میرا خیال ہے، تم رہ سکتے ہو..... اس میں کوئی حرج نہیں..... بس، جس حد تک ممکن ہو سکے، لوگوں کی نظر میں آنے سے بچنا۔''

''ارے..... تم فکر ہی نہ کرو۔ تمہیں خود بھی مشکل سے ہی پتا چلے گا کہ کوئی تمہارے ساتھ رہ رہا ہے۔'' نادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

غزالہ کے ہونٹوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس لمحے وہ نادر کو بہت دلکش دکھائی دی۔ وہ گویا اسے اس کے فاضل وزن اور چشمے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اسے بانہوں میں بھر لے، لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ پارک میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں اس نے کچھ دیر پہلے، کچھ دور، جوگنگ ٹریک کے دوسری طرف سے ایک باوردی گارڈ کو بھی گشت کرنے کے انداز میں گزرتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

غزالہ کا کمرا نادر کی توقعات سے بہتر تھا۔ علاقہ خواہ جیسا بھی تھا لیکن کمرا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ غزالہ نے اسے اچھے طریقے سے سیٹ بھی کیا ہوا تھا، جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ خاصی سلیقہ شعار عورت تھی۔ کمرے میں ڈبل بیڈ کے علاوہ چھوٹا سا ایک صوفہ سیٹ بھی تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا کچن اور باتھ روم بھی موجود تھا۔ نادر نے اپنی اس نئی پناہ گاہ کو دیکھ کر سکون کی سانس لی۔ آتے وقت وہ ہوٹل سے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس بھی اٹھا لایا تھا۔ کرائے کی ایک پرانی اور چھوٹی سی گاڑی بھی اس کے پاس تھی، جس کا کرایہ بہت کم تھا۔ ایسی گاڑی اسے بڑی تلاش کے بعد ملی تھی۔ کرائے پر گاڑیاں دینے والی تمام کمپنیوں کے پاس زیادہ تر اچھی، بڑی اور مہنگی گاڑیاں تھیں جن کے کرائے زیادہ تھے اور رینٹ اے کار والے ان کے ساتھ ڈرائیور بھی اپنا بھیجنے پر اصرار کرتے تھے۔ چھوٹی سی وہ کھٹارا گاڑی کمپنی نے اسے بہت کم کرائے پر، اور بغیر ڈرائیور کے آسانی سے دے دی تھی۔

غزالہ نے اپنے چھوٹے سے فریج میں رکھی چیزوں سے مزیدار سا کھانا..... تیار کر کے خود بھی کھایا اور اسے بھی کھلایا تو اس کی روح اور بھی سرشار ہو گئی۔ پھر گرما گرم چائے پی کر تو وہ گویا باقاعدہ ترنگ میں آ گیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر ایک سگریٹ سلگا کر، پہلا طویل کش لینے کے بعد تو اس کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو دنیا کے خوش قسمت انسانوں میں شمار کرنا شروع کر دے۔ یہ سگریٹ اس نے کئی گھنٹے بعد سلگائی تھی۔ غزالہ پاؤں فرش پر بچھی دینائل کی شیٹ پر ٹکائے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نادر نے گویا اسے تسلی دی۔ ''تم میری طرف سے کوئی تشویش محسوس نہ کرنا اور نہ ہی میری کوئی فکر کرنا۔ میں اس صوفے پر ہی سو جاؤں گا۔ تمہیں اپنے معمول کے مطابق جب بھی سونا ہو، سو جانا۔'' اس کے خیال میں اس وقت غزالہ پر اپنی ''بلند کرداری'' کا تاثر مضبوط کرنے میں ہی بہتری تھی۔

''مجھے اس بات کی کوئی خاص فکر نہیں ہے کہ تم کہاں سوؤ گے۔'' غزالہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اس کے جواب اور چہرے کے خوشگوار تاثرات نے چند لمحوں کے لیے نادر کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں اور اسے اپنے

''بلند کرداری'' کے فلسفے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ تو خواہ مخواہ ہی بلند کرداری کا ثبوت دینے کے لیے ہلکان ہو رہا تھا۔ تاہم اس احساس کے بعد بھی وہ اپنی جگہ بیٹھا دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لیتا رہا۔

چند لمحے بعد غزالہ نے اٹھ کر لائٹ آف کی، زیرو کا بلب جلایا اور نادر کی طرف سے منہ پھیر کر چادر میں اپنے آپ کو کندھوں تک چھپا کر لیٹ گئی۔ نادر نے سگریٹ ختم کر کے اسے خالی کپ میں بجھایا اور کشن سرہانے رکھ کر گھٹنے موڑ کر صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں اتنا گہرا سکوت طاری تھا کہ نادر، غزالہ کے مدھم سانسوں کی آواز بھی سن رہا تھا اور اسے توقع تھی کہ غزالہ بھی اس کے سانسوں کی آواز سن رہی ہوگی۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ آخر نادر نے سونے کا ڈراما ختم کیا اور اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک سگریٹ اور سلگالی۔ غزالہ نے کروٹ لے کر، کہنی کے بل ذرا اونچی ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم ابھی تک سوئے نہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اس کی آواز میں نیند کا ہلکا سا خمار تھا۔ ہلکی روشنی میں نادر کو اس کا چہرہ اور نیند سے بوجھل آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

''تم بھی تو نہیں سوئیں۔'' نادر مسکرایا۔

''میں تو تقریباً سو ہی گئی تھی۔ تم نے تیلی جلائی تو میری آنکھ کھل گئی اور پھر ایک سوال نے بجلی کے جھماکے کی طرح میری نیند اُڑا دی۔'' غزالہ بولی۔ غنودگی کے بھاری پن سے اس کی آواز دلکش محسوس ہو رہی تھی۔

''کیسا سوال؟'' نادر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مراد نے زندگی کے آخری لمحوں میں رقم کے بارے میں تمہیں کیا اشارہ دیا تھا۔'' غزالہ نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے خمار کی وجہ سے گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس وقت ان آنکھوں پر موٹے سے فریم کا وہ، بوڑھوں جیسا چشمہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس لیے ان آنکھوں کو دیکھ کر نادر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ وہ صوفے پر کھسک کر بیڈ کے قریب ہو گیا۔ ان کے چہروں کے درمیان اب بہ مشکل ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔

''اس نے کہا تھا کہ رقم اب بھی پرویز ہی کے پاس ہے۔'' نادر نے دھیمی آواز میں کہا۔

''یہ بھلا کیا اشارہ ہوا؟'' غزالہ کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔ ''اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ وہ ایک بار پھر اپنی بے گناہی کا اعلان کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ پرویز ہی رقم لے کر فرار ہو گیا تھا اور ابھی تک غائب ہی تھا۔ رقم بھی اسی کے پاس ہوگی۔''

نادر اسے ''بے وقوف عورت'' کہنے ہی لگا تھا لیکن اس نے بروقت یہ الفاظ اپنے منہ میں ہی روک لیے اور ہاتھ بڑھا کر پیار بھرے انداز میں اس کا گول مٹول گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''ڈارلنگ! ذرا دوسرے زاویے سے سوچنے کی کوشش کرو۔''

اس نے لفظ ''ڈارلنگ'' بے اختیار یا غیر ارادی طور پر نہیں بولا تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کر، بروقت ''بے وقوف عورت'' کو ''ڈارلنگ'' میں بدل دیا تھا۔ بظاہر وہ محبت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت بہت باریک بینی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ غزالہ کے چہرے پر اسے ناگواری کی کوئی علامت دکھائی نہ دی۔ نادر نے اس کا گال تھپکا تھا اور اسے ڈارلنگ کہا تھا تو غزالہ کے تاثرات پہلے کی نسبت کچھ اور خوشگوار ہو گئے تھے۔ نادر کے دل میں خوشی کی ایک نئی لہر ابھری۔ ایک ایک کر کے اس کے مشن کے مرحلے بہ خیر و خوبی طے ہو رہے تھے۔

اسے خود بھی احساس تھا کہ جیل جانے سے پہلے وہ کسی اور طرح کا انسان تھا اور جیل میں رہنے کے دوران وہ کسی اور طرح کا انسان بن گیا تھا۔ اب اس کے دل میں بھی کامیاب انسان بننے کی خواہش بہت طاقت پکڑ چکی تھی۔ شاید وہ اب خواہش بھی نہیں رہی تھی بلکہ ہوس بن گئی تھی۔ اس کے خیال میں آج کے معاشرے میں کامیاب انسان وہی تھا جس کے پاس دولت تھی اور بیشتر انسانوں کی طرح اس کے نزدیک بھی یہ بحث غیر اہم ہو چکی تھی کہ دولت حاصل کرنے کے طریقے یا ذرائع کیا ہوں۔ وہ بھی شارٹ کٹ کا قائل ہو گیا تھا۔ ابھی وہ پہلا شارٹ کٹ طے کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پہلا شارٹ کٹ کامیابی سے عبور کرنے کے بعد اس کا سفر آسان تر ہوتا جائے گا اور یہ سفر ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے شارٹ کٹ کا سفر ہوگا۔ ہر شارٹ کٹ کے بعد اس کی دولت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب اسے اپنی وہ زندگی بہت ہی بے وقوفی کی زندگی محسوس ہونے لگی تھی جو اس نے جیل جانے سے پہلے گزاری تھی۔

''وہ دوسرا زاویہ کیا ہے؟'' غزالہ نے پوچھا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھی اور پاؤں اس نے بیڈ سے نیچے لٹکا لیے تھے۔ یوں

وہ نادر کے اور زیادہ قریب ہوگئی تھی۔

غزالہ سے قربت کے نشے اور اپنی کامیابی کی سرشاری کے احساس سے نادر کا دماغ گویا ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اس سے پہلے اس نے کیا کہا تھا۔

''کون سا دوسرا زاویہ؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''تم کہہ رہے تھے نا..... کہ دوسرے زاویے سے سوچنے کی کوشش کرو۔'' غزالہ نے یاد دلایا۔

''ارے ہاں۔'' نادر کو یاد آیا اور اس نے محبت سے غزالہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ دوسرے زاویے سے مراد کے جملے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز مراد آفس سے جلدی نکلا تھا لیکن وہ اس کے تین چار گھنٹے بعد گھر پہنچا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑوں پر کئی جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور چہرے سے وہ کچھ وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔''

''ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے۔'' غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا میری جان..... کہ اس نے واقعی پرویز کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اس کی لاش کہیں چھپا دی تھی اور یقیناً رقم بھی اس کے ساتھ ہی چھپا دی تھی۔ اس لیے اس نے کہا تھا کہ رقم اب بھی پرویز ہی کے پاس ہے۔ اس کا یہ جملہ معنی خیز تھا۔'' نادر نے گویا ایک معما حل کر دیا۔

غزالہ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب اس کی آنکھوں سے نیند کا خمار غائب ہو چکا تھا۔ نادر ہولے ہولے اس کا ہاتھ تھپتھپا رہا تھا۔

''اور اس کمینے نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔'' آخر غزالہ ایک طویل سانس لے کر تاسف زدہ سے لہجے میں بولی۔ ''دو سال اس نے جیل میں گزار دیے۔ لمبے لمبے خط لکھتا رہا۔ بڑی لیلیٰ مجنوں والی باتیں لکھتا رہا مگر اصل کام کی بات کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں دیا۔''

''اس کے ذہن میں کچھ ہوگا۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچا ہوا تھا مگر انسان کو اپنے مستقبل کا پتا نہیں ہوتا۔ اس بے چارے کو کیا پتا تھا کہ ایک دن وہ اچانک ہی مر جائے گا۔'' نادر نے قدرے ہمدردانہ لہجے میں کہا پھر خود بھی اُچک کر بیڈ پر غزالہ کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ مراد نے لاش کہاں چھپائی ہوگی۔ لاش جہاں ہوگی، رقم بھی وہیں ہوگی۔''

''یہ تو بڑا مشکل مسئلہ ہے۔'' غزالہ نے معصومانہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اتنا بڑا شہر کراچی ہے۔ یہاں تو سیکڑوں لاشوں کا پتا نہیں چلتا۔ ہم اکیلے پرویز کی لاش کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔''

''ہم اگر یونہی منہ اٹھا کر ڈھونڈنے نکل پڑیں گے، پھر تو ہمیں واقعی کچھ نہیں ملے گا۔'' نادر بولا۔ ''جب تک تھوڑا بہت اتا پتا نہ ہو، لاش تو کیا، زندہ آدمی کو ڈھونڈنا بھی ممکن نہیں۔ تم مجھے ذرا دماغ لڑانے دو، سوچ بچار کرنے دو۔ کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ کوئی راستہ نظر آجائے گا۔''

غزالہ نے پُرخیال انداز میں سر جھکا لیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نادر بولا۔ ''مراد کا کچھ بچا کھچا سامان تمہارے پاس نہیں ہے؟ ذاتی چیزیں..... کوئی کاغذات وغیرہ؟''

اس کے کپڑے اور استعمال کی دوسری کچھ چیزیں تو میں نے مانگنے والوں کو دے دی تھیں۔ دو چار فائلیں، کچھ کاغذات، بل وغیرہ ہیں۔ وہ چیزیں میں نے چھوٹے سے ایک ٹرنک میں ٹھونس رکھی ہیں۔ مجھے تو وہ بھی بیکار ہی لگتی ہیں۔ میں تو کچھ دنوں تک انہیں بھی کوڑے میں پھینکنے کا ارادہ کر رہی تھی۔'' غزالہ نے بتایا۔

''نہیں..... نہیں.....'' نادر جلدی سے بول اٹھا۔ ''تم پہلے وہ چیزیں مجھے دکھاؤ۔ اس کے بعد پھینکنے یا نہ پھینکنے کا فیصلہ کرنا۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کسی چیز میں کوئی سراغ موجود ہو۔''

''ابھی تو میں نہیں دکھا سکتی۔ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔'' غزالہ نے گویا اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک زوردار جماہی بھی لی۔ ''کل میری چھٹی ہے۔ صبح آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف پیٹھ کر کے، ایک بار پھر چادر گردن تک کھینچ کر لیٹ گئی۔

نادر چند لمحے صوفے پر ہی بیٹھا، پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ہمت کر کے خود بھی بیڈ پر اس کے قریب دراز ہوگیا۔ غزالہ نے نہ چونک کر، پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی اعتراض کیا۔ خوشی اور اشتیاق سے ایک بار پھر نادر کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رقم کے ساتھ بونس کے طور پر اگر ایک اچھی خاصی عورت بھی ہاتھ آرہی ہے تو کیا برا ہے۔ اسے امید تھی کہ مستقبل قریب میں غزالہ اپنے موٹے چشمے سے چھٹکارا پا کر اور کچھ عرصہ ڈائٹنگ کر کے ایک ایسی عورت بن جائے گی جسے ایک بار دیکھنے والا کوئی بھی مرد پلٹ کر دوبارہ ضرور دیکھے گا۔

☆☆☆

دوسری صبح ناشتے کے بعد بھی نادر کے حواس پر شب رفتہ کا خمار باقی تھا۔ بات بے بات اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ برسوں بعد اس نے خود کو اتنا خوش اور آسودہ محسوس کیا تھا۔ غزالہ نے جس طرح اسے سوتے سے جگایا تھا، جس طرح ناشتا تیار کیا تھا اور پھر جس طرح ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ دونوں برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے اور نہایت خوشگوار زندگی بسر کررہے تھے۔ نادر کے ذہن کے کسی گوشے میں مستقبل کے کئی حسین خوابوں کے تانے بانے خود بہ خود جنم لے رہے تھے اور خود ہی معدوم ہورہے تھے۔

آخر جب غزالہ ناشتے کے برتن بھی دھو کر فارغ ہو چکی اور صوفے پر آن بیٹھی تو نادر نے فوراً فرمائش کر ڈالی۔

''اب تم وہ صندوق نکالو جس کا تم نے ذکر کیا تھا...... جس میں مراد مرحوم کی کچھ چیزیں ہیں۔''

''نکالنا کہاں سے ہے...... وہ تو سامنے ہی رکھا ہے۔'' غزالہ نے کونے میں رکھی، لوہے کی پرانی سی الماری کی طرف اشارہ کیا۔ اس الماری کے اوپر بہت سا کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹرنک بھی تھا۔

نادر نے اٹھ کر، کھینچ کھانچ کر اسے اتارا تو تھوڑی سی دھول مٹی اس پر آن پڑی۔ غزالہ نے جلدی سے ایک کپڑا لے کر نادر کو بھی جھاڑا اور ٹرنک کو بھی۔ نادر نے فرش پر بیٹھ کر آلتی پالتی مار کر اطمینان سے ٹرنک کو کھولا۔ اس پر کوئی تالا نہیں تھا۔ اس میں زیادہ تر مڑے تڑے کاغذات اور آڑے وقت میں کام آنے والی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ لگتا تھا، کوئی بھی چیز احتیاط اور سلیقے سے نہیں رکھی گئی تھی، ہر چیز یونہی عجلت میں، بے پروائی سے ٹرنک میں ڈال دی گئی تھی۔

بہت سی رسیدیں، بل اور دیگر کاغذات مراد کے دفتر کے ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کا تعلق اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ سے تھا اور وہ اوریجنل تھے۔ نادر نے ایک ایک کر کے ان سب کا جائزہ لیا اور غزالہ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''مراد نے یہ سب کاغذات گھر میں کیوں رکھے ہوئے تھے؟''

غزالہ نے اس کی توقع کے عین مطابق لاعلمی کا اظہار کیا، پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتی، اور نہ ہی انہوں نے اس سلسلے میں کبھی مجھے کچھ بتایا لیکن جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے، مجھے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اکاؤنٹس میں چھوٹی موٹی ہیرا پھیریاں کرتا رہتا تھا۔ شاید فالتو خرچے انہی سے چلتے تھے اور ہمارا رہن سہن ذرا بہتر تھا، ورنہ وہ محض اکاؤنٹس کلرک ہی تو تھا۔''

نادر تائید میں سر ہلا کر رہ گیا۔ غزالہ کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

ایک ایک کر کے اس نے ساری چیزیں اور کاغذات وغیرہ نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیے۔ ٹرنک کی تہ میں سے زرد رنگ کی ایک پرانی، پتلی سی فائل نکلی۔ اس میں صرف دو کاغذ لگے ہوئے تھے۔ ایک اقرار نامہ تھا جو بیس روپے کے عدالتی اسٹیمپ پیپر پر تحریر تھا۔ آڑی ترچھی رائٹنگ میں اس پر درج چند سطروں کے مضمون کے مطابق عبدالقادر نامی کوئی شخص محض بیس ہزار روپے کے عوض 80 گز کا کوئی پلاٹ مراد کو فروخت کر رہا تھا جو ''لہڑی گوٹھ۔ دیہہ چاکراں'' میں واقع تھا۔

فائل میں لگے دوسرے سفید کاغذ پر دُھندلی سی لکیروں سے محض ایک چوکور سا خانہ بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف فاضل لکیریں بھی کھنچی ہوئی تھیں۔ چوکور خانے کے اندر 302 نمبر درج تھا۔ جبکہ اس کے گرد دوسرے نامکمل خانوں میں دوسرے نمبر تھے۔ نادر یہ تو سمجھ گیا کہ جو خانہ مکمل تھا اور جس میں 302 نمبر درج تھا، وہ اس پلاٹ کی نشاندہی کر رہا تھا جو مراد نے صرف بیس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ چاروں طرف کے نامکمل خانوں میں درج نمبر اس کے اردگرد کے پلاٹوں کے تھے مگر فائل میں لگے ہوئے ان دونوں کاغذوں پر شہر کے کسی ادارے، کسی محکمے یا ادارے کا نام یا کسی قسم کا کوئی اور حوالہ نہیں تھا۔ لہڑی گوٹھ اور دیہہ چاکراں کہاں تھی، یہ نادر کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' نادر نے کھلی فائل غزالہ کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

''اوہ...... اسے تو میں بھول ہی گئی تھی۔'' غزالہ پیشانی پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گئی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''دوسری بہت سی خوش فہمیوں کے علاوہ مراد کو اپنے بارے میں ایک خوش فہمی یہ بھی تھی کہ وہ دنیا کے عظیم ''انویسٹرز'' میں سے ایک ہے۔ نہ جانے کن کن منصوبوں میں انویسٹ کرنے کے لیے وہ رقم حاصل کرنے کی ترکیبیں دن رات سوچتا رہتا تھا لیکن اس کی کوئی تدبیر بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ دو گز زمین کا ہاتھ مارنے کا جو منصوبہ شاید کامیاب ہو گیا، وہ بھی میرا خیال ہے، اس نے اچانک ہی بنایا ہوگا۔ دیکھا جائے تو شاید اسے بھی ہم کامیاب نہیں کہہ

سکتے۔ اس نے اتنا تشدد برداشت کیا اور آخر جان سے ہی چلا گیا۔ رقم، پتا نہیں اسے دیکھنی بھی نصیب ہوئی یا نہیں۔"

"یہ اس پلاٹ کا کیا قصہ ہے؟" نادر نے فائل لہرا کر گویا اسے اصل موضوع یاد دلایا۔

"پتا نہیں اس پلاٹ کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔" غزالہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "یہ اس نے مجھ سے شادی سے بھی پہلے خریدا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ننھا سا یہ پلاٹ ایک روز اسے کروڑ پتی بنا دے گا۔"

"مگر یہ ہے کہاں؟" نادر نے قدرے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" غزالہ بولی۔ "میں تو اس فائل کو بھی بھول گئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ اس کی کوئی وقعت ہے۔ تمہیں معلوم ہے کراچی میں لینڈ مافیا کا کاروبار کتنا وسیع ہے۔ میرا خیال ہے شہر کی حدود میں جتنے بھی مکان اور عمارتیں وغیرہ بنی ہوئی ہیں، ان میں سے آدھی، لینڈ مافیا ہی کی ہتھیائی ہوئی اور بچی ہوئی زمین پر بنی ہیں۔ مراد کو بھی شاید لینڈ مافیا یا لینڈ گریبرز کا کوئی کارندہ ٹکرا گیا تھا۔ شاید وہ لوگ کچھ زمین پر قبضہ کر کے، گوٹھ کے نام پر وہاں پلاٹ بنا کر بیچ رہے ہوں گے۔ اس وقت گلستان جوہر بھی ٹھیک طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ مراد نے مجھے سرسری سا بتایا تھا کہ یہ جگہ صفورا گوٹھ سے بھی چار پانچ میل آگے، یونیورسٹی روڈ اور سپر ہائی وے کے سنگم سے بائیں جانب بہت آگے جا کر کہیں تھی۔"

"گویا تمہیں اس کی صحیح لوکیشن معلوم نہیں ہے؟" نادر نے نرم لہجے میں پوچھا۔ یہ نرمی اس نے اپنے لہجے میں ذرا کوشش سے پیدا کی تھی۔ ورنہ اسے غزالہ پر تھوڑا تھوڑا غصہ آنے لگا تھا۔

"نہیں۔" غزالہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ویسے مراد نے یہ بتایا تھا کہ اس نے پلاٹ پر چار دیواری بنوا کر کچا پکا سا ایک کمرا بنوا دیا تھا اور گیٹ بھی لگوا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح پلاٹ محفوظ ہو گیا تھا ورنہ اس قسم کے پلاٹوں پر قبضہ در قبضہ کا خطرہ رہتا ہے۔ وہ بڑا خوش ہوتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ 'آج وہ جگہ جنگل ہے..... مٹی ہے..... لیکن کل سونا ہو گی۔' پلاٹوں کی اسکیموں کے اشتہاروں میں بھی اکثر یہ جملہ لکھا جاتا ہے۔ ہم جیسے کنگلے عام طور پر اس قسم کے جملے پڑھ کر بہت متاثر ہوتے ہیں اور اپنی جمع پونجی لے کر بکنگ کرانے چل دیتے ہیں لیکن میں اس قسم کے جملوں سے کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ انسان کا اپنی خواہشوں پر کوئی اختیار نہیں اور خواہشیں پالنے پر کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ میری خواہش ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ میرا مکان پہلے سے آباد، کسی صاف ستھرے علاقے میں ہو..... اور چونکہ مستقبل قریب میں میری یہ خواہش پوری ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے جہاں میں افورڈ کر سکتی تھی، وہاں کرائے پر ہی یہ ایک کمرا لے کر صبر شکر سے رہنے لگی۔"

نادر کا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ غزالہ کے خیالات اور نظریات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے بتایا تھا کہ مراد دفتر میں اپنے آخری دن جلدی چھٹی کر کے نکلا تھا لیکن وہ رات کو گھر پہنچا تھا۔ اس کے کپڑوں اور بالوں پر مٹی لگی ہوئی تھی اور وہ کچھ وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔"

"ہاں، یہ تو مجھے یاد ہے۔" غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

نادر چند سیکنڈ پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اس چھوٹے سے پلاٹ پر بنے ہوئے کچے پکے کمرے کو تلاش کرنا ہوگا۔"

"لیکن کیسے؟ مجھے تو اس جگہ کا سر پیر نہیں معلوم۔" غزالہ قدرے مایوسی سے بولی۔

"مجھے کچھ اندازہ ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس قسم کی جگہوں کو تلاش کرنے میں کس سے مدد لینی چاہیے۔" نادر کچھ فاتحانہ سے انداز میں مسکرایا۔ اسے گویا اس وقت غزالہ پر کسی حد تک برتری حاصل تھی۔ غزالہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور تھی۔ اس کے پاس نہایت کم کرائے کی ایک چھوٹی سی، پرانی گاڑی بھی موجود تھی جس میں رکھا ہوا اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس وہ غزالہ کے کمرے میں ہی لے آیا تھا۔ تھوڑی سی رقم بھی اس کے پاس تھی۔ وہ غزالہ کی مدد کے بغیر بھی کچھ دن جدوجہد اور بھاگ دوڑ میں گزار سکتا تھا۔ یہ ایک طرح سے چھوٹی سی سرمایہ کاری تھی، جو اسے دو کروڑ روپے "منافع" کے حصول کے لیے کرنی تھی۔ سودا برا نہیں تھا اور اب تو اسے غزالہ جیسا سہارا بھی میسر تھا جس کی اپنی ایک دلکشی بھی تھی اور اہمیت بھی۔ اسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے دو کروڑ روپے تلاش کرنے کی یہ مہم دلچسپ بھی تھی اور پُرکشش بھی۔ اسے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اس مہم میں لطف آنے لگا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلے اور

گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ کھڑکھڑاتی گاڑی میں غزالہ کی سیٹ کے نیچے، اس کے پیروں کے پاس بھی کوئی چیز کھڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا، وہ بڑا سا ایک قدرے زنگ آلود سا رنچ تھا۔

''یہ یہاں کیوں پڑا ہے؟ تم نے اسے ڈکی میں کیوں نہیں رکھا؟'' غزالہ بولی۔

''میں نے جب سے گاڑی لی ہے، اس کی کسی چیز کو چھیڑا نہیں ہے۔ جو چیز جیسی ہے اور جہاں پڑی ہے، اسے اسی حالت میں، وہیں رہنے دیا ہے۔ تم بھی اسے وہیں رہنے دو۔ ویسے بھی، جس قسم کی یہ گاڑی ہے، کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے نادر بولا۔ ''ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس گاڑی میں ڈکی ہے ہی نہیں۔ پچھلی سیٹوں کے پیچھے بس تھوڑی سی جگہ ہے۔ اس میں بھی گاڑی کو ڈھکنے کا پھٹا پرانا سا کپڑا اور کچھ کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے۔''

''مجھے حالانکہ ڈرائیونگ آتی ہے.....'' غزالہ نے بتایا۔ ''لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے گاڑیوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں۔'' اس نے پاؤں سے رنچ کو سیٹ کے نیچے، ذرا پیچھے کر دیا جس سے اس کی کھڑکھڑ بند ہو گئی۔

''زیادہ تر خواتین کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔'' نادر ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور فوراً ہی اس نے اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔ وہ بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

خاصی طویل ڈرائیونگ کے بعد وہ صفورا چورنگی سے بھی کافی آگے نکل گئے۔ اب سڑک کے دونوں طرف کہیں کہیں، چھدری چھدری سی آبادی نظر آ رہی تھی۔ کہیں تعمیرات جاری تھیں اور کہیں ادھوری پڑی تھیں۔ کہیں جھاڑ جھنکاڑ بھی تھے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے، سڑک شکستہ تر ہوتی جا رہی تھی، گڑھے بڑھتے جا رہے تھے اور گاڑی ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔

''یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟'' غزالہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے یوں قدرے حیرت سے پوچھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اتنی دیر میں وہ کہیں چاند پر تو نہیں پہنچ گئے تھے۔ ''میں زندگی میں کبھی یہاں تک نہیں آئی۔''

''یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔'' نادر اطمینان سے بولا۔ ''کراچی کے آدھے شہری ایسے ہیں جن کی پوری زندگی کراچی میں گزری ہو گی لیکن انہوں نے پورا کراچی نہیں دیکھا ہو گا۔ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ شہر چاروں سمتوں میں اتنا زیادہ پھیل گیا ہے کہ انسان کسی طرف بھی نکل جائے، چکرا کر رہ جاتا ہے۔'' پھر اس نے گرد و پیش کی طرف سرسری سا اشارہ کیا۔ ''میرا خیال ہے یہ علاقہ اسکیم تینتیس میں شامل ہے جو ملیر کینٹ، یونیورسٹی روڈ اور سپر ہائی وے کے درمیان نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔''

''لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟'' غزالہ نے شاید ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں کسی کام کے بندے کی تلاش میں ہوں جو ہمیں منزل تک پہنچانے میں ہماری مدد کرے گا۔'' نادر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اب وہ ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جو تقریباً ویرانہ ہی لگ رہا تھا لیکن وہاں بھی کہیں کہیں اِکا دُکا مکانات کی تعمیر جاری تھی جہاں دو چار مزدور چمکتی دھوپ میں کام

کوشش

ایک عورت اپنی سہیلی سے بولی۔ ''شادی سے پہلے میرے شوہر میرے گھر کے اردگرد چکر لگاتے تھے۔ انہیں دور رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنی پڑتی تھی۔''

''اور اب.....؟'' سہیلی نے پوچھا۔

''اب مجھے ان کو گھر میں رکھنے کے لیے سخت محنت اور کوشش کرنی پڑ رہی ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔

ڈاکٹر گوپال، عمرکوٹ

تقسیم

مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی نے ایک مرتبہ نہال سیوہاروی سے کہا۔ ''ملک کی تقسیم سے پاکستان خسارے میں رہا، نہ خزانے میں سے کچھ ملا اور نہ پانی کا بٹوارا برابر ہوا۔''

نہال صاحب بولے۔ ''آپ سچ فرماتے ہیں۔ شاعروں کے بٹوارے ہی کو دیکھیے، بڑے بڑے شاعر ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان کے ساتھ، ہم آئے یا آپ آئے۔''

عبدالوحید خاں، حافظ آباد

آمیز انداز میں کام کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر گردوپیش پر گویا سکوت ہی چھایا ہوا تھا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے ایک خاصا معقول قسم کا کمرا نظر آیا۔ اپنی بناوٹ سے وہ اوسط درجے کا آفس معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دروازہ شیشے کا تھا۔ کمرے کی پیشانی پر بڑا سا ایک بورڈ نصب تھا جس پر بہت سے علاقوں کے نام لکھے ہوئے تھے اور عوام الناس کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ان علاقوں میں نہایت سستے داموں پلاٹ خریدنے کے لیے ''دفتر ہذا'' سے رجوع کریں۔ اس مضمون سے اوپر نہایت جلی الفاظ میں ''حیات پراپرٹی ڈیلر'' لکھا ہوا تھا۔

نادر اس کمرے اور بورڈ پر نظر پڑتے ہی گاڑی کی رفتار بالکل کم کر چکا تھا پھر اس نے گاڑی کا رخ ذرا موڑا اور دفتر کے آگے سے گزر کر اس کے پہلو میں پہنچ کر بریک لگا دیے۔

''مجھے لگتا ہے، یہ شخص ہمارے لیے رہنما ثابت ہو گا۔'' نادر پُرامید لہجے میں بولا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم اس علاقے کے آس پاس ہی کہیں ہیں جہاں تمہارا مرحوم شوہر اپنے مستقبل کا تاج محل تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

اس نے ایک بار پھر گردوپیش پر نظر ڈالی، گاڑی کا انجن بند کیا اور اترنے کے لیے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''تم گاڑی میں ہی بیٹھو، میں بس پانچ منٹ میں آیا۔''

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا اور سیٹ کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

نادر جب شیشے کا دروازہ کھول کر دفتر میں داخل ہوا تو اسے حبس اور گھٹن کا احساس ہوا۔ کمرا ائرکنڈیشنڈ نہیں تھا لیکن پراپرٹی ڈیلر دروازہ بند کیے بیٹھا تھا۔ وہاں شاید بجلی ہی نہیں تھی۔ نادر کو دیکھ کر ڈیلر کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ جب سے... وہاں بیٹھا تھا، یقیناً مکھیاں ہی مار رہا تھا۔ وہ پُرجوش انداز میں نادر کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ نادر نے بھی اس سے مصافحہ کرتے ہوئے جوابی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ وہ پلاٹ کی فائل ساتھ لایا تھا، جو اس نے میز پر رکھ دی۔ ڈیلر نے بیٹھنے سے پہلے کن انکھیوں سے فائل کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھر آئی۔ شاید اسے امید ہو گئی کہ آنے والا متوقع کلائنٹ ہی تھا۔

دونوں بیٹھ چکے تو ڈیلر نے قدرے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔ ''فرمایئے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

نادر نے جواب دینے سے پہلے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں چھوٹی سی ایک میز کرسی اور پڑی تھی جس پر گرد کی ہلکی سی تہ نظر آ رہی تھی۔ تین دیواروں پر پلاٹوں وغیرہ کے نقشے لگے ہوئے تھے۔

''حیات صاحب آپ ہی ہیں؟'' نادر نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''جی..... میں آپ کا خادم حیات عزیز ٹھولی..... اس علاقے کا سب سے پرانا ڈیلر۔'' ڈیلر نے باقاعدہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں گردن کو خم دیتے ہوئے جواب دیا۔

''ذرا اس پلاٹ کے بارے میں تو بتائیں، یہ کدھر پڑے گا؟'' نادر نے فائل اس کی طرف کھسکا دی۔

حیات نے فائل کو کھولنے سے پہلے الٹ پلٹ کر اسے اچھی طرح دیکھا، پھر نہایت احتیاط سے کھولا۔ اس نے اسٹیمپ پیپر کو توجہ سے پڑھا۔ پھر ورق پلٹ کر مختصر سے نقشے کا جائزہ لے کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فائل بند کر دی۔

''میں سمجھ گیا۔ آپ اسے بیچنا چاہ رہے ہیں؟'' اس نے نادر کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص کاروباری سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں اسے خریدنا چاہ رہا ہوں۔ دراصل یہ میرے ایک جاننے والے کا ہے۔ میرے دفتر میں کام کرتے تھے لیکن بہت عرصے سے بیمار ہیں۔ اسی لیے خود نہیں آ سکے۔ انہوں نے مجھے بڑا سمجھا کر بھیجا تھا لیکن پھر بھی میں تلاش نہیں کر سکا۔ میں ان علاقوں کی طرف کبھی نہیں آیا۔ وہ بے چارے ضرورت کے تحت بیچنا چاہتے ہیں، ورنہ انہوں نے ''آج کی مٹی کل کا سونا'' والے فلسفے کے تحت ہی خریدا تھا۔'' نادر نے بڑی روانی لیکن اختصار سے، اپنی گھڑی ہوئی کہانی سنائی۔

حیات نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا، کہنیاں میز پر ٹکائیں اور عینک درست کرتے ہوئے کاروباری متانت سے بات شروع کی۔ ''سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ پلاٹ جو کل مٹی تھا، یہ آج بھی مٹی ہی ہے۔ ابھی اس کے سونا بننے کی نوبت نہیں آئی۔ اسے سونا بننے میں ابھی شاید پانچ سات سال اور لگیں گے۔ ابھی تک یہ جگہ تقریباً غیر آباد ہی پڑی ہے۔ اگر آپ میرے تھرو سودا کریں گے تو میں آپ کا کافی فائدہ کرا دوں گا۔ مالک اگر

یہاں نہیں آسکتے تو آپ مجھے ان کے پاس لے چلیں۔ میں ان سے آپ کی ایسی ڈیل کراؤں گا کہ آپ ساری زندگی مجھے دعائیں دیں گے۔"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ سودا تو آپ کے تھروہی ہوگا۔ اس قسم کے پلاٹ کی ڈیل کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" نادر نے بلا تامل کہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک سادہ لوح آدمی ظاہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

"بس..... آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ حیات عزیز تنولی کے تھرو جس نے بھی ڈیل کی ہے، اس کے پیسے ڈبل ضرور ہوئے ہیں اور اس نے زندگی بھر دعائیں دی ہیں۔" حیات کے یہ جملے شاید رٹے رٹائے تھے پھر اچانک اسے گویا خیال آیا۔ "آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میرا نام آپ سے ملتا جلتا ہی ہے۔ آپ کو یاد رکھنے میں آسانی رہے گی۔ آپ حیات عزیز ہیں، میں عبدالعزیز ہوں۔" نادر نے کہا اور ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ حیات عزیز بھی گویا اخلاقاً ہنس دیا۔

"تو پھر آپ مجھے کب مالک کے پاس لے چلیں گے؟ ابھی چلیں؟" حیات عزیز گویا اٹھنے کے لیے پر تولنے لگا۔

"نہیں..... نہیں..... ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" نادر نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ "پہلے آپ مجھے جگہ دکھا تو دیں۔ پھر مالک سے میٹنگ کا پروگرام طے کریں گے۔ میری طرف سے ساری اتھارٹی آپ کے پاس ہوگی۔ سودا آپ ہی طے کریں گے۔" نادر کا لہجہ کچھ ایسا شاہانہ ہو گیا جیسے وہ اپنے لیے حیات عزیز کو دبئی میں کوئی پلیس وغیرہ خریدنے کے لیے ڈیل کرنے کے اختیارات دے رہا ہو۔

حیات عزیز کی کاروباری حسیات پہلے ہی بیدار تھیں، اب کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئیں اور وہ اپنی اردو میں انگریزی کا پیوند لگاتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے صاحب! بزنس از بزنس، اینڈ اے کپ آف ٹی از اے کپ آف ٹی..... حالانکہ اس ویرانے میں تو میں آپ کو "اے کپ آف ٹی" بھی آفر نہیں کر سکتا..... لیکن خیر..... آپ کا کپ آف ٹی یا کولڈ ڈرنک وغیرہ مجھ پر ادھار رہی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان علاقوں میں پلاٹ دکھانے کی میری وزٹ فیس بھی ہوتی ہے۔ صرف ایک ہزار روپے۔ امید ہے آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

حیات عزیز یقیناً وہاں بیٹھا مکھیاں ہی مار رہا تھا اور

افسوس

دو آدمی اجرت پر خط لکھنے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے دونوں ہی اتنے بدخط تھے کہ اپنا لکھا خود ہی پڑھ سکتے تھے۔ ایک دن دونوں کی سرراہ ملاقات ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "کہو بھائی! کیسی کٹ رہی ہے؟"

دوسرے نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ چونکہ میرا لکھا کوئی اور نہیں پڑھ سکتا اس لیے خط پڑھنے کے لیے بھی مجھ ہی کو جانا پڑتا ہے جس سے مجھے اجرت دگنی مل جاتی ہے۔"

پہلے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دوسرے نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم نے سرد آہ کیوں بھری؟"

پہلے نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں اب اس نوبت کو پہنچ چکا ہوں کہ اپنا لکھا خود بھی نہیں پڑھ سکتا، چنانچہ میں بدقسمتی سے اس دوسری اجرت سے محروم ہو گیا ہوں۔"

مجبوری

ایک شرابی ریلوے بکنگ آفس پر ایک شخص کو اپنے کندھے پر سوار کیے پہنچا اور ٹکٹ بیچنے والے سے کہا۔ "مجھے روہڑی کا ایک ٹکٹ دے دو۔"

ٹکٹ بیچنے والے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ اور بولا۔ "اس شخص کا ٹکٹ نہیں لو گے جو تمہارے کندھوں پر سوار ہے؟"

"یہ شخص۔" شرابی نے جواب دیا۔ "یہ تو میرا بچہ ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں ہوئی ہے۔"

"چھ سال سے کم عمر کا بچہ ہے؟" ٹکٹ بیچنے والے نے کہا۔ "کیوں بے وقوف بناتے ہو یہ شخص چھ فٹ لمبا ہے، اس کا وزن کم سے کم ستر کلو ہوگا اور اس کی داڑھی کسی حال میں بھی تین انچ سے کم نہیں ہے پھر بھی تم اسے بچہ کہہ رہے ہو؟"

شرابی نے کندھے پر سوار شخص کو زمین پر دے پٹکا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ "گدھے میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا اپنی داڑھی منڈھوا دو۔ اب مجبوراً مجھے تمہارا بھی ٹکٹ لینا پڑے گا۔"

کراچی سے جاوید کاظمی کی شوخی

اب ایک ممکنہ کلائنٹ نظر آیا تھا تو اس سے کچھ نہ کچھ کھینچ لینے کی فکر میں تھا۔ نادر نے اسے مایوس نہیں کیا اور فوراً ہزار کا نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''وزٹ فیس یا آپ کا کمیشن وغیرہ کوئی مسئلہ نہیں ہے حیات صاحب! آپ کا جو حق بنے گا، وہ ادا کرنے میں ایک منٹ بھی دیر نہیں کروں گا۔ میں چھوٹا سا..... غریب سا آدمی ہوں لیکن لین دین میں بالکل کھرا ہوں۔''

''انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ایسا ہی انسان فائدے میں رہتا ہے۔'' حیات عزیز نے ستائشی انداز میں سر ہلایا اور ہزار کا نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر چلیں؟''

''ضرور۔'' نادر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ساری تمہید اور سارا ڈراما اسی مرحلے کے لیے تھا۔

وہ باہر آئے اور حیات عزیز نے اپنے آفس کا دروازہ لاک کر دیا۔ وہ قریب کھڑی گاڑی تک پہنچے تو حیات عزیز نے اگلی سیٹ پر بیٹھی غزالہ کی طرف صرف ایک نظر دیکھا اور فوراً ہی نہایت شریفانہ انداز میں نظر جھکالی۔ نادر نے اس کے لیے پچھلا دروازہ کھولا تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ نادر نے اس کی ہدایات کے مطابق گاڑی چلانا شروع کی۔ وہ راستے ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ کئی ناہموار اور کچی پکی سی سڑکوں سے گزرنے کے بعد آخر ایک جگہ حیات عزیز نے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

وہاں ریتیلی سی مٹی کے چند ٹیلوں کے قریب بے ترتیب سے انداز میں پندرہ بیس مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی پر بھی پلستر نہیں تھا۔ بیشتر کی چھتیں شیٹ کی تھیں۔ چند مکان تو جھونپڑیوں سے ہی مشابہ تھے۔ ان سب کے درمیان کافی جگہ خالی تھی۔ ذرا ڈھنگ کی آخری آبادی بھی کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ان مکانات کے بیچ بیچ میں کہیں چند ننگ دھڑنگ سے بچے کھیلتے کودتے اور دوڑتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ اِکا دُکا، دیہاتی اور غریبانہ سے حلیے کے آدمی بھی آتے جاتے دکھائی دیے۔ انہوں نے نہایت سرسری انداز میں گاڑی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر کوئی خاص تجسس نظر نہیں آیا۔ شاید وہاں ان کے لیے اس طرح لوگوں کی آمد و رفت کوئی نئی بات نہیں تھی۔

نادر اور حیات عزیز گاڑی سے اترے۔ غزالہ گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ نادر نے اسے اترنے کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ حیات عزیز کے پیچھے پیچھے، اس مختصر سے گوٹھ سے ذرا دور ہی رہتے ہوئے آگے بڑھا۔ حیات عزیز نظروں ہی نظروں میں گویا مکانات اور خالی پلاٹوں کو گنتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

آخر وہ ایک چار دیواری کے قریب جا رکا جو باقی کچے پکے مکانوں سے کافی ہٹ کر تھی۔ بیچ میں خاصی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس چار دیواری پر بھی شیٹ کی چھت تھی اور اس میں خاصا بڑا لوہے کا گیٹ نصب تھا۔ گیٹ زنگ آلود تھا اور دیوار کے بلاک بھی سال خوردہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ گیٹ پر ایک زنگ آلود تالا بھی لگا ہوا تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تالے سے ذرا اوپر گیٹ پر میلے سے پینٹ سے لکھا ہوا نمبر بھی نظر آ رہا تھا۔ نمبر وہی تھا جو نادر نے فائل میں دیکھا تھا۔

حیات عزیز نے پیشہ ورانہ انداز میں چار دیواری کا جائزہ لیا، چاروں طرف دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے جناب، آپ کا مطلوبہ پلاٹ۔ چابی نکالیں، گیٹ کھول کر اندر سے بھی دیکھ لیں۔''

''چابی تو میرے پاس نہیں ہے۔'' نادر نے اطمینان سے کہا۔ ''میں نے ان صاحب سے مانگی ہی نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر جگہ پسند آئی تو اگلے چکر میں اندر سے بھی دیکھ لیں گے اور معاملات بھی طے کر لیں گے۔''

''جگہ بُری نہیں ہے۔'' حیات عزیز نے ایک بار پھر اردگرد دیکھ کر تبصرہ کیا۔ ''اب آپ مالک کی ڈیمانڈ معلوم کر لیں، کہ وہ پیسے کتنے مانگ رہے ہیں۔ پھر میں آپ کو فیصلہ کرنے والا مشورہ دوں گا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' نادر نے طمانیت سے سر ہلایا۔ ''بہت ہی اچھا ہوا کہ میں آپ سے آ ٹکرایا۔ آپ تو واقعی اس علاقے کی ''دائی'' ہیں۔''

حیات عزیز اپنی اس تعریف پر خاصا خوش نظر آنے لگا۔

نادر واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک دو دن میں چابی لے کر آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔ اگر قیمت پر بات بن گئی تو ڈیل فائنل کرتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے، ہم جیسے سفید پوشوں کے پاس زیادہ پیسے تو ہوتے نہیں۔''

''بے شک۔'' حیات عزیز نے تائید میں سر ہلایا۔ ''لیکن عقلمندی یہی ہے کہ انسان جہاں افورڈ کر سکتا ہو، وہاں کچھ نہ کچھ خرید کر چھوڑ دے۔ پانچ سات سال بعد آپ دیکھیے گا، یہ سب گوٹھ والے یہاں سے جا چکے ہوں گے اور آپ کو یہاں ٹھیک ٹھاک پکے مکانات نظر آئیں

گے۔ بلڈرز جب ایسے مکانات بناتے ہیں تو انہیں "سُپر لگژری بنگلوز" کا نام دیتے ہیں۔"

"بے شک۔" نادر نے تائید میں سر ہلایا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ غزالہ برابر کی سیٹ پر سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

جب وہ لوگ گاڑی میں واپس روانہ ہوئے تو شاید غزالہ کو خیال آیا کہ اس موقع پر اس کی جانب سے بھی کسی رائے کا اظہار ہونا چاہیے۔ وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو یہ جگہ بالکل پسند نہیں آئی۔ اُجاڑ، بیابان، جنگل ہے۔"

"دو چار سال بعد آپ اس جگہ کو دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔" حیات عزیز فوراً بول اٹھا۔

"اور پھر اپنا بجٹ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے بیگم۔" نادر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جناب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" حیات عزیز نے پُرزور لہجے میں تائید کی۔ "روز ایسے کچھ نہ کچھ لوگوں سے میری ملاقات ضرور ہوتی ہے جنہوں نے ایسی جگہوں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی جہاں وہ کچھ خریدنا افورڈ کر سکتے تھے اور انہوں نے وہاں کچھ نہیں خریدا، لیکن بعد میں بے چارے پچھتاتے رہے، ہاتھ ملتے رہے۔"

"ہاں بیگم! حیات صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" نادر نے زوردار طریقے سے اس کی تائید کی۔

غزالہ خاموش رہی۔ شاید اس کے خیال میں اس ڈرامے میں اس کا اتنا ہی مکالمہ کافی تھا۔

نادر نے جب حیات عزیز کو اس کے دفتر کے سامنے اتارا اور اس سے پُرجوش مصافحہ کر کے واپسی کے سفر پر روانہ ہوا تو غزالہ نے گہری سانس لے کر سیٹ کے پشتے سے سر ٹکایا اور قدرے تھکن زدہ لہجے میں پوچھا۔ "اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"ارادے کیا ہونے ہیں، بس اس جگہ کی تلاش لیٹی ہے جو ہم دیکھ کر آرہے ہیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے امید کی کرن نظر آئی ہے۔" نادر نے مطمئن سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے سے اب تھکن کے آثار غائب ہو چکے تھے اور اس کی جگہ امید کی چمک نظر آنے لگی تھی۔

"کب لیٹی ہے تلاشی؟" غزالہ نے دریافت کیا۔

"آج رات ہی۔" نادر نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "اب ہمیں ذرا بھی وقت ضائع نہیں کرنا ہے۔ پہلے ہی ہماری زندگی کا کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔" وہ اب اپنے اور غزالہ کے بارے میں اس طرح بات کرنے لگا

مشورہ

ایک صاحب نے نوجوان گداگر کا دست سوال دراز دیکھ کر ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہٹے کٹے اور جوان آدمی ہو۔ بڑھے ہوئے بال اور داڑھی ترشوا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لو تو معقول آدمی نظر آؤ گے... تم کو آسانی سے کہیں بھی ملازمت مل جائے گی... بھیک کیوں مانگتے ہو؟"

"کچھ دینا ہے تو دو ورنہ چلتے بنو۔" گداگر نے اس سے زیادہ زہریلے انداز میں جواب دیا۔ "مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں... پہلے میں بھی ایمانداری سے سرکاری نوکری کرتا تھا... اب اس سے کئی گنا زیادہ کماتا ہوں... منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں الٹے سیدھے مشورے دینے۔"

حب الوطن

نواب مشتاق احمد خان ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن کا بیان ہے کہ ایک بڑھیا اپنی گٹھری لیے ہوئے بڑی مشکل سے ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر نے آکر سب کے ٹکٹ دیکھے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی دن تھے۔ ان دنوں اول درجے اور تیسرے درجے میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی لیکن بلا ٹکٹ سفر کرنے پر ضرور پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ بڑھیا کی باری آئی تو اس نے ٹکٹ چیکر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! میں اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہوں۔ میری کل کائنات یہی گٹھری ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔"

نواب صاحب خود ایک ریلوے افسر رہ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے مشاہدہ کرتے رہے کہ دیکھیں چیکر کیا کرتا ہے؟ چیکر نے جو کچھ کیا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس نے اپنی کاپی سے رسید کاٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بڑھیا کو جواب دیا۔

"اماں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی مظلوم ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا؟ جس کے لیے تم نے اور میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اس لیے رسید تو بنے گی تاکہ ملک کا نقصان نہ ہو۔ البتہ اس کی رقم میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔"

اوکاڑہ سے ثنا کا تعاون

تھا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھی چلے آرہے تھے۔

''مگر کیسے لو گے تلاشی؟ وہاں تو گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔'' غزالہ نے یاد دلایا۔

نادر یوں ہنس دیا جیسے غزالہ نے کوئی بچکانا سی بات کی ہو۔ ''ارے تم اتنے چھوٹے سے تالے کو رکاوٹ سمجھ رہی ہو۔ لوگ تو لوہے کی بڑی بڑی تجوریاں توڑ ڈالتے ہیں۔ الیکٹرانک لاک والے سیف ڈپازٹ والٹ کھول لیتے ہیں۔ اس بے چارے چھوٹے سے، پرانے، زنگ آلود تالے کی کیا حیثیت ہے۔ میں نے پہلے ہی اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا کہ اس طرح کی کسی چیز سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی ایک اوزار کا بندوبست کر رکھا ہے۔ یہیں پڑا ہوا ہے۔'' اس نے اپنی سیٹ کے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

غزالہ ایک لمحے خاموش رہی۔ وہ شاید ہر پہلو پر غور کر رہی تھی اس لیے پھر بول پڑی۔ ''رات کے اندھیرے میں ہم یہاں آکر تالا توڑیں گے، اگر وہاں رہنے والوں کو پتا چل گیا اور انہوں نے چور سمجھ کر ہمیں پکڑ لیا تو.....؟''

''ارے میری جان..... تم تو شاید اسی طرح بیکار کے اندیشوں میں مبتلا ہو کر پریشان ہونے کی عادی ہو۔'' نادر کے لہجے میں پیار جھلک آیا۔ ''تم نے دیکھا نہیں، قدرت نے حالات ہمارے لیے کتنے موافق کر رکھے ہیں۔ ایک تو وہاں کوئی گنجان آبادی نہیں ہے۔ ایک قسم کے ویرانے میں تھوڑے سے، کچے پکے مکان بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی چھدرے سے ہیں اور وہ، مراد کا پلاٹ تو ان سے بھی خاصا ہٹ کر ہے۔ رات کو تو یہاں اندھیرا اور موت کا سا سناٹا ہوتا ہوگا۔ مجھے یقین ہے، ہمارا کام بہت آسان ہوگا۔ تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ ویسے تو دبلا ہونا تمہارے حق میں بہتر ہے لیکن فی الحال تم اس قسم کے اندیشوں اور فکروں میں گرفتار ہو کر دبلی مت ہو۔ تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو اور دیکھتی جاؤ، کیا ہوتا ہے۔ ہم نے یہ جگہ ڈھونڈ نکالی ہے، یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا جو ہم نے سر کر لیا ہے۔ اب باقی کام آسان ہے۔''

''اور اگر رقم یہاں بھی نہ ملی تو.....؟'' غزالہ ایک اور اندیشے کی نشاندہی کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''ویسے تو میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہی جگہ ہماری منزل ہے لیکن اگر خدانخواستہ کامیابی نہ ہوئی تو پھر نئے سرے سے مغز ماری کریں گے، نئے سرے سے جدوجہد کریں گے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے دو کروڑ روپے بہت بڑی رقم ہے۔ اگر مل جاتی ہے تو ہم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ یہ زندگی، جس میں ہم فی الحال گھن چکر کی طرح پھنسے ہوئے ہیں، یہ تو کوئی خاص زندگی نہیں ہے۔ تم تو پھر بھی ایک چھوٹی موٹی نوکری کر رہی ہو جس سے پیٹ تو پالا جا سکتا ہے۔ ایک کمرا بھی تمہارے پاس ہے۔ کرائے کا ہی سہی، لیکن سر چھپانے کا ٹھکانا تو ہے۔ میں تو بالکل ہی خالی ہاتھ ہوں۔ تھوڑے سے پیسے ہیں جو چند دنوں میں ختم ہو جائیں گے۔ رہنے کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' نادر کے لہجے میں خود اپنے لیے تاسف تھا۔

''تم پریشان مت ہو۔'' غزالہ نے اُسے تسلی دی۔ ''میں جیسی بھی ہوں، جس حال میں بھی ہوں، لیکن تمہاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا نا کہ حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے..... گرچہ کیڑا ہوں ذرا سا۔ مدد تو ذرا سے کیڑے کی بھی کافی ہوتی ہے۔ میں تو پھر بھی کم از کم کیڑے سے تو کافی بہتر ہوں۔''

نادر نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا اور والہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ غزالہ نے فوراً اس کے کندھے پر ہلکا سا گھونسا رسید کیا اور سنجیدگی سے بولی۔ ''ڈرائیونگ پر دھیان رکھو۔ جیسی یہ سڑکیں ہیں اور جیسی اس گاڑی کی حالت ہے، ذرا سی غلطی بھی ہمیں اوپر پہنچا سکتی ہے۔'' اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں، ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اُن کی گاڑی ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ کمزور سی ہیڈ لائٹس کی روشنی کے سوا دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ پراپرٹی ڈیلر حیات عزیز کا دفتر وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ غزالہ بغور کبھی سامنے اور کبھی دائیں بائیں دیکھنے لگتی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں راستہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد غزالہ نے تبصرہ کیا۔ ''میں تو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ خاص طور پر رات کے اندھیرے میں اکیلی تو میں دوبارہ اس جگہ پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔''

''ہم جب دن میں حیات عزیز کے ساتھ وہاں جا رہے تھے تو میں نے اپنا سارا دماغ اور ساری توجہ راستوں اور سمتوں کی طرف ہی لگائی ہوئی تھی۔ کسی اور طرف تو میرا دھیان ہی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ تمہاری طرف بھی نہیں۔'' وہ ایک نظر غزالہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن غزالہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ ویسے بھی گاڑی میں تقریباً

اندھیرا ہی تھا۔ اگر کچھ روشنی ہوتی تو شاید نادر دیکھ سکتا کہ وہ تھوڑی سی فکرمند نظر آرہی تھی۔

آخر وہ اس گوٹھ کے قریب جا پہنچے جو اُن کی منزل تھی، نادر یوں اس مختصر سی بستی کے قریب سے گزرتا چلا گیا جیسے اسے مزید آگے جانا تھا۔ وہ دن میں دیکھ چکا تھا کہ گوٹھ سے ذرا آگے ہی درختوں کا جھنڈ سا تھا۔ اس نے گاڑی ان کی اوٹ میں کھڑی کی اور جلدی سے ہیڈلائٹس آف کر دیں۔ چاروں طرف گہرا سکوت تھا۔ کبھی کبھار کسی جھینگر کی آواز اس سکوت کو مجروح کرتی تھی۔ کچے پکے مکانوں کے مکین یقیناً اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ سردی خاصی تھی۔

چند سیکنڈ گاڑی میں بیٹھے رہنے اور گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد نادر نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے، غزالہ کو بھی گاڑی سے اترنے کی ہدایت کی۔ غزالہ چند سیکنڈ تاخیر سے اتری۔ وہ گویا گاڑی سے اترتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن بہرحال اتر ہی آئی اور وہ دونوں آگے پیچھے اپنے مطلوبہ مکان کی طرف روانہ ہوئے جسے درحقیقت مکان کہا نہیں جاسکتا تھا۔ صرف پلاٹ کو محفوظ رکھنے کے لیے اس پر کچی سی ایک چاردیواری بنا کر شیٹوں کی چھت ڈال دی گئی تھی۔

گیٹ پر پہنچ کر غزالہ نے نادر کی ہدایت کے مطابق ٹارچ سے زنگ آلود تالے پر روشنی ڈالی۔ نادر کے پاس لوہے کا ایک خاصا بڑا زنبور نما اوزار موجود تھا۔ اس نے اس کا منہ تالے کے حلقے میں پھنسایا اور ہینڈل پر طاقت آزمائی کی۔ اسے کچھ زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ تالا ہلکی سی ''کڑک'' کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ غزالہ نے فوراً ٹارچ بجھا دی۔ نادر نے حتی الامکان بےآواز طریقے سے کنڈی کھول کر آہستگی سے گیٹ کھولا۔ زنگ آلود گیٹ کھلنے کی آواز خاصی نمایاں تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اندر گھس گئے اور نادر نے گیٹ اپنے عقب میں بند کرلیا۔ اندر اندھیرے میں سب سے پہلا احساس انہیں ایک عجیب سی بُو کا ہوا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ مویشیوں کے کسی ایسے باڑے میں گھس گئے تھے جو چاروں طرف سے بند تھا اور نہ جانے کتنے عرصے سے وہاں ہوا کا گزر نہیں ہوا تھا۔

''ٹارچ روشن کرو۔'' چند لمحے بعد نادر نے سرگوشی کے سے انداز میں غزالہ کو ہدایت کی۔

غزالہ نے ٹارچ روشن کی اور فوراً ہی وہاں گویا ایک قسم کی ہلچل سی مچ گئی۔ سرسراہٹ، معمولی سی کھڑ پڑ، حتی کہ چیں چیں کی نہایت باریک سی آوازیں بھی سنائی دیں۔

وہ دونوں ڈر سے گئے۔ کیا اس بند جگہ میں کوئی موجود تھا۔ غزالہ نے ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر گھمائی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس روشنی میں اسے اِدھر اُدھر، کونے کھدروں میں پچاسوں موتی سے جھلملاتے دکھائی دیے تھے، جو کبھی نظر آرہے تھے، کبھی غائب ہو رہے تھے اور ان میں سے بہت سے حرکت بھی کر رہے تھے جس کی وجہ سے سرسراہٹ اور معمولی سی کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔

ایک لمحے کی تاخیر سے ان کی سمجھ میں آیا کہ وہاں پچاسوں موٹے موٹے چوہے جمع تھے جو اُن کی آمد کی وجہ سے اور پھر روشنی ہو جانے کی بنا پر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کچھ چوہے، چاردیواری کے ایک کونے میں موجود چھوٹے سے شگاف سے کسی نہ کسی طرح گزر کر باہر بھی جا رہے تھے۔ زیادہ تر اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

پہلی نظر میں وہ جگہ نادر اور غزالہ کو ایک قسم کا کباڑخانہ دکھائی دی۔ مراد نے نہ جانے کیا کیا وہاں لاکر ڈھیر کیا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی الماری، کچھ سالخوردہ شہتیروں کے ٹکڑے، چند ناکارہ اور کٹے پھٹے ٹائر، چند بلاک، لوہے اور پلاسٹک کے چند ٹوٹے پھوٹے سے ڈرم اور اسی طرح کا کچھ اور کاٹھ کباڑ۔

مراد نے غالباً اس قسم کی جگہ پر قبضہ ہوجانے کے ڈر سے، یہاں اس طرح کا کاٹھ کباڑ جمع کرکے اس جگہ کو اپنے زیرِاستعمال ہونے کا تاثر دینے کی کوشش کی تھی۔ فوری طور پر تو مراد کی سمجھ میں یہی جواز آیا۔ اس نے ٹارچ غزالہ سے لے لی اور ذرا آگے ہوکر، کباڑخانہ ٹائپ اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ موٹے موٹے چوہوں کا اس کونے میں گویا ''انبار'' لگ گیا تھا جہاں دیوار میں سوراخ تھا۔ سوراخ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک وقت میں ایک چوہا ہی باہر جاسکتا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، باہر جانے کی تگ و دو میں تھے۔ ان کی ''پُرسکون'' زندگی میں اچانک ہلچل مچ گئی تھی۔

ٹوٹی پھوٹی الماری ایک دیوار کے قریب کھڑی تھی۔ نادر کو اس کے عقب سے، ناہموار فرش پر پڑی کوئی چیز گویا باہر کو جھانکتی دکھائی دی۔ نادر اسے بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔ غزالہ اس کے ساتھ تھی۔ اسے شاید خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے نادر کا بازو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے کندھے پر لٹکتے ہوئے بڑے سے لیڈیز بیگ کو پکڑا ہوا تھا تاکہ وہ اِدھر اُدھر

نہ جھولے۔

نادر نے الماری کے قریب پہنچ کر جب روشنی اس کے پیچھے ڈالی تو بے اختیار سانس کھینچ کر رہ گیا۔ غزالہ کی تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ درحقیقت الماری کی آڑ میں ایک انسانی ڈھانچا پڑا تھا جس کی کھوپڑی الماری کے عقب سے جھانک رہی تھی۔ وہ ایک مکمل ڈھانچا تھا اور کہیں سے ذرا بھی ٹوٹا پھوٹا نہیں تھا۔ اگر میڈیکل کالج کے طلبا اسے دیکھ لیتے تو یقیناً ان کے دل میں اسے اپنی لیبارٹری میں لے جانے کی خواہش جاگ اٹھتی۔ ڈھانچے پر کہیں بھی کھال یا گوشت کا ایک ذرہ بھی موجود نہیں تھا۔

اس کی وجہ بھی فوراً ہی نادر کی سمجھ میں آ گئی۔ یہاں موٹے موٹے چوہوں کی آمدورفت نہ جانے کب سے جاری تھی۔ وہ یقیناً اس لاش کے گوشت کا ایک ایک ذرہ تک کھا گئے تھے۔ انہوں نے لاش کے سر پر بال بھی نہیں چھوڑے تھے۔ شاید اسی لیے لاش کے سڑنے کی نوبت بھی نہیں آئی ہوگی ورنہ شاید اس کی بُو، اس بند کباڑ خانے سے باہر چلی گئی ہوتی اور کسی کو اس طرف متوجہ کر لیتی۔ عین ممکن تھا، لوگ شک زدہ ہو جاتے اور جمع ہو کر گیٹ کھولنے کی کوشش کرتے لیکن چوہوں نے یقیناً اس سے پہلے ہی لاش کا مکمل ''صفایا'' کر دیا ہوگا۔

''یہ کس کا ڈھانچا ہے؟'' غزالہ نے سرسراتی سی آواز میں پوچھا۔

نادر نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے خیال میں تم ایک تیز طرار اور ذہین عورت ہو۔ تمہیں تو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' غزالہ نے سادگی سے پوچھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا، جیسے واقعی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

نادر نے ٹھنڈی سانس لی اور گویا تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے، یہ اسی شخص کا ڈھانچا ہے جو دفتر سے دو کروڑ روپے لے کر بینک میں جمع کرانے کے لیے روانہ ہوا تھا اور تمہارے شوہر نے اسے اپنی گاری میں لفٹ دی تھی۔ اس کے بعد نہ تو اس شخص کا کچھ پتا چلا اور نہ ہی رقم کا۔''

''اوہ.....'' غزالہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''اور تمہارے شوہر نے آخری بات یہی کی تھی کہ رقم اسی شخص کے پاس موجود ہے۔'' نادر نے بات جاری رکھی۔ ''اب خواہ ڈھانچے کی شکل میں ہی سہی..... بہرحال، یہ شخص ہمیں مل گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، رقم بھی آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔''

اس دوران مختلف آوازوں کے ساتھ، چوہوں کا اس سوراخ کے راستے باہر جانے کا سلسلہ جاری تھا اور بہت کم چوہے اندر رہ گئے تھے۔ نادر نے اب قدرے بے تابی سے ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر گھمانا شروع کی۔ اسے اب رقم کی تلاش تھی۔ اس نے ہر کونے کھدرے کا جائزہ لیا۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہر چیز کو ہلا جلا کر، یا اس کی جگہ سے ہٹا کر دیکھا مگر کہیں رقم کی موجودگی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ آخر میں وہ ٹوٹی پھوٹی الماری کی طرف متوجہ ہوا۔

اس دوران اسے اس جگہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی دُھن میں رقم کی تلاش میں مصروف تھا۔ آخرکار ٹوٹی پھوٹی الماری کے اوپر کے خانے میں اسے ایک ایسی چیز نظر آ گئی جو اس کے خیال میں اس کا گوہرِ مراد ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ لوہے کا چھوٹا سا ایک ٹرنک تھا جس کا سیاہ پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس پر چھوٹا سا ایک تالا بھی لگا ہوا تھا جسے توڑنے میں نادر نے ایک منٹ بھی نہیں لگایا۔ اس کی حرکات و سکنات سے اب معمولی سی ہیجان زدگی کا اظہار ہونے لگا تھا۔

ٹرنک کا ڈھکن اٹھاتے ہی وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ٹرنک میں خاصے بڑے سائز کا ایک معقول سا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب کھڑی غزالہ کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے ذرا پھیلیں لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور اس کا چہرہ سپاٹ نظر آنے لگا۔ نادر کا اس وقت اس کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس وقت بھول ہی گیا تھا کہ غزالہ اس کے ساتھ تھی۔ غزالہ ذرا پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی۔

نادر نے بے تابی سے بریف کیس کو ٹرنک میں سے نکالا۔ بریف کیس بھی مقفل تھا لیکن اس قسم کا مسئلہ گویا نادر کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس جو اوزار موجود تھا، وہ ایک بار پھر اس کے کام آیا اور بریف کیس کھل گیا۔ بریف کیس کھلتے ہی نادر کے تاثرات سے کچھ ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں۔ بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے ''لبالب'' بھرا ہوا تھا۔

اس لمحے گویا نادر کو غزالہ کا خیال آیا۔ اس نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے بریف کیس بند کر دیا۔

''مراد بے چارے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ رقم پرویز

ہی کے "پاس" تھی۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا اور بریف کیس کو دوبارہ ٹرنک میں رکھنے لگا۔ وہ شاید بریف کیس کو ٹرنک میں ہی رکھ کر لے جانا چاہتا تھا۔ شاید اس طرح اسے رقم کی دہری حفاظت کا احساس ہوتا۔

اس نے ابھی ٹرنک کو بند ہی کیا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ عقب سے اس کی کھوپڑی پر گویا کوئی ہتھوڑا پڑا تھا۔ آخری احساس اسے بس یہ ہوا کہ اوندھے منہ گرتے گرتے وہ غالباً الماری سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اسے قطعی اندازہ نہیں ہوسکا کہ دوبارہ اس کی آنکھیں کھلنے تک کتنا وقت گزر چکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں کیونکہ اسی لمحے ان پر تیز روشنی پڑی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ کسی نے ٹارچ روشن کی تھی جس کا رخ اس کے چہرے کی طرف تھا۔ شاید اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے سے ہٹالی گئی۔ ٹارچ کا رخ تقریباً زمین کی طرف ہوگیا۔ تب دھندلی روشنی میں نادر نے دیکھا کہ ٹارچ دراصل غزالہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وہ رنچ تھا جو نادر نے گاڑی میں پسنجر سیٹ کے نیچے بے پروائی سے پھینکا ہوا تھا۔ وہ شاید اس نے آج رات یہاں آتے وقت اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا تھا اور نادر کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اس کے سر میں ابھی تک دھمک سی ہو رہی تھی اور سر کے پیچھے، گدی پر چپچپاہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید وہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔

اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنی گردن کے پچھلے حصے کو ٹٹولنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ تو پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے کھڑا ہونے کے ارادے سے ٹانگوں کو حرکت میں لانا چاہا تو پتا چلا کہ اس کے پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس کا دل ڈوب سا گیا اور ایک بار پھر گویا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹارچ کی روشنی کے عقب میں، ملگجے سے اندھیرے میں بیٹھی غزالہ کو دیکھا۔ غزالہ کا چہرہ اسے ذرا دھندلا، لیکن آنکھیں نہ جانے کیوں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان آنکھوں پر اب چشمہ نہیں تھا۔ وہ قدرے ترحم آمیز سے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" نادر نے جاننا چاہا۔ اسے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

"وہی، جو میرے خیال میں مجھے کرنا چاہیے تھا۔" غزالہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر ہمیں تو رقم ملنے کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنی تھی۔" نادر نے گویا اسے یاد دلایا۔

"ہاں..... مجھے نئی زندگی شروع تو کرنی ہے لیکن تمہارے ساتھ نہیں..... کسی اور کے ساتھ۔" اس کے ہونٹوں پر گویا کسی کے تصور سے ایک مدھم اور قدرے خوابناک سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اس کے ساتھ جس سے میں محبت کرتی ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" سوال گویا خود بہ خود نادر کی زبان سے پھسل پڑا۔

"ہے کوئی..... کیا کرو گے جان کر؟ بہت پیارا اور معصوم سا ہے وہ..... جان دیتا ہے مجھ پر..... بس ایک چھوٹی سی خرابی ہے اُس میں..... بہت غریب ہے وہ۔ ہم اسی انتظار میں تھے کہ کہیں سے تھوڑی سی رقم ہاتھ آجائے تو شادی کرلیں تاکہ ذرا ڈھنگ کی زندگی گزار سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ اتنی غربت میں شادی کرلیں اور چار دن بعد ایک دوسرے کی شکل سے بیزار ہو جائیں۔ غربت بڑی ظالم چیز ہے۔ تھوڑے سے دنوں میں محبت کو کھا جاتی ہے۔" غزالہ کے چہرے پر دانشورانہ سنجیدگی تھی۔

نادر نے غیر ارادی طور پر ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن بُری طرح کراہ کر رہ گیا۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں بے بسی آمیز سے غصے کی آمیزش تھی۔ "اگر تمہیں اس گدھے سے اتنی ہی محبت ہے تو تم نے دو راتیں میرے ساتھ کیسے گزار لیں؟"

"تھوڑی دیر کے لیے میری طبیعت پر کچھ ہرجائی پن سا غالب آگیا تھا۔" غزالہ نے بلا تامل جواب دیا۔ "وہ جو محاورہ ہے نا کہ مطلب کے لیے لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں..... بس، یہ کچھ اسی قسم کی بات تھی۔ ورنہ مجھے تو تم سخت بُرے لگ رہے تھے۔ مجھے تو مراد بھی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی بُرا لگنے لگا تھا..... مگر اس کے بُرا لگنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی حد سے زیادہ کنجوسی تھی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ وہ کس قدر کنجوس تھا۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ اس کے پاس ان دو کروڑ سے پہلے بھی کافی پیسا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کن بینکوں میں تھا، اس کے اکاؤنٹس کہاں تھے۔ وہ ہمیشہ اکاؤنٹس کے شعبے میں رہا، اور میرا خیال ہے ہر جگہ غبن کرتا رہا لیکن اس نے نہ تو کبھی اپنے رہن سہن پر ذرا دل کھول کر خرچ کیا اور نہ ہی اپنی شریکِ حیات تک کو اپنی جمع

پونجی کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ میں تو کہیں جا کر اس کے پیسوں پر کلیم بھی نہیں کر سکتی۔ پتا نہیں، وہ کہاں پڑے رہ گئے...... اور یہ دو کروڑ بھی یہیں پڑے رہ جاتے، اگر تم میری مدد نہ کرتے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے قریب اشارہ کیا۔

تب نادر نے دیکھا کہ نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا جو بریف کیس اس نے خون پسینا ایک کر کے تلاش کیا تھا، وہ غزالہ کے قریب زمین پر رکھا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر غزالہ نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''گویا تم محاورے کے طور پر نہیں، بلکہ بالکل صحیح معنوں میں کہہ سکتے ہو کہ مراد پیسے پر جان دینے والا آدمی تھا۔ اس نے پیسوں کے لیے جان دے دی۔''

''لیکن مجھے تم نے کیوں باندھ کر یہاں ڈال دیا ہے؟ میرا کیا قصور ہے؟'' نادر کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

''ہاں...... قصور تو کوئی خاص نہیں ہے۔'' غزالہ نے ایک انگلی سے سر کھجاتے ہوئے گویا ذہن پر زور دیا۔ ''لیکن کیا کروں؟ مجھے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی قطعی کوئی خواہش نہیں...... اور نہ ہی مجھے تم پر بھروسا ہے۔ اس لیے میں تمہیں اس رقم میں پارٹنر بھی نہیں بنا سکتی۔''

''میں اب اس رقم میں یا تمہاری زندگی میں...... کسی بھی چیز میں پارٹنر بننا نہیں چاہتا۔ میں ہر چیز سے دستبردار ہوتا ہوں۔ بس تم میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔ میں تمہیں اس رقم سمیت تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ بلکہ یوں کہو کہ ہمیشہ کے لیے تمہاری جان چھوڑ دیتا ہوں۔ بس، تم میری جان بخش دو۔'' نادر اٹک اٹک کر التجائیہ لہجے میں بولا۔

غزالہ نے شاید کوشش کر کے اپنے چہرے پر تھوڑی سی افسردگی طاری کی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب تو معاملہ بہت آگے چلا گیا ہے۔ اب تو تمہیں آج ہی کی رات اپنی زندگی کی آخری رات سمجھ کر صبر کرنا پڑے گا۔ امید ہے، آس پاس موجود سیکڑوں...... یا شاید ہزاروں چوہے اسی طرح شاید تمہاری لاش کے سڑنے کی نوبت نہیں آنے دیں گے جس طرح انہوں نے غالباً پرویز کی لاش کو سڑنے نہیں دیا ہوگا۔ تمہارے سر سے خون بھی بہہ رہا ہے۔ خون کی بو پر وہ جلدی آئیں گے۔ کچھ عرصے بعد اگر اس جگہ کو لاوارث محسوس کرتے ہوئے کسی قبضہ گیر یا دوسرے کسی آدمی نے گیٹ کھولا تو اسے یہاں ایک کے بجائے دو ڈھانچے ملیں گے۔''

نادر کے تاثرات بدل گئے۔ اس کا بگڑا ہوا سا چہرہ نفرت اور غصے سے کچھ اور بگڑ گیا۔ غزالہ نے گویا اس کے تاثرات سے بے نیاز رہتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''گاڑی کی تم فکر نہ کرنا۔ میں چپکے سے اسے رینٹ اے کار والوں کے دفتر کے قریب کھڑی کر دوں گی۔ گاڑی میں ان کا اسٹیکر لگا ہوا ہے۔ اس پر ان کا ایڈریس موجود ہے۔''

نادر کو شاید اب اس سے رحم یا نرم دلی کی توقع نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے غزالہ، اس کے مرحوم شوہر، حتیٰ کہ رینٹ اے کار والوں کو بھی چند موٹی موٹی گالیوں سے نواز ڈالا اور اپنی بندشیں کھولنے کے لیے تڑپنے کے سے انداز میں کچھ زور آزمائی کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا وہ تکلیف سے کراہ اٹھا۔ پھر اس نے شاید اس امید پر، کہ اس کی آواز کسی تک پہنچ جائے۔ چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن غزالہ پوری طرح ہوشیار اور مستعد تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی چیخ یا تیز آواز برآمد ہوتی، لوہے کا بھاری رینچ ایک بار پھر اس کی کھوپڑی پر پڑا۔ اس بار ضرب شاید پہلے سے زیادہ شدید تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

غزالہ نے اس کی طرف جھک کر اس کا جائزہ لیا اور یوں طمانیت سے سر ہلایا گویا اپنی کارکردگی پر خود ہی اپنے آپ کو خراجِ تحسین پیش کر رہی ہو۔ پھر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے چوڑی ماسکنگ ٹیپ نکالی اور نادر کے منہ پر چپکا کر اچھی طرح اس کے چہرے کے اردگرد لپیٹ دی۔ وہ پوری تیاریوں کے ساتھ آئی تھی۔ نادر تو شاید یہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ جب وہ اس کے ساتھ روانہ ہوئی تھی، اس وقت سے وہ ڈاکٹروں والے دستانے پہنے ہوئے تھی۔

اس نے کھڑے ہو کر ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھما کر الوداعی انداز میں گردوپیش کا جائزہ لیا، اپنا بیگ کندھے پر پھنسایا، بریف کیس بغل میں دبایا اور بلی کی طرح دبے پاؤں گیٹ کی طرف مڑ گئی۔ وہ گیٹ تک پہنچی ہی تھی کہ ''چیں چیں'' کی تیز سی آوازیں سن کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک کونے کی طرف روشنی ڈالی۔ اندھیرے پس منظر میں اسے چند ننھی ننھی گول آنکھیں چمکتی نظر آئیں۔ دو تین چوہے سوراخ کے راستے ایک بار پھر اندر آ گئے تھے لیکن وہیں رک کر متجسس انداز میں غزالہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

غزالہ نے زیرِ لب ان کا شکریہ ادا کیا اور آہستگی سے گیٹ کھول کر باہر نکل آئی۔

❖❖❖

pklibrary.com

آشنا ناآشنا

ماہ رخ ارباب

اپنے آشیانے کو طوفان بادوباراں اور خشک ہواؤں سے بچانا پڑتا ہے... تُند خو اور تباہ کُن دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو مضبوط کرنا پڑتا ہے... دل و جاں کی کھیتی کو تہس نہس کرکے برباد کردینے والے دشمن اس کی تاک میں تھے... پہلے اس کے لیے زیادہ نقصان برداشت کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا چنداں مشکل نہ تھا... مگر معمولی رخنے سے داخل ہونے والی سرد ہوا کے مانند دشمن نے اپنا وار کرڈالا تھا...

دوست ودشمن..... نفرت وانتقام کے گرد گھومتی پُراسرار کہانی کے پیچ وخم.....

ٹک، ٹک، ٹک... کی آواز مختصر وقفے کے ساتھ مسلسل گونج رہی تھی۔

اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔ سیاہی مائل بھوری آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ کسی بھیڑیے کی طرح وہ جو نیند اُچٹنے کے گواہ تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ گو کہ اس آنکھیں نیند میں بھی بیدار رہتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ غافل بھی ہوسکتی ہیں۔

صرف سفید ڈیلوں میں نظر آتے سرخ ڈورے تھے

سے رات یا دن کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔

ان دنوں میں چوبیس گھنٹے یہاں سرمئی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

اس نے بغور کان لگا کر سنا۔ نیند بے سبب نہیں ٹوٹی تھی۔ ٹک ٹک کی آواز، اس سناٹے میں بہت واضح تھی۔

اس نے غیر معمولی احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر سرہانے رکھی شاٹ گن اٹھالی۔ یہ احتیاط مسلسل اعصابی تناؤ اور سالوں تک کی گئی مشقوں کا نتیجہ تھی۔

سلیپر نظر انداز کرتا، وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں پہننے میں وقت ضائع ہوتا۔ جس کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ قدم آگے بڑھانے سے پہلے اس نے ایک اچٹتی سی نظر دائیں جانب گھمائی۔ علین سینے تک دبیز کمبل اوڑھے گہری نیند میں تھی۔ اس کی نیند اپنے باپ کی طرح حساس نہیں تھی۔ بارہ سال کی عمر میں نیند ویسے ہی مغلوب کرلیا کرتی ہے۔ بچی کی جانب سے بے فکر ہوکر اس نے شاٹ گن کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور گربہ پا چلتا ہوا دروازے پر جا پہنچا۔

ٹک ٹک کی آواز کا تسلسل خراب ہو چکا تھا۔ اب وہ کافی رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ صبح کی روشنی غیر محسوس انداز میں پھیل چکی تھی مگر منظر کچھ واضح نہیں تھا۔ ہر جانب بس برف کی سفید چادر پھیلی تھی۔ اس پر سیاہ دھبوں کے مانند نظر آتے چیڑ کے درخت۔ یہ یہاں سردیوں کا عروج تھا۔ سوائے سیاہ بے لگام شاخوں کے ہر شے برف کے نیچے دبی تھی۔

اس نے گہری سانس سینے میں بھری اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ چوبی کیبن کا بھاری دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سردی کا ایک جھونکا اندر داخل ہوا۔ وہ محض سویٹر اور جرابیں پہنے منفی درجہ حرارت کی سردی میں کیبن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

اسے صبح کے اس پہر اپنے گھر کے آس پاس منڈلانے والے کی تلاش تھی۔ جہاں کبھی بھولے سے بھی کوئی آدم زاد نہیں بھٹکتا تھا۔ اگر کوئی اس جانب آنکلا تھا تو اس کی تلاش ضروری تھی۔

آخر متلاشی نگاہوں نے دشمن کو ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ کھڑکی کے نیچے ایک چلغوزے کا کون تھامے، اسے توڑنے کی تگ و دو میں مصروف چھوٹی سی گلہری تھی جو معصوم آنکھوں سے اس عظیم الجثہ دشمن کو گھور رہی تھی جو جسامت میں کسی ریچھ سے بھی اونچا تھا۔ اس نے ایسی مخلوق اپنی مختصر زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی، اور اب تنی آنکھوں سے اجنبی دشمن کی خطرناکی کا اندازہ لگا رہی تھی۔ تاکہ جا کر اپنے ہم نفسوں کو اس کی خبر دی جاسکے۔

وہ نہ جانے کس طرح اس منجمد موسم میں باہر نکل آئی تھی۔ یہ تو ان کے آرام کا وقت تھا۔

''بابا!'' اسے پیچھے باریک سی آواز سنائی دی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔ تھوڑی دیر اسے کھلا رکھنے سے ہی اندر کا موسم سرد ہو چلا تھا۔

''ہاں جانِ بابا۔'' اس نے دہلیز پر پڑی برف سے گیلی ہوتی جرابیں اتارتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا۔

''کون تھا؟'' اس کی نگاہوں میں تشویش تھی۔ باپ کی حساسیت بچی میں بدرجہ اتم اتر آئی تھی۔

''ایک بھوکی گلہری۔'' وہ مسکرایا۔

''اس موسم میں؟'' بچی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہاں شاید خوراک جمع کرنے کے موسم میں وہ بھی تمہاری طرح باتیں بگھار رہی تھی۔'' اس نے دانستہ بچی کو چڑایا۔ وہ واقعی بہت باتونی تھی۔

''بابا! یہ غلط ہے۔ میں کہاں زیادہ باتیں کرتی ہوں۔ وہ تو آپ نہیں بولتے اس لیے آپ کی جگہ بھی مجھے ہی بولنا پڑتا ہے۔ جب ہم شہر میں تھے تب میری سہیلیاں مجھ سے کہتی تھیں۔ علین تم.....''

''خاموش کب ہوگی۔'' اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتی۔ سعود نے اس کا جملہ اچک کر مناسب الفاظ سے پُر کر دیا۔

''بابا! جائیں میں نہیں بولتی۔'' وہ ٹھنکی اور احتجاجاً چادر چہرے تک کھینچ لی۔

اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اگر اسے یونہی رہنے دیا جاتا تو کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ سو جاتی۔

''اب سونے کا وقت ختم ہو چکا اور ناراضی کاموں کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے۔ تو اٹھ جایئے۔'' اس نے علین کے سر سے چادر کھینچی اور لکڑی کے پلنگ کے برابر رکھی ٹیبل کی دراز سے جرابوں کی دوسری جوڑی نکال لی۔

لکڑی کے کیبن میں موجود تمام سامان اسی کے ہاتھوں سے تیار کردہ تھا۔ اس ویرانے میں اس کے پاس وقت کی کمی کبھی نہیں رہتی تھی۔ جو اسی طرح کے کاموں میں خرچ ہوتا رہتا تھا۔

جب وہ پہلی بار یہاں آیا تھا تو اس ویران شکاری کیبن کے ٹوٹے پھوٹے پنجر کے سوا کچھ نہیں تھا مگر اب کیبن کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ورکشاپ بھی تعمیر کر

چکا تھا۔

آج کل وہ لکڑیوں کے شیڈ کو وسعت دینے کے لیے سرگرم تھا۔ لکڑی کے استعمال سے نزدیکی درختوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ اب اسے دور جا کر لکڑی لانی پڑتی تھی۔ ہر درخت کی کٹائی کے ساتھ وہ موسم میں نئے پودے لگا دیا کرتا تھا مگر کھپت زیادہ تھی اور افزائش کم۔ لہٰذا درختوں کے درمیان خالی جگہ کا دائرہ دھیرے دھیرے وسیع ہوتا چلا جا رہا تھا۔

چادر ہٹائے جانے پر ناراض علین دوبارہ اسے اپنے گرد لپیٹنے کے چکر میں نظر آئی تو اس نے جلدی سے اسے کھینچ لیا۔

''بالکل نہیں۔ یہ ایکسرسائز کا ٹائم ہے، اٹھ جاؤ۔ پھر تمہیں ٹیسٹ کی تیاری بھی کرنی ہے۔''

''بابا! ابھی تو بہت وقت ہے اور سردی ای ی ی.....'' اس نے جلدی سے ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

کیبن واقعی سرد ہو رہا تھا۔ ایک کونے میں رکھی کوئلوں کی انگیٹھی تمام رات کیبن کو گرم رکھتی تھی۔ اس نے پرانے طرز کی انگیٹھی کی جالی سے جھانکا۔ اندر محض سرخ انگارے باقی تھے۔ پاس رکھے لکڑی کے ٹکڑے اٹھا کر اس نے ایک ترتیب سے انگیٹھی میں رکھے اور فیول کی بوتل سے تھوڑا سا مائع اس پر چھڑک دیا۔ آگ دکھاتے ہی خشک لکڑی تیزی سے جلنے لگی۔

''میں باہر سے مزید لکڑی لا رہا ہوں۔ تب تک تم بستر سے اٹھ جاؤ۔ اور ہاں تمہارے گرم کپڑے وہ لٹکے ہوئے ہیں۔'' اس نے ایک کھونٹی کی جانب اشارہ کیا اور جیکٹ کی آستین میں بازو ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے یقین تھا اس کے اس لہجے کے بعد علین مزید چون وچرا نہیں کرے گی۔

بھاری لباس میں ملبوس وہ باہر نکلا اور احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ یہاں کبھی بڑے جانور نظر نہیں آئے تھے۔ مگر ریچھ، بھیڑیے اور جنگلی بلوں کی اس خطے میں موجودگی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ علاقہ ان جانوروں کی جائے پناہ تھا اور وہ بھی رسک نہیں لیتا تھا۔ لے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی بیٹی میں اس کی جان تھی۔ بیوی کے سلسلے میں ہونے والا احساسِ جرم بچی کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ تحفظ کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ ثانیہ کا خیال آیا تو اس نے سر جھٹکا۔ اس کا خیال اس کے لیے ایک روگ بن چکا تھا۔ اس کے متعلق سوچنے سے بچنے کے لیے ہی اس نے وہ تمام معمولات ترک کر دیے جو اس کی یاد دلاتے تھے۔

ہوا بالکل بند تھی۔ یعنی مزید برف پڑنے کا امکان تھا۔ شیڈ میں لکڑی سردیوں کا موسم گزارنے کے لیے کم تھی۔ مزید جلانے کی لکڑی تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے کھڑکی میں لگے دھندلے شیشے سے اندر جھانکا۔ علین انگیٹھی پر برتن میں پانی ابال رہی تھی۔

وہ کئی چھوٹے موٹے کام اس کے کہے بنا ہی کر لیا کرتی تھی۔ ایک پل کو اس کا دل اداسی سے بھر گیا۔ یہ عمر اس کے اسکول جانے کی تھی۔ مگر وہ اس کے ساتھ اس ویرانے میں خوار ہو رہی تھی۔ باپ سے علیحدہ ہو کر، تنہا ہاسٹل میں رہنے کے لیے وہ کسی طرح تیار نہیں تھی۔

اس نے لکڑیوں کا ڈھیر انگیٹھی کے برابر رکھا اور ایک برتن اٹھا کر گھر کے پچھواڑے بنے بکریوں کے باڑے میں جا پہنچا۔

دروازے کی کنڈی کھولتے ہی وہ ایک پل کو دہلیز پر ٹھٹکا تھا۔ وہاں تازہ برف موجود تھی۔

''یہ کیسے ہوا۔'' وہ الجھا۔

باڑا مکمل طور پر بند تھا۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اندر برف پہنچ پاتی۔ اس نے سر اٹھا کر چھت کا جائزہ لیا۔ وہاں بھی کوئی درز موجود نہیں تھی۔

''ہمم.....'' اس نے مزید وقت ضائع کرنے سے گریز کیا اور آگے بڑھ گیا۔ شاید ہوا کے زور سے دروازے کے نیچے سے آ گئی ہوگی۔

بکریوں کی ہمیشہ اس کے پاس ایک مخصوص تعداد ہی رہا کرتی تھی۔ اضافی جانور وہ شہر میں فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ایک اچھے چرواہے کی طرح وہ اپنے جانوروں کی شکل و صورت، عادات و اطوار تک سے واقف تھا اور ایک بکری میں دودھ عام معمول سے کم ہے۔ یہ اندازہ اسے فوراً ہوا تھا۔

ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کا احساس ایسا واضح تھا کہ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا تھا جب اسے کسی خطرے کی سر پر موجودگی یقینی محسوس ہوتی۔

ایک بند باڑے میں اس طرح کا واقعہ حیران کن بلکہ پریشان کر دینے والا تھا۔ اس نے دور کھڑے میمنوں کی رسی چیک کی۔ وہ مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔

باڑا مربع صورت میں تعمیر کردہ تھا۔ کہیں کوئی دیوار ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ جانوروں کے گھونٹے تھے۔ ایک طرف ..... بھوسے کا ڈھیر رکھا تھا۔ دروازہ بھی بند تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی کی موجودگی کے بنا

ایسا ہو جائے۔ اگر کوئی چور ہوتا تو پورا جانور ہی لے جاتا۔

اس سے پہلے کہ وہ بھڑک کر چہار اطراف کی تلاش شروع کرتا۔ اتفاقاً اس کی اِدھر اُدھر کچھ کھوجتی نظر بکری کی رسی پر پڑی۔ سکون کی ایک گہری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی۔ رسی کھلی ہوئی تھی۔ وہ اسے باندھنا بھول گیا تھا۔ یقیناً رات وہ بچوں کے پاس پہنچی ہوگی اور وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر شکم سیری میں کامیاب رہے۔

''ٹھیک ہے ننھے بدمعاشو! کرلو عیاشی۔ اس گرما میں تمہارا بندوبست بھی کرتا ہوں۔'' اس نے سفید و سیاہ نشان والے چتکبرے میمنوں کو گھورا اور باہر نکل آیا۔ باڑے کا دروازہ بند کرنا البتہ وہ نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

اُس نے بھوسے کے ڈھیر میں جھری بنائی اور آنے والے کا جائزہ لیا۔ وہ لمبا تڑنگا صورت سے سخت گیر نظر آتا شخص تھا۔ وہ جھگڑالو اور ہتھ چھٹ ہے یہ اس کی صورت پر لکھا تھا۔ حرکات و سکنات سے جھلکتی توانائی اور مضبوطی، یہ اس مزاج کے لوگوں کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ وہ اس علاقے کا رہائشی نہیں ہے۔ یہ اس کے لباس سے ظاہر تھا۔ اس نے موٹے کپڑے کی پینٹ شرٹ اور جیکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔

پہلے پہل تو اسے لگا وہ اس کی جانب سے مشکوک ہو چکا ہے۔ خاص طور پر جب اس نے دہلیز پر برف کے ذرات دیکھے تھے۔

یہ اس کی غلطی تھی۔ اس نے جیسے تیسے کنڈی تو لگا لی مگر پیروں سے برف جھاڑنے میں بے احتیاطی کی تھی مگر جس حالت میں اسے یہ باڑا نظر آیا تھا۔ سوائے زندگی بچانے کے اور کچھ سوچنا ہی ناممکن تھا۔ بھوک سے حواس مختل تھے۔ ایسے میں تازہ دودھ جیسے زندگی کی نوید محسوس ہوا تھا۔

باہر کھٹ پٹ کی آواز ابھری تب اس کے پاس بمشکل اتنا وقت تھا کہ خود کو بھوسے کے ڈھیر پر گرا لیا جاتا۔ اور اس نے یہی کیا۔ لرزتے ہاتھوں سے تنکے اپنے اوپر ڈال کر دم سادھ لیا۔

اب بس امید کی جا سکتی تھی کہ آنے والا اس کے وجود سے بے خبر رہے۔ ایک ذرا سی حرکت اس کا راز فاش کر سکتی تھی۔ تنکوں کے درمیان لیٹنا کٹھن کام تھا۔ دھول، سانس کی گھٹن۔ اس نے بمشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر چھینکوں کا راستہ روکا۔ باہر کی یقینی موت جو سخت موسم اور انسانی صورت میں اس کی منتظر تھی۔ یہ غیر یقینی صورتِ حال بہرحال اس سے بدرجہا بہتر تھی، بچنے کی ایک موہوم سی امید جو تھی۔

اس نے دیکھا، وہ دودھ دوہتے ہوئے اچانک ٹھٹکا تھا۔ اب وہ بغور رسی کو دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بکری کو کھونٹے سے باندھنا اسے یاد نہیں رہا تھا۔ یقیناً باڑے کا مالک مشتبہ ہو چکا تھا۔

وہ دودھ لینے کے بعد بھی کسی شکاری کی طرح فضا کو سونگھ رہا تھا۔ جیسے نادیدہ دشمن کو محض سونگھ کر باہر نکال لے گا مگر کچھ دیر کی پُراسرار خاموشی کے بعد اس نے دودھ لیا اور باہر کی راہ لی۔

باڑے کے مالک کے باہر نکلتے ہی اس کی کمزوری سے بند ہوتی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ بھوسے کو ایک ہاتھ سے دور پھینکتے ہوئے اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔ ہر سانس کے ساتھ چہرے کے زاویے بگڑ جاتے۔ درد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جو تمام جسم میں متحرک تھا۔ سینے میں جیسے کوئی ٹھوس چیز سانسوں میں رکاوٹ تھی۔

اسے یاد آیا۔ اس سردی میں وہ گھر سے باہر نکلنے سے ہر ممکن گریز کرتی تھی۔ اور اب اس نے گھریلو لباس میں اونچائی پر ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ ایک اضافی تکلیف پہلو میں لگے زخم کی تھی۔ اس نے ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ خون جم چکا تھا۔ مگر گھاؤ گہرا تھا۔ اگر علاج نہ کیا جاتا تو وہ ناسور بن جاتا۔ اس نے لوگوں کے زخموں کو ناسور بنتے دیکھا تھا۔ یہ تصور ہی خوف زدہ کرنے والا تھا کہ وہ خود اس کا شکار ہو جائے۔

اس نے پیروں کا جائزہ لیا۔ ایک معمولی جوتے کے ساتھ برف پر کئی کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد اگر اس کے پیر ٹوٹ کر گرے نہیں تو یہ ایک معجزہ تھا مگر اسے پیروں کی انگلیوں میں سن پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ سردی نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا تھا۔ وہ نیلی پڑ چکی تھیں۔ اس نے قمیص کا دامن پھاڑ کر پیروں پر لپیٹ لیا مگر اس کے پورے جسم کو ہی گرمی کی ضرورت تھی۔ اگر اب بھی حرارت نہ ملتی تو سردی اس کے وجود کو ختم کر دیتی۔ ٹوٹے پھوٹے جوتے کو اس نے پہلے ہی مکان سے کچھ دور اتار کر پھینک دیا تھا۔

اس نے دھیرے سے زمین پر قدم رکھا اور فوراً لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ بے جان ہوتے پیر جو برف پر دوڑتے رہے تھے۔ اب اس کا وزن سہارنے سے انکاری تھے۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ مگر اسے کھولنا آسان تھا۔ کنڈی کے نیچے ایک عدد جھری موجود تھی۔ جہاں سے انگلی داخل کر کے کنڈی کھولی

بند کی جاسکتی تھی۔ مسئلہ کنڈی نہیں بلکہ وہ فاصلہ تھا جو زخمی بدن اور بے جان انگلیوں کے ساتھ طے کرنا تھا۔ اس نے چند قدم چلنے کے بعد ہی ہار مان لی۔ جان کا خوف اسے وادی سے یہاں تک لے آیا تھا۔ مگر اب چند قدم چلنا دشوار تھا۔

اس کے گھٹنے آہستہ سے خم ہوئے اور سر سجدے میں گر پڑا۔ رگ رگ میں اترتی یخ بستگی وہ واحد احساس تھا جسے اس وقت اس کا جسم محسوس کر سکتا تھا۔ موت کی چاپ لحہ بہ لحہ نزدیک آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مگر پھر کوئی معجزہ ہوا تھا۔ نہ جانے کس طرح۔ وہ سرد جہنم جیسی یخ بستگی گرم حرارت بخش سکون میں کیسے تبدیل ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ بس خون جمتی ہوئی رگوں میں دوبارہ بہنے لگا تھا۔ کسی بالوں بھری کھردری شے نے اسے دونوں اطراف سے گھیر لیا تھا اور یہ اسے آنے والا آخری خیال تھا۔ اس نے پوری طرح اپنے آپ کو اس حرارت کے منبع سے لپیٹ لیا۔

☆☆☆

''بابا! آج ہم ایکسر سائز گول نہیں کر سکتے؟'' علین نے نزاکت سے انڈے کی زردی کو سفیدی سے علیحدہ کر کے اس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ وہ زردی کھانے میں ہمیشہ ڈنڈی مار جاتی تھی۔

''وہ کس خوشی میں؟'' سعود نے اپنی تیار کردہ ڈبل روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر اسے چائے کی مدد سے حلق سے نیچے اتارا۔

''آج مجھے بہت سارا پڑھنا ہے۔ آپ نے کل پوری کتاب یاد کرنے کو دے دی۔'' اس نے پھر سعود کی نظر بچا کر انڈے کا ایک ٹکڑا ٹیبل کے نیچے اچھالا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہے تو آج ہم باڑے کی صفائی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی وہاں کافی پرانا چارا جمع ہو چکا ہے۔ کھرلیاں بھی گندی ہیں۔'' سعود نے اطمینان سے اس کا سکون غارت کیا۔

بچی کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔

''کس وقت شروع کرنا ہے؟'' کچھ دیر بعد اس کے حلق سے مری مری سی آواز نکلی۔

''ابھی چلتے ہیں بس! تم صفائی کا سامان نکال لو۔ تاکہ پہلے کمرے کی صفائی کر سکو۔''

اس نے ٹیبل کے نیچے گرے انڈے کے ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھا۔

''میں اس چیز کی بات کر رہی ہوں۔ جسے آپ ورزش کہتے ہیں۔'' وہ ناراضی سے اس کی تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ اس کی غیر انسانی مشقتوں سے حد درجہ بیزار تھی۔ وہ اس سے اس طرح محنت کرواتا تھا جیسے جنگ کے لیے کسی سپاہی کو تیار کیا جاتا ہے۔ جسمانی مشقتوں سے لے کر نشانے بازی تک، وہ اس کی ہر ریاضت میں حصے دار تھی۔

''تمہیں اپنے آپ کو جسمانی طور پر ہمیشہ فٹ رکھنا چاہیے۔ تاکہ کبھی بھی، کسی بھی صورت حال کا سامنا کر سکو۔'' اس نے ناصحانہ مگر حتمی انداز اپنایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس لہجے کے بعد مخاطب کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ برف پر آگے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر علین کو دیکھا۔ وہ آہستہ دوڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود بچی کو اس کے قریب پہنچنے کے لیے زور لگانا پڑ رہا تھا۔ اس کے اندر کچھ سی بھرنے لگی۔ اسے بچے بہت پسند تھے۔ کھلونوں سے کھیلتے ہوئے، اٹکھیلیاں کرتے ہوئے مگر اس کی ننھی بیٹی اپنی گڑیوں سے کھیلنے کی عمر میں جان توڑ مشقت کر رہی تھی۔ کمزوریوں پر قابو پانا سیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی خواب دیکھنے کی عمر تھی جب وہ اسے زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا سکھا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ایسی زندگی نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔

''بس بابا! اب نہیں دوڑا جاتا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئی۔

''یہ سب ٹھیک سے خوراک نہ لینے کا نتیجہ ہے۔ کل سے ناشتا میں بناؤں گا۔ تم اپنا ہی بنایا ناشتا نہیں کھاتیں۔ ہر روز انڈے ابال لیتی ہو۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

وہ شرمندہ ہو گئی۔

''میں تو بس آپ کی مدد کے لیے۔'' اس نے پیر سے برف کریدی اور نگاہ اِدھر اُدھر دوڑانے لگی دفعتاً وہ چونکی۔

''بابا! یہ کیا ہے؟'' اس نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ سعود نے اس کی انگلی کے تعاقب میں چہرہ گھمایا اور دیکھتا رہا۔

وہ ایک کھوکھلا درخت تھا۔ تیز ہواؤں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر زمین بوس پڑا تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خاص بات اس درخت کے شانے میں پھنسا سیاہ کپڑے کا ٹکڑا تھا۔ اور غور سے دیکھنے پر اس لکڑی کے نیچے تازہ برف پر بنے سرخ دھبے اور دھبوں کے ساتھ برف پر بنے قدموں کے نشان واضح تھے۔ جو سیدھا باڑے کی جانب رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ دھبوں کو یک ٹک گھورتا رہا۔ ذہن

میں بجتی خطرے کی گھنٹیاں کچھ اور شور مچانے لگی تھیں۔

وہ کپڑے کا ٹکڑا ایک ٹوٹے ہوئے درخت کے موٹے سے شاخ سے الجھا ہوا تھا۔ سعود نے پارچے کو نکیلی شاخ سے الگ کیا اور چونک اٹھا، شاخ پر سرخ مائع لگا تھا جو جم کر خشک ہو چکا تھا۔ اس کی تجربہ کار نگاہیں ایک نظر دیکھ کر ہی بتا سکتی تھیں کہ وہ خون تھا۔

وہ کپڑا بھی عجیب تھا۔ اس کا استعمال اس موسم میں کون کر سکتا تھا۔ اس نے سیاہ مخمل کی اوپری سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا، وہ زخمی ہو چکا تھا یا شاید پہلے ہی رہا ہو۔ جو کچھ بھی تھا، وہ خود اس وقت نامعلوم خطرے کی زد میں تھے۔ اس نے غیر ارادی طور پر پاس کھڑی علین کو بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''تم گھر جاؤ اور وہیں رہو۔ جب تک میں نہ کہوں۔''

اس نے علین کو بازو سے تھاما اور تیز تیز قدموں سے کیبن کی جانب بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے لکڑی کے برآمدے کو بغور دیکھا مگر برف کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔

بچی نے بھی خطرے کی بُو محسوس کر لی تھی اور بالکل خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا، ہنگامی حالات میں اسے کیا کرنا ہے۔

گن کو چیک کر کے کندھے پر لٹکاتے ہوئے اس نے لاک کی مضبوطی چیک کی اور باہر نکل آیا۔ دبے قدموں کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم پر اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخری بار اسے اس وقت یہ کیفیت محسوس ہوئی تھی جب اس نے ثانیہ کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ثانیہ کا خیال آیا تو جبڑے بھینچتے ہوئے گن کندھے سے اتار کر ہاتھ میں تھام لی۔

باڑے کے سامنے پہنچنے کے لیے اب کی بار اس نے کیبن کی دوسری سمت اختیار کی تھی۔ وہ راستہ نسبتاً کم طویل تھا۔

وہاں اب بھی ویسا ہی سکوت طاری تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ درخت بالکل ساکت تھے۔ حتیٰ کہ جانور بھی خاموش تھے۔ اس نے دروازے پر پہنچنے سے پہلے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مگر واحد کھڑکی کے سامنے بھوسے کا بڑا سا ڈھیر ایستادہ تھا۔

اس نے آہستگی سے دروازے کا کنڈا ہٹایا۔ چند لمحوں تک ردِعمل کا انتظار کیا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ زمین و آسمان کی گردش تھم جاتی، سمندر کی لہریں اس کے پہاڑی کیبن کو چھونے لگتیں۔ تب بھی شاید اسے وہ حیرت نہ ہوتی۔ جو سامنے موجود منظر کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ منظر کچھ ایسا ہی ہوش رُبا تھا۔

وہ زمین پر محوِ استراحت تھی۔ کچھ اس انداز میں کہ شہد رنگ گھونگھریالے بال شفاف گردن اور چہرے پر ریشم کے مانند بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے پیر سیاہ مخمل کی گھیر دار سلوٹوں میں گم تھے۔ دو اطراف میں اس کے باڑے کے جانوروں نے ایک فصیل بنا رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک بکری کے گرد حمائل تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے وہاں پناہ لی تھی یہ تو ظاہر تھا مگر لڑکی حال سے بیگانہ تھی۔ یہ اندازہ اس کی گردن کے غیر معمولی زاویے سے ہوا تھا۔

اس نے احتیاطاً دائیں بائیں نظر دوڑائی اور آہستگی سے آگے بڑھا۔ یہ کوئی ٹریپ بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے آہستگی سے لڑکی کے نتھنوں کے نیچے انگلی رکھ کر سانسوں کی آمد و رفت جانچی۔ وہ زندہ تھی مگر مُردوں سے بدتر۔ وہ اس جان لیوا سردی میں محض ایک مخملیں سیاہ فراک میں ملبوس تھی۔ سیاہ پڑتے ناخن اور ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ سردی کے ہاتھوں ہار مان چکی ہے۔

مگر شاید خدا کو زندگی منظور تھی جو نا سمجھ جانور اس کی زندگی کے پیامبر بن کر اس کے اردگرد آ بیٹھے تھے۔ یہ جانوروں کا ایک غیر معمولی ردِعمل تھا۔ مگر اس قسم کے مظاہر عموماً ویرانے میں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں جو فطرت کے متعلق انسان کا نظریہ بدل دیں۔

سعود نے ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے..... رکھ کر اسے اٹھایا اور جانوروں کو ہشکارا تاکہ اسے اٹھا کر باہر لایا جا سکے۔ تب ہی اس کی نظر لڑکی کے پہلو میں لگے زخم پر پڑی۔ سیاہ فراک پر خون جم کر سخت ہو چکا تھا مگر عنابی رنگ واضح تھا۔

''نہ جانے یہ زندہ کیسے ہے۔ بہت ہی سخت جان لگتی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

باڑے سے باہر روشنی میں اُسے لڑکی کے خدوخال ٹھیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ افسانوی حُسن کی مالک تھی۔ بدترین حالات میں بھی اس کے چہرے کے نقوش دل موہ لینے والے تھے مگر یہ سب باتیں ایک عام زندگی گزارنے والے کے لیے اہم ہو سکتی تھیں۔ وہ سالوں پہلے عام انسانوں والی حسیات کو دفن کر چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ لڑکی کے یہاں پہنچنے کے پیچھے موجود وجوہات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے باڑے سے کیبن تک اسے بہت عجلت میں پہنچایا تھا۔

''اسے یہاں لٹانے میں میری مدد کرو۔'' اس نے علین کو مدد کے لیے آواز لگائی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے تھامے بمشکل دروازہ کھول پایا تھا۔

''اوہ میرے خدا! یہ کون ہے؟'' علین کی اس کو دیکھتے ہی، منہ اور آنکھیں دونوں کھل گئیں۔

''یہ تو بالکل بھیگی ہوئی ہے اور زخمی بھی ہے۔ اس کا خون بہہ رہا ہے اور اس کے پیر۔ اوہ مائی گاڈ۔ آپ نے اسے مار دیا؟'' وہ لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس پر تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھی۔ آخر میں اس نے سعود کو الزام دینے والے انداز میں دیکھا تھا۔

''چپ ہو جاؤ علین! میں سب دیکھ رہا ہوں۔ اور اسے میں نے نہیں مارا۔ پہلے سے زخمی تھی۔ جاؤ میرا فرسٹ ایڈ بکس لاؤ۔ اور ہاں! پانی گرم کرو۔'' اس نے لڑکی کے پیروں کا جائزہ لیتے ہوئے اسے جھڑکا تو وہ خاموشی سے سرک گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا ایک معمولی فرسٹ ایڈ بکس کے ذریعے وہ کیسے اس کے اتنے گہرے زخموں کا علاج کر سکے گا۔ نیلے پڑتے پیر ابھی مکمل طور پر ناکارہ نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کو لانے کے لیے اُسے باہر جانا پڑتا اور واپسی تک وہ زخمی لڑکی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اچانک ہی غیر متوقع مصیبت سر پر آپڑی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے زخم پر چپکا کپڑا کاٹ کر دور ہٹایا۔ گھاؤ لمبا تھا مگر زیادہ گہرا نہیں تھا۔ شاید عام دواؤں سے ٹھیک ہو جاتا۔

''اتنے سخت حالات میں نہیں مری تو اب بھی زندہ رہے گی۔'' اس نے تھک ہار کر کچھ سنگ دلی سے سوچا اور لڑکی کے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ بھیگا ہوا تھا۔ اسے بدلنا ضروری تھا۔ اس کے دل میں ناگواری کی لہر سی اٹھی۔ اسے تمام مشقت ایک ایسے فرد کے لیے کرنی تھی جس کی یہاں موجودگی ہی مشکوک تھی۔

☆☆☆

''بابا!''

''ہاں؟''

''یہ کب ہوش میں آئیں گی؟''

سعود نے کتاب ایک جانب رکھی اور علین کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے لحافوں کے ڈھیر میں گم، زخمی مہمان کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر انہماک کا گہرا تاثر تھا بلکہ اسے انہماک کہنا غلط تھا۔ وہ مبہوت ہو گئی تھی۔ اس نے پہلی بار کسی کہانیوں کی شہزادی کو حقیقی روپ میں دیکھا تھا۔ اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔ وہ تمام کام نمٹا کر اب گہری ہوتی رات میں بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔

''میں نہیں جانتا۔ آجائے گی ہوش میں۔ تم دودھ پی لو۔'' وہ کافی دیر سے لیمپ کی روشنی میں اپنی ہی بنائی گئی بینچ پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ جو اسے باہر برآمدے سے اٹھا کر لانی پڑی تھی۔ یہ اس کی زندگی میں ہونے والی پہلی بدنظمی تھی۔ جو اس لڑکی کے آنے سے پیدا ہوئی تھی۔ آگے نہ جانے اور کیا مصیبتیں آنے والی ہیں۔ اس نے سوچا مگر اظہار سے گریز کیا اور کمبل سینے پر کھینچ لیا۔ علین نے اس کی بات سن کر منہ بنایا مگر خاموشی سے لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ سو چکی تھی۔

وہ زخمی لڑکی کون تھی! کس لیے یہاں تھی! یہ سب جاننے کے لیے اس کا ہوش میں آنا ضروری تھا۔ اور یہ فی الحال ممکن نہیں تھا۔ اس نے.... آخری بار اجنبی مہمان کی جانب دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔

نیند میں ماضی کے پُر پیچ اُلجھے خوابوں کے درمیان کوئی غیر معمولی احساس تھا جس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کمرے میں لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ اچانک جاگنا پڑے تو پریشانی نہ ہو اور اب اسی زرد روشنی میں کچھ فاصلے پر، بستر میں لیٹی وہ زور زور سے گردن نفی میں ہلا رہی تھی۔ تیز تیز سانسوں کی آمدورفت اور ہونٹوں کی جنبش نیم اندھیرے میں بھی واضح تھی۔ اس کے برابر لیٹی علین بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اور اب گھبرا کر اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

لڑکی نیند میں تھی مگر کسی سانحے کی خوفناکی اُس کے خوابوں کو بھی متاثر کر رہی تھی۔

سعود نے کمبل سینے سے ہٹایا اور کہنی کے بل اٹھ بیٹھا۔

''علین! اس کا ماتھا چھو کر بتاؤ بخار تو نہیں؟'' اس نے وہیں سے آواز لگائی۔ خوابوں کے عذاب کسی کو تنہا نہیں چھوڑتے۔ سعود نے پہلی بار اس کے متعلق ہمدردی سے سوچا۔

علین نے ہاتھ رکھا اور گھبرا کر پیچھے کھینچ لیا۔ ''بہت تیز بخار ہے۔'' اس کے انداز میں بدحواسی تھی۔

سعود نے تیزی سے کمبل سینے سے جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بخار کی دوا موجود تھی مگر اس کی حالت کے پیش نظر اسے مزید درد کش اور جراثیم کش دوائیں لا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔

اسے دردکش دوا کی ایک خوراک دے کر وہ پھر بستر پر آلیٹا۔ علین فوراً ہی سوگئی مگر اس کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی۔

وہ ہر کچھ عرصے بعد خریداری کے لیے نزدیکی گاؤں کا رخ کرتا تھا۔ سامان قریب اختتم تھا مگر وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کا شیڈ کو وسعت دینے کا کام بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ دراصل وہ ذہنی اُلجھن کے سبب کام پر توجہ مرکوز کر ہی نہیں پا رہا تھا۔ لڑکی پھر سے دواؤں کے زیر اثر سو چکی تھی۔

اس کے زخم کی کیفیت بتاتی تھی کہ وہ لمبے عرصے تک بستر سے اٹھ نہیں پائے گی۔ اور ایک بستر پر لیٹے مریض کی تیمارداری کا خیال ہی خوف ناک تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

''اس کو اس کے گھر تک پہنچانا ہی میرے تمام مسائل کا حل ہے۔'' اس نے حتمی فیصلہ کیا اور آنکھیں موند لیں اور نہ جانے کس وقت پریشان خوابوں کی رتھ پر سوار بے سکون نیند کے رستوں پر نکل پڑا۔

صبح اس کی آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ کوئی اس کے سرہانے باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ سوتا رہا۔ یہ ناممکن تھا۔ وہ تو آہٹ پر چونک جانے والا انسان تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ علین تھی۔ جو اس کے پاس کھڑی کھڑکی سے تانک جھانک کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بول بھی رہی تھی۔

سعود کو بالکل یاد نہیں تھا کہ اس کے کیبن میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو چکا ہے اور علین اسی سے مخاطب ہے۔

وہ عین کھڑکی کے ساتھ سو رہا تھا۔ کیبن میں صرف ایک بستر کی گنجائش تھی۔ اور اب اسی کے متوازی بینچ رکھ دی گئی تھی۔ درمیان میں ایک پتلی سے راہداری بن گئی تھی۔

اس کو پوری آنکھیں کھول کر گھورتے دیکھا تو علین گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

آج وہ اس کے بعد جاگا تھا۔ اس کا معمول بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ اور اس کے مزاج کی خرابی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ خاموشی سے ہر بات مان لی جائے۔ وہ جلدی سے کچن میں جا کر کھٹ پٹ کرنے لگی۔

سعود نے کیبن کا جائزہ لیا۔ سب معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ جائزہ لیتی نگاہ مریضہ پر آ کر ٹھہر گئی۔ وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔

چہرہ بے تاثر تھا۔ بس بڑی بڑی سنہری آنکھوں میں ہراس کی کیفیت بدستور موجود تھی۔ وہ مخاطب کی آنکھوں میں اس قسم کا ہراس دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے شخصیت ہی ایسی پائی تھی۔ قد کاٹھ تو قدرتی تھا مگر چہرے پر چھائی سختی اور زخموں کے نشان حالات کی دین تھے۔ کچھ مزاج فطرتاً سنجیدہ تھا اور وہ لڑکی تو تھی بھی دراندازی، اس کا ڈرنا جائز تھا۔

وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ناشتا بنانے اور لڑکی کے لیے پرہیزی خوراک تیار کرنے تک اس نے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔

وہ اب ہوش میں تھی اور اس سے مفصل بات چیت کی جاسکتی تھی۔ سوپ کا پیالہ اور گوشت کے ریشے ملا کر تیار کردہ آملیٹ لا کر اس نے ٹیبل پر سجا دیا۔ چائے کے کپ اور اپنی ہی تیار کردہ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کے ساتھ۔

وہ ان تمام کاموں کی باقاعدہ تربیت رکھتا تھا جو تنہا زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اب وہی تربیت اس کے کام آرہی تھی۔

''چلو علین! ناشتا تیار ہے۔'' اس نے کھڑکی سے ناک چپکائے بیٹھی بچی کو آواز دی تو نظر خاموشی سے خود کو گھورتی لڑکی پر پڑی جس کا وہ نام تک نہیں جانتا تھا۔

اسے دیکھ کر اچانک اسے ایک نیا خیال آیا اور اس نے سر تھام لیا۔ لڑکی خود سے کھانا نہیں کھا سکتی تھی بلکہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے بالوں میں ہاتھ گھمایا۔ ذہن تیزی سے اس صورتِ حال کا حل سوچ رہا تھا۔

''سنو! تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ اب اسے خود اپنا بوجھ اٹھانا تھا۔ وہ صرف اس کی مدد کر سکتا تھا، مستقل اس کا بوجھ نہیں ڈھو سکتا تھا۔

وہ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

اس نے سوال دہرایا۔ اور کوئی ردِعمل نہ پا کر اس پر ایک اور بھیانک انکشاف ہوا۔ لڑکی اردو نہیں جانتی تھی۔

اس نے سوال پشتو میں پوچھا اور لڑکی کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک نے بتا دیا کہ وہ اس زبان سے واقف ہے۔

''میں شینا ہوں۔'' وہ اتنی آہستہ آواز میں بول رہی تھی کہ اسے باقاعدہ کان لگا کر سننا پڑا۔

''کیا تم اٹھ کر بیٹھ سکتی ہو؟ میں تمہیں اٹھا کر نہیں لے جاسکتا۔'' اس نے بے مروتی سے کہا تو لڑکی نے جواب دینے کے بجائے کہنی کے زور پر اوپری دھڑ اوپر اٹھایا۔ مگر فوراً ہی پہلو پر ہاتھ رکھ کر ڈھیر ہوگئی۔

"نہیں...... نہیں اٹھ سکتی۔" اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

سعود خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شدید خفگی کی واضح جھلک تھی۔ جو لڑکی کو مزید پریشان کررہی تھی۔ اس کے آنسو آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگے تھے۔

"دیکھو! میں یہاں تنہا رہتا ہوں۔ تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اپنے گھر اور حوالے بتاؤ۔ تاکہ ان سے رابطہ کیا جاسکے۔ آج میں شہر جاؤں گا۔ وہاں سے فون کیا جاسکتا ہے اُن کو۔ اگر رابطہ ہوسکا......"

وہ خاموش رہی۔ پھر لب کاٹنے لگی۔ انداز سے کشمکش و پیچ ظاہر تھا۔ "میرا کوئی گھر نہیں۔" اس نے سعود کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

"میں گھر چھوڑ کر بھاگ آئی ہوں۔" اب اس کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ سفید چھوٹی سی ناک سرخ ہوچکی تھی۔

وہ گھبرا گیا۔ اپنی تمام تر سختی اور بے مروتی کے باوجود کسی روتی ہوئی عورت کو دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیسے چپ کرائے جب اس کی نگاہ علینہ پر پڑی۔ وہ نگاہوں میں خشونت لیے اسے گھور رہی تھی۔ مادری زبان پشتو نہ ہونے کے باوجود اس علاقے میں طویل قیام نے اسے بھی اس زبان سے واقفیت کرادی تھی۔

"آپ نے انہیں رُلا دیا؟" اس کا انداز الزام دینے والا تھا۔ وہ مزید بدحواس ہوا۔

"میں نے نہیں رُلایا۔"

"آپ نے رُلایا ہے۔ آپ کیسے ایک زخمی کے ساتھ ایسا سلوک کرسکتے ہیں؟" اب وہ اسے جذباتی بلیک میل کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے۔ جب تک یہ چلنے کے قابل نہیں ہو جاتی مگر اس کے بعد تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔" اس نے علینہ اور شینا کو باری باری مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر بے بسی سے ناشتے کی جانب دیکھا۔ وہ اس تمام کشمکش میں ٹھنڈا ہوچکا تھا مگر پھر نہ کرتے بھی اس دن اور اس کے بعد کے چند اور دن اسے شینا کی جملہ ضروریات کا خیال رکھنا ہی پڑا تھا۔ کیونکہ غیر متوقع برف باری نے اس کا گھر سے نکلنا ناممکن کردیا تھا اور آنے والے دنوں میں اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ لڑکی کے متعلق اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر سخت جان تھی۔ یا پھر اس میں جینے کی امنگ بہت شدید تھی۔ جو بھی تھا، ان چند دنوں کے دوران اس کا زخم بھرنے کی رفتار حیران کن تھی۔

اب وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اپنے چھوٹے موٹے کام بھی علینہ کی مدد سے کرلیا کرتی تھی۔ وہ معمول کے کاموں کے دوران مسلسل اس پر نگاہ رکھتا تھا مگر یہ نگاہ رکھنا اس قدر مسلسل تھا کہ وہ خود کسی اور کی نگاہ میں آچکا تھا۔ اس کا پتا بھی اسے اتفاقاً چلا۔

وہ شینا نامی لڑکی کی وہاں موجودگی کا تیسرا دن تھا۔ جب اسے راستے سے برف ہٹاتے ہوئے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور ایک پل کو دیکھتا رہ گیا۔ دھندلے شیشوں والی کھڑکی پر دھوپ براہ راست پڑ رہی تھی۔ برف باری رک چکی تھی اور بادلوں کے درمیان سے دھندلا سورج پل بھر کو جھانک لیتا تھا۔

اور اسی دھندلے شیشوں سے ایک نارنجی مائل سرخ بالوں سے گھرا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک پل کو وہاں دیکھا اور پھر دیکھتا رہ گیا۔

وہ چہرہ ہر رنگ میں مختلف ہونے کے باوجود ثانیہ سے بے حد مشابہت رکھتا تھا۔

وہ شاید مزید کچھ دیر وہاں تکتا رہتا اگر علینہ کے کھنکھارنے کی آواز اس کا ارتکاز نہ توڑتی۔

اسے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اگر شینا اس دوران رخ موڑ لیتی تو یقیناً اسے اپنی جانب یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے پا کر بدگمان ہوتی۔

"شینا بہت پیاری ہیں۔" علینہ نے اس کی نظروں کا زاویہ محسوس کرلیا تھا۔

"ہاں! مگر ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اجنبیوں پر بھروسا نہیں کرتے۔" اس نے پھر سے بیلچہ چلانا شروع کردیا۔ پل بھر کو روشنیوں نے جو سحر طاری کیا تھا۔ وہ ختم ہوچکا تھا۔ اب وہ پھر سے ایک سخت جان محتاط شخص تھا۔

"مجھے نہیں پتا بابا! اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں، مجھے تو وہ بس ماما جیسی لگتی ہیں۔ دیکھیں۔" اس نے تصویر جیب سے نکالی جو وہ اکثر نکال کر دیکھا کرتی تھی اور سعود ایک بار پھر اپنی بیٹی کے ساتھ خیالات کی ہم آہنگی پر حیران رہ گیا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا جب دونوں کے خیالات ایک ساتھ زبان پر آئے ہوں۔

علینہ نے ماں کو بہت کم عمری میں دیکھا تھا۔ اس کی

کی وہ اس کی تصویر دیکھ کر پوری کیا کرتی تھی۔

''علین!'' اس نے بلیچ زمین پر رکھ کر دونوں ہاتھ اس پر ٹکا لیے۔

''دنیا میں بہت سے لوگ ہمیں اپنے عزیزوں سے ملتے جلتے لگتے ہیں اور ہم ان پر بھروسا کرنے لگتے ہیں۔ مگر یاد رکھو ہم چوٹ تب ہی کھاتے ہیں۔ جب آگ اور روشنی کو ایک سمجھ لیتے ہیں۔ تم بس یہ یاد رکھو کہ تمہاری ماما اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' اس نے لہجے میں نرمی اور سنجیدگی سمو کر بچی کو سمجھایا۔ مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نے صاف سمجھا دیا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے تصویر دوبارہ جیکٹ کی جیب میں ڈالی اور کیبن کی جانب چل پڑی۔ جو نصیحتیں میں بچی کو کر رہا تھا کیا خود ان پر عمل کرتا ہوں؟'' اس نے سوچا مگر اندر چھایا سناٹا جواب دینے سے گریزاں رہا۔ سعود نے سر جھٹکا اور بلیچ چلانے کی رفتار تیز کر دی۔ بادل پھر سے گہرے ہونے لگے تھے۔

علین سے شینا کے تعلقات مثالی تھے۔ اس کا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔

البتہ سعود سے تعلقات ہنوز سرد مہری کا شکار تھے۔ یہ یک طرفہ سرد مہری اسی کی جانب سے تھی۔ وہ شینا کی بتائی گئی کہانی سے مطمئن نہیں تھا۔

وہ مطمئن ہونے والی بات تھی ہی نہیں۔ ایک دیہاتی لڑکی جو گھر سے فرار ہوئی کیونکہ اس کی جان کو خطرہ تھا۔ کس سے؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ گھر سے فرار ہوئی اور کئی کلو میٹر چل کر اس کے گھر تک آ پہنچی۔ یہی کہانی تھی جو شینا نے اسے اپنے فرار کے متعلق سنائی تھی۔ وہ اس بات کو اتفاق ماننے پر تیار نہیں تھا کہ اس گھنے جنگل میں وادی سے کوئی زندہ سلامت اس کے گھر تک پہنچ جائے۔

اب اسے اس بات کی تصدیق کرنی تھی۔ وہ شدت سے شہر جانے کے لیے مطلع صاف ہونے کا منتظر تھا۔

دو دن کی شدید برف باری کے بعد تیسرے دن آسمان صاف ہوا تو اس نے چھت پر جمع شدہ برف صاف کرنے کا ارادہ باندھا۔ مگر اس دن باڑے میں ایک اور غیر متوقع سانحہ اس کا منتظر تھا۔

وہ صبح دودھ لینے آیا تھا اور تب ہی وہ وحشت ناک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ وہ چکبری بکری تھی جو اس وقت کچھ اس انداز میں اس کے سامنے موجود تھی جیسے کسی درندے نے اسے چیر دیا ہو۔ بہت بے دردی سے معصوم جانور کے اعضا الگ کر دیے گئے تھے۔ سر غائب تھا۔ ٹانگ ایک جانب پڑی تھی۔ وہ منظر اس حد تک بھیانک تھا کہ تھوڑی دیر کو اسے مفلوج سا کر گیا۔ دراصل اس منظر کی دید نے اس کے ذہن میں کئی پرانی یادوں کے عکس تازہ کر دیے تھے۔

اس نے ایک جانب سے ٹوٹی ہوئی لکڑی کی دیوار کو دیکھا۔ وہاں سے نقب لگائی گئی تھی۔ یہ کسی بڑے جانور کی کارروائی لگتی تھی۔ اس کے دل میں وحشت براجمان ہونے لگی۔ جو درندہ اس بکری کا یہ حال کر سکتا ہے، اس کے لیے کسی بچی پر قابو پانا کیا مشکل تھا۔

یہ واقعہ یقیناً صبح صادق کے وقت پیش آیا تھا۔ ورنہ برف باڑے کے اندر تک موجود ہوتی مگر ایسا نہیں تھا، عجیب وہ قدموں کے نشان تھے۔ وہ ان کی ساخت سے جانور کی نسل کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ مگر محسوس ہوتا تھا جانور یقیناً جثے میں بڑا تھا۔

اس نے ٹوٹے ہوئے تختے کو کیلیں ٹھونک کر دوبارہ اپنی جگہ پر جوڑا اور کچھ مزید تختوں سے اسے مضبوط کر دیا۔

اسے لمبے عرصے کے لیے باہر نکلنے سے پہلے اس موذی کو ڈھونڈ کر نشانہ بنانا تھا جو ممکنہ طور پر کوئی ریچھ ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اس جگہ ریچھ کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ وہ دل میں وحشت اور تشویش کے سائے لیے باہر نکل گیا۔ دماغ اُلجھن میں تھا مگر شہر جانا بھی ضروری تھا اس سے پہلے کہ دوبارہ برف باری کے ہاتھوں قید ہو جاتا۔

اس نے شینا یا علین کو کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ مردہ جانور کے اعضا وہ گھر سے کچھ دور دفنا آیا تھا۔ اب مشکل تھا کہ وہ اس دہشت انگیز واقعے سے واقف ہوتیں۔

تمام معمولات سے فارغ ہو کر اس نے خاموشی سے گرم لباس زیب تن کیا اور علین کو تیار کر کے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ شینا گردن تک چادر لپیٹے خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے حلقے کچھ اور گہرے ہو چکے تھے۔ وہ واضح طور پر خون کی کمی کا شکار تھی۔

کیبن سے نکلنے سے چند لمحے قبل وہ اچانک دروازے پر رکا اور ایک نظر شینا کو دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے بالکل بے یار و مددگار تھی۔ اگر وہاں کچھ 'خطرناک' تھا تو وہ اس سے مقابلے کے لیے بالکل نہتی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ سنگ دل میں کچھ پگھل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ جانے کا ارادہ ڈانواں ڈول ہوتا، اس نے دیوار پر لٹکتی گن اتاری اور اس کے نزدیک پہنچا۔ ''یہ استعمال کرنا آتی

ہے؟'' لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مگر تب اسے خود اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بستر پر تھی اور زخمی تھی۔ گن سے لگا دھچکا اس کا زخم پھر کھول دیتا۔

اس نے گن اس کے پاس رکھی اور کچن کیبنٹ سے ڈھونڈ کر ایک بڑی سی چھری نکال لی۔

لڑکی اس کی حرکات سے خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ ''کیا مجھے کوئی خطرہ ہے؟'' وہ منمنائی۔

سعود نے چھری اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''ہاں! ہو سکتا ہے اور نہیں بھی مگر تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ میں نے باہر کچھ حفاظتی اقدامات کیے ہیں اب کوئی اس کیبن تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ تم اسی خطے کی باسی ہو۔ بڑا سفر طے کر کے یہاں تک آئی ہو۔ کچھ شبہ ہے کہ یہاں کوئی جانور موجود ہے۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا مگر تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔'' اس نے شینا کے خوفزدہ تاثرات سے نظر چراتے ہوئے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی اور دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونستا باہر نکل گیا۔ جہاں دروازے کا پٹ تھامے علین اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں شینا کے پاس رکنے کی بات کی تھی مگر سعود کی جھڑکیاں سن کر اب خاموش مجوتما شا تھی۔ البتہ آنکھوں میں شینا کی بے چارگی پر تاسف واضح دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ اپنے مزاج کے برخلاف پہلے ہی اس کی کافی مدد کر چکا تھا۔ اس سے زیادہ کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ اپنی مدد آپ کرتی۔

اس کا رخ گھر کے پیچھے بنے ایک چھوٹے سے ہٹ کی جانب تھا۔ وہ ایک کمرے کا چھوٹا سا کیبن تھا۔ جو گھر سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اسے دور سے دیکھنا مشکل تھا۔

وہاں اس کی اسنو موبائل موجود تھی۔ اس علاقے میں تیز ترین سفر کے لیے اس نے بطور خاص اس کا بندوبست کیا تھا۔ براہِ راست اس کے کیبن تک آنے والا گاڑی کی موجودگی سے بے خبر ہی رہتا اور یہی وہ چاہتا تھا۔

اس نے علین کو پیچھے بٹھایا اور آہستگی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

چیڑ کی شاخیں برف سے بوجھل ہو کر مزید جھک گئی تھیں مگر اس طرح ان کے پیچھے چھپنا آسان ہو گیا تھا۔ اب اگر کوئی نزدیک آ کر نہ دیکھتا تو سر تا پا سفید لباس میں ملبوس، برف آلود شاخوں میں چھپا وہ شخص ہرگز نظر نہ آتا۔

اس قدر دور سے کیبن کے اندر کا جائزہ لینا مشکل تھا مگر نزدیک جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے محض اتفاق سے ہی یہ جگہ دریافت کر لی تھی۔ ورنہ چیڑ کے درختوں کے درمیان چھپے اس مختصر کیبن کو باقاعدہ پتے کی مدد سے ڈھونڈنا مشکل تھا۔

وہ محض ایک امکان کے سہارے یہاں گھوم رہا تھا۔ جب اسے ایک درخت کے نیچے نیلے رنگ کی زنانہ کینوس کی جوتی نظر آئی۔ اور اس کی شکاری آنکھوں نے فوراً اس بے محل نشانی کو گرفت میں لیا تھا۔ برف پر پڑی وہ نیلی جوتی دور سے واضح تھی۔ اس کے بعد اس نے وہ جگہ ٹھیک سے کھوجی اور اپنے شبہات کی تصدیق کے بعد، دوسرے ہی دن فوراً کارروائی کی تھی۔ شدت کی برف باری میں اسے دیکھ لیے جانے کا امکان کم تھا۔ اتنی دیر یہاں کھڑے رہ کر وہ کیبن کے مکینوں کی تعداد کے متعلق اطمینان کر چکا تھا اور اب جھاڑیوں میں چھپا اپنی کارروائی کے نتائج دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھا۔

اس کے آنے کے کافی دیر بعد کیبن سے جیکٹ پوش برآمد ہوا اور اس کی آنکھوں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔

وہ باڑے سے کافی دیر بعد برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود جانور... کی آلائش، دور سے ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ انہیں باڑے سے کافی دور لے جا کر کہیں جنگل میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ اسے واپسی میں اس قدر دیر لگی کہ وہ بیزار ہو کر اس کے پیچھے جانے کے متعلق سوچنے لگا مگر تب ہی باڑے والا واپس آتا نظر آیا۔ اب کی بار اس کا رخ گھر کے برابر بنے ایک الگ حصے کی جانب تھا۔ جب کیبن کا مکین وہاں سے تحفے لے کر برآمد ہوا تو اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قسم کا اسٹور ہو سکتا تھا۔ یعنی وہ وہاں ہر طرح کے انتظامات کے ساتھ رہ رہا تھا۔

اس سے نمٹنا آسان نہیں تھا مگر ہار ماننا وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے کیبن کے مالک کو دہشت زدہ کرنے کے لیے جو کارروائی کی تھی محسوس ہوتا تھا، وہ اس سے اس حد تک متاثر نہیں ہوا کہ گھبرا جاتا۔ اسے مزید ایسی کارروائیوں کی ضرورت تھی۔ باڑے کی دیوار دوبارہ توڑنا کوئی مشکل نہیں تھا بلکہ مشکل تو کیبن کی دیوار کاٹنا بھی نہیں تھا۔ اس نے جوتوں کے ٹھوکوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے برف پر

استعمال کے قابل بنایا تھا۔ جس کے بعد اس سے بننے والے نشانات کو کسی جوتے کے نشان کے طور پر شناخت کرنا مشکل تھا۔

اس نے ایک گہری نگاہ سے کیبن کے بند دروازے کو دیکھا اور واپس پلٹ گیا۔ جہاں کچھ دور لگے ٹینٹ میں اس کا جوڑی دار موجود تھا۔

☆☆☆

اسنو موبائل تیزی سے بل دار رستوں پر برف اُڑا رہی تھی۔ علین مضبوطی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس کی پشت سے پیوست تھی۔ اس کا رخ وادی سے کچھ پہلے واقع اپنے دوست کے گھر کی جانب تھا۔

اس علاقے میں اسنو موبائل کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ لوگ پیدل یا خچروں پر آمدورفت کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اسے بھی گاڑی شہر میں پہنچنے سے پہلے ہی ٹھکانے لگانا پڑتی تھی اور اس کام کے لیے شہر سے کچھ دور پتھروں سے بنا وسعت اللہ کا یہ چھوٹا سا مکان اس کے لیے پارکنگ کا کام بھی دیتا تھا۔ اس نے ایک چکر دے کر گاڑی کو مکان کے قدچوں کے سامنے روکا تو تازہ برف کی ایک بوچھاڑ سی ابھری۔

آواز سن کر اندر سے دو ننھے ننھے بچے برآمد ہوئے اور خوشی سے قلقاریاں مارتے ہوئے دونوں باپ بیٹی سے لپٹ گئے۔ وہ تین اور چار سال کے ننھے شہزور محض شلوار قمیص پر سادہ سے سویٹروں میں ملبوس تھے۔ اس کی وجہ بے پروائی نہیں بلکہ وسعت اللہ کی غربت تھی۔ سعود کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لیے ہر بار وہ کسی نہ کسی بہانے اس کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا براہِ راست مدد وہ خوددار شخص کبھی قبول نہیں کرے گا۔ دونوں نے اپنی ٹانگوں سے لپٹے بچوں کو گود میں بھر لیا۔ کیونکہ ٹانگوں سے علیٰحدہ ہونے کو وہ کسی طور تیار نہیں تھے۔ جب تک وہ چند قدچے پار کر کے اوپر پہنچتے، وسعت اللہ دونوں بازو پھیلائے۔ خود باہر نکل آیا۔

''کیا خوب دن ہے آج! میرا یار آ گیا۔ ابھی میں اس کو یہی بول رہا تھا کہ اس بار سعود لالہ آیا نہیں ابھی تک۔'' خاموش کھڑی خاتونِ خانہ کی جانب اشارہ کرتا وہ گرمجوشی سے اس سے لپٹ گیا۔ وہ جب بھی اس سے ملتا، اسی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتا۔ چاہے ملاقات چند دن قبل ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔

''برف باری دیکھ رہے ہو مڑا! کیسے لگتا، بس آج کچھ صبر کیا آسمان نے تو نکل آئے۔ ہمیں قہوہ پلاؤ جلدی پھر نکلنا ہے۔'' وہ ہاتھ رگڑتا جلدی سے مکان میں داخل ہو گیا۔ بیرونی کمرے میں قالین بچھا کر اسے فرشی نشست گاہ کی صورت دی گئی تھی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے جوتے اتارنا ضروری تھا۔

دراصل مکان ایک ہی کمرے اور باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ وہ وہیں رک کر جوتے اتارنے لگا۔ علین اس کام میں پھرتیلی ثابت ہوئی تھی۔

اس کے قہوہ پلانے کی بات وسعت اللہ کو ڈنک کی طرح لگی تھی۔

''ایسے کیسے صرف قہوہ پی کر جائے گا؟ کھانا تیار ہے۔ رزق کو چھوڑ کر جائے گا؟'' اس کے انداز میں تحیّر سے زیادہ ملامت تھی۔

پہلے ایسا کبھی ہوا بھی تو نہ تھا کہ سعود اس کے گھر سے کھانا کھائے بنا چلا گیا ہو۔

''یار! اب کھانے کی عزت کے لیے معدے پر ظلم تو نہیں کر سکتے نا۔ بس قہوہ۔ ابھی ناشتا کر کے نکلے ہیں۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا تو وسعت اللہ نے منہ بنا کر علین کی جانب رخ موڑ کر اس سے گفتگو شروع کر دی۔ یہ سعود کے موقف سے ناگواری کا اظہار تھا۔ اس کی بیوی جو ہونٹوں پر انگلی رکھے مسکراتے ہوئے اس نوک جھوک کو سن رہی تھی۔ تنازع کا تصفیہ ہو جانے کے بعد ایک کونے میں بنے باورچی خانے کی جانب مڑ گئی۔

''تم سناؤ! اِدھر علاقے میں کوئی تیندوا، ریچھ وغیرہ نظر آیا ہے کیا؟ کل میری بکری لے گیا ہے ایک۔'' سعود نے قہوے کی پیالی اٹھاتے ہوئے، خوش گپیوں میں مصروف وسعت اللہ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ایسا کچھ سنا تو نہیں۔ ہو سکتا ہے اُدھر اوپر سے نیچے آیا ہو کوئی جانور۔ تم خیال رکھو۔ بولو تو کل میں آتا ہوں۔ مل کر ڈھونڈتے ہیں اُسے۔'' وہ یک دم پُرجوش ہو گیا۔ ایسے ایڈونچر اسے بہت بھاتے تھے۔

''نہیں، میں کر لوں گا۔ بس کچھ ایسا سنو تو مطلع کرنا۔'' اس نے سامنے رکھی پلیٹ سے مصری کی ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔

نکلتے نکلتے بھی وسعت اللہ علین کو گڑ سے تیار کردہ مٹھائی کا ٹکڑا پکڑانا نہیں بھولا تھا۔ سعود اس جوڑے کی محبتوں کا ہمیشہ خود کو مقروض محسوس کرتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس کی اس وقت مدد کی، جب وہ اس علاقے میں بالکل نیا

تھا۔

اس نے باہر نکلنے کی تیاری کرلی تھی۔ جب اچانک اسے وداع کرنے کے لیے اٹھنے والے وسعت اللہ کو کچھ یاد آیا۔

''مڑا! ایک بات ہم بتانا بھول گیا۔ جانور تو نہیں۔ مگر اِدھر کچھ دن پہلے کوئی آدمی پوچھ رہا تھا کہ ادھر جنگل میں کوئی رہتا ہے کیا؟ ہم نے بولا جنگل میں بہت کچھ رہتا ہے۔ بھالو، بھیڑیا، لومڑی تمہیں کیا چاہیے؟ معلوم پڑتا ہے اس کو ہمارا جواب پسند نہیں آیا۔ دوبارہ نہیں آیا۔'' وہ اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بول رہا تھا۔ اور سعود کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس کے خدشات صحیح ثابت ہورہے تھے۔ حالات ویسے پُرسکون نہیں تھے۔ پے در پے ہونے والے واقعات کو ماضی سے جوڑ کر دیکھنا ضروری ہوگیا۔

اس کے اندر سالوں سے سوئی ہوئی جنگجو روح بیدار ہونے لگی تھی۔ تمام تفکرات کو ذہن سے جھٹک کر اس نے علین کی جانب دیکھا۔ اسے وہاں چھوڑ کر شہر جانا تھا۔ آخری لمحات میں وہاں رکنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کرتے افراد کو مڑ کر دیکھا اور شہر جانے والے راستے پر قدم رکھ دیے۔

ایک سیدھی مختصر پگڈنڈی اسے سیدھا شہر کی مرکزی شاہراہ پر اتار دیتی۔

بڑی سڑک برف اور مٹی کے ملغوبے سے آلودہ ہو رہی تھی۔ سڑک پر برف کے درمیان گاڑیوں کے پہیوں سے سرنگیں سی بن گئی تھیں۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ایک بڑی سی دکان میں داخل ہوگیا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت کم تھی مگر متروک نہیں۔ سخت سردی بھی معمولاتِ زندگی کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

تمام سامان کی خریداری سے فارغ ہوکر وہ واپس نکلنے لگا تھا جب اخبار اسٹینڈ پر رکھے ایک پرانے اخبار پر اس کی نظر پڑی۔ وہ چونک اٹھا۔ چونکنے کی وجہ خبر نہیں بلکہ خبر پر لگی تصویر تھی۔ وہ شینا کی تصویر تھی۔ وہ جوں جوں خبر پڑھتا گیا، اس کا چہرہ رنگ بدلتا گیا۔

☆☆☆

سعود اور علین کے باہر نکلنے تک وہ دم سادھے چشم تصور سے دروازے میں چابی گھومتے دیکھتی رہی۔ ان کے جاتے ہی آنکھوں کے کناروں پر رکے آنسو بند توڑ کر بہہ نکلے۔

ایسی بے بسی۔ اس درجہ بے چارگی کہ ایک ایسی جگہ آپھنسا جہاں کے لوگ اس کا وجود بمشکل برداشت کر رہے ہوں۔ وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی رہی۔ ذہن تیزی سے حالات کی کڑیاں جوڑ رہا تھا، گھر سے نکل کر یہاں پہنچنے تک کے تمام واقعات کو دہرا رہا تھا۔

ذہن میں بس کچھ سرخ دھبے تھے۔ یا سفید برف پر لڑکھڑاتا اور پھر بھاگتا اپنا وجود۔ زندگی نے بہت تیزی سے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں کو آنسوؤں سے پاک کیا۔ جو ہو چکا تھا، اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا مگر اب جینے کے لیے نئے اطوار سیکھنے تھے۔

حالات جس طرح چل رہے تھے، اسے جلد ہی یہاں سے بھی رخصت ہونا تھا۔ بہتر تھا کہ ابھی سے اس کی مشق شروع کردی جاتی۔ اس نے احتیاط سے دونوں پیر زمین پر رکھے۔ وہ مکمل طور پر ناکارہ ہونے سے بچ گئے تھے مگر سردی نے انہیں کافی نقصان پہنچایا تھا۔

بروقت گرم پانی کی ٹکور اور دواؤں کے استعمال سے کچھ بہتری آئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ وزن پیروں پر منتقل کرنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی گرنے سے بچنے کے لیے دوبارہ بیٹھ جانا پڑا۔ دل کے دھڑکنے کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ اس نے پھر سے بستر کے کناروں کو تھاما اور کھڑے ہونے کے لیے پیروں پر دباؤ ڈالا اور آہستہ آہستہ ان پر وزن ڈالتے ہوئے سیدھی کھڑی ہوگئی پھر آس پاس رکھی چیزوں کا سہارا لیتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس کا رخ سامنے رکھے صفائی کے برش کی جانب تھا جس کا مضبوط ڈنڈا سہارے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

اپنی کامیابی پر اس کی سنہری آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ جب اچانک وہ روشنی ماند پڑتی نظر آئی۔ باہر کسی تحریک کا احساس ہوا تھا۔ کچھ نامعلوم کھٹ پٹ۔ وہ چند لمحے دم سادھے کھڑی رہی۔ دوبارہ کسی حرکت کے انتظار میں مگر شاید وہ ہواؤں کا شور تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور آگے بڑھ گئی۔ اس نے بمشکل جوتے پیروں میں پھنسائے تھے۔ وہ ابھی تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں تھی۔ یہ جلد بازی اس کے گلے بھی پڑسکتی تھی۔

اب ان جوتوں کے ساتھ برف پر چلنا اذیت ناک تھا۔ وہ بہت کوشش سے قدم اٹھا پارہی تھی۔ یہ علین کے اضافی جوتے تھے جو تھوڑی کھینچا تانی کے بعد اسے بھی پورے آگئے تھے۔ علین ایک صحت مند بچی تھی۔ اس کا

لباس تھوڑے سے فرق سے اس کے جسم کو ڈھانپنے میں بھی کامیاب تھا۔

اس نے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑا سا خنجر مضبوطی سے اس نے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔ خطرے کی موجودگی میں باہر نکلنا اس کی حماقت تھی مگر انتظار اعصاب شکن تھا۔

اس نے پہلے دائیں جانب بنی عمارت کا رخ کیا۔ وہ ورکشاپ تھی اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے نیا تعمیر کیا گیا ہے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا، وہ بند تھا مگر خوش قسمتی سے محض کنڈی لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا۔ ہلکی سی آواز سے وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک جہاں حیرت اس کا منتظر تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہاں اوزاروں سے لے کر مضبوط آہنی الماریاں تک موجود تھیں۔ اس نے ایک الماری کا دروازہ کھولا۔ اندر وائرلیس سیٹ رکھا تھا۔ الماری غیر مقفل تھی۔ اس سے سعود کے اپنی رہائش کے متعلق اعتماد کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ اس کی پوشیدگی کے متعلق حد سے زیادہ پر یقین تھا۔

ایک جانب لکڑی کاٹنے کی مشین اور بڑا سا جنریٹر موجود تھا۔ تمام اوزار سلیقے سے مختلف ریکس میں رکھے ہوئے تھے۔ دوسری الماری لاک تھی۔ یقیناً اس کے اندر بھی کچھ اسی نوعیت کا سامان ہوتا۔ اس کا دل پسلیوں کے پنجرے میں پھڑپھڑانے لگا تھا۔ کنویں سے بچتے بچتے وہ کھائی میں آگری تھی شاید۔

سعود کی شخصیت میں کچھ تو پُراسرار تھا جو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ ویسا سادہ نہیں تھا جیسا نظر آتا تھا۔ وہ سادہ اوزار استعمال کرتا تھا۔ لیکن ورکشاپ بتاتی تھی کہ وہ مشینوں کی مکمل جان کاری اور اس پر دسترس رکھتا ہے۔ اس پر وائرلیس کی موجودگی۔ اور وہاں رکھی نشست، جو بتاتی تھی کہ وہ سسٹم بھی استعمال میں ہے۔

وہ تیزی سے دروازہ بند کر کے کیبن میں واپس آگئی۔ ڈنڈے کو واپس رکھتے ہوئے اس کی نظر ہاتھوں پر پڑی۔ وہ کانپ رہے تھے۔ اور یقیناً اس کی وجہ سردی نہیں تھی۔ ذہن بے شمار سوچوں کی آماج گاہ بن چکا تھا۔ وہ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اپنے قدموں پر چلنے کی خوشی بے شمار خدشات کے ڈھیر میں کھو چکی تھی۔

☆☆☆

اسنو موبائل تیزی سے برف پر لکیریں بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس سے زیادہ تیزی سے اس کے ذہن میں خیالات کی آمد و رفت جاری تھی۔ چہرہ شدتِ جذبات یا شاید شدتِ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ دکان پر اخبار پڑھنے کے بعد سے اسے دھوکا دہی اور بیوقوف بنائے جانے کا احساس ڈس رہا تھا۔

کیا یہ غصہ اس لیے تھا کہ شینا نے اس سے جھوٹ بولا؟ مگر اس کے جھوٹ کا جواز واضح تھا وہ کیسے بتاتی کہ اس کا باپ ایک قانون کو مطلوب شخص تھا۔ کوئی بھی شخص یہ بات سنتے ہی اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر کا راستہ دکھاتا۔

تو غصہ کس لیے تھا؟ جبکہ اپنے پالتو جانور... کی موت کے متعلق وہ پُریقین تھا کہ شینا جیسی لڑکی کسی جانور کی اس بہیمانہ موت کا سبب نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی جان دار شے کا کارنامہ تھا۔

تو کیا اس لیے کہ وہ شادی شدہ تھی؟ یہ سوال اچانک لاشعور سے ابھر کر سامنے آیا تھا اور اسے ایسا جھٹکا دے گیا کہ اسنو موبائل ایک پل کو لہرا گئی۔ اپنی تحلیل نفسی آسان نہیں ہوتی۔ انسان اپنے ہی خیالات کے کشف سے شرمندگی کے سمندر میں ڈوب سکتا ہے۔ اس نے گاڑی کو ایک دم روک دیا۔ چہرے کی سرخی، سفیدی میں تبدیل ہو گئی۔

وہ گاڑی کو بند کر کے نیچے اترا اور اس سے ٹیک لگا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ثانیہ کی موت کے بعد اس نے زندگی سے محبت نامی شے کو دیس نکالا دے دیا تھا مگر یہ لطیف جذبات کیا پھر سے اس پر حاوی ہونے لگے تھے۔ اب جبکہ وہ اس باب کو ہی اپنی زندگی سے خارج کر چکا تھا یا پھر یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ علین بھی اسے اترتے دیکھ کر اس کے برابر آبیٹھی۔ اسے خاموش پا کر وہ بھی چپ تھی۔ شاید یہ اس کی سنجیدگی کا اثر تھا۔ ورنہ اس کا خاموش رہنا مشکل تھا۔

سامنے برف سے ڈھکے درختوں کو گھورتے، اس نے ایک ہاتھ سے علین کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اسے ثانیہ سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔

وہ ایک گرلز کالج تھا۔ اور اس کے باہر اس کی ڈیوٹی کا چھٹا دن۔ ہر روز سامنے سے گزرتی، ایک جیسی یونیفارم میں ملبوس ہم عمر و ہم قامت لڑکیوں میں تفریق کرنا اس کے لیے اتنا ہی دشوار تھا۔ جتنا ایک گلدان میں لگے ہم رنگ و ساخت پھولوں کو علیحدہ شناخت کر پانا۔ مگر اس دن کچھ خاص ہوا تھا۔ وہ سفید یونیفارم میں ملبوس لڑکیوں کے درمیان شوخ گلابی

لباس میں یوں منفرد تھی، جیسے بہت سے ہنسوں کے درمیان ایک مورنی چہلیں کر رہی ہو۔

وہ مختصر الوجود تھی، صورت اگر حسین تھی تو وہاں اس جیسی بہت تھیں مگر اپنی شخصیت پر نازاں وہ اس کے سامنے سے یوں گزری جیسے وہ کچھ پل کو نادیدہ ہو چکا ہو۔ وہ بس اس کے نقشِ پا کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ اس کی ثانیہ سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکا کون سی شے تھی جس نے اسے اس لڑکی کی جانب متوجہ کیا تھا مگر اس دن سعود نے پہلی مرتبہ ڈیوٹی سے رُوگردانی کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ چند قدم چل کر آگے گیا، محض یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس کلاس میں داخل ہوتی ہے اور اس کی خوش قسمتی سے وہ کسی کمرائے جماعت میں جانے کے بجائے کلرک روم میں داخل ہوئی تھی۔

اس کے بعد اپنی نوکری کا رعب دے کر کلرک سے کسی طالبہ کے مندرجات نکلوانا اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

یہ اور بات کہ گرگِ باراں دیدہ کلرک کی معنی خیز مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اس جانچ پڑتال کے پیچھے چھپی لطیف جذبوں کی بھنک اچھی طرح پا چکا ہے۔

وہ کسی اور کالج سے مائیگریٹ کر کے یہاں آئی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی اس طالبہ کو تعلیم مکمل کرنے کے لیے مزید دو سال کا عرصہ درکار تھا۔ ہر متوسط طبقے کی لڑکی کی طرح اس نے بھی تعلیمی حوالے سے طویل منصوبے سوچ رکھے تھے اور ہر متوسط طبقے کی لڑکی کے والدین کی طرح اس کے والدین کو بھی ان منصوبوں سے شدید اختلاف تھا۔

نتیجتاً سعود کے رشتے کو ہاں کہنا ان کے لیے اتنا ہی خوشگوار تھا جتنا ان کی لڑکی کے لیے پریشان کن۔ اس کے تمام تر احتجاج کے باوجود وہی ہوا جو منظورِ والدین تھا مگر شادی کے بعد جیسے کوئی جادوئی تبدیلی آئی تھی۔ سعود کے سنجیدہ مزاج میں بتدریج گھلتی شگفتگی کو یار دوست واضح طور پر محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اسے خوش مزاج ہنسوڑ بھابی کے مزاج کا اثر قرار دینے لگے تھے۔ تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

دوسری جانب عائلی زندگی میں ہوتی ترقی کے رنگ اس کی نوکری پر بھی پڑنے لگے تھے۔ نوکری کی نوعیت سنجیدہ تر اور اوقات سخت ترین ہونے لگے تھے۔

ثانیہ کو مطمئن کرنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ سیدھی سادی لڑکی یہی سوچتی تھی کہ اس کا شوہر کسی سرکاری سیکیورٹی ادارے سے وابستہ تھا۔ اس سے آگے کی معلومات رکھنا نہ وہ ضروری سمجھتی تھی۔ نہ اس کی کھوج کرتی تھی۔ یونہی گزر جاتا سفرِ زیست..... اگر اس کی زندگی میں وہ منحوس دن نہ آتا۔

اسے معمول سے ہٹ کر ایک ذمے داری سونپی گئی تھی۔ ایک دوست ملک کے سفارت کار کو اغوا کرنے کی ذمے داری۔ انہیں اسے اس وقت اٹھانا تھا جب وہ سفارت خانے کی عمارت سے باہر نکل رہا ہو۔ اس طور سے کہ وہاں لگے تمام سی سی ٹی وی اسے ریکارڈ کر پاتے۔ یہ سرکاری گاڑی تھی۔ ان کی ٹیم اس قسم کی گاڑیاں استعمال نہیں کرتی تھی مگر اس کام کے لیے انہیں بطور خاص یہ گاڑی منصوبہ سازوں کی جانب سے مہیا کی گئی تھی۔ ان کی وردیوں پر ادارے کا نام بڑے بڑے حروف میں چھپوایا گیا تھا۔ تاکہ دیکھنے والوں کو اس کارروائی کے پیچھے سرکاری ہاتھ کھوجنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ تمام کام بہت عمدگی سے ہوا تھا۔ یہ ایسا اقدام تھا جس کے مضمرات ملک کو بہت دور تک بھگتنے تھے۔ مگر وہ یہ کام کر رہے تھے۔ بنا کوئی سوال کیے۔

گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی جب اس نے پہلے سے طے شدہ سیف ہاؤس کے بجائے گاڑی کو ایک بالکل ہی مختلف سڑک پر گھومتے دیکھا۔ ان کے پاس وقت کا ایک ایک لمحہ گنا ہوا تھا۔ سفارت کار کے اغوا کی خبر پھیل چکی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں انہیں اپنے ہی ملک کے قانون نافذ کرنے والے دوسرے اداروں سے الجھنا پڑتا۔

یہ ایک ایسی کارروائی تھی جس کا منظرِ عام پر آنا ملک کی بدنامی کے ساتھ ساتھ اغوا شدہ سفارت کار کے ملک سے واضح دشمنی کا آغاز ثابت ہوتا۔ اطلاعات کے مطابق وہ شخص جاسوسی کے ایک بڑے نیٹ ورک سے جڑا تھا۔ اس کا غیاب کئی حساس حلقوں میں ہلچل مچانے والا تھا۔

ہاتھ پیر بندھے، آنکھوں پر پٹی لپیٹے سفارت کار کو اس کے تینوں ساتھی سیف ہاؤس کے بجائے کہیں اور لے جا رہے تھے۔ یہ بھانپنے میں سعود کو زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ انہوں نے سمت کیوں بدلی، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یقیناً وہ ایک دوسرے کی جانب سے بھی مشکوک تھے۔

"ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" اس نے ٹیم کے غیر اعلانیہ سربراہ سے پوچھا تھا۔ وہ ایک پینتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ ورزشی جسم کا مالک اور چہرے سے بدمعاش نظر آتے اس شخص کے لیے پیسہ ہر چیز سے بڑھ کر اہمیت رکھتا تھا۔

"تم بے فکر رہو، سیف ہاؤس کی لوکیشن لیک ہو چکی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچتے بندہ وہاں سے چھڑا لیا جاتا۔ خدشہ ہے کہ منصوبے کی مخبری ہو چکی ہے۔" نوشاد نے سیاہ سن گلاسز کی اوٹ سے راستے کو تکتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس کی جانب سے مشکوک ہے۔ ہے بھی یا نہیں۔ چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

سعود کو محض چند لمحے لگے تھے اس صورتِ حال کو سمجھ کر اس کا حل نکالنے میں۔ وہ اس کی جانب سے بالکل بے پروا بیٹھے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز بے چینی سے کلبلاتا اور رقم کا لالچ دیتا مغوی اور مہارت سے ویران راستوں کی جانب بڑھتا ڈرائیور تھا۔ گاڑی شہر سے باہر کی جانب گامزن تھی۔

اگر وہ ایک بار وہاں پہنچ جاتے تو اس کا رابطہ مرکز سے منقطع ہو جاتا۔ اور یہ قطع تعلق ہمیشہ کے لیے ہوتا۔ اس کی خوشگوار زندگی اس کا خاندان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا۔ اس کی چھوٹی سی بیٹی جس نے زندگی کے رنگوں کو پہچاننا ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ماتھے پر ہمیشہ کے لیے ایک غدار کی بیٹی ہونے کا داغ رہ جاتا۔

گاڑی کی پچھلی نشست پر وہ اور نعمان سفارت کار کو درمیان میں دبوچے بیٹھے تھے۔ جبکہ اگلی نشست پر نوشاد اور ساگر براجمان تھے۔ اس نے محض چند لمحوں کے لیے سوچا تھا اور پھر تیزی سے حرکت میں آیا۔ غیر محسوس انداز میں ایک ہاتھ سے مغوی کا بازو تھامتے ہوئے، اس نے دوسرا ہاتھ گاڑی کے لاک پر رکھ لیا۔ جونہی گاڑی موڑ کاٹتے وقت ایک گہرے نالے کے نزدیک سے گزری، اس نے دروازہ کھول دیا اور جسم کی پوری قوت سے گاڑی ڈرائیو کرتے ساگر کے سر پر گھونسا رسید کر دیا۔ اس سے زیادہ کرنا اس وقت ممکن ہی نہ تھا۔

ساگر کا سر کسی اسپرنگ کے مانند اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا اور اسی رفتار سے واپس آیا۔ گاڑی بُرے طریقے سے لہرائی تھی۔ جب تک بقیہ مسافر اپنے آپ کو سنبھالتے، وہ گاڑی سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ یہ سیدھا سیدھا موت کے منہ میں چھلانگ لگانے والی بات تھی۔ گاڑی اس وقت مضافات سے گزر رہی تھی۔ دونوں اطراف چھوٹی چٹانوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے گھری کھائیوں کا طویل سلسلہ تھا۔

وہ چھلانگ کے بعد لگنے والے جھٹکے کے لیے تیار تھا مگر مغوی کا بھاری وجود سنبھالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے لمبی چھلانگ لگائی اور اپنے اندازے سے کہیں زیادہ نیچے گیا تھا۔ اس کے بعد بھی رکنے کے بجائے کئی فٹ نیچے لڑھکتا چلا گیا تھا۔ سفارت کار بندھے ہاتھوں کے ساتھ خود کو سنبھالنے میں بالکل لاچار تھا۔ اس لیے بندھی گٹھڑی کی طرح اُڑتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور جھاڑیوں میں کہیں اُلجھ کر رہ گیا۔

اسے اندازہ تھا کہ کام بگڑ جانے کا اندازہ ہو جانے کے بعد وہ تینوں اس کے پیچھے آنے کے بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کریں گے۔ حالانکہ نوشاد جیسے خردماغ اور منتقم مزاج شخص سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ وہ خطرے کو بالائے طاق رکھ کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ مگر اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ جب اس نے سنبھلنے کے بعد گاڑی کو کئی گز دور سے کھائی میں اترتے دیکھا۔ یقیناً وہ اسے سنبھالنے میں ناکام رہے تھے۔ گاڑی تیزی سے کھائی میں اترتی چلی گئی اور کئی گز نیچے جا کر اس نے آگ پکڑ لی۔ سعود کے دل میں ایک پل کو افسردگی نے جگہ بنائی۔ اور معدوم ہو گئی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ اگر وہ نہ مرتے تو یہ مارا جاتا۔

اس نے اس وقت گاڑی کی خبر لینے کے بجائے کمر سے بندھے مخصوص فون کی مدد سے مرکز سے رابطہ کرنے کو ترجیح دی۔ اس نمبر کو ٹریس کرنا مشکل تھا۔

"ہم دارالحکومت سے تقریباً تین کلومیٹر دور ایک کھائی میں ہیں۔ ایک عدد جلتی گاڑی بھی وہاں موجود ہے۔ جی ہاں۔ سامان موجود ہے۔ محفوظ ہے یا نہیں وہ دیکھنا پڑے گا۔" رابطہ ہوتے ہی اس نے مختصر اطلاع دے کر فون بند کر دیا اور مغوی کی تلاش میں نکل پڑا۔ سامان سے اس کی مراد سفارت کار تھا۔

دارالحکومت سے مدد پہنچنے میں دس منٹ لگے تھے۔ ہائی وے پولیس کی گشتی گاڑیوں نے پیغام ملتے ہی جائے وقوعہ کا رخ کیا تھا۔ اسے اور ہاتھ بندھے بے ہوش سفارت کار کو زخمی حالت میں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ البتہ گاڑی سے محض ایک شخص کی جھلسی ہوئی لاش برآمد ہوئی تھی۔ بقیہ دو کی غیر موجودگی بتاتی تھی کہ وہ براہِ راست خطرے کی زد پر ہے۔ جان بچ جانے کے باوجود وہ اس کے پیچھے آتے۔ اس نے ان کا پلان ہی فیل نہیں کیا تھا انہیں مکمل طور پر برباد کر دیا تھا۔

سعود نے چھٹی کے لیے درخواست دی لاگاؤں میں اپنے والد سے رابطہ کیا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ چار سال

سے تھا اور اچھی طرح ان کی فطرت سے واقف، وہ کسی طرح یہ ہزیمت بھولنے والے نہیں تھے۔ ایسے میں اپنا آبائی گاؤں اسے فوری رہائش کے لیے مناسب محسوس ہوا تھا۔ گاؤں کی سادہ گلیاں ویسی ہی فراخ اور کشادہ تھیں جیسے وہاں کے مکینوں کے دل۔ اس کے بزرگ والد نے بازو کھول کر اسے خوش آمدید کہا تھا۔

''کیوں جوان! تنگ پڑ گیا نا آخر شہر کا دامن تمہارے لیے؟'' انہوں نے ثانیہ اور علین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اسے گاؤں میں رکھنے کے خواہش مند تھے۔

''ابا! میں رہتا شہر میں ہوں مگر دل یہاں چھوڑ جاتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''او چل اوئے! بوہتی باتیں نہ کر، بہت اچھے سے جانتا ہوں تیرا دل کدھر رہتا ہے۔'' والد کو اس کا بہانہ جچا نہیں تو فوراً اسے ہوا میں اُڑایا تھا۔

پیچھے ہجوم کی صورت میں آتے گاؤں والوں نے یہ جملہ بغور سنا اور دل کھول کر ہنسے تھے۔

وہ سب اس کے بچپن کے دوست بیلی اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے گواہ تھے۔ اس وقت بھی اس کی شرمندگی انہیں لطف دے گئی تھی۔ اسے حیرت ثانیہ پر ہوئی جو خود بھی ہاتھ منہ پر رکھے ہنسی چھپا رہی تھی۔ اسے لگا تھا وہ گاؤں والوں کی کھلی ڈلی فطرت سے اجنبیت محسوس کرے گی۔

یونہی چلتے وہ حویلی تک جا پہنچے جو آج بھی سبز کھیتوں کے دامن میں کسی سفید لباس میں ملبوس ملکہ کی سے شان سے کھڑی تھی۔

حویلی کا دامن سالوں سے کسی عورت کے وجود سے خالی تھا۔ ایک بھرے پُرے خاندان کی آوازوں نے ویران در و دیوار کو جیسے نئی زندگی دے دی تھی۔

اس کے والد سردار نعمت خان کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جاتے۔ اس کے لیے وہ اکثر و بیشتر علین اور ثانیہ کے ساتھ راز و نیاز کرتے نظر آتے۔ سعود کے ساتھ وہ سالوں پہلے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ ان کے بقول یہ لڑکا ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ لہٰذا اب ان کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کی فیملی تھی۔

وہ اس تمام ڈرامے سے واقف ہونے کے باوجود طرح دے جاتا۔ جب وہ باتیں کرتے کرتے، اس کی موجودگی میں اچانک چپ ہو جاتے۔ کبھی کبھار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر گڑبڑا کر موضوع تبدیل کرنا زیادہ قابلِ دید ہوتا تھا۔

وہ سرکاری طور پر چھٹیوں پر تھا جو کبھی نہ کبھی ختم ہو جانے والی تھیں۔ دونوں مفرور تا حال مفرور تھے۔ اس صورتِ حال میں اس کا واپس جانا مناسب فیصلہ نہیں تھا۔ وہ شش و پنج میں تھا۔ نوکری یا خاندان میں سے اسے کسی ایک شے کا انتخاب کرنا تھا۔ نوکری اس کا شوق تھی۔ اور خاندان ضرورت۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ضرورت کا انتخاب کیا تھا۔ اور استعفیٰ لکھ بھیجا تھا۔

وقت سالوں کسی حادثے کے لیے جگہ بناتا ہے۔ بس کوتاہ نظر انسانوں کو وہ اچانک محسوس ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا ادھورا پن اسی وقت طے ہو گیا تھا جب اس نے ان تینوں کی ٹگڈم میں جگہ بنائی تھی۔

وہ تینوں اپنی اپنی صلاحیت میں یکتا تیز ترین لڑاکے تھے۔ نشانے بازی میں ماہر، ہر نوع کے ہتھیاروں کے استعمال کی صلاحیت رکھنے والے۔ دو بدو لڑائی میں دو پر ایک بھاری تھا۔ ہر لحاظ سے قابلِ رشک ان تینوں میں اگر کوئی شے انہیں کمزور بناتی تھی تو وہ ان کا انتہا درجے کا لالچ تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ ان صلاحیتوں کے ساتھ وہ بے انتہا دولت کے مالک بن سکتے تھے۔ بس راستہ ذرا سا بدلنا پڑتا۔

وہ کسی معمول کی طرح ہر خیال میں ان کا ساتھ دیتا رہا۔ وہ اس کے لیے مثالی تھے۔ اور ان کے ہر خیال کو من و عن قبول کرنا اس کی کمزوری۔ انہوں نے دولت کے لیے ڈبل ایجنٹ کا کردار پسند کیا تھا۔ اور اپنے لالچ کو ان ناکام آپریشنوں کے ذریعے ڈھانپا تھا۔ جو ہر ادارے کے ریکارڈ کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کے بقول وہ مفت میں لوگوں کو مار کر گناہ کماتے تھے۔ جنہیں جانتے تک نہیں تھے۔ لہٰذا بہتر تھا کہ وہ ان کے لیے کام کریں جو انصاف کے ساتھ تھے۔ معاملات یونہی چلتے رہے۔ تا آنکہ سفارت کار کے اغوا کا معاملہ پیش نہیں آیا۔

اس دن اس نے دولت کے بجائے خاندان کو چن لیا۔ اور تب ثابت ہوا کہ دل اس کے دوستوں کے نظریات سے متاثرہ دماغ پر فوقیت لے گیا اور اب وہ تین میں سے دو شوٹر تمام حفاظتی انتظامات، تمام خطرات کو روندتے ہوئے اس تک آ پہنچے تھے۔

وہ رات اس کے حافظے میں کسی پکی سیاہی سے بنے نقش کی طرح محفوظ ہو گئی تھی۔ جس کی ایک ایک تفصیل اسے

از بر تھی۔ وہ علین کے ساتھ گھر سے باہر تھا۔ گاؤں کی چوپالیں اسے بہت پسند تھیں مگر گھر سے آنے والی کال ایسی تھی کہ اسے نکلنا ہی پڑا۔ وہ ثانیہ کی آواز تھی۔ پریشان یا ہراساں، اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ تیزی سے گھر کی جانب لپکا تھا۔

شب کا سناٹا بتا رہا تھا، کوئی انہونی اس کی منتظر ہے۔ پیڑ پودے تک دم سادھے خاموش کھڑے تھے۔ محض سیاہ رات کے سینے پر چمکتے چاند کی روشنی میں، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی جانب رواں تھا۔ دو منزلہ مکان پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ فون کرنے والی ہراساں ثانیہ بھی کہیں کمروں میں گم تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو لکڑی کے کواڑ چرچرا اٹھے۔ سناٹے میں آواز بہت واضح تھی۔ صحن میں بکھری چاندنی اور کمروں سے جھلکتی روشنیوں کے باوجود عجیب نوع کی ویرانی وہاں رقصاں تھی۔ جھینگروں کی آوازیں تک معدوم تھیں۔

اس نے دہلیز پر کھڑے ہو کر ثانیہ کو پکارا۔ لمحاتی توقف کے بعد باپ کو آواز دی۔ تب آہستہ آہستہ ایک کمرے کی دہلیز پر وہ چہرہ نمودار ہوا۔ ورزشی جسم پر کسے ہوئے پینٹ شرٹ اور روشنی میں چمکتے گنجے سر کے ساتھ۔ وہ ایک پل کو ہل کر رہ گیا۔ اس چہرے کو وہ اپنے بھیانک خواب میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آج وہ مجسم وہاں موجود تھا۔ ایک ہاتھ میں گن دبوچے۔ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے۔

''تم نے کیا سوچا تھا۔ ہمارے لیے تمام راستے بند کر کے تم یہاں آرام سے زندگی گزار لو گے؟ تمہاری وجہ سے..... محض تمہاری وجہ سے ساگر بے موت مارا گیا۔'' وہ پھنکارا۔

''میں اتنے عرصے سے جان بچاتا پھر رہا ہوں اور تم.....'' اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ ''یہاں عیش کر رہے ہو۔'' اس کے طنزیہ لہجے میں آخر میں غراہٹ سے در آئی تھی۔

سعود کو خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ خوف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے خاندان کی سلامتی کے لیے تھا۔ گھر میں موجود دونوں افراد ابھی تک سامنے نہیں آئے تھے۔ بچی کو ساتھ لانے کے بجائے اس نے اپنے دوست کے گھر بھیج دیا تھا اور اب اسے وہ احتیاط صائب محسوس ہو رہی تھی۔

''میرے گھر والے کہاں ہیں؟'' اس نے نوشاد کے طعنوں کے جواب میں کہا تو بس اتنا۔

اس کے پاس دینے کو کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے آخری وقت پر راستہ بدلا تھا اور ان کے نزدیک یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔

''اوہ! مطلب تمہارے پاس دینے کو اب کوئی صفائی نہیں۔ جن کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔ کھایا پیا۔ آخر میں ان کے ساتھ دغا کیا۔ اور جواب کیا؟ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ واہ رے تیرا حرامی پن۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

سعود نے بے چینی سے نگاہ اِدھر اُدھر گھمائی۔

یہ تمام مکالمہ برآمدے میں ہو رہا تھا۔ آخر انہوں نے دو جیتے جاگتے لوگوں کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ دونوں کمروں میں سناٹا طاری تھا۔ شاید وہ کمرے کے اندر ہوں۔ اس نے سوچا۔

''دغا بازی کی بات کرتے ہو؟ تو پہلے اپنے گریبان میں جھانک لو۔ دغا بازی تم اس ملک کے ساتھ کرنے لگے تھے۔ جس نے تمہیں شناخت اور عزت دی۔ کس کے کہنے پر؟ اس خبیث مشرا کے کہنے پر۔ اگر ہم اس دن کامیاب ہو بھی جاتے۔ تو کیا گارنٹی تھی کہ وہ لوگ جو اپنے حلف اٹھائے لوگوں کو نہیں اپناتے۔ دشمن ملک کے باغی ایجنٹوں کی سلامتی کا خیال رکھتے؟ دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکتے وہ ہمیں۔''

''سیف ہاؤس کی مخبری میں نے ہی کی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ہمارے لوگ سفارت کار کو چھڑا لاتے اور مشرا گرفتار ہو جاتا۔ ہمارے سینوں پر کچھ ستارے اور بڑھ جاتے۔ مگر تمہارے عین وقت پر راستہ بدل لینے کی وجہ سے مجھے وہ فیصلہ کرنا پڑا۔'' اس نے آخر میں بے بسی سے کندھے اچکائے۔

''اور تمہارے اس فیصلے کی وجہ سے ساگر مارا گیا۔''

نوشاد جو بغور اس کی وضاحت سن رہا تھا۔ آخر میں بولا۔ تو سعود کو اپنے الفاظ کے بے وقعت ہونے کا احساس ہوا۔ وہ اس نفرت سے بھرے شخص کو کسی بھی طرح قائل نہیں کر سکتا تھا کہ ملک سے غداری اور بعد ازاں دوستوں سے غداری کے پیچھے دراصل ان چاروں کی حفاظت کا خیال ہی کارفرما تھا۔

ایک دشمن ملک کے لیے۔ دوست ملک کے سفارت کار کا اغوا۔ اپنی سرکاری حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ایک ایسی غلطی تھی جس کی کامیابی کے نتائج ان کے خاندان بھگتتے۔ یہ تو انہیں بعد میں علم ہوا کہ وہ سفارت کار ان کے

ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اسی لیے دشمن کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

''دیکھو! جو کچھ ہوا، اسے واپس نہیں لایا جاسکتا۔ میں ساگر کی موت کو بدل نہیں سکتا۔ مگر تمہارا مالی نقصان پورا کرنے کے لیے مجھے اپنے تمام اثاثے بیچنے پڑے تو وہ بھی کروں گا۔ مجھے ایک موقع دو۔''

حالات اس وقت مکمل طور پر ان لوگوں کے قابو میں تھے۔ نومری کے جذباتی پن میں اس نے غلط افراد کو آئیڈیل بنالیا تھا۔ اور وہ لمحاتی لغزش اس پر بھاری پڑنے والی تھی۔

اس وقت اپنے باپ اور بیوی کی جان بچانے کے لیے وہ ان کے قدموں میں گر جانے کو بھی تیار تھا مگر دشمن اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا۔ ان کے انتقام کی آگ پر اس کا رونا گڑگڑانا تسکین کی پھوار برسا رہا تھا۔ اور وہ اس صورتِ حال کو مستقل کرنے کے زعم میں تھے۔

''موقع تو تم نے ہمیں نہیں دیا۔ تو تمہیں کیسے ملے گا۔ اندر چلو۔'' اس نے گن لہرائی۔

پرانی لکڑی کے سبز پٹ پوری طرح کھلے تھے۔ اور اس کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری تھے۔ جب ایک زوردار دھکے نے اسے کئی قدم آگے دھکیل دیا۔ اس کی نگاہ بے ساختہ اوپر اٹھی۔ تو اندازہ ہوا کہ بدتر کے لیے ذہن کو تیار کرنا اور اس کا سامنا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ اس کا ذہن محض دوسروں کے لیے لڑنے کی تربیت لیے ہوئے تھا۔ اپنوں کو تکلیف میں دیکھ کر وہ بالکل کسی عام انسان کی طرح بدحواس ہونے لگا تھا۔

اس کی پہلی نگاہ ثانیہ پر پڑی تھی اور وہ نگاہ ہی قیامت کی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہاتھ اور پیر مضبوط ٹیپ سے بندھے تھے۔ اور گردن پر خنجر کے دباؤ سے ایک سرخ لکیر نمودار ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اندرونی خوف کو پوری طرح آشکار کر رہی تھیں۔ اگر منہ پر ٹیپ نہ ہوتا تو وہ ہذیانی انداز میں چیخنا شروع کر دیتی۔

اس کی گردن پر دباؤ ڈالتا خنجر پشت پر کھڑے نعمان کے ہاتھ میں تھا۔ وہی نعمان جسے وہ جلتی گاڑی میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بے ساختہ تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ وہ پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر جھلس چکا تھا۔

اس نے باپ کی تلاش میں نظر گھمائی اور اسے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ وہ ایک کونے میں زمین پر دراز تھے۔ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان کا لہولہو جسم زندگی کی حرارت رکھتا ہے یا نہیں۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر منظر اوجھل ہونے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ آنکھیں کھولنے پر سب جوں کا توں موجود تھا۔ ایک بوڑھے شخص پر یہ تشدد کسی خاص مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی سفاک فطرت کی تسکین اور سعود کو تکلیف دینے کے لیے تھا۔

''تم نے ان پر تشدد کیوں کیا ہے؟'' اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''تاکہ تمہیں بھی وہی تکلیف محسوس ہو۔ تم بھی اسی طرح تڑپو۔ جب ہم بند گاڑی میں جلتے وقت تڑپے تھے۔''

اس نے سوال نوشاد سے کیا تھا مگر جواب نعمان کے کریہہ لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

''بلکہ تکلیف تو تمہیں اب ہوگی جب تمہاری چڑیا ہمارے ہاتھوں میں تڑپے گی۔ چیخے گی۔ اور جب جب تم اس میں مجھے دیکھو گے۔'' نعمان کے مسخ شدہ چہرے پر جیسے اس کی فطرت جھلک دکھانے لگی تھی۔

اس نے خنجر سے ثانیہ کے چہرے پر ایک لکیر کھینچی تو وہ بے اختیار چلائی۔ اب اس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل تھا۔ اس نے نعمان کی جانب جست لگائی۔ وہ جانتا تھا، نہتے ہاتھوں ان دونوں سے نمٹنا مشکل تھا مگر اس کی خاموشی مزید انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ یہ کوشش بجھتے دیے کی آخری لو جیسی تھی۔

یہ اندھا دھند کوشش تھی جس کا نتیجہ بھی ویسا ہی نکلا۔ نعمان تک رسائی سے پہلے ہی سر پر پڑنے والی گہری چوٹ نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا۔ تو جھلسنے کے گہرے نشانات سامنے آگئے۔ اسی طرح کے بہت سے نشانات اس کے جسم کے ہر پہلو کو گھیرے ہوئے تھے۔

اس رات اسے جلتے ہوئے مکان سے نیم بے ہوشی کی حالت میں، اس کے دوستوں نے باہر نکالا تھا۔ البتہ وہ بندھی ہوئی اس کی بیوی اور باپ کو نہیں بچا سکے تھے۔ اس کی احمقانہ کوشش بس اس کی بیوی کو مرنے سے پہلے بے عزت ہونے کی اذیت سے بچا گئی تھی۔

اس رات اس نے اپنی تمام دنیا کو بے خبری کے عالم میں کھو دیا تھا۔ اسپتال کے تمام عرصے میں اس کے اندر کی کمزوریوں پر صدموں کی سخت تہ جمتی رہی تھی۔ نتیجتاً جب وہ

گھر آیا تو کسی مشین کی طرح جذبات سے عاری اور بے حس تھا۔

ذہن سے گزرتے خیالات کے سیلِ رواں کو درختوں سے الجھتے کسی جانور کی آہٹ نے روکا تو وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو بہت دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ جھاڑے۔

علین نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھلملاتی نمی کو دیکھا اور نا سمجھی سے سر ہلا دیا۔ اس کا باپ تو لوگوں کو رُلانے کا ماہر تھا، رو نہیں سکتا۔ شاید آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہوگا۔ اس نے سوچا اور گاڑی پر جا بیٹھی۔

☆☆☆

''تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ مزاحمت کرے گا؟'' اس نے بندوق کی صفائی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''وہاں ایک بچی بھی ہے۔ اگر اسے قابو کر لیا جائے تو مزاحمت کا امکان کم ہے۔ میں نے اسے گھر سے باہر نکالنے کے لیے اس کے جانور بھی ہلاک کیے مگر بندہ ڈھیٹ ہے۔''

بندوق بردار کے سامنے بیٹھے شخص نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔ وہ اس سردی میں مسلسل مشقت سے جھلایا ہوا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو سعود کے مکان کی نگرانی کرتا رہا تھا۔

''تم نے فضول کوشش کی۔ وہ شکاری ہے۔ اتنی آسانی سے نہیں ڈرے گا۔ ویسے بھی اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سرحد پر حالات بہت سخت ہو چکے ہیں۔'' صورت سے سنجیدہ نظر آتے اس شخص کا انداز حکمیہ تھا۔

درختوں کے درمیان لگے اس چھوٹے سے خیمے میں دو عدد زمینی بستروں اور چند برتنوں کے سوا اگر کوئی شے قابلِ ذکر تھی تو ایک لکڑی کے صندوق میں رکھے ہتھیار تھے۔ اس کے علاوہ خیمہ خالی تھا۔

''ہم یہاں کام ہو جانے کے بعد، ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے اس لیے یقینی بناؤ کہ وہاں ہم میں سے کوئی زخمی نہ ہو۔'' ہتھیار بند نے بندوق کی نال کو رگڑتے ہوئے دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

تو اس نے بے اختیار آنکھیں چُرا لیں۔ وہ اس سنجیدگی کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی زخمی ہو جاتا تو دوسرا اسے یہیں چھوڑ جاتا۔

''ہم آج ہی وہاں جائیں گے۔ کام کے سلسلے میں مزید دیر ہمیں سرحد پار بھی مشکوک بنا دے گی۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا تو بندوق کی صفائی کرتے شخص نے بغور اسے دیکھا۔ مگر کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

☆☆☆

سورج کی شعاعوں کے زمین تک پہنچنے میں بادل حائل تھے۔ اس کے باوجود بتدریج اترتی شام کا اندازہ ایک عجیب نوع کے سناٹے سے ہو رہا تھا۔ پرندوں کی ہلکی پھلکی چہچہاہٹ بھی معدوم ہو چکی تھی۔

وہ اپنی دانست میں تو کافی جلدی نکلا تھا مگر اس کے باوجود بڑھتی تشنگی اسے جلدی گھر پہنچنے پر اکسا رہی تھی۔ ذہن میں اخبار میں پڑھی خبر کی سرخیاں شور مچا رہی تھیں۔ ذہن کے .... کسی گوشے میں اپنی سوچ کی نامعقولیت کا احساس بھی کچوکے دے رہا تھا مگر فی الحال وہ محض جذبات کے تابع تھا۔ اپنی جذباتی فطرت کو دبا کر رکھنے کا نتیجہ اس کے زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے آنے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور اب وہ صحیح، غلط سوچے بنا محض اپنے خیالات کی تشفی چاہتا تھا۔ اس نے دوبارہ اخبار میں پڑھی خبر کو ذہن میں دہرایا۔

پسند کی شادی نہ ہونے پر نوجوان لڑکی ماں باپ اور بھائی کو قتل کر کے آشنا کے ساتھ فرار۔

تفصیلات کے مطابق، دوشیزہ جو یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ والد کی جانب سے کیے گئے نکاح کو قبول کرنے سے انکاری تھی۔ والدین کے مسلسل دباؤ پر، وقوعے والے روز گھر میں موجود تینوں افراد کو آشنا کی مدد سے ہلاک کر کے گھر سے فرار ہوگئی۔

پولیس کے مطابق گھر سے قیمتی اشیا بھی غائب پائی گئیں۔

اسے یاد آیا کس طرح شینا نے خود کو اردو سے نابلد بتایا تھا۔ اور اس کا آشنا۔

اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ جھوٹ در جھوٹ۔ اس کا مددگار اس کے ساتھ کیوں نہیں تھا۔ یہ سوال محض ایک پل کو ذہن میں ابھرا تھا مگر غصے میں بھرا ذہن کسی استدلال کے قابل نہیں تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔

اسنو موبائل کو اس کی مخصوص جگہ روک کر اس نے سامان سمیٹا اور کیبن کا رخ کیا۔ ہر چیز بظاہر معمول کے مطابق تھی۔ سوائے ایک شے کے۔

وہ قدموں کی ایک لکیر تھی جو باڑے سے ہوتی ہوئی جنگل میں گم ہو رہی تھی۔ اس نے نزدیک جا کر بغور نشانات کا جائزہ لیا۔ وہ ویسے ہی قدموں کے نشان تھے جو پہلے بھی اس کے باڑے میں تباہی مچا چکے تھے۔ ان کی موجودگی کا

مطلب پھر اس کے کسی جانور کی ہلاکت تھا۔

وہ تیزی سے کیبن کی جانب بڑھا مگر نگاہیں چہار اطراف نگراں تھیں۔ حملہ آور کہیں آس پاس موجود ہوسکتا تھا مگر اسے ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ نرم برف پر زنانہ جوتے کے نشانات سیدھے شیڈ تک چلے گئے تھے۔

اس کے ذہن میں سرخ غبار سا چھانے لگا۔ ایک مریضہ جو بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کے گھر سے باہر جاتے ہی اطراف میں مٹرگشت کرنے لگی تھی۔ مطلب اس کی بیماری بھی ڈراما تھی۔ اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر زوردار انداز میں دروازہ بجایا۔

فوری ردِعمل ظاہر ہوا تھا چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ جیسے کوئی دروازے کے نزدیک ہی موجود ہو۔ اس نے اندر داخل ہوکر سامان ایک جانب رکھا اور خون آشام نگاہوں سے سامنے کھڑی شینا کو گھورنے لگا۔ علین اپنے باپ کی ذہنی اٹھان سے بے خبر سامان اپنی جگہ پر رکھنے میں مصروف تھی۔

مگر شینا کو اس کے چہرے سے شاید کچھ اندازہ ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سعود کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے نزدیک آیا اور مضبوطی سے اس کا بازو دبوچ لیا۔

''کون ہو تم؟'' وہ غرایا۔ ''کس مقصد کے لیے میرے گھر میں گھسی ہو؟'' اس نے سختی سے دبوچے ہوئے بازو کو جھنجوڑا۔ وہ ہل کر رہ گئی۔

''کون ہیں وہ لوگ ہیں جو میرے مویشی ہلاک کر رہے ہیں؟ یا وہ تم ہی ہو؟'' وہ پے در پے سوال پوچھتا چلا گیا۔

''اور جھوٹ مت بولنا۔ ایک بھی جھوٹ۔'' آخر میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انگلی اٹھا کر وارننگ بھی دے ڈالی۔ اس کے کئی سوالوں کی بے مقصدیت خود اس پر واضح تھی۔ مگر وہ محض اسے ذہنی طور پر پریشان کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح جس طرح خود پریشان ہوا تھا۔

اس کے سانسوں سے نکلتی آگ شینا کا چہرہ جھلسانے لگی۔ اس نے اتنے عرصے میں پہلی بار اس کے اس طرح کے سخت لہجے کا سامنا کیا تھا۔ اور الزامات۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ قدم بے جان ہونے لگے تو گرنے سے بچنے کے لیے پیچھے رکھی کرسی کا سہارا لیا۔

سعود کا لہجہ اور سوال بتا رہے تھے کہ وہ اس کے متعلق کچھ جان کر آیا ہے۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں کو آنسوؤں سے پاک کیا۔ مگر منظر دھندلا ہی رہا۔ اس کی نگاہ علین پر پڑی جو آنکھیں پھیلائے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں ...'' اس نے حلق تر کیا۔ ''میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور ایک بدنصیب خاندان کی لڑکی۔ جس کا باپ ایک ایسے پیشے سے منسلک تھا کہ میں ہر بیٹی کی طرح فخر سے اس کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ نہیں لگا سکتی۔ بس۔ اس کے علاوہ میرے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جو آپ نہیں جانتے۔ باقی آپ کا نقصان۔ میں نہیں جانتی۔ کس نے کیا۔ میں۔ میں بہرحال محسن کش نہیں ہوں۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

اس نے بمشکل آنسو روکتے ہوئے بات پوری کی تھی۔ عجیب بات تھی۔ سعود کا اتنا سخت سلوک بھی اس کے لیے دل میں نفرت کے بجائے یاس کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ کچھ کھونے کا احساس تھا۔ جسے فی الحال وہ سمجھنے سے قاصر تھی یا سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔

''آپ نے میری اتنی مدد کی۔ اس کے لیے بہت شکریہ۔ مگر اب میں یہاں نہیں رک سکتی۔ شاید آپ چاہتے بھی نہیں کہ رکوں۔'' اس نے سعود کی گرفت سے بازو چھڑوایا۔ جس کی آنکھیں مسلسل اس کے چہرے پر رقصاں تھیں۔ شاید اس کے بیان میں سچ اور جھوٹ کے درمیان کی لکیر وہ اس کے تاثرات سے بنا رہا تھا۔

''ہاں تم یہاں کیوں رکو گی۔ باہر جس کا شوہر اور.....'' اس نے کچھ کہتے کہتے علین کی جانب دیکھا اور زبان دانتوں تلے دبالی۔

وہ اپنی بچی کے سامنے اس کے مبینہ محبوب کے متعلق باز پرس بھی نہیں کر سکتا تھا مگر دل کی جلن کی کوئی راہ بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔

شینا کی آخری بات پر علین نے گھبرا کر سعود کو دیکھا کہ شاید وہ شینا کو جانے سے روک لے مگر وہاں ایک جمود سا طاری تھا۔

''کیا بکواس ہے۔ کون سا شوہر؟'' ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ شینا نے سوالیہ انداز میں سعود کا چہرہ دیکھا۔ پھر وہاں بے یقینی لکھی دیکھ کر اس نے سر جھٹکا اور چند قدم آگے بڑھ کر علین کے سامنے جا ٹھہری۔

''تم نے میرا اتنا خیال رکھا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ تمہیں بھی نہیں بھولوں گی۔ بہت شکریہ۔'' اس نے پیار سے بچی کا گال چھوا اور ایک نظر سعود کو دیکھا۔ بالواسطہ یہ شکریہ دونوں کے لیے تھا۔

جواباً علین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے ٹھہرنے کی استدعا کی تھی۔ جو وہ کمالِ خوبی سے نظر انداز کر گئی۔ بنا پلٹ کر دیکھے اس نے مضبوط انداز میں دروازہ کھولا اور آگے بڑھ گئی۔ محض ایک پل کو کیبن میں سرد ہوا کا جھونکا داخل ہوا اور دوبارہ لپکتے شعلوں کی آواز باقی رہ گئی۔ ان کے آنے سے پہلے وہ انگیٹھی میں آگ سلگائے وہاں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جو اب بھی یونہی کھلی رکھی تھی۔

سعود نے تھکے تھکے انداز میں کتاب کو الٹ کر دیکھا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔ دل کے تابع چلتے چلتے دماغ کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ دل اس بے وفائی پر نڈھال تھا۔ علین خاموشی سے جوتے اتارے بنا بستر پر جا لیٹی تھی اور اب آنکھیں موندے پڑی تھی۔ وہ واضح طور پر باپ سے ناراض تھی۔

''بابا! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ باہر بہت سردی ہے اور اندھیرا بھی۔ وہ کہاں جائیں گی؟'' کچھ دیر بعد اس کی زلہ زدہ آواز ابھری۔

وہ یقیناً رو رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر بچی کو دیکھا۔

''میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا، وہ خود گئی ہے۔ محض میرے سوالوں سے بچنے کے لیے اور میں نے جو کچھ کیا، تمہاری بھلائی کے لیے۔ تم نہیں جانتیں۔ جو میں جانتا ہوں۔'' اس نے کچھ توقف کیا۔

''بہتر ہوگا اسے بھول جاؤ۔'' اس نے ہاتھ میں تھامی کتاب کو دیکھا جہاں کچھ نادیدہ لمس روشن تھے۔

''اور آپ؟'' اس نے جواباً پوچھا۔ اس نے حیرت سے علین کو دیکھا۔ اس کا چہرہ کمبل میں چھپا ہوا تھا۔

وہ بچی تھی، اسے کیا معلوم تھا اپنے باپ کی دلی کیفیت کے متعلق۔ یا اس کا سوال محض ایک معصومانہ استفسار تھا۔

''میں بھی بھول جاؤں گا۔'' اس نے دھیرے سے کہہ کر شاید خود کو یقین دلایا تھا۔

''نہیں، میں انہیں واپس لے کر آؤں گی۔ باہر بہت سردی ہے۔'' وہ اچانک چھلانگ لگا کر بستر سے اتری۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتا، وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔

جب اچانک ایک زوردار چیخ نے کیبن کا سکون تار تار کر دیا تھا۔ وہ واضح طور پر شینا کی آواز تھی۔

تھکے ہوئے اعصاب پر باریک چلاتی ہوئی آواز نے وہی کام کیا جو کسی ساز کے تاروں پر ایک انگلی کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ مضطرب ہو کر ایک ہی جست میں دیوار پر ٹنگی رائفل تک پہنچا تھا۔ اسی وقت ایک اور چیخ ابھری تھی۔

کوئی مردانہ چیخ جس میں درد کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

سعود کے رگ و پے میں بے چینی سی بھر گئی۔ گن کندھے پر ڈال کر اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔

اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔ وہ فوراً دروازہ بند کر کے جھک گیا۔ مضبوط لکڑی نزدیک سے چلائی گئی گولی کو

جھیل گئی تھی۔ وہ باہر نہیں جاسکتا تھا۔ باہر رابطے کا واحد ذریعہ کھڑکی رہ گئی تھی۔

اس نے جلتے ہوئے لیمپ کی لو کو دھیما کر دیا۔ اب باہر سے اندر دیکھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ جتنا باہر دیکھنا۔

کھڑکی کے شیشے دھندلائے ہوئے تھے۔ اس نے ہتھیلی شیشے پر رگڑی۔ باہر جمی برف نے منظر اور نگاہوں کے بیچ پردہ سا تان رکھا تھا۔

مگر سفید برف پر دو انسانی وجود اتنے متحرک تھے کہ تھوڑی سی کوشش سے اس نے بھانپ لیا کہ وہ دو ہیں۔ اور ایک، دوسرے کو سہارا دے کر زمین سے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اور اچانک ایک تیسرا اچھلتا ہوا مختصر وجود اس کی نظر میں آیا۔ اندھیرے میں اندازہ لگانا مشکل تھا مگر یقیناً شینا ان کے ساتھ موجود تھی۔

آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ اس نے تنفر سے سوچا۔

مگر ان افراد کے جثے اور قامت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں برسوں سے پلتے اندیشے توانا ہونے لگے تھے۔

اس نے رائفل تھام لی۔ وہ تین تھے۔ گولی کسی ایک کو تو ضرور لگتی۔ اس نے نشانہ لیتے ہوئے سفاکی سے سوچا تھا۔

مگر اسی وقت باہر موجود افراد کے ہاتھوں میں شعلہ سا روشن ہوا۔ اور اُن کے چہرے واضح ہو گئے۔ کھڑے ہوئے شخص نے لائٹر جلایا تھا۔

تب ہی اس نے وہ دیکھا جس نے اسے عمر بھر کے پچھتاوے سے بچالیا۔

مردانہ آواز کا منبع زمین پر پڑا کراہتا ہوا وہ شخص تھا۔ جس کا پیر اس کے لگائے گئے شکنجے کا شکار ہوا تھا۔ وہ تیس تا چالیس سالہ ایک صحت مند شخص تھا۔ بھاری بھر کم بندوق اس کے ہاتھ میں کسی کھلونے کے مانند محسوس ہو رہی تھی۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم پر ایک جیکٹ اور گرم شال اور سر پر محض قراقلی ٹوپی تھی۔

اس نے مکان کے اردگرد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے وہ شکنجے لگا دیے تھے جن کی موجودگی کا علم صرف ان تینوں کو تھا۔ اور شکنجوں نے اپنا کام بخوبی کیا تھا۔ مگر جزوی طور پر۔

دوسرا فرد صحیح سلامت تھا۔ اور ایک ہاتھ سے لڑکی کو بالوں سے جکڑے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لائٹر جلایا تھا۔ جسے فوراً ہی بجھا دیا گیا مگر اتنی روشنی سعود کے لیے کافی تھی۔ اب وہ اندھی چاند ماری کے بجائے صحیح چیز کو ٹارگٹ کر سکتا تھا۔

اس نے طویل قامت سائے کا نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز اور زخمی کی دبی دبی چیخ ایک ساتھ بلند ہوئی تھی۔

سعود نے ٹوٹے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کی بے چین نگاہوں کو علین کی تلاش تھی مگر وہ کہیں غائب تھی۔ اسے کیبن میں ایک ہی دروازہ رکھنے پر پہلی مرتبہ افسوس ہوا تھا۔ وہ وہاں پھنس چکا تھا۔ مگر خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ ان لوگوں کی سخت جانی حیرت انگیز تھی۔ وہ زخمی ہو کر بھی اس پر حملہ کر رہے تھے۔ بلکہ اب شاید زیادہ بھڑک چکے تھے۔

اس نے رائفل کندھے پر ڈالی اور دروازہ کھولا۔ تب اسے ایک حیرت انگیز منظر نظر آیا۔ وہ لڑکی جو اَب تک ان سے بال چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اچانک کسی عفریت کی طرح ان سے لپٹ گئی تھی۔ نتیجتاً ان کی توجہ دروازے سے باہر آتے سعود سے مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔ اور تب سعود کو اندازہ ہوا وہ شینا نہیں بلکہ علین تھی۔ شینا تو کسی وقت اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر غائب ہو چکی تھی۔ علین نے یقیناً سعود کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ یا شاید یہ محض غصے میں دیا گیا جنونی ردِعمل تھا۔ جو بھی تھا، وہ اس وقت اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی تھی۔

اس نے دوڑ کر چند قدم طے کیے اور ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اب ان زخمیوں سے بات چیت ضروری ہو گئی تھی۔ اگر انہیں اس سرد جہنم سے زندہ نکلنا تھا تو ہتھیار پھینکنے پر راضی ہونا تھا۔

☆☆☆

"زندگی کو میں نے ہمیشہ کسی ایسے دوست کے مانند پایا ہے۔ جو ہمہ وقت ناراض رہتا ہو۔ جسے ساتھ چلنے پر راضی کرنے کے لیے بار بار خوشامد کرنی پڑتی ہو۔ اور جب اس کے سلوک سے تنگ آ کر آپ اسے چھوڑنا چاہیں۔ تب وہ پچھلے سلوک کی تلافی کے لیے آپ کے گلے سے لگ جاتا ہو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پیالے سے نکلتی گرم بھاپ پر نگاہ جما کر کہا۔

جسم کو گرم کپڑوں کے علاوہ ایک بھاری سے کمبل میں لپیٹے گرم نیم روشن کمرے میں نم آنکھوں کے ساتھ انہیں اپنی کہانی سناتی وہ خود کسی دیومالائی داستان کا کوئی کردار محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ساحرہ جو وقت کے گولے میں قید ہو گئی ہو۔

دونوں زخمی ایک جانب پڑے، زخموں پر عارضی پٹی بندھوائے اپنی قسمت کے منتظر تھے۔ سعود نے ان کی مدد کرنے سے پہلے انہیں مکمل طور پر بے دست و پا کر دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر بچی نے خوفزدہ ہوئے بنا اس کی مدد کی تھی۔

انہیں کیبن میں باندھ کر جب وہ ورکشاپ کی جانب آیا۔ تو اندھیرے میں ایک کونے میں ٹھٹھرتی شینا اچانک کسی گٹھڑی کی طرح اس پر آپڑی تھی۔ وہ اس اچانک افتاد سے بوکھلا گیا تھا۔

"اگر..... اگر..... آپ نہیں آتے تو یہ لوگ۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ادھوری بات کی مگر اس کا مفہوم واضح تھا۔

وہ پوری جان سے لرز رہی تھی۔ کچھ خوف..... کچھ یخ بستگی۔ وہ بھول چکی تھی کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ اسے اپنے گھر سے نکال چکا ہے اور اسے بھی یاد تھا تو بس یہی کہ وہ اس سے مدد مانگ رہی ہے۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پہلو میں لٹکتے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کے گرد کس لیے۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"میں ایک بار سب برباد کر چکا ہوں۔ اب کی بار نہیں۔" اس نے اپنے ہونٹ شینا کے گیلے بالوں پر رکھتے ہوئے کہا تھا مگر وہ سننے سے پہلے ہی اس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ سعود نے گرنے سے پہلے ہی اسے تھام لیا۔

وہ دل میں پناہ گزین تھی اور دل کا نازک آبگینہ بار بار ٹھیس لگنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ بھاپ اڑاتے قہوے کے پیالے کو ہاتھ میں لیے اس کی بھاپ کے ساتھ لہراتے کچھ پیکروں پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ وہ بھاپ جیسے اس کے ماضی کے پرت کھول رہی تھی۔

داجی، مورے، لالہ ایک ایک کر کے سب کا تصور ذہن کی کھڑکیوں پر دستک دینے لگا تو اس نے آنکھیں موند لیں۔ تاکہ درد کہیں پلکوں سے نہ چھلکنے لگے۔

"میں پشاور یونیورسٹی سے چھٹیوں پر گھر پہنچی تھی۔ جب وہ منحوس دن ہمارے گھر میں اترا تھا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"میری رہائش مستقلاً ہاسٹل میں ہوتی تھی اور میں مستقل اس بات پر معترض رہتی تھی لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ داجی کے مجھے ہاسٹل میں رکھنے کے پیچھے کیا مصلحت کارفرما تھی۔" اس نے ایک نظر سعود کی جانب دیکھا۔ جو زمین پر لاچار پڑے زخمیوں پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ وہ زخمی اور بندھے ہوئے تھے۔ مگر بے ضرر نہیں تھے۔ اس کے انداز سے کسی کا انتظار مترشح تھا۔ اس نے انہیں باندھنے کے بعد گھسیٹ کر کیبن میں ڈالا تھا۔ وہ یقیناً مزاحمت کرتے اگر سعود انہیں رات بھر باہر سردی میں چھوڑنے کی دھمکی نہ دیتا۔

"آپ میری بات سن بھی رہے ہیں؟" اس نے چیخ کر سعود کو مخاطب کیا۔

"میں سن رہا ہوں۔ تم بولتی رہو۔" اس نے دھیرے سے گردن گھما کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔

اس نے گھبرا کر نظر جھکالی۔

"اس شخص کی آنکھوں میں دیکھنا کتنا مشکل ہے۔" اس نے سوچا۔ "غصے میں نہ ہو تب بھی لگتا ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"اس دن میں ماں کے ساتھ باورچی خانے میں پڑے پر بیٹھی مستقل ان کا دماغ خراب کر رہی تھی۔"

"آپ بھی دماغ خراب کرتی ہیں۔" علین نے حیرت سے پوچھا تھا مگر سعود کے گھورنے سے خائف ہو کر چپ ہو گئی۔ شینا نے ہلکے سے مسکرا کر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

"مورے! داجی سے بولو نا، ایک گاڑی میرے لیے رکھیں۔ روز نہ سہی۔ ہفتے میں ایک چکر تو یہاں کا لگ ہی سکتا ہے نا۔" مورے نے توے پر روٹی رکھی اور اپنا رخ میری جانب موڑ لیا۔

"اور یہ ہفتے ہفتے کی ذمے داری نبھائے گا کون؟" ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ مگر مجھ پر یہ پیار بھرے طنز کب اثر کرتے تھے۔

"لالہ ہے نا۔ یا ڈرائیور۔" میں نے ڈرائیور کہہ کر فوراً زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ یہ بات کہنے والی جو نہیں تھی۔

وہ شاید اس لمحے کو سوچ کر مسکرائی تھی۔ تو اداس چہرے پر روشنی پھیل گئی۔

"دیکھو لڑکی! ڈرائیور کو تو بھول ہی جاؤ۔ تمہارے داجی کسی پر بھروسا نہیں کرتے اور تمہارے لالہ اور داجی کے پاس کرنے کو اور بہت کام ہیں۔ سکون سے پڑھائی مکمل کرو اور شادی کر کے اپنے گھر جاؤ۔ یہاں رکھا کیا ہے جس کو یاد کرتی ہو۔" مورے نے حتمی لہجے میں بات مکمل کی تھی مگر آخر میں لہجہ کچھ افسردہ سا ہو گیا تھا۔

میں نے ماں کی افسردگی محسوس کی تو اٹھ کر اس کو لپٹا لیا۔

"مورے! لالہ کی شادی کر دو، اس کی بیوی آئے گی تو تمہاری تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔" میری بات سن کر میری بوڑھی ماں نے جس طرح زخمی نگاہوں سے میری جانب دیکھا تھا۔ وہ شرمندہ کر دینے والی تھیں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میرا بھائی

شادی کے لیے راضی ہی نہیں تھا۔ اب تو مورے اس سے کچھ کہنا ہی چھوڑ چکی تھی۔ پینتیس سال کی عمر میں بھی اس کے شوق نوجوانوں والے تھے۔ بازارِ حسن کی اندھیری گلیوں کے راستے اسے اچھی طرح ازبر تھے۔

اس نے روانی میں بولتے ہوئے علین کی موجودگی بالکل فراموش کر دی تھی۔ جو منہ پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے کہے بہت سے الفاظ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

''مورے! داجی لالہ کو روکتے کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔ اس سوال پر مورے کا طنزیہ انداز میں مسکرانا مجھے آج بھی یاد ہے۔

''بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ باپ پہ پوت، نسل پہ گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔'' اس ایک جملے میں میرے تمام سوالوں کے جواب تھے اور میں چپ ہو گئی تھی۔

زخمی بظاہر خاموش پڑے تھے۔ انہیں گھورتے سعود نے اس کی آخری بات پر ایک پل کو گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا اور پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔ وہ بظاہر لاتعلق تھا۔ مگر کہنا مشکل تھا وہ تمام حسیات کا ایک ساتھ استعمال کرتا تھا۔

''داجی کو بچپن سے ہی پُراسرار طور پر مصروفِ عمل دیکھا تھا۔ میری سہیلیوں کے والد یا تو شہر میں ملازمت کرتے تھے یا وہیں کھیتی باڑی اور سوداگری۔ سب ایک مخصوص اوقات کار کے تحت چلتے تھے۔ سوائے میرے داجی کے۔ جس کا کام ہی راتوں کے اندھیروں میں شروع ہوتا تھا۔ اور بڑے ہوتے ہوتے مجھے اچھی طرح علم ہو گیا کہ میرا باپ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔'' وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بار بار پلکیں جھپک رہی تھی۔

''اسی لیے تم نے مجھ سے اپنے بارے میں غلط بیانی کی؟'' سعود نے جیسے خود کلامی کی تھی۔ مگر شینا تک اس کی بات بخوبی پہنچی تھی۔ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ شکایت تھی یا بیان۔ شینا نے جواباً خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

''بُرے لوگوں سے تعلقات رکھنے والے تمام افراد کی طرح وہ بھی اپنے خاندان کی عافیت کے لیے پریشان ہی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے گھر سے دور رکھا جاتا تھا۔'' اس نے کندھے اچکائے اور آواز کی رقت پر قابو پا کر بات جاری رکھی۔

''ہاں لالہ البتہ مکمل طور پر داجی کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ میں نہ جانے کیسے اس بڑی حقیقت کو فراموش کر گئی تھی۔ حالانکہ میری ماں نے تمام عمر اسی تکلیف دہ سچ کو جھیلتے ہوئے گزاری تھی۔ مورے کے جواب کے بعد میں خاموش ہو گئی تھی۔ جب تیز تیز قدم اٹھاتا لالہ اس جانب آتا نظر آیا۔ ہلکے نیلے، سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس، آستینوں کو کہنیوں تک چڑھائے۔ حلیے سے وہ بالکل عام سا گھریلو انسان محسوس ہوتا تھا۔''

''مورے! کچھ مہمان آئے ہیں۔ ان کے لیے کھانا حجرے میں پہنچانا ہے بلکہ آپ رہنے دو شینا کو بولو۔ یہ طریقے سے پیش کرے گی۔''

میں نے غور سے بھائی کو دیکھا۔ درمیانہ قد، سرخ و سفید چہرہ جو ہر نوع کے نشے کے استعمال سے پھولا پھولا اور متورم رہنے لگا تھا۔ چھوٹے کٹے ہوئے مگر سر پر بہت کم بچے ہوئے بال۔ وہ پینتیس کی عمر میں پچاس کا محسوس ہوتا تھا مگر اپنی بڑھتی عمر سے بے خبر تھا۔

''ہاں ہاں، مورے کو کیا پتا کھانا کیسے پروستے ہیں۔ سالوں سے جو کھا رہے ہو۔ وہ شینا ہی تو کھلاتی ہے۔'' مورے کو اس کی بات پر غصہ آیا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

''مجھے معلوم ہے۔ میری ماں دنیا کا سب سے اچھا کھانا بناتی ہے۔ مگر وہ لوگ شہر سے آئے ہیں نا۔ مورے! آپ یہی گھر کے برتنوں میں بھیج دو گی۔'' لالہ نے ماں کی ناراضی محسوس کر کے اس کو مسکا لگایا۔

''وہ ٹرے سجا کر حجرے میں لے گیا۔ ہم دونوں ماں بیٹی باہر برآمدے میں چارپائی پر آ بیٹھے۔ اور اس وقت وہ کھانے کی شروعات کرنے ہی لگی تھیں۔ جب گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ہمارے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا۔'' شینا نے غیر محسوس انداز میں سسکی لی۔

''مورے کے ہاتھ سے پانی کا جگ چھوٹ گیا۔ پانی نے تمام رکابیوں کو برباد کر دیا تھا۔ مگر پروا کس کو تھی۔ ہمارا تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا تھا۔ مورے چارپائی سے اتر کر حجرے کی جانب دوڑی تھی۔ میں پریشان ہو کر وہیں کھڑی رہی تھی۔ آواز واضح طور پر حجرے کی جانب سے آئی تھی۔ اسی وقت ایک بار اور گولیوں کی آواز گونجی تھی۔ مورے ابھی دہلیز پر ہی پہنچی تھی جب میں نے اسے رکتے اور پھر گرتے دیکھا۔'' شینا نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی شدتِ جذبات سے سرخ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔ مگر آنسوؤں کو پلکوں کی باڑھ توڑنے سے اس نے کسی طرح روک رکھا تھا۔

''وہ گولی لگنے کے بعد چند لمحوں تک یونہی کھڑی رہی تھی۔ اور پھر کسی دیمک لگے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑی تھی۔'' اس کے آنسو اب گالوں پر بہہ رہے تھے۔ مگر

وہ ان سے بے خبر تھی۔

"مگر....." اس نے آستین سے گال صاف کیا۔

"زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ہاتھ سے مجھے کچھ اشارہ کیا تھا۔ میں اس اشارے کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ کیسے سمجھتی۔ ان حالات میں کس کی سمجھ قائم رہتی ہے؟ حجرہ برآمدے سے کافی دور تھا۔ ماں کو گرتے دیکھا تو میں بے اختیار اس جانب دوڑی تھی۔ مگر فوراً ہی رک گئی تھی۔ شاید کسی غیبی طاقت نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ حجرے سے دو افراد برآمد ہوئے تھے۔ اسلحہ بردار۔ چہرے پر نفرت اور ہاتھوں پر خون لیے۔ میں انہیں نہیں جانتی تھی مگر ان کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔ "وہ رہی۔ پکڑو اُسے" اور تب ماں کا اشارہ مجھے سمجھ آیا تھا وہ مجھ سے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ اور مجھ میں جیسے برق بھر گئی۔ میں پلٹی اور دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس بات سے بے خبر کہ باہر کا ماحول گھر کی طرح دوستانہ نہیں ہے۔ چادر سے چہرہ چھپائے میں نے وہ تمام راستہ دوڑتے ہوئے پار کیا تھا۔ برف میں۔ گھر میں پہننے والی جوتی کے ساتھ۔ مجھے تو باہر کے راستے بھی معلوم نہیں تھے۔ مگر جان بچانے کو بھاگتی رہی۔ دوڑتے ہوئے مسلسل اپنی پشت پر ان لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ تب تک..... جب تک جنگل کے مہربان درختوں نے مجھے آغوش میں نہ چھپا لیا۔" اس نے غیر ارادی طور پر پیر ہلائے تھے۔ شاید اپنی تکلیف یاد کر کے۔

"اپنے ساتھ ہونے والے ممکنہ سلوک نے شاید مجھ میں اتنی ہمت بھر دی تھی کہ جب تک قوتِ ارادی ساتھ دیتی رہی، میں اس برف زار میں دوڑتی رہی۔ جسمانی قوت تو کب کی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔" اب اس کے بے آواز آنسو گالوں پر بہہ کر سوپ کے پیالے میں مدغم ہونے لگے تھے۔ علین نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے پیالہ تھام کر میز پر رکھ دیا۔ اور ایک کپڑا اسے تھما دیا تاکہ وہ چہرہ صاف کر سکے۔

"داجی کا یقیناً شہر سے آنے والوں سے کسی نوعیت کا تنازعہ رہا تھا۔ جو جھگڑے میں بدل کر میرے گھر کی روشنیوں کو گل کر گیا۔"

"یقیناً مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ تمہارے گھر والوں کی موت کی وجہ یہی دونوں تھے؟" سعود نے اچانک پوچھا۔

علین نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ اس کا محدود ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ نتیجہ اس کے باپ نے کوئی سوال کیے بنا کیسے نکالا۔

شینا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو اب مجھے ان سے یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہارے متعلق اخبار میں وہ اشتہار نما خبر کس نے لگوائی تھی۔" سعود نے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ اس کا ایک ہاتھ ایک مضروب کی ٹانگ پر تھا۔ یہ وہی تھا جس کی ٹانگ کو آہنی شکنجے نے جکڑا تھا۔ اس کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اور سعود جانتا تھا کہ گوشت اور ہڈی کے زخم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ اس کی بات سن چکے تھے۔ زمین پر کسی کیچوے کے مانند پڑے وہ بازی ہار چکے تھے۔ اب مزید تکلیف سے بچنے کا یہی طریقہ تھا کہ زیادہ مزاحمت نہ کی جائے۔ اس نے معمولی سا دباؤ ہی ڈالا تھا مگر زخمی شخص کا جسم کسی سانپ کی طرح بل کھا گیا۔

"ایسا مت کرو۔ تمہیں جو پوچھنا ہے، پوچھو۔" وہ دانت بھینچ کر بولا۔ تکلیف ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے ماتھے پر اس سردی میں بھی پسینہ چمکنے لگا تھا۔

"لڑکی کے پیچھے کیوں لگے تھے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"اس کے باپ نے کچھ سامان منگوایا تھا۔" اس نے انگلی سے شینا کی جانب اشارہ کیا۔ "اور ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا تھا۔ ہمیں حکم تھا۔ اگر خان اس کو سردار سنگریز سے بخوشی بیاہنے پر راضی نہ ہو تو اسے اٹھا کر لے آئیں مگر یہ بھاگ نکلی۔ ہم اسے ڈھونڈنے نکلے تھے۔ اگر خالی ہاتھ جاتے تو خود مارے جاتے۔ وہ خبر بھی ہم نے نہیں لگوائی تھی۔ یہ جھنجھٹ کرنے کا ہمارے پاس وقت کہاں تھا۔ بس چند لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ لڑکی دراصل سنگریز کی منکوحہ تھی اور کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ تمہیں معلوم ہے ادھر زبان دے کر پھرنے والے کو لوگ پسند نہیں کرتے۔ امید تھی، کوئی خود ہی اس کی مخبری کر دیتا۔" اس نے رک رک کر بات مکمل کی تھی اور بات کے اختتام پر آنکھیں بند کر کے ہانپنے لگا تھا۔

"کیا سامان منگوایا تھا خان نے؟" سعود نے آنکھیں سکیڑیں۔ خان، شینا کے باپ کی عرفیت تھی۔

"سنگریز خان۔ وہ ہتھیاروں کا سوداگر ہے۔ مگر وہ ہر طرح کی قیمتی شے باہر بھیج سکتا ہے۔ چاہے لڑکی ہو۔" اس نے کن انکھیوں سے شینا کی جانب دیکھا۔

اور سعود کا دل چاہا ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دے۔ اور اس نے فوراً ہی اس خواہش پر عمل کیا تھا جبڑے پر بھرپور غصے کا دباؤ سہہ کر اس کا چہرہ دوسری جانب گھوم گیا تھا۔ شینا کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

"آپ چیختی بہت ہیں۔ بابا کہتے ہیں لڑکیوں کو بہادر

ہونا چاہیے۔" علین نے اس کے چیخنے پر تبصرہ کیا تو اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور علین کے مسکرانے پر خود ہی شرمندہ سی ہوگئی۔

"کاش میں انہیں ورکشاپ لے جاتا۔" اس نے دل میں سوچا۔ مگر وہاں تک انہیں گھسیٹنا دشوار تھا۔ اس نے دوسرے کی جانب دیکھا۔ یہ شخص پہلے کے مقابلے میں کچھ پست محسوس ہوتا تھا۔ اس سے اگلوانا آسان تھا۔

"تم بتاؤ۔ کیوں تباہی مچائی تھی میرے جانوروں میں؟"

"تمہیں..... گھر سے نکالنا چاہتے تھے۔" اس نے کہا۔ "تاکہ پیچھے کوئی۔ مزاحمت نہ کرے۔" اس کے خشک ہونٹوں سے آواز پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ وہ مسلسل بے چینی سے آنکھیں گھما رہا تھا جیسے کوئی راہِ فرار ڈھونڈ رہا ہو۔ یہ سعود کی گولی سے زخمی ہونے والا شخص تھا۔ سعود کو کچھ وقت لگا اس کی بات سمجھنے میں اور پھر ایک ہلکا پھلکا قہقہہ اس کے حلق سے آزاد ہوا۔

"تم لوگوں کی قسمت ہی خراب ہے۔ اگر کچھ وقت وہاں رک جاتے تو جان لیتے کہ میں تقریباً پورا دن گھر میں موجود نہیں تھا۔" وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ان کے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ اور پیر دونوں باندھ رکھے تھے۔

"تم ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟" اس نے سعود کو کھڑے ہوتے دیکھ کر سوال کیا۔ اس کے لہجے میں نامحسوس سی وحشت تھی۔

شاید اس کی جہاندیدہ نگاہ نے سعود کے پتھریلے چہرے پر نوشتۂ تقدیر پڑھ لیا تھا۔

"تم نے تین افراد کو مارنے کا اعتراف کیا ہے۔ اور بھی جانے کتنوں کو قتل کیا ہوگا۔ اگر میں یہیں تمہیں گولی مار دوں تو یہ غلط تو نہیں ہوگا؟ تمہارے قاعدے کی رُو سے؟" اس نے سوالیہ انداز اپنایا۔ وہ بنا جواب دیے آنکھیں پٹپٹاتے رہے۔

"مگر فکر مت کرو میں ایسا کروں گا نہیں۔ تم انتظار کرو۔ جلد ہی یہاں سے لے جائے جاؤ گے۔ دہشت گردی کے الزامات کے تحت۔" وہ رخ مکمل طور پر ان کی جانب پھیر کر بولا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم..... ہم اسمگلنگ کرتے ہیں۔ مگر..... دہشت گرد نہیں ہیں۔" اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"کس کو یقین دلاؤ گے۔" سعود نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہتھیاروں کے ساتھ بارڈر پار کر کے آئے ہو۔ ان حالات میں یہی کافی ہے۔ باقی میرا ایمان ہوگا، تمہاری قبر کھودنے کے لیے یہ بہت ہے۔" آخر میں اس نے سنجیدگی سے کہا تھا اور یہ سچ تھا۔ اس نے ثانیہ کی موت کے بعد مکمل طور پر جاب سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی مگر وہاں اب بھی اس کے دوست اور ہمدرد موجود تھے۔ جس طرح کے حالات سے وہ گزرا تھا، اس کے معمولات سے مکمل طور پر آگاہی رکھی جاتی تھی۔ وہ دو مطلوبہ دہشت گردوں کے نشانے پر تھا۔ اور کبھی بھی ان کی گرفتاری کی وجہ بن سکتا تھا۔ اب بھی شاید وہ اسی جگہ موجود ہوں۔ اسے وسعت اللہ سے پوچھ گچھ کرتا شخص یاد آیا۔

اچانک اس کی نگاہ اپنی جانب دیکھتی شینا سے ملی۔ وہ جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" اب کے وہ کچھ نرمی سے بولا۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ اس کا سخت لہجہ لڑکی کے الفاظ کو لبوں کے پیچھے ہی روک دیتا ہے۔

"میں..... وہ....." اس نے کچھ مضطرب انداز میں انگلی پر بالوں کی لٹ کو لپیٹ کر کھولا۔ وہ یہ عمل بار بار دہرا رہی تھی۔

"ہاں تم؟" سعود نے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سفید کبوتر سرخ ریشم کے ڈھیروں میں اُلجھے ہوئے۔ بار بار دیکھنے کو نہیں ملتے تھے۔

"وہ ورکشاپ میں جو ہوا..... وہ..... وہ بس اچانک ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے علین کو دیکھا۔ سعود چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ پیروں پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹا۔ شینا نے اس کی خاموشی محسوس کر کے نگاہیں اٹھائیں اور نظر ان ساحر آنکھوں سے ٹکرائی۔ اب کے ان میں جھکنے کا یارانہ تھا۔

"تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض دعائیں اس طرح بھی شرمندۂ تعبیر ہوتی ہیں۔ اب یہ نہ پوچھنا کس کی دعا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا تھا یا اسے وہم ہوا تھا۔ باہر ایک سے زائد قدموں کی چاپ ابھری تو وہ باہر نکل گیا۔ یہ ممکن تھا اسے یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑتی۔

جب تک اس کے دشمن زندہ تھے، اس کی جنگ جاری تھی مگر کم از کم اس محاذ پر وہ ناکام نہیں رہا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا تھا۔

❖❖❖